ایمانی صفات

جلد دوم

تالیف

حضرت مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب

خلیفہ مجاز

برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ

صبر کا بیان

صبر لغت میں باندھنے، روکنے اور قابو کرنے کو کہتے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر باندھنا اور ثابت قدم رکھنا، اور اصطلاح شرع میں اپنے نفس (یعنی خواہشات، جذبات اور میلانات) کو قابو کرکے ہر حال میں حق یعنی دینِ اسلام پر قائم رہنا اور دینِ اسلام کو تھامے رکھنا صبر کہلاتا ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ناگواریاں برداشت کرنے کا عادی بنایا جائے، خواہ وہ ناگواریاں اختیار کرنے سے متعلق ہوں یا چھوڑنے سے متعلق ہوں۔ لہٰذا صبر کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔

دینِ حق اور صبر

صبر ایک عظیم الشان خلق اور صفت ہے۔ یہ انسان کو برائیوں سے بچانے کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے انسان اپنے نفس کو گناہوں اور نافرمانیوں سے باز رکھتا ہے اور اسے حق اور دینِ اسلام پر کاربند رکھتا ہے۔ بلاشبہ صبر انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے۔ جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہیں ہوتی، اُس کی دینی عمارت تمام تر ریت کے ٹیلے پر بنی رہتی ہے۔ جب خواہشات کی آندھی چلتی ہے تو اس کی دینی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

صبر کی نعمت مخلوق میں انسان اور جن کو حاصل ہو سکتی ہے

جہاں اور جس امر میں نفس کو گرانی اور ناگواری ہوتی ہے ایسی حالت میں راہِ راست پر ثابت قدم صرف وہی رہ سکتا ہے جو نفسانی خواہشات کے ساتھ ساتھ عقل اور دینی شعور بھی رکھتا ہو، اِسی لیے فرشتوں کو تو صبر کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ شہوات اور خواہشاتِ نفسانیہ سے بالکل پاک ہیں اور حیوانات میں اس کی قوت نہیں، ان میں صرف خواہشات اور شہوات ہیں، وہ عقل اور دینی شعور سے خالی ہیں۔ یہ نعمت صرف انسان کو اللہ تعالیٰ شانہ نے عطا فرمائی ہے کہ اس کو شہوات اور خواہشاتِ نفس بھی دی ہیں اور ساتھ ہی عقل اور دینی شعور کی اہلیت بھی دی ہے۔ تو انسان ہی عقل کے ذریعے اپنے جذبات اور

خواہشات کو راہِ راست کے مطابق کر کے مفید نتائج حاصل کر سکتا ہے ورنہ جو کوئی اپنی خواہشات اور جذبات کو شترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دے وہ رفتہ رفتہ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، کمینہ پن اور غیظ و غضب وغیرہ جیسی بری خصلتوں میں ایسا غرق ہو جاتا ہے کہ انسانیت کے مقام سے گر کر اخلاقی حیثیت سے جانوروں اور درندوں سے بھی نیچے ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں خواہشات اور جذبات کو روکنے اور کنٹرول کرنے کے بارے میں چند مثالیں ذکر کرتے ہیں۔ اس سے صبر کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے۔

۱۔ کوئی شخص کسی نشہ کا عادی ہے، اس نشہ کو چھوڑنا اور پھر جب کبھی وہی نشہ آور چیز دیکھے اور نفس اس کو چاہے تو اپنی خواہشات کو قابو کر کے اپنے آپ کو نشہ سے بچانا۔

۲۔ ایک حسین لڑکے، لڑکی یا ایک شاندار عمارت پر نظر پڑی اور دل میں اس کی کوئی لالچ پیدا ہو گیا تو اپنی نظروں کو قابو میں رکھنا، اپنے دل اور نفس کو اس سے پھیر کر اپنی نظر اللہ تعالیٰ اور آخرت پر جمائے رکھنا۔

۳۔ آپ کو یقین ہو کہ اگر میں نے فلاں معاملہ میں ذرہ برابر جھوٹ بولا یا بد عہدی کی یا چغلی کھائی تو مجھے منوں سونا مل جائے گا اور یہ بھی یقین ہو کہ میری خیانت اور جھوٹ کا راز رہتی دنیا تک کوئی کھول نہیں سکے گا، یا تھوڑی سی بد عہدی کی وجہ سے آپ پوری جنگ جیت سکتے ہوں، پھر بھی اپنے نفس کو کنٹرول کر کے جھوٹ، بدی، خیانت، چغلی اور بد عہدی سے اپنے آپ کو بچانا۔

۴۔ آپ کو یقین ہو کہ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب اور دنیا میں عزت کا مقام ایسی صورت میں مل سکتا ہے کہ میں فلاں شخصیت کو داغدار کروں، اس کی غیبت کروں، پھر بھی اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو کر کے اپنے آپ کو حق پر جمائے رکھنا۔

۵۔ غصہ آجائے تو اس کو کنٹرول کرنا اور عین غصہ کی حالت میں بھی حق و عدل سے نہ ہٹنا۔

۶۔ اگر آپ کے کسی رشتہ دار یا دوست وغیرہ کا کسی ایسے شخص کے ساتھ معاملہ آئے جس کے ساتھ آپ کی عداوت، دشمنی اور بغض و کینہ ہے تو آپ کا ان دونوں کے درمیان فیصلہ کے وقت اپنے جذبات اور خواہشات کو کنٹرول کر کے عدل و حق کے مطابق فیصلہ کرنا۔

۷۔ آپ پر لوگوں کے مالی حقوق ہیں یا ان کی خدمت آپ کے ذمہ ہے ایسی صورت میں اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو کر کے اپنی لذت، راحت اور اپنے مال و دولت کو قربان کر کے لوگوں کے حقوق ادا کرنا۔

۸۔ عبادات: مثلاً نماز، ذکر، روزہ وغیرہ کا اہتمام اور ان پر دوام کرنا، نفس نہ بھی چاہے پھر بھی اپنی خواہش نفس کو کنٹرول کر کے پوری ہمت و یکسوئی کے ساتھ ٹھیک وقت پر خشوع و خضوع، سکون اور ظاہری و باطنی آداب کے ساتھ نماز وغیرہ عبادات کی پابندی کرنا۔

۹۔ فقر و تنگی کی حالت میں بھی لوگوں سے طمع و سوال سے اپنے نفس کو روکنا۔

۱۰۔ بیماریوں اور رشتہ داروں کی موت پر جزع و فزع، گریبان پھاڑنے وغیرہ ناجائز امور سے اپنے آپ کو بچانا۔

۱۱۔ جب اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ حق کا داعی بن کر میدان میں اترتا ہے تو اس وقت اُسے مخالفین کے پروپیگنڈوں، لوگوں کے طعن اور رشتہ داروں، پرانے دوستوں اور عام لوگوں کی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مالی وجانی ایذارسانیوں کی مشکلات او ر مصائب سامنے آجاتے ہیں، ان تمام ایذارسانیوں اور مشکلات کو حق کی خاطر برداشت کرنا اور اپنے نفس اور جذبات کو قابو کر کے حق پر ڈٹے رہنا۔

۱۲۔ باطل سے مقابلے کی صورت میں اپنے آپ کو گھبراہٹ، مایوسی اور پست ہمتی سے بچانا، مشکل اور سخت حالات میں بھی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنا۔

۱۳۔ ہنگامی اور جذباتی حالات ہوں یا عام حالات، خواہشِ نفس کے مطابق احکام ہوں یا نفس پر سخت شاق گزرنے والے احکامات، سب میں اپنے مرکز حق کے فیصلوں کا پابند رہنا۔

۱۴۔ جوش اور جذباتی حالات میں نفس کو لگام دے کر اس کو حق کے تابع بنانا کہ کوئی اقدام اس کے صحیح وقت اور حالات سے قبل نہ کیا جائے۔

صبر کی شاخوں کے مختلف نام

صبر کے چند پہلو بطورِ نمونہ پیش کئے گئے تا کہ صبر اور صابر کی پہچان ہو سکے، اب اس کے بعد اس

بات کو جان لیجیے کہ جن امور کے متعلق صبر اختیار کیا جاتا ہے ان کے اعتبار سے صبر کے بہت سے نام ہیں، یایوں کہیے کہ صفتِ صبر کی بہت سی شاخیں ہیں جن کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان شاخوں کی موٹی موٹی صورتیں اور اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ دولت وثروت اور مال و اولاد کی کثرت وزیادتی پر صبر کرنا۔ اس کا نام ''ضبط نفس'' ہے اور اس کے ضد کا نام ''بطر'' یعنی اترانا اور فخر ہے۔

۲۔ فرائض اور احکامات پر صبر۔

۳۔ برائیوں سے اپنے نفس کو روکنا مثلاً: غیبت نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، چوری نہ کرنا اور خیانت وغیرہ سے نفس کو روکنا، اس طرح مختلف گناہوں سے رکنے کی وجہ سے صبر کے مختلف نام ہو جاتے ہیں مثلاً: اگر خواہشاتِ نفس پر قابو رکھنا پیٹ اور شرمگاہ کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام ''عفت'' ہے، اور جھوٹ سے پرہیز کرنے والے کو ''سچا'' کہتے ہیں۔

۴۔ میدانِ جنگ اور خطرناک حالات میں صبر یعنی تحمل وبرداشت کا نام ''شجاعت'' ہے اور اس کی ضد کا نام جبن، بزدلی اور نامردی ہے۔

۵۔ فضول عیش پسندی سے اجتناب اور دنیا کے مال ومنصب اور جاہ سے بے رغبتی اور صبر کا نام ''زہد'' ہے اور اس کی ضد کا نام ''حب الدنیا'' (دنیا کی محبت اور عیش پسندی) ہے۔

۶۔ نفسانی اور جنسی خواہش کے مقابلہ میں صبر کا نام ''عفت'' ہے اور اس کی ضد کا نام شہوت پرستی، فحاشی اور بے حیائی ہے۔

۷۔ تھوڑی سی چیز پر خوش ہو کر صبر کرنا، یا جو کچھ مل جائے اس پر خوش ہونا اور کم سے کم لذت اور راحت بخش چیز پر راضی اور خوش ہونے کا نام ''قناعت'' ہے اور اس کی ضد کا نام حرص وطمع ہے۔ ان چیزوں کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی جگہ آئے گا۔

۸۔ غیظ وغضب کے حالات پر صبر کرنا اور درگزر کرنا، اس کو اصطلاح میں ''حِلم'' کہتے ہیں۔

۹۔ مصائب کے مقابلہ میں صبر کرنا؛ اس کو اصطلاح میں ''صبر'' کہا جاتا ہے اور اس کی ضد کا نام جزع وفزع ہے۔

صبر کی یہ چند موٹی موٹی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے فضائل تو یہاں ذکر کیے جائیں گے اور بعض کے فضائل اس کتاب کے مختلف ابواب میں آچکے ہیں اور بعض کے ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیں گے۔ نیز ان میں سے بعض کی تشریح ضروری ہے وہ بھی ان شاء اللہ پیش کروں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے متعلق قرآن وحدیث سے بھی کچھ پیش کیا جائے گا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ''صبر'' بے بسی اور کمزوری کا نام نہیں بلکہ یہ نفس کو ہر حال میں گھبراہٹ سے بچانے، اس کو شریعتِ مطہرہ کے مطابق قابو رکھنے، ہر حال میں راہِ حق پر ثابت قدم رہنے اور ڈٹ جانے کو کہتے ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معیّت نصیب ہوتی ہے۔

صحت، مال اور ثروت وغیرہ پر ''صبر'' ضبطِ نفس

جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ صحت، مال و دولت کی فراوانی یا زیادہ اولاد عطا فرماتا ہے تو ایسے خوشی کے حالات میں خواہشاتِ نفس انسان کو طرح طرح کی فضول خرچیوں میں پھنساتی ہیں اور فخر و غرور وغیرہ پر اُس کو اکساتی ہیں۔ ایسے حالات میں ''صبر'' یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اللہ تعالیٰ کو بھول نہ جائے، یادِ الٰہی میں کوتاہی نہ کرے۔ غریبوں اور فقیروں کو حقیر نہ جانے، اُن کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا رہے، فخر و غرور، فضول خرچی، بخل اور دوسرے مظالم سے اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ اس کو ''ضبطِ نفس'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان پر تکلیف کی حالت آتی ہے تو انسان بددل ہوجاتا ہے اور مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور راہِ حق پر ثابت قدم رہنا ان لوگوں کا کام ہے جن میں صبر و استقلال ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۞ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۞ یعنی ''اگر کبھی ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھادیتے ہیں، پھر اس سے اس (مہربانی) کو چھین لیتے ہیں تو وہ بڑا مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے، اور اگر کسی مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت چکھادیتے ہیں تو بول اٹھتا ہے کہ مجھ سے (ساری) برائیاں (یعنی سختیاں اور تکلیفیں) دور ہوگئیں، بے شک وہ اترانے والا اور بڑا فخر کرنے والا ہے۔ مگر (اس کمزوری اور قبیح خصلت سے پاک صرف) وہ لوگ (ہیں) جو صبر کرتے

ہیں (یعنی جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں مستقل مزاج اور نفس پر قابو رکھنے والے ہوتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جن کے لیے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے۔"

(سورۂ ہود: آیت ۹ تا ۱۱)

مذکورہ بالا آیتوں میں مؤمن کی شان بتلائی گئی ہے کہ وہ کفار و مشرکین کی طرح نہیں کہ غم و مصیبت کے وقت مایوس، بددل اور ناشکرا ہوتا ہے اور خوشی و آرام کی حالت میں فخر و غرور میں مبتلا ہوتا ہے، بلکہ مؤمن اللہ تعالیٰ پر ایمان، اُس کی تقدیر پر ایمان اور اُس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ سچی اور پکی محبت کے تعلق کی وجہ سے نہ تو مصیبتوں اور تکلیفوں میں پڑ جانے کی حالت میں مایوسی، نااُمیدی، بددلی اور ناشکری کا شکار ہوتا ہے اور نہ خوشی کی حالت میں نازاں اور مغرور ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں راہِ حق پر قائم رہتا ہے اور صبروا کے بعد عملوا الصّٰلحٰت کا ذکر کر کے شاید اس طرف اشارہ دے دیا گیا ہے کہ جب انسان ہمیشہ نیک اعمال کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے تو اس میں صبر، ثبات و استقامت اور استقلال کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور بڑھ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

فرائض و احکامات پر صبر

فرائض اور احکامات پر صبر کا مطلب ہے کہ فرائض کو عمر بھر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یہ نہیں کہ جب دل نے چاہا تو کچھ دن خوب نمازیں ادا کیں، نوافل پڑھے اور خوب ذکر کیا، پھر جب نفس پر گراں گزرا تو چھوڑ دیا یا اس میں کوتاہی شروع کی بلکہ نیک کاموں کو دل چاہے یا نہ چاہے مضبوطی اور استقامت کے ساتھ کرنا یہ "صبر" ہے جو پوری بندگی کو اور انسان کے تمام اعمالِ خیر کو محیط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا "اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس پر جمے رہو۔" (سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۳۲)

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ یعنی "وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہیں پس اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم (اور جمے) رہو۔"

(سورۃ مریم: آیت ۶۵)

کارِ خیر پر دوام اللہ تعالیٰ کو پسند اور محبوب ہے

کسی کارِ خیر یا نیک عمل کو کچھ دن کرنا زیادہ کٹھن اور مشکل کام نہیں البتہ اس پر دوام اور پختگی کے ساتھ عمل کرنا نفس پر بہت گراں گزرتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس کو کسی کام کا پابند کیا جائے۔ دوام میں یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ بندہ یہ کارِ خیر خواہشِ نفس کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے، کیونکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو کسی کارِ خیر (نفل وغیرہ) میں لذت محسوس ہوتی ہے تو وہ اُس نیک عمل کو جذباتی طور پر اختیار کر لیتا ہے، لیکن جب وہ "بسط"(1) کی حالت نہیں رہتی اور نفس پر عمل کرنا گراں گزرتا ہے تو وہ اُس عمل کو چھوڑ دیتا ہے یا اُس میں کوتاہی کرنے لگتا ہے۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ جو عمل کرتا تھا وہ خالص نہیں تھا، اس میں نفس لذت پا رہا تھا اور جوں ہی لذت اور نفس کی خوشی نہ رہی تو اسے چھوڑ دیا یا اس میں کوتاہی کرنے لگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کو وہ اعمال (نیک کام) زیادہ پسند اور محبوب ہوتے ہیں جن پر دوام اور استقامت ہو، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ "اللہ تعالیٰ کو اعمال (اور نیکیوں) میں وہ عمل زیادہ محبوب ہے جس پر دوام اور ہمیشگی اختیار کی جائے، اگرچہ وہ عمل کم ہو۔" (مسلم و بخاری)

اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ جب انسان کوشش کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی یاد پر دوام اختیار کر لیتا ہے، نفس کی خوشی اور ناخوشی دونوں حالتوں میں وہ برابر نیکیوں کو کرتا رہتا ہے تو بالآخر یہی کارِ خیر اور نیکیاں اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے انسان کے اندر صبر و استقامت کا جوہر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا میں بھی بے قراری اور گھبراہٹ سے محفوظ، اطمینان و سکون کی زندگی گزارتے ہیں اور آخرت میں بھی عظیم اور ابدی انعامات پا جاتے ہیں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ "صبر

---

(1) (قبض و بسط "تصوف" کی اصطلاح ہے۔ بسط کی حالت میں عبادت اور نیکیوں میں دل لگتا ہے اور قبض کی حالت میں عبادت، ذکر وغیرہ میں دل نہیں لگتا۔ اس کی بھی بہت سی اقسام ہیں)

کے فضائل" میں آجائے گا۔

شجاعت، یعنی حق کی خاطر تکلیفوں پر صبر اور میدانِ جنگ میں صبر واستقامت اختیار کرنا

حق کی خاطر تکلیفوں کو خاطر میں نہ لانا اور اُن کو برداشت کرنا تو صبر ہے ہی بلکہ میدانِ جنگ میں بہادری اور ثابت قدمی سے لڑنا اور دشمن کے حملوں سے نہ گھبرانا اور نہ بھاگنا بھی صبر کے مفہوم میں داخل ہے۔ قرآن مجید نے اس کے لیے باربار "صبر" کا لفظ استعمال فرمایا ہے مثلاً: اللہ تعالیٰ سچوں اور پرہیزگاروں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞ "اور جو صبر کرنے (یعنی ثابت قدم رہنے) والے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور (حق کی خاطر) جنگ کے وقت، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔" (سورۃ البقرہ: آیت ۱۷۷)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ "اے نبی! مؤمنوں کو (دشمنوں کے ساتھ) لڑائی پر اُبھارو، اگر تم میں سے بیس آدمی صبر کرنے والے (یعنی ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں۔"

(سورۃ الانفال: آیت ۶۵)

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ۞ "کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے (آزما کر) تم میں سے ان لوگوں کو الگ نہیں کر دیا ہے جو جہاد کرنے والے ہیں اور جو صابر (یعنی جہاد میں ثابت قدم رہنے والے) ہیں۔"

(سورۃ آل عمران: آیت ۱۴۲)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا ط وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۞ یعنی "اور کتنے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے (باطل کے ساتھ) جنگ کی، پس اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان (تکلیفوں اور مصیبتوں) کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزوری

دکھائی، اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا اور اللہ تعالیٰ (ہر تکلیف ومشکل میں ثابت قدم رہنے والے ایسے ہی) صابرین سے محبت رکھتے ہیں۔" (سورۃ آل عمران: آیت ۱۴۶)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی معیت ونصرت فقط ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو حق کی خاطر لڑتے ہوں اور جو پورے دینِ اسلام پر پختگی سے عمل کرنے والے اور تمام مشکلات و مصائب کا مردانگی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے والے ہوں۔ ہمارے اسلاف ایسے ہی تھے اور یہی اہلِ ایمان کی نشانی ہے کہ وہ راہِ حق پر استقامت کے ساتھ چلتے ہیں اور راہِ حق میں پیش آنے والی ہر تکلیف اور مصیبت کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ حالات کی سنگینیاں نہ تو اُن کو دبا سکتی ہیں اور نہ ہی کمزور کر سکتی ہیں بلکہ وہ ان کے جوش ایمان کو اور بڑھاتی ہیں۔

حِلم یعنی غیظ وغضب کے حالات پر صبر ودرگزر کرنے کی فضیلت

غیظ وغضب اور غصہ پر صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ غصہ پر قابو رکھا جائے اور بلاضرورت غیظ وغضب کے تقاضے پر عمل نہ کیا جائے۔ بلاشبہ لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر کرنا انسانی اخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے اور غیظ وغضب اور غصہ میں بے اعتدالی اور حد سے تجاوز بہت بڑی برائی اور ہلکاپن ہے۔ غصہ میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور انجام سوچنے کا ہوش نہیں رہتا اس لیے انسان اکثر اوقات غصہ اور غضب کی حالت میں ایسی باتیں یا ایسے کام کر جاتا ہے جن کے بعد وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور بے جا غصہ نکالنے کی وجہ سے دنیا وآخرت کو برباد کر دیتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے غصہ کو قابو میں رکھے اور اچھا مسلمان تو وہ ہے جو تکلیف دینے والوں کے قصور کو نظر انداز کر کے ان کو معاف کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ متقیوں اور پرہیزگاروں کی چند صفات بیان کرتے ہوئے ان کی ایک خاص صفت اور علامت یہ بھی بتلائی ہے کہ: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۞ یعنی "(متقی لوگ) غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کے قصور معاف کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔"

کظم خوب بھری ہوئی مشک کے منہ باندھنے کو کہتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ جب ایسی صورت حال پیش آجائے جس کی وجہ سے غیظ وغصہ سے جسم بھر جائے تو غصہ کو بند اور ضبط کیا جائے

، تاکہ گالی گلوچ یا کوئی انتقامی، جذباتی اور ضرر رساں چیز زبان وہاتھ سے نہ نکل جائے، بلکہ تکلیف پہنچانے والے کی خطاو قصور کو نظر انداز کر کے اسے معاف کیا جائے۔ یہ بلاشبہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔

غصہ آنا برا نہیں، غصہ کا بے جا استعمال برا ہے

اس آیتِ کریمہ میں اور اس طرح دوسری قرآنی آیات اور احادیث میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ غصہ کے کام پر غصہ آنا کوئی برا کام نہیں، بلکہ "غیظ وغصہ" انسان کے اندر ایک قوت ہے جو اگر صحیح سبب اور صحیح علم سے آجائے تو اسے بے جا غصہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ غصہ کے کام پر غصہ نہ آنا بے علمی، بے وقوفی یا بے حمیتی اور بے غیرتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن وحدیث میں یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ غصہ کو ختم کر دو یا وہ لوگ متقی ہیں جن کو غصہ نہ آئے بلکہ اُن لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جن کو غصہ آئے اور وہ غصہ نکالنے پر قادر بھی ہوں لیکن پھر بھی وہ غصہ نہ نکالیں تو یہ ہمت کا اور اجر وثواب کا کام ہے۔ اگر غصہ آیا ہی نہ ہو یا غصہ نکالنے پر قدرت نہ ہو جیسے جابر اور ظالم بادشاہ وغیرہ کو اکثر جواب نہیں دیا جاتا کہ وہاں غصہ نکالنے کی قدرت نہیں ہوتی، تو ایسی صورتوں میں غصہ نہ نکالنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غصہ نہ نکالنا تو اس وقت سمجھا جائے گا کہ سخت غصہ بھی آیا ہو اور پھر اس کے نکالنے پر قدرت بھی حاصل ہو جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے لیے آخرت کی خوشیاں اور نعمتیں ذکر کی ہیں ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۞ "اور جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔" (سورۃ الشوریٰ: آیت ۳۷)

غصہ پی جانے والے کا دل سکون وایمان سے بھر جاتا ہے

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے الکاظمین الغیظ کی تفسیر میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى إِنْفَاذِهِ مَلَأَ اللّٰهُ جَوْفَهُ أَمْنًا وَإِيْمَانًا "جس شخص نے غصے کو ضبط کیا باوجود یکہ وہ غصہ نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ (یعنی دل) کو سکون اور ایمان سے بھر دے گا۔" (مسند احمد کذا فی ابن کثیر)

غصہ کو پی جانے والا روحانی اور اعصابی پہلوان ہوتا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِی يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ یعنی "(حقیقی) پہلوان وہ شخص نہیں جو (کسی پہلوان یا طاقتور شخص کو) پچھاڑے بلکہ پہلوان وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے (یعنی غصہ نہ نکالے)۔" (بخاری و مسلم)

اعصابی کمزوری کا علاج غصہ پی جانے کی مشق میں ہے

انسان کا سب سے بڑا دشمن اُس کا اپنا نفس ہے اور جو چیز انسان کے مقابلے میں سب سے زیادہ طاقتور ہے وہ بھی خود اس کا نفس ہے، اس لیے اصل کمال، بہادری اور پہلوانی یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو زیر کر دے اور یہی وہ اعصابی اور روحانی پہلوانی ہے جو دنیا و آخرت اور ہمیشہ کے لیے سرخروئی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس حدیث سے بھی اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ جو شخص غصہ پی جانے کی مشق کرتا ہے وہ بالآخر اپنے نفس اور غصہ پر خوب قابو پا لیتا ہے اور وہ اعصابی طور پر بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ پھر وہ مصائب اور مشکلات میں بھی گھبراہٹ اور اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔ نیز اعصابی قوت اور مضبوطی ہی ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان کو بلند و بالا کر دیتی ہے۔

غصہ پی جانے کا گھونٹ سب سے افضل ہے

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ جُرْعَةً اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰی یعنی "کسی بندہ نے کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ عزوجل کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جس کو وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے پیے۔" (مسند احمد)

غصہ ضبط کرنے کا انعام

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنِ اعْتَذَرَ اِلَى اللّٰهِ قَبِلَ اللّٰهُ عُذْرَهٗ)

"جو شخص اپنی زبان کو (دوسروں کی بد گوئی اور دوسری بری باتوں سے) بند رکھتا ہے، اللہ اس کے عیوب کو ڈھانپ لیتا ہے اور جو شخص اپنے غصے کو ضبط کرتا ہے (اور انتقام لینے سے باز رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا اور جو شخص (اپنے گناہوں پر نادم ہو کر) اپنی تقصیرات کی معذرت اللہ تعالیٰ کے حضور میں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی معذرت کو قبول کرتا ہے (یعنی جو شخص اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرماتے ہیں)۔" (مشکوۃ)

قیامت کے دن غصہ پی جانے والے کا اعزاز

حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ قَادِرٌ عَلَى اَنْ يُّنَفِذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهُ اللّٰهُ مِنْ أَيِّ الْحُوْرِ الْعِيْنِ شَآءَ "جو شخص اپنے غصہ کو ایسی حالت میں پی جائے کہ وہ اپنے غصے کے تقاضے کو پورا کرنے پر قدرت اور طاقت رکھتا ہو (لیکن پھر بھی اپنے غصہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پی جائے اور انتقام نہ لے) تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے بلائیں گے اور اس کو اختیار دیں گے کہ جنت کی حوروں میں سے جس حور کو چاہے اپنے لیے منتخب کر لے۔" (ابوداؤد)

حلیم شخص طاقتور ہوتا ہے

بلاشبہ غصہ آدمی کے اندر ایک قوت ہے اور اس کا بلاوجہ استعمال اور بے جا نکالنا ضیاعِ قوت ہے۔ اس کا پینا اعصابی قوت کو بڑھانے والا ٹانک ہے۔ اس لیے غصے کے مریض کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اعصابی کمزور سمجھ کر غصہ پینے کی خوب مشق کرے اور اپنے اندر حِلم اور بردباری پیدا کرنے اور اس کو بڑھانے کے لیے اس ٹانک اور قوت کو استعمال کرے (یعنی غصہ کو محبت سے پیے)۔ حلیم شخص ہی درحقیقت بڑا طاقتور ہوتا ہے۔

حِلم کے معنی

حِلم کے معنی یہ ہے کہ انتقام پر قدرت کے باوجود کسی ناگوار بات یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

حِلم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے

قدرت وطاقت کا اصل سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ربُّ العالمین کی ذات ہے اور انتقام کی اصل اور سب سے زیادہ قدرت اسی کو حاصل ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بندوں کی بہت سی برائیوں اور خطاؤں سے چشم پوشی فرماتا ہے، گناہوں پر اُن کو بار بار مہلت دیتا ہے اور بخشش مانگنے والوں کو بار بار معاف کرتا رہتا ہے۔ اس حلیم ذات نے اپنی اس صفت کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان فرمایا ہے اور جہاں جہاں اس صفت کا اظہار فرمایا ہے اکثر بیشتر اس کے ساتھ ہی اپنے علم و بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حِلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش اور درگزر کا نتیجہ ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

۱۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔

۲۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا۔

۳۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا۔

اس طرح کی آیتوں میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے علم کے ساتھ ہر بات اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بھی بردباری فرماتا ہے۔ ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغناء کا بھی ذکر یوں فرمایا ہے کہ: وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حِلم بندوں کی طرح کسی دنیوی یا اُخروی احتیاج وفائدے یا کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا یہ حِلم کامل استغناء کے ساتھ ہے۔ ان آیتوں میں اس طرف بھی رہنمائی ملتی ہے کہ بندوں کو چاہیے کہ اپنے اندر حِلم و بردباری کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

بندوں میں حِلم و بردباری کی صفت اور اس کی فضیلت

حِلم و بردباری کی ابتدا غصہ پینے سے ہوتی ہے۔ جب غم و غصہ کو زبردستی دبایا جاتا ہے تو یہ حِلم اور بردباری کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ حِلم کا ادنیٰ درجہ ہوتا ہے، اور جب اس میں پختگی حاصل ہو جاتی ہے اور غم و غصہ آجانے کے بعد انسان اس کو آسانی سے پینے لگتا ہے گویا یہی صفت اس کی طبیعت بن جاتی ہے تو اس کا نام ''حِلم'' ہے۔ حِلم و بردباری ایسی فضیلت ہے جو انسان کے لیے کمالِ عقل، اعصابی

قوت اور مردانگی کی علامت ہوتی ہے۔ اس فضیلت کے ساتھ اگرچہ ہر شخص کو متصف ہونا چاہیے لیکن جو لوگ قوم کے رہنما، قائدین اور مصلحین ہیں ان میں اس صفت کا کمال درجے میں ہونا بہت ضروری ہے ۔یہ صفت حِلم اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں: اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ۞ ”بے شک ابراہیم بڑے بردبار (اور تحمل والے)، نرم دل (اور رحم دل اور ہر حال میں ہماری طرف) رجوع کرنے والے تھے۔“

(سورہ ہود: آیت ۷۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: يَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ ”اے میرے پروردگار! تیرے بندوں میں سے کون بندہ تیرے نزدیک زیادہ عزیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا! جو بندہ قدرت رکھنے کے باوجود عفو ودرگزر کرے۔“ (مشکوٰۃ)

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار اشج سے فرمایا: اِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ الْحِلْمُ وَالْاَنَاةُ ”تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پیاری ہیں، ایک حِلم (بردباری) اور دوسری جلد بازی نہ کرنا۔“ (مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حِلم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی عورت بکری کے گوشت میں زہر ملا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ نوش فرمایا (تو آپ کو پتہ چل گیا)۔ اس عورت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اس زہر ملانے کے بارے میں پوچھا تو اس عورت نے صاف کہا کہ میں آپ کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ میرے خلاف تمہارے اس منصوبے کو ہرگز کامیاب کرنے والے نہیں تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ اس عورت کو قتل نہیں کریں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں زندگی بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے کے کوے پر اس زہر کا اثر دیکھتا رہا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی عورت نے بکری کے گوشت میں زہر ملا کر

حضور ﷺ کی خدمت میں دعوت میں بھیجا (اس میں سے کچھ کھانے کے بعد) حضور ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: رک جاؤ! اس گوشت میں زہر ملا ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے اس یہودی عورت سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس عورت نے کہا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو اللہ آپ کو بتادیں گے (کہ اس میں زہر ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو آپ زہر سے ہلاک ہو جائیں گے اور لوگوں کی جان آپ سے چھوٹ جائے گی (نعوذباللہ من ذلك)۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ان سے کچھ نہ کہا۔

امام احمد، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی اس حدیث جیسی حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں، اس میں یہ مضمون بھی ہے کہ جب بھی حضور ﷺ کو اس زہر کی وجہ سے جسم میں تکلیف محسوس ہوا کرتی تو آپ سینگی لگواتے چنانچہ ایک مرتبہ سفر میں آپ تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے احرام باندھا اور آپ کو اس زہر کا اثر محسوس ہوا تو آپ نے سینگی لگوائی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے ایک بکری کو بھونا اور پھر اس میں زہر ملایا اور پھر حضور ﷺ کی خدمت میں اسے بھیجا۔ حضور ﷺ نے اس کی دستی کو لیا اور اس میں سے نوش فرمانے لگے اور آپ کے ساتھ چند صحابہ نے بھی اس کا گوشت کھایا۔ پھر حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: اپنے ہاتھ روک لو۔ حضور ﷺ نے آدمی بھیج کر اس عورت کو بلایا اور اسے فرمایا: کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ اس یہودی عورت نے کہا: آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ دستی کا ٹکڑا جو میرے ہاتھ میں ہے اس نے مجھے بتایا ہے۔ اس عورت نے کہا: ہاں! میں نے ملایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: زہر ملا کر تو کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟ اس عورت نے کہا: میں نے سوچا کہ اگر آپ سچے نبی ہوں گے تو یہ زہر ملی بکری آپ کا نقصان نہیں کر سکے گی اور اگر آپ نبی نہیں تو ہماری جان آپ سے چھوٹ جائے گی۔ حضور ﷺ نے اس عورت کو معاف کر دیا اور اسے سزا نہ دی۔

جن صحابہ نے اس بکری کا گوشت کھایا تھا ان میں سے بعض صحابہ کا انتقال ہو گیا اور جو گوشت آپ ﷺ نے کھایا تھا اس کی وجہ سے آپ نے اپنے کندھے پر سینگی لگوائی۔ حضرت ابو نہد رضی اللہ عنہ نے آپ

کو سینگ اور چھری سے سینگی لگائی۔ حضرت ابو نہد رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ بنو بیاضہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ انتقال کرنے والے صحابی حضرت بشر بن براء بن معرُور رضی اللہ عنہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر اس عورت کو قتل کر دیا گیا۔ حضرت مروان بن عثمان بن ابی سعید بن معلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مرض الوفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی بہن آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے اُمّ بشر! میں نے تمہارے بھائی کے ساتھ جو بکری کا گوشت خیبر میں کھایا تھا اس کی وجہ سے مجھے اس وقت اپنے دل کی رگ کٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، اور تمام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے نوازا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کا مرتبہ بھی عطا فرمایا ہے۔

حضرت جعدہ بن خالد سمہ جُشمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موٹے آدمی کو دیکھا تو ہاتھ سے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر یہ (مال) اس جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ ہوتا تو تمہارے لیے بہتر تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور صحابہ نے بتایا کہ یہ آدمی آپ کو (نعوذ باللہ من ذلک) قتل کرنا چاہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ڈرو مت! اگر تمہارا یہ ارادہ تھا تو اللہ نے تمہیں اس میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صلح حدیبیہ کے موقع پر مکہ کے اسّی (۸۰) آدمی ہتھیار لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر حملہ آور ہونے لگے تھے۔ وہ لوگ بے خبری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف بد دعا کی تو وہ سب پکڑے گئے۔ حضرت عفان راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی: وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ "اور وہ ایسا ہے کہ اُس نے اُن کے ہاتھ تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ اُن (کے قتل) سے عین مکہ (کے قریب) میں روک دیے، بعد اس کے کہ تم کو اُن پر قابو دے دیا تھا"۔ (سورہ فتح: آیت ۲۴)

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ كَانَ عِنْدَهٗ رَجُلٌ بِهٖ اَثَرُ صُفْرَةٍ قَالَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَكَادُ يُوَاجِهُ اَحَدًا بِشَيْءٍ يَكْرَهُهٗ فَلَمَّا قَامَ قَالَ

لِقَوْمٍ لَوْ قُلْتُمْ يَدَعُ هٰذِهِ الصُّفْرَةَ

ترجمہ: ''انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا جس پر زرد رنگ کا کپڑا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ ناگوار کو منہ در منہ منع نہ فرماتے تھے اس لیے سکوت فرمایا اور جب وہ شخص چلا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس کو زرد کپڑے سے منع کر دیتے تو اچھا ہوتا''۔

ف: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی امت پر غایت شفقت تھی کہ اکثر بالمواجہ ایسے امور کو منع نہ فرماتے تھے اس لیے کہ مبادا وہ شخص انکار کر بیٹھے یا اعتراض کا سبب بن جائے جس سے نوبت کفر تک پہنچ جائے۔ اگر ان امور سے اطمینان ہوتا تو منع بھی فرما دیتے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایسے ہی کپڑوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود منع فرما دیا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات حدیث کی کتابوں میں ہیں، نیز یہ تاخیر اور بالمواجہ منع نہ فرمانا ایسے ہی مواقع میں تھا جہاں خلاف اولیٰ بات ہو یا تاخیر میں کوئی نقصان نہ ہو، ورنہ حرام چیز کے ارتکاب میں یہ صورت نہ تھی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے باب میں مفصل روایت میں ہے کہ جب امر حق سے تجاوز کیا جاتا تو اس وقت آپ کے غصہ کی کوئی شخص تاب لا سکتا تھا اور نہ کوئی اس کو روک سکتا تھا، جب تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا انتقام نہ لے لیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کبھی اپنے کسی خادم کو یا کسی عورت کو یا کسی اور چیز کو نہیں مارا، اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے کسی کو مارا ہو تو اور بات ہے، اور جب بھی آپ کو دو (دنیوی) کاموں میں اختیار دیا جاتا تو دونوں میں سے جو زیادہ آسان ہوتا تو وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند ہوتا بشرطیکہ وہ کام گناہ نہ ہوتا۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے سب سے زیادہ دور رہتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنی بھی زیادتی کی جاتی آپ اپنی ذات کی وجہ سے کسی سے بدلہ نہ لیتے البتہ کوئی اللہ کا حکم توڑتا تو اس سے اللہ کے لیے بدلہ لیتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی کے ظلم کا بدلہ لیا ہو البتہ جب اللہ کا حکم توڑا جاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سب سے زیادہ ناراض ہوتے اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو دونوں میں سے جو زیادہ آسان ہوتا اسے ہی

اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا۔

حضرت ابو عبد اللہ جدلی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو طبعاً فحش گو تھے اور نہ بتکلف فحش بات کرتے تھے اور نہ بازاروں میں چلّاتے اور شور مچاتے تھے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے، بلکہ معاف فرمادیتے اور درگزر فرماتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حِلم

حضرت بحریہ رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں میرے چچا حضرت خداش رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پیالہ میں کھاتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ پیالہ بطورِ ہدیہ مانگ لیا۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ پیالہ دے دیا) چنانچہ وہ پیالہ ہمارے ہاں رکھا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ پیالہ میرے پاس نکال کر لاؤ، ہم زمزم کے پانی سے بھر کر وہ پیالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے لاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں سے کچھ پیتے اور کچھ (برکت کے لیے) اپنے سر اور چہرے پر ڈال لیتے۔ پھر ایک چور نے ہم پر بڑا ظلم کیا کہ وہ ہمارے سامان کے ساتھ اسے بھی چوری کر کے لے گیا۔ پیالہ کی چوری کے بعد حضرت عمر ہمارے پاس آئے اور حسبِ دستور پیالہ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا: اے امیر المؤمنین! وہ پیالہ تو ہمارے سامان کے ساتھ چوری ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ چور تو بڑا سمجھ دار ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیالہ چرا کر لے گیا۔ راوی کہتے ہیں: اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ چور کو برا بھلا کہا اور نہ اس پر لعنت بھیجی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیینہ بن حصین بن (حذیفہ بن) بدر رضی اللہ عنہ (مدینہ) آئے اور وہ اپنے بھتیجے حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرے۔ حضرت حر ان لوگوں میں سے تھے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قریب رکھتے تھے اور عبادت گزار علماء ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں ہوتے تھے چاہے وہ جوان ہوتے یا عمر رسیدہ۔ حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تمہیں امیر المؤمنین کے ہاں بڑا درجہ حاصل ہے تم ان سے میرے لیے آنے کی اجازت حاصل کرو۔ انہوں نے جا کر اپنے چچا کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ جب وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو ان سے یہ کہا: اے ابن خطاب! دیکھو اللہ کی قسم! آپ

ہمیں زیادہ نہیں دیتے اور ہمارے درمیان عدل کا فیصلہ نہیں کرتے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور حضرت عیینہ کو سزا دینے کا ارادہ فرمالیا۔ حضرت حر نے کہا: اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ "سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجیے اور نیک کام کی تعلیم کردیا کیجیے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجیے۔" (سورۂ اعراف: آیت ۱۹۹)

اور یہ بھی ان جاہلوں میں سے ہے (اس لیے آپ ان کی اِس بات سے کنارہ کرلیں)۔ جب حضرت حر نے یہ آیت پڑھی تو اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں رک گئے (اور سزا دینے کا ارادہ چھوڑ دیا) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بہت بڑی صفت تھی کہ وہ کسی کام کا ارادہ کرلیتے، پھر انہیں بتایا جاتا کہ اللہ کی کتاب اس کام سے روک رہی ہے تو فوراً اس ارادہ کو چھوڑ دیتے اور ایک دم رک جاتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ جب بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر غصہ آیا، پھر کسی نے ان کے سامنے اللہ کا نام لے لیا یا انہیں آخرت کی پکڑ سے ڈرایا یا ان کے سامنے قرآن کی آیت پڑھ دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں جس کام کا ارادہ کر چکے ہوتے تھے اس سے ایک دم رک جایا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا حِلم

عبد الرحمٰن نے ان کو لکھا کہ میرے اجلاس میں ایک شخص کو اس لیے پیش کیا گیا کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے میں نے اس کی گردن اڑا دینی چاہی تھی لیکن پھر اس خیال سے قید کر دیا کہ اس بارے میں آپ کی رائے لے لوں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا "کہ اگر تم اس کو قتل کر دیتے تو میں تم سے قصاص لیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو گالی دینے پر کوئی شخص قتل نہیں کیا جا سکتا اس لیے اگر تمہارا جی چاہے تو اس کو گالی دے لو ورنہ رہا کر دو ایک بار منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تم فاسق ہو۔ یہ سن کر صرف اس قدر بولے کہ "تم جھوٹے گواہ ہو، میں تمہاری شہادت کو قبول نہیں کرتا۔"

ایک بار کسی نے ان کو کلماتِ ناملائم کہے۔ لوگ بولے کہ آپ کیوں چپ ہیں؟ فرمایا: "تقویٰ

نے منہ میں لگام لگادی ہے۔"

ایک بار کسی نے ایک آدمی کی نسبت ان سے کہا کہ یہ آپ کو گالی دیتا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر کہا، اب کے بھی روگردانی کی۔ اس نے تیسری بار کہا تو بولے: "عمر اس کو اس طرح ڈھیل دے رہا ہے کہ اس کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

ایک بار وہ سوار جارہے تھے کہ ایک پاپیادہ شخص سواری کی جھپٹ میں آگیا اور اس نے غصے کی حالت میں کہا: "دیکھ، تو دیکھتا نہیں"۔ جب سواریاں نکل گئیں تو اس نے کہا کہ کیا کوئی ہے جو مجھے اپنے پیچھے بٹھائے؟ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اپنے غلام سے کہا کہ اس کو چشمے تک لے چلو۔

ایک بار رات کو مسجد میں گئے۔ ایک شخص سو رہا تھا، اندھیرے میں اس کو ان کے پاؤں کی ٹھوکر لگ گئی۔ اس نے جھلا کر کہا: کیا تم پاگل ہو؟ بولے: نہیں۔ چپراسی نے اس گستاخی پر اس کو سزا دینی چاہی، لیکن حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے روک دیا اور کہا کہ اس نے مجھ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم پاگل ہو ، میں نے جواب دے دیا کہ نہیں۔

ایک بار ان کو کسی شخص نے سخت بات کہی۔ بولے: "تو چاہتا ہے کہ حکومت کے غرور میں میں بھی تیرے ساتھ وہی سلوک کروں جو تو کل (قیامت کے دن) میرے ساتھ کرے گا"۔ یہ کہہ کر اس کو معاف کر دیا۔

ایک بار وہ قیلولہ کرنے کے لیے اٹھے۔ ایک آدمی ہاتھ میں کاغذوں کا پلندا لیے ہوئے بڑھا اور پلندے کو ان کی طرف پھینک دیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو پلندا منہ پر جاکے گرا اور رخساروں پر چوٹ لگی اور گالوں سے خون جاری ہو گیا لیکن انہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی عرضی پڑھی اور اس کی حاجت کو پورا کیا۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز: ۸۳ تا ۸۴)

غصہ عبادت کو بے مزہ، زندگی کو بے چین اور ایمان کو خراب و برباد کر دیتا ہے

جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اس کی عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں نہ اس کو اپنے نفع کا خیال رہتا ہے اور نہ نقصان کا۔ نہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میں کون ہوں یا یہ کہ میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ میری ماں ہے یا باپ یا اُستاد یا کوئی اور محترم شخصیت۔ غرض یہ کہ غصہ کی حالت میں

نہ کسی کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ کسی کی موجودگی کا احساس، بلکہ جو زبان پر آجاتا ہے بک جاتا ہے یا جو ہاتھ سے ہو سکتا ہے کر گذرتا ہے اور حدودِ شریعت سے تجاوز کر جاتا ہے۔ جب بے جا غصہ اتارنے کی عادت بن جاتی ہے تو اطمینان و سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہر وقت دل غم و غصہ اور کینہ سے بھرا رہتا ہے جس کی وجہ سے نہ عبادت میں مزہ آتا ہے اور نہ کسی دوسرے کارِ خیر میں اور نہ اس میں ایمانی ذوق اور مزہ باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْإِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ یعنی "غصہ ایمان کو اس طرح خراب و برباد کرتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب (اور کڑوا) کر دیتا ہے۔" (بیہقی مشکوٰۃ)

ایلوا ایک نہایت کڑوی دوا ہے، اگر بہت سے شہد میں تھوڑا سا ڈال دیا جائے تو بھی شہد کو کڑوا کر دیتا ہے۔ یہاں بھی مطلب یہی ہے کہ غصہ ایمان کی مٹھاس کو ختم کر کے کڑوا اور برباد کر دیتا ہے۔

غصہ کے وقت انسان کی حالت اور اس کا علاج

جب انسان کو غصہ آجاتا ہے تو ایسی صورت میں یہ شیطان کی مٹھی میں ایک کھلونا بن سکتا ہے۔ غصہ کی آگ بھڑک کر دنیا ہی نہیں، بلکہ اس کے اعمال و ایمان تک کی بربادی کا سبب بن سکتی ہے، اس لیے غصہ کو قابو میں رکھنے کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کا طریقہ بھی بتلایا ہے جیسا کہ حضرت عطیہ بن عروہ سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَاِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ یعنی "بلاشبہ (ناحق اور بے جا) غصہ شیطان (کے اثر) سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اس کو چاہیے کہ وضو کر لے۔" (ابو داؤد)

مطلب یہ ہے کہ ناحق اور بے جا غصہ اُتارنا شیطان کے مشتعل کرنے اور اس کے فریب میں آجانے کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے چاہیے کہ اگر غصہ آجائے تو فوراً وضو کرنے لگ جائے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ قَائِمٌ فَلْیَجْلِس فَاِنْ ذَھَبَ عَنْہُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْیَضْطَجِعْ "جس وقت تم میں سے کسی کو غصہ آجائے اور وہ اس وقت کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے، اگر غصہ جاتا رہا (یعنی قابو ہو گیا) تو ٹھیک ہے ورنہ پھر لیٹ جائے۔" (ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں غصہ کو قابو رکھنے کی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ غصہ اُتارنے اور غصہ پر صبر کرنے کے انجام کو سوچیں اور اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ جب کوئی کسی ظلم اور اشتعال انگیزی کے جواب میں فوری اقدام کرتا ہے تو اُس وقت اُس کا یہ اقدام ایک متاثر ذہن سے نکلا ہوا اقدام اور عمل ہوتا ہے اور اُس وقت وہ جو کاروائی کرتا ہے وہ اس کے ابلتے ہوئے اور سفلی جذبات کی وجہ سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ لازماً ایسی غلطیاں کرلیتا ہے کہ بجائے مظلوم ہونے کے ظالم بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد اس سے ہٹ کر مظلوم کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جو شخص فوری جواب دینے کے بجائے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ابدی قوانین اس کے مظالم کے خلاف ہو جاتے ہیں اور انجام کے لحاظ سے مظلوم جیت جاتا ہے اور ظالم شکست کھاتا ہے یا بالآخر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس لیے سوچیں کہ اگر میں بھی اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرلوں گا تو اللہ تعالیٰ میری بھی مدد فرمائے گا، میرے اس صبر سے مفید نتائج پیدا کرے گا اور مجھے دنیا و آخرت کی سعادتیں نصیب فرمائے گا۔ یہ سوچ کر اس بات کا خوب عزم کرلیں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ غصہ کو قابو رکھنے کا پورا پورا اہتمام کروں گا۔

۲۔ پھر جب غصہ آجائے تو بالکل خاموش ہو کر فوراً بیٹھ جائیں اور چپکے سے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے شیطان پر پناہ مانگیں۔ اگر اس سے کام نہ بنے تو فوراً لیٹ جائیں، ان شاء اللہ تعالیٰ غصہ قابو میں ہو جائے گا۔

۳۔ اگر شدید غصہ آیا ہے اور بیٹھنے، لیٹنے سے کام نہیں بنتا تو ایسی صورت میں اگرچہ باوضو ہو پھر بھی فوراً وضو کے لیے جائیں، اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھیں اور وضو کرلیں، بلکہ اچھا یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھیں اور بار بار اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر یہ سوچیں کہ جس قدر یہ

شخص میرا قصور وار ہے اس سے زیادہ میں اللہ تعالیٰ کا قصور وار ہوں۔ جس طرح میں چاہتا ہوں اور مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے قصور اور گناہوں کو معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں اسی طرح مجھے بھی چاہیے کہ اس کو معاف کر دوں۔

۴۔ اگر قصور پر سزا دینا مناسب معلوم ہو مثلاً یہ کہ سزا دینے میں اس کی بھلائی ہو جیسے اپنی اولاد جن کی تربیت ضروری اور لازمی ہے یا مثلاً سزا دیئے جانے میں کسی دوسرے کا فائدہ اور خیر ہو جیسے کسی ظالم نے کسی شخص پر ظلم کیا اب مظلوم کی مدد کرنا بھی ضروری ہے تو ایسی صورتوں میں بھی اتنی ہی سزا دینا یا بدلہ لینا چاہیے جتنی اس کی خطا تھی۔ یہ بھی اس وقت ہو سکتا ہے جب عقل ٹھکانے آجائے یعنی غصہ کی حالت جاتی رہے، پھر شریعت کے مطابق جس قدر سزا اسے دینی چاہیے اتنی دے دی جائے۔

۵۔ بعض بزرگوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ اگر کوئی نماز کے بعد اکیس بار بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کھانے سے پہلے تین بار بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرے یا کم از کم تین بار ہر نماز کے بعد اور ایک ایک بار کھانے پینے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا خوب اہتمام کیا جائے تو اس سے غصہ قابو میں آجائے گا۔ نیز بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ یعنی "نہ گناہ سے بچنے کی طاقت ہے اور نہ نیک عمل کرنے کی طاقت مگر اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق سے (گناہ سے بچاؤ اور نیک عمل ہو سکتا ہے)۔" یہی الفاظ بار بار پڑھیں۔

جب کسی پر بے جا غصہ اتارا جائے تو اس سے معافی مانگیں اور جو زیادتی کی ہے اس کا پورا پورا بدلہ دیں، بلکہ مجمع عام میں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگیں ورنہ جن لوگوں کے سامنے غصہ اتارا ہے ان کے سامنے اپنی غلطی اور زیادتی کا اعتراف کر کے اس سے اپنے آپ کو معاف کروائیں۔

اگر مذکورہ بالا طریقۂ علاج پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ غصہ قابو میں ہو جائے گا اور بے جا اور ناحق غصہ اتارنے کی نوبت بہت کم آئے گی۔ اس سے اعصابی قوت بھی حاصل ہو جائے گی اور غصہ کی وجہ سے دنیا و آخرت میں جو مصیبتیں اور پریشانیاں آتی ہیں اُن سے بھی بچ جائیں گے۔

غصے کی ضرورت اور اس کی حدود

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ غصہ بذاتِ خود بری چیز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی جان، مال، عزت اور اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے، نیز یہ کہ غصہ کے صحیح اسباب موجود ہوں تو غصہ آجانا بھی بری چیز نہیں بلکہ اگر کسی کو غضب وغصہ پیدا کرنے والی چیز بری ہی معلوم نہیں ہوتی تو یہ کوئی کمال وفضیلت نہیں بلکہ ذلتِ نفس، بے حمیتی اور بے غیرتی ہے۔

غرض یہ کہ غصہ ایک ایسا جذبہ ہے جسے مٹایا نہیں جاسکتا ہے البتہ دبایا جاسکتا ہے۔ اس کا فنا کرنا بھی درست نہیں کیونکہ اسی جذبہ کو حدود میں رکھ کر اس سے بہت بڑے کام بھی لیے جاتے ہیں، البتہ بے جا غصہ کرنا یا غصہ میں اندھا ہو کر حواس کھو بیٹھنا اور ایسا کام اور ایسی بات کرنا جو نہ کرنے کی ہو اور جو دینِ اسلام اور اخلاق کی نگاہ میں قابلِ نفرت ہو یہ غصہ قابل مذمت ہے، کیونکہ غصہ سے مغلوب ہو جانا اعصابی مریضوں کا خاصا ہے اور درست جذبات اور توانا اعصاب کے لوگ غصہ اور غضب سے مغلوب نہیں ہوتے (اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے)۔

غصہ کی برائی کب ظاہر ہوتی ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ غصہ آنا اس وقت بُرا ہوتا ہے جب غصے کے اسباب موجود نہ ہوں بلکہ اعصابی اور دماغی کمزوری اور جلد بازی کی وجہ سے بلاوجہ غصہ آتا ہو یا غصہ سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہو کہ عقل وحواس کام چھوڑ دیں اور اس کی برائی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب غصہ کی وجہ سے راہِ حق چھوٹ جائے اور احکامِ شریعت کی پابندی ترک ہو جائے اور غصہ میں آکر شریعت کی مقررہ حدود سے تجاوز کر جائے۔ شریعت میں جس غصے کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غصہ نفسانیت کی وجہ سے ہو اور جس سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کی حدود اور شریعت کے احکام کی پابندی ترک ہو جائے۔ جو غصہ اللہ تعالیٰ کے لیے آئے اور حق کی بنیاد پر آئے اور اس کے اتارنے میں حدود سے تجاوز بھی نہ ہو اور ہو بھی موقع محل کے مناسب تو پھر یہ ایمان کی نشانی ہے۔ یہی حال بغض اور کینہ کا ہے جیسا کہ حضرت ابو امامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِاسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ

"جو شخص اللہ کے لیے محبت رکھے اور اللہ تعالیٰ کے لیے بغض اور کینہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کے لیے دے اور اللہ تعالیٰ کے لیے روکے تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا۔" (ابو داؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ کے لیے بغض اور کینہ

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بغض و کینہ رکھنے یا غصہ آنے اور اُتارنے میں یہ دیکھنا چاہیے اور اس بات کی خوب تحقیق کرنی چاہیے کہ یہ کینہ اور غصہ واقعی اللہ تعالیٰ کے لیے، دینِ اسلام کے لیے ہے اور ناجائز بات یا کام کے ارتکاب کی وجہ سے ہے یا دینِ اسلام کے نام پر اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہے۔

آج کل بظاہر دین دار لوگ یہ بات بہت کثرت سے کر رہے ہیں کہ فلاں آدمی یا فلاں جماعت کے ساتھ میری دشمنی، میرا بغض اور اس پر غصہ اللہ تعالیٰ کے لیے، دین کے لیے، ناجائز امور کی روک تھام کے لیے ہے۔ حالانکہ ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولوں پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ اجماعی مسائل جیسے ختم نبوت، عصمتِ انبیا علیہم السلام مجروح ہو رہے ہیں، یہودیت، عیسائیت اور دہریت کے طوفان ہمارے اساسی عقائد کے قلعوں میں شگاف ڈال کر اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہیں اور مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر کے ختم کرنے کے درپے ہیں، کفر و نفاق اور الحاد کہیں قادیانیت، کہیں پرویزیت اور کہیں انکارِ حدیث وغیرہ کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ایمانوں پر ڈاکہ ڈال کر دینِ اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب و شتم اور ان کی توہین کرنے والے فتنوں اور اسلام دشمن تحریکوں کے مہلک اثرات سے ہم بخوبی واقف ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کا مذاق اڑائے جانے کا بھی ہمیں بخوبی علم ہے، مگر جتنے غیظ و غضب اور غم کا اظہار ہم اپنے مخالف مسلمان بھائی پر کرتے ہیں، جو ہمارے ساتھ صرف فروعی مسائل میں کچھ اختلاف رکھتا ہے، اس کا ایک فی صد بھی دوسرے بے دینوں، ملحدوں اور یقینی ممنوعات پھیلانے والوں پر نہیں اور نہ ان پر غصہ اتارا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہمارا یہ بغض و کینہ اور غصہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں بلکہ نفسانیت اور اپنے ذاتی مفادات اور گروہی نظریات کی وجہ سے ہے۔ اس پر مزید ظلم یہ کہ اس کو دین کا نام دے کر ہم خود اپنے ہاتھوں گلستانِ اسلام کو اُجاڑ رہے ہیں۔

مؤمن کا اللہ تعالیٰ کے لیے غصہ

مؤمن اپنی ذات کی خاطر نہیں بلکہ اللہ کی خاطر، حق کی خاطر غصہ بھی کرتا ہے اور بغض بھی رکھتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین سے محبت کی وجہ سے ہوتا ہے: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھی اور اللہ تعالیٰ کے لیے بغض رکھا اور اللہ تعالیٰ کے لیے دیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے روکا تو اس نے اپنا ایمان کامل کیا۔ (مشکوٰۃ)

اس کے متعلق چند واقعات پڑھ لیجیے:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق کی خاطر بتوں کو توڑا اور مناسب وقت دیکھ کر بت خانے کو درہم برہم کر دیا، نیز اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۞ ”اور ابراہیم کا اپنے والد کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے کر لیا تھا، پھر جب اس پر وحی الٰہی کے ذریعہ یہ کھل گیا کہ وہ (قبولیتِ حق کی خداداد استعداد کو برباد کرکے) اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے (اور اس کا انجام بھی یہی ہوگا) تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، بے شک ابراہیم بڑا نرم دل اور بُردبار تھا۔“ (توبہ:۱۱۴)

یہ آیتِ کریمہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حِلم و برداشت اور بُردباری کو اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے حق کی خاطر بغض کو ظاہر کرتی ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کو ناحق مار رہا ہے اور اس کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے اور اس مظلوم نے امداد کی درخواست کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ظالم کو مکّا مارا اور مظلوم کو ظالم کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ (تفصیل کے لیے سورۂ قصص رکوع ۸ دیکھئے)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا نمونہ پیش کرکے مؤمنوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگیوں میں یہی روح و فکر رہی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھنے اور اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر غصہ کرنے والے تھے۔ ان کے واقعات میں آپ کو یہی ملے گا کہ انہوں نے اپنے دنیوی مفاد اور اپنی ذات کی خاطر کسی سے بغض نہیں رکھا بلکہ ان کا مادۂ غیظ

وغضب منکرین حق کے خلاف رہتا تھا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ”محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان (یعنی آپ ﷺ) کے ساتھ ہیں وہ منکرینِ حق پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔“ (سورۂ فتح: آیت ۲۹)

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

”تم ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے مخالف ہیں اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے قبیلہ والے کیوں نہ ہوں۔ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی جماعت اور اس کا گروہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔“

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۫ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ

”بے شک تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جبکہ انہوں نے اپنی (منکرین) قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا بندگی کرتے ہو ان سے بالکل بیزار اور الگ ہیں، ہم تمہارے (معبودوں باطل عقیدوں، سرکش لیڈروں کے) منکر ہیں، (ہم ان کو بالکل نہیں

مانتے) اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی ظاہر (اور قائم) ہوگئی، یہاں تک کہ تم صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہ پر ایمان لاؤ۔" (سورۃالممتحنۃ)

یاد رکھیں! ابتدا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت نرمی کے ساتھ خیر خواہانہ انداز میں توحید کی دعوت دی اور جب ان پر پوری طرح اتمام حجت کیا اور ان کو خوب معلوم ہوا کہ وہ کھلے دلائل کے باوجود حق کی طرف نہیں آتے، تب ان کے ساتھ دشمنی کا اظہار کیا۔

بہت سے دین دار لوگ غصہ اپنی خاطر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گویا ان کا یہ غصہ خدا کے لیے ہے۔ مؤمن اللہ کے لیے بغض اور عداوت کے بارے میں اس بات کا خیال رکھیں کہ مؤمن مخلوق خدا پر سخت مہربان اور شفیق ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی پر غصہ کرتا ہے یا کسی سے دشمنی کرتا ہے تو اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے بغض اور غصے کی گرمی اور آگ، باطل پرست لوگوں کی باطل پرستی اور ظالموں کے ظلم کو ختم کردے۔ وہ جب کسی سے براءت کا اعلان کرتا ہے تو وہ بھی دعوت ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک طریقہ ہوتا ہے وہ یہ کہ داعئ حق اپنی طرف سے اپنے یقین کا آخری اظہار کرتا ہے اور باطل اور ظالم کو بتاتا ہے کہ تم باطل اور ظلم پر ہو، اس کو اپنے آپ سے دور کردو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے براءت وبیزاری اور دشمنی کو ختم کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ پر ایمان لانے کی شرط لگائی، اور مؤمن جب کسی باطل اور ظالم کے خلاف تلوار بھی اٹھاتا ہے تو صرف اس لیے کہ انسانیت میں سے باطل اور ظلم کو مٹادے۔

یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس قدر مہربان اور شفیق ہو اور پھر وہ کسی طالبِ حق پر اُس کی کسی غلطی کی وجہ سے غصہ کرے تو اس کا یہ غصہ اُس کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور اِس سے اُس کے دل کا زنگ اُتر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کے لیے غصہ نہیں کرتا، بلکہ وہ ہمیشہ حق اور اللہ تعالیٰ کی خاطر غصہ کرتا ہے۔

آج کل یہ بیماری بہت عام ہے کہ جو شخص کسی سے دشمنی کرتا ہے تو اس کے لیے یہی حیلۂ شرعی ڈھونڈلاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی خاطر غصہ کرتا اور دشمنی رکھتا ہوں۔ اگر واقعی اس کو اللہ تعالیٰ اور حق کی خاطر غصہ آتا ہے تو پھر غصہ نکالنے میں حد سے تجاوز کیوں کرتا ہے؟ لوگوں کی تحقیر وتذلیل کیوں کیے

پھرتا ہے؟ اپنے مخالف کی باتوں اور عبارتوں کی ایسی تشریح کیوں کرتا ہے جس سے اس کا مخالف انکار اور اس کی تردید کرتا ہے؟ آخر اپنے مخالف کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتان تراشیاں کیوں کرتا ہے۔ پورا دینِ اسلام مٹ رہا ہو، فحاشی اور ظلم وبربریت کا ڈنکا بج رہا ہو اس پر اتنا غصہ نہیں آتا جتنا اس شخص پر غصہ آتا ہے جس کے ساتھ کسی فروعی مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ یہ سارا غصہ اپنی ہی ذات کے لیے ہے نہ کہ حق اور اللہ تعالیٰ کی خاطر، لیکن دلوں کے برتن اتنے گندے ہو چکے ہیں کہ پھر بھی یہ سب حقائق ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

مصائب پر صبر کرنا

۱۔ مصائب پر صبر کرنا، یعنی فقر وتنگ دستی، بیماری، زخم اور رشتہ داروں کی موت پر صبر کرنا۔ انسان جب بیمار ہو جاتا ہے یا اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے یا زخمی ہو جاتا ہے یا اس کا کوئی رشتہ دار مر جاتا ہے یا کسی اور مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو ایسی صورتوں میں نفس کی خواہش اور جذبہ یہ ہوتا ہے کہ واویلا کرے، گلہ شکوہ کرے وغیرہ وغیرہ۔ مصائب کے وقت صبر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بدگمانی نہ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرے مثلاً یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت ہم پر کیوں نازل کی؟ نہ یہ خیال دل میں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی دیکھا ہے کہ بلائیں اور مصیبتیں ہم پر نازل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اور نہ مصیبت کے وقت گریبان پھاڑے، نہ ماتم کر کے چہرے وغیرہ کو مارے۔ مصائب کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور نفس کو حق پر ثابت اور باندھے رکھنے کو عام اصطلاح میں ”صبر“ کہا جاتا ہے اور اس کی ضد کو ”جزع فزع“ کہتے ہیں۔

مصائب پر صبر کی فضیلت

صبر کی اس صورت کے بہت سے فضائل میں سے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور واقعات میں سے بطورِ نمونہ کچھ پڑھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۞

"اور (یاد رکھو!) ہم کسی قدر خوف وخطر، بھوک کی تکلیف (یعنی فقر فاقہ)، مال وجان اور پھلوں (یعنی پیداوار وغیرہ) کے نقصانات میں (مبتلا کر کے) ضرور تمہیں آزمائیں گے اور (ان حالات میں جو لوگ حق پر استقامت اختیار کر کے صبر کریں گے تو) آپ ایسے صابرین کو (فتح وکامرانی اور فلاح ونجات کی) خوشخبری سنا دیجیے (جن کا حال یہ ہے کہ) جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ (دل وزبان سے یہی کہتے ہیں) کہ انا للہ وانا الیہ راجعون (یعنی ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے طرح طرح کی عنایتیں اور رحمت ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ یعنی "اے بنی آدم! اگر تو نے صدمہ (یعنی تکلیف اور مصیبت) کے ابتدائی مرحلہ میں صبر کیا اور (اس صبر میں) میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں تیرے لیے جنت سے کم کسی اجر وثواب پر راضی نہیں ہوتا۔"

(ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان کسی مصیبت اور تکلیف کے پہنچنے کے ابتدائی وقت میں اللہ تعالیٰ کی رضا وثواب کی نیت سے صبر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جنت دیے بغیر راضی اور خوش نہیں ہوگا، اس کو اس صبر کے بدلے میں جنت میں ضرور داخل فرمائے گا۔

رنج وغم کا پہنچنا گناہوں کو دھوڈالتا ہے

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا يُصِيْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًى وَّلَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ "مسلمان کو جب کوئی رنج، دکھ، فکر، حزن، تکلیف اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ کانٹا چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اُس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

(بخاری ومسلم)

کون سی تکلیف و مصیبت باعثِ رحمت ہے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیۡراً یُصِبۡ مِنۡہُ "اللہ تعالیٰ جس شخص کو خیر و بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے (اس خیر کے حصول کے لیے) مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔" (بخاری)

مصیبت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو دل پسند نہ کرے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مصیبتیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قہر اور عذاب ہی کے طور پر نہیں آتی، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس بندہ پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرنا چاہتا ہے اور اسے خیر و بھلائی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا فرما دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کے دل و دماغ کو اس مصیبت کی سختی سے پاک وصاف کر کے اُس کے اندر خیر و بھلائی کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ بندہ پر جو مصیبت و تکلیف آتی ہے یہ اس وقت رحمتِ الٰہی سمجھی جائے گی جبکہ اس پر صبر کیا جائے اور نفس کو واویلا، جزع فزع اور نافرمانی سے بچا لیا جائے، ورنہ اگر گلے شکوے ہیں، واویلا ہے، جزع فزع ہے تو یہ مصیبت اس کے حق میں رحمت نہ ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہو گا۔

یاد رہے کہ کسی مصیبت پر صبر کرنے کا وقت اُس صدمہ اور مصیبت کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے، ورنہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد تو ہر کوئی صبر کر کے چیخنا چلانا اور واویلا کرنا بند کر دیتا ہے۔ اس لیے ایک واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّمَا الصَّبۡرُ عِنۡدَ الصَّدۡمَۃِ الۡاُوۡلٰی یعنی "صبر تو (وہی کہلائے گا جو) صدمہ کے ابتدائی وقت میں ہوتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اولاد کے انتقال پر صبر کرنے کا اجر و ثواب

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسی مؤمن بندے کا بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ "ہاں"۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہاں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس (مصیبت) پر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض

کرتے ہیں کہ اس نے تیری تعریف کی اور انا لله وانا اليه راجعون پڑھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کے لیے (اس مصیبت پر صبر کے بدلے) جنت میں ایک بڑا گھر بناؤ، اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا لِعَبدِی الْمُؤمِنِ عِنْدِیْ جَزَاءٌ اِذَاقَبَضْتُ صَفِیَّهٗ مِنْ اَهلِ الدُّنیَاثُمَّ احْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّةَ یعنی ”جب میں اپنے مؤمن بندے کے عزیز و محبوب کو، جو اہل دنیا میں سے ہو، اٹھالیتا ہوں اور وہ بندہ اس پر ثواب کا طلب گار رہتا ہے (یعنی صبر کرتا ہے) تو میرے پاس اس کے لیے جنت (سے کم) کوئی جزا نہیں ہے (یعنی ایسے بندے کو میں جنت دے دیتا ہوں)۔“ (بخاری مشکوٰۃ)

فقر و بیماری اور دوسری مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَااُخرِج اَحَدًامِنَ الدُّنْیَا اُرِیْدُ اَغْفِرُلَهٗ حتّٰی اَسْتَوْفِیَ کُلَّ خَطِیْئَةٍ فِیْ عُنُقِهٖ بِسُقْمٍ فِیْ بَدَنِهٖ وإِقْتَارٍ فِیْ رِزْقِهٖ ”میری عزت وجلال کی قسم! جس بندے کو میں بخشنا چاہتا ہوں اسے میں دنیا سے اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ اس کے بدن کو بیماری میں مبتلا کرکے اور اس کو رزق کی تنگی میں ڈال کر اس کے ہر گناہ کا بدلہ نہ دوں جو اس کے ذمہ ہوگا۔“ (مشکوٰۃ ج ۲)

مطلب یہ ہے کہ جس بندہ کو آخرت کی ابدی سعادت سے نوازنا چاہتا ہوں تو اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اس طرح دے دیتا ہوں کہ کبھی اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہوں اور کبھی رزق کی تنگی اس پر مسلط کر دیتا ہوں، تو وہ بخش دیا جاتا ہے اور عذابِ آخرت سے نجات پالیتا ہے۔ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مصیبتیں، فقر وفاقہ اور بیماری وغیرہ تمام پریشانیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُصِیْبُهٗ اَذًی مِّنْ مَّرَضٍ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ بِهٖ سِیِّاٰتِهٖ کَمَاتَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا ”جس مسلمان کو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہ (اس طرح) دور کر دیتا ہے جیسے درخت

اپنے پتے جھاڑ تا ہے۔" (مسلم وبخاری)

بینائی سے محرومی پر صبر کا بدلہ جنت ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِیْ بِحَبِيْبَتَيْهِ ثُمَّ صَبَرَ عَوَّضْتُهٗ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ يُرِيْدُ عَيْنَيْهِ یعنی "جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دونوں پیاری چیزوں میں مبتلا کر دیتا ہوں، وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں ان دونوں کے بدلے میں اسے جنت دیتا ہوں (راوی کہتے ہیں کہ اس کی دونوں پیاری چیزوں سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔" (بخاری)

بیماری پر صبر کی فضیلت

حضرت مقداد بن اوس اور حضرت صنابحی رضی اللہ عنہما دونوں کے بارے میں روایت ہے کہ یہ دونوں ایک بیمار شخص کے پاس گئے اور اس کی عیادت کی۔ دونوں نے مریض سے پوچھا کہ تم نے صبح کیسے گزاری؟ مریض نے کہا کہ میں نے نعمت کے ساتھ صبح کی (یعنی مرض وتکلیف کی وجہ سے جزع وفزع میں مبتلا نہیں ہوا بلکہ رضا بتقدیر اور صبر کے دامن کو پکڑے ہوئے ہوں جس سے میرا دل خوش اور مطمئن ہے) تو اس پر حضرت شداد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گناہوں کے جھڑنے اور خطاؤں کے دور ہونے کی بشارت سے خوش ہو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ:

اِذَا اَنَا ابْتَلَيْتُ عَبْدًا مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنًا فَحَمِدَنِیْ عَلٰی مَا ابْتَلَيْتُهٗ فَاِنَّهٗ يَقُوْمُ مِنْ مَّضْجَعِهٖ ذٰلِكَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ مِنَ الْخَطَايَا وَيَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَنَا قَيَّدْتُ عَبْدِیْ وَابْتَلَيْتُهٗ فَاَجْرُوْا لَهٗ مَا كُنْتُمْ تُجْرُوْنَ لَهٗ وَهُوَ صَحِيْحٌ

"جب میں اپنے بندوں میں سے کسی مؤمن بندے کو (بیماری ومصیبت میں) مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ بندہ اس پر میری تعریف کرتا ہے تو وہ اپنے بستر علالت سے ایسا (گناہوں سے پاک وصاف ہو کر) اٹھتا ہے جیسا کہ وہ اس دن گناہوں سے پاک صاف تھا جس روز اس کی ماں نے اسے جنا تھا، نیز پروردگار اللہ تبارک وتعالیٰ (فرشتوں سے) فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کو قید میں ڈالا ہے (یعنی وہ بیماری اور

مصیبت کی وجہ سے نیک کاموں میں محنت و کوشش اور دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا ہے) اور اسے آزمائش میں مبتلا کیا ہے لہٰذا تم (اس کے نامۂ اعمال میں) وہ نیک اعمال جاری رکھو جو تم اس کی تندرستی کے زمانہ میں لکھنا جاری رکھتے تھے۔" (مشکوٰۃ)

مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرنے میں دنیوی فائدے

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب کوئی بھی مسلمان کسی (چھوٹی یا بڑی) مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ الفاظ (دل و زبان سے) کہتا ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون (بے شک ہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور یقیناً اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)، پھر اس کے بعد یہ کہے کہ: اَللّٰھُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاَخْلِفْ لِیْ خَیْرًا مِنْھَا "اے اللہ! میری مصیبت پر مجھے اجر دے دے اور (اس مصیبت میں جو چیز میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے خواہ وہ صحت ہو یا مالی جانی نقصان ہو حتیٰ کہ چراغ بجھ کر کچھ عرصہ کے لیے روشنی نہ رہنا وغیرہ وغیرہ) اس کا مجھے اس سے بہتر بدلہ دے دے تو اللہ تعالیٰ اس چیز کا بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے۔" (مسلم)

حضرت اُمّ المؤمنین فرماتی ہیں کہ جب (میرے پہلے شوہر) ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے (دل میں) کہا کہ ابو سلمہ سے بہتر مسلمان کون ہو گا؟ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے مع اہل و عیال کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی، اور پھر میں نے مذکورہ بالا کلمات کہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے بدلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمایا (یعنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی)۔

یاد رہے کہ ہر وہ چیز مصیبت میں داخل ہے جو انسان کے دل کو ناگوار گزرے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حتیٰ کہ اگر چراغ بھی بجھ جائے یا بجلی چلی جائے یا کانٹا چبھ جائے یا جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ان سب کا شمار مصیبتوں میں ہوتا ہے چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ اَحَدِکُمْ فَلْیَسْتَرْجِعْ فَاِنَّہٗ مِنَ الْمَصَائِبِ "جب کسی شخص کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے کیونکہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے۔"

(بیہقی)

لہٰذا ہر چھوٹی بڑی مصیبت اور ناگواری کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھیں۔ دل سے اس کے معنی سمجھ کر پڑھنا بہت ہی اجر و ثواب کا باعث، مفید اور دلی اطمینان و سکون کا ذریعہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری جانیں، ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال وغیرہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور مالک کو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا حق ہے، لہٰذا وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ ہم سب مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور دنیا کے نقصانات اور تکالیف کا بدلہ اور ثواب وہاں بہت زیادہ ملے گا۔ جو شخص دل میں اس کے معنی سوچ کر مذکورہ بالا کلمات پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ دے دے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا بیمار ہو گیا۔ وہ گھر سے باہر نکلے تو بچہ کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ رات کو واپس آئے تو اپنی بیوی ام سلیم رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ بیٹے کا کیا حال ہے؟ حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا کہ وہ پہلے سے سکون میں ہے اور ان کے سامنے شام کا کھانا پیش کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے حاجتِ انسانی بھی پوری کی۔ جب وہ فارغ ہو چکے تو اس کے بعد ام سلیم رضی اللہ عنہا نے حقیقت حال بتلائی (کہ وہ بیماری سے سکون پا کر انتقال کر گئے لہٰذا) اپنے بیٹے کو دفن کیجیے۔

جب صبح ہوئی تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ سنایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم نے آج رات ہم بستری کی ہے؟ حضرت ابو طلحہ نے عرض کیا: "ہاں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شاید کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں یعنی ام سلیم رضی اللہ عنہا اور ابو طلحہ کے لیے ان کی رات میں برکت عطا فرمائے۔ چنانچہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا دے دیا اور جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کو چبا کر اور ان کو اپنے دہن مبارک سے لے کر بچہ کے منہ میں ڈال کر اس کے اوپر کے تالو سے چپکایا (اس کو اصطلاح میں تحنیک کہتے ہیں) اور اس کا نام عبد اللہ رکھا۔ سفیان راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے بیان کیا کہ میں نے ان کی نو اولاد کو دیکھا ہے، وہ سب کے سب قرآن مجید کے قاری (یعنی عالم) تھے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے بخاری: ج۱، ص ۱۷۴۔ اور ج۲، ص ۸۲۲)

خلاصہ یہ کہ مصائب پر صبر کرنا عظیم اجر و ثواب کا باعث اور دنیا اور آخرت میں سعادت مندی کا ذریعہ ہے اور بے صبری میں انسان کو کچھ ملتا نہیں بلکہ اُلٹا دنیا و آخرت کا نقصان کرتا ہے۔

جزع فزع کی ممانعت اور مذمت

کسی مصیبت میں چیخنا، چلانا، گریبان پھاڑنا، پگڑی یا ٹوپی اتار پھینکنا، بال نوچنا یا ناشکری کے الفاظ منہ سے نکالنا وغیرہ؛ یہ سب کچھ شریعتِ مطہرہ میں حرام و ناجائز ہے۔ چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ (ماتم) کرنے والی عورت اور نوحہ (کو پسند کرکے اس) کو سننے والی عورت دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابو داؤد، مشکوٰۃ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ "نوحہ اور ماتم کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے جسم پر گندھک اور خارش کا کرتا ہو گا۔"
(مسلم)

مطلب یہ ہے کہ اگر نوحہ کرنے والی عورت اس بُرے عمل سے توبہ کیے بغیر مر گئی تو قیامت کے روز اس پر سخت قسم کی خارش کو مسلط کیا جائے گا اور اس پر گندھک ملی جائے گی تاکہ اس کی خارش میں اور زیادہ سوزش اور جلن پیدا ہو جائے، جس کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہو گی، اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ "جو شخص (مصیبت کے وقت) رخساروں کو پیٹے، گریبان چاک کرے اور ایامِ جاہلیت کی طرح (رونے میں) آواز بلند کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (بخاری و مسلم)

مصیبت کے وقت بلا جزع فزع کے رونا ممنوع نہیں

البتہ اگر جزع فزع نہ ہو، چیخنا چلانا نہ ہو، واویلا نہ ہو اور نہ گریبان پھاڑنا اور بال نوچنا وغیرہ ہو تو کسی مصیبت کے وقت آنسو بہنا یا رونا حرام و ناجائز نہیں، بلکہ یہ دل کی غمگینی کی وجہ سے ہوتا ہے اور دلوں میں رحم و محبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے کسی کا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا) انتقال ہوا تو عورتیں جمع ہو گئیں اور ان پر (آہستہ آہستہ) رونے لگیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کو رونے سے منع کیا

اور ان کو بھگانے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: دَعْهُنَّ یَا عُمَرُ فَإِنَّ الْعَيْنَ دَامِعَةٌ وَالْقَلْبَ مُصَابٌ وَالْعَهْدَ قَرِيبٌ "اے عمر! انہیں (اپنے حال پر) چھوڑ دو کیونکہ آنکھیں رو رہی ہیں اور دل مصیبت زدہ ہے اور صدمے کا وقت قریب (یعنی صدمے کا ابتدائی وقت) ہے۔" (احمد، نسائی، مشکوٰۃ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر عورتیں چلاّ چلاّ کر، گریبان پھاڑ کر اور چہرہ مار مار کر نہیں رو رہی تھیں، بلکہ کچھ آواز کے ساتھ رو رہی ہوں گی، اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس احتیاط کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے بڑھ کر یہ عورتیں نوحہ اور ماتم کرنے لگیں، ان عورتوں کو رونے سے منع کرنا چاہا، مگر آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو روک دیا اور اُن (رونے والیوں) کی طرف سے عذر بیان فرمایا اور بتلایا کہ ایسے سخت حادثہ اور غم کے موقع پر رنج و غم کا اظہار ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، البتہ رنج و غم کے اظہار میں شریعت کی حدود سے تجاوز کرنا ممنوع ہے جو کہ چیخنا چلانا، گریبان پھاڑنا اور زبان سے نازیبا الفاظ نکالنا وغیرہ ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کے مرنے اور مصیبت میں مبتلا ہونے پر دل کا غمگیں ہونا انسانی فطرت کا تقاضا، بلکہ رحم دلی کی علامت ہے۔ لوگوں کے مرنے اور اُن کو مصیبت پہنچنے پر آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو یوسف لوہار کے گھر گئے (ابو یوسف لوہار آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دایہ کے شوہر تھے اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ انہی کے گھر میں بیمار ہو گئے تھے اور انہی کے گھر میں انتقال کر گئے۔) تو آپ ﷺ نے (اپنے صاحبزادے) حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر بوسہ لیا اور سونگھا (یعنی اپنا منہ اور ناک ان کے منہ پر اس طرح رکھا جیسے کوئی خوشبو سونگھتا ہے)۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ہم پھر ابو یوسف کے ہاں گئے جبکہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حالتِ نزع میں تھے۔ اُن کی حالت دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ (اس کو دیکھ کر) حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ (بھی) رو رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: يَا ابْنَ عَوْفٍ إِنَّهَا رَحْمَةٌ "اے بن عوف! یہ (آنسو کا بہنا) رحمت (کی علامت) ہے۔"

اس کے بعد پھر آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ العَینَ تَدمَعُ والقلبَ یَحزَنُ وَلَا نَقُولُ اِلَّا مَا یَرضٰی ربُّنَا وَاِنَّا بِفِراقِكَ یَا اِبرَاھِیمُ لَمَحزُونُونَ ”آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں اور دل غمگین ہے مگر اس کے باوجود ہماری زبانوں پر وہی الفاظ ہیں جن سے ہمارا پروردگار راضی رہے، اے ابراہیم! ہم تیری جدائی میں یقیناً غمگیں ہیں۔“

(بخاری و مسلم)

اسی طرح آپ ﷺ کے نواسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے کی نزع کی حالت میں جب آپ ﷺ نے انہیں گود میں اٹھایا تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ھٰذِہٖ رَحمَۃٌ جَعَلَھَا اللّٰہُ فِی قُلُوبِ عِبَادِہٖ وَاِنَّمَا یَرحَمُ اللّٰہُ مِن عِبَادِہِ الرُّحَمَآءَ ”یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمایا ہے (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف ان ہی لوگوں پر رحمت (اور مہربانی) کرتا ہے جو جذبۂ رحم رکھنے والے ہیں۔“ (بخاری)

مذکورہ بالا روایات کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی آپ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ کسی قابلِ رحم واقعہ کو دیکھ کر آپ ﷺ کے آنسو مبارک بہہ جاتے اور اس کو آپ ﷺ نے جذبۂ رحم کی علامت بتلایا۔ مذکورہ بالا احادیث میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ جو شخص ایسے مواقع پر غمگیں نہ ہو اُس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہے، بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، اور یہ بتلادیا کہ یہ کوئی ضبط نہیں ہے، بلکہ احساسِ محبت و مروّت اور جذبۂ ترحم کا فقدان ہے۔ یہی حال اہلِ کمال کے نزدیک بہ نسبت ان حضرات کے کامل تر ہے جن کے چہروں پر ایسے غم ناک واقعات میں بھی غم کا اثر نہ ہو جیسا کہ بعض صاحب حال لوگوں کو یہ حالت پیش آجاتی ہے کہ ایسے مواقع میں بھی ان کے چہروں پر بشاشت کی لہریں دوڑ رہی ہوتی ہیں، یہ حالت ان کے دل کی سختی کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ اُن حضرات کا ایک حال ہوتا ہے جو بہتر ضرور ہے، لیکن کامل ترین نہیں ہے۔ واللہ اعلم

صابرین یعنی صبر کرنے والے کون لوگ ہیں؟

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ ''صبر'' بے بسی، کمزوری اور ناتوانی کا نام نہیں، بلکہ ہر دور اور ہر حال میں حق پر ثابت قدم رہنے اور جمنے کا نام ہے، یا یوں کہیے کہ نفس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کو صبر کہتے ہیں، لہٰذا صابر وہی شخص کہلاتا ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن اور اپنے قول و عمل کو شریعت کے مطابق برقرار رکھے اور پورے دینِ اسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہے اور ہر اس فائدہ اور لذت سے بیزار ہو جائے جو حرام اور ناجائز طریقوں سے حاصل ہو۔ وہ غم اور دکھ میں بے تاب ہو کر گلے شکوے اور چیخ و پکار نہیں کرتا، نہ وہ خوشی اور فراوانی کے حالات میں پھُول جاتا ہے اور نہ تنگی کے حالات سے بے حوصلہ اور بے ہمت ہو جاتا ہے، بلکہ وہ سخت فقر و فاقہ کی حالت میں بھی اپنی قناعت اور خودداری پر حرف آنے نہیں دیتا۔ کوئی اس کو غصہ دلائے تو وہ بے قابو ہو کر آپے سے باہر نہیں ہوتا، عمل اور دُعا کے ثمرات کا صبر و سکون سے انتظار کرتا ہے، مشکلات و تکالیف کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر اس کی نصرت و مدد کا منتظر رہتا ہے۔ وہ ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے جو اسے راہِ حق پر چلنے میں پیش آئے۔ اگر حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔

غرض وہ ہر حال میں اور ہر گردش میں شریعت کی حدود کا پابند رہتا ہے، کوئی حالت اور گردش اُس کے قدموں کو حق یعنی شریعت سے ذرہ برابر نہیں ہلا سکتی۔ یہ سب کچھ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے اور وہ اپنے اچھے اعمال کے مفید نتائج و ثمرات کے لیے جلد بازی نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ آخرت کا انتظار کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ''صابرین'' کہا جاتا ہے اور یہی وہ صبر ہے جس کی فضیلت سے قرآن مجید اور حدیث شریف کی کتابیں پُر ہیں۔ یہاں بھی ان کے فضائل میں سے کچھ پڑھ لیجیے۔

دنیا و آخرت میں صبر و استقامت کے فضائل و فوائد

صبر کی اہمیت، فائدے اور اس کے فضائل قرآن و حدیث میں اتنی زیادہ تعداد میں موجود ہیں کہ اگر ان سب کو اکٹھا کیا جائے تو صرف اس کے فضائل ہی سے ایک مستقل ضخیم کتاب بن جائے گی اس لیے

یہاں صبر کے تمام فضائل کا بیان مطلوب نہیں صرف بطورِ نمونہ صبر کے چند فضائل کو ذکر کیا جاتا ہے۔

صابرین کو بے حساب اجر ملے گا

۱۔ صابرین کو بے حساب اجر ملے گا چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۞ "(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے ڈرتے رہو، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا اُن کے لیے بھلائی ہے، اور (اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنی سخت مشکل ہو جائے تو دوسری جگہ چلے جاؤ کیونکہ) اللہ (تعالیٰ) کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں (یعنی ہر حال اور گردش میں راہِ راست پر قائم رہنے والوں ہی) کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔" (سورۂ زمر: آیت ۱۰)

۲۔ مَا عِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجۡزِیَنَّ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۞ یعنی "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ (ایک دن) ختم ہو جائے گا اور جو اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور جو لوگ (ہر حال میں راہِ راست پر) صبر کرنے (ثابت قدم رہنے) والے ہیں ہم ان کو ان کے اچھے اعمال کے عوض ان کا اجر ضرور دیں گے۔" (سورۃ النحل: آیت ۹۶)

فرشتے جنت میں صابرین کا استقبال کریں گے

۳۔ فرشتے جنت میں صابر لوگوں کا استقبال کریں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ۞ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ ۞ یعنی "اور فرشتے ان (جنتی) لوگوں کے استقبال کے لیے ہر دروازے سے آئیں گے (اور انہیں کہیں گے) تم پر سلامتی ہو (یہ سب کچھ) اس وجہ سے ہے کہ تم نے (دنیا میں) صبر کیا تھا (یعنی دین پر مضبوطی سے قائم رہے تھے)، پس کیا ہی اچھا ہے یہ آخرت کا گھر (جو ان صابر لوگوں کے حصہ میں آیا)۔"

(سورۃ الرعد: آیت ۲۳-۲۴)

آخری جیت حق پر صبر واستقامت والوں کی ہوتی ہے

۴۔ آخری جیت حق پر صبر کرنے والوں کی ہوتی ہے اور ان کو زمین والوں پر اقتدار ملتا ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝

یعنی "اور ہم نے اس قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو جسے بالکل کمزور خیال کیا جاتا تھا اس سرزمین کے مغرب و مشرق کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی، اور (اسی طرح) پورا ہو گیا وہ نیک وعدہ آپ کے پروردگار کا بنی اسرائیل کے حق میں بسبب ان کے صبر کرنے کے، اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا وہ سب کچھ درہم برہم کر دیا جو وہ بنایا کرتے تھے اور وہ بلند مکان جو وہ تعمیر کیا کرتے تھے۔"

(سورۂ اعراف: آیت ۱۳۷)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اُن کی ہدایت اور تعلیم کے مطابق فرعونیوں کی سخت ایذا رسانیوں پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے جو نیک وعدہ ان سے کیا تھا اُسے پورا کر کے اُس ملک کی پوری سرزمین پر ان کو قابض بنایا اور ان کے مخالفین اور دشمنوں کو ان کے تکبر اور ظلم کی وجہ سے تباہ و برباد کیا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ یعنی "اور جب انہوں (بنی اسرائیل) نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ہم نے انہی میں سے (ایسے) پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔"

(سورۂ سجدہ: آیت ۲۴)

جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم بنی اسرائیل کا عروج اللہ تعالیٰ کی آیات و احکامات پر یقین اور اس صبر و استقامت پر تھا جو انہوں نے احکامِ الٰہی میں دکھایا، اور خود بنی اسرائیل کے اندر بھی امامت اور پیشوائی کے اعلیٰ منصب کے لیے وہی لوگ چنے گئے جو کتاب اللہ کے سچے پیروکار اور مؤمن تھے، جو اس کو مان کر پوری طرح حق کی پیروی کرتے تھے۔ وہ دنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے

نہ تھے۔ انہوں نے جب راہِ راست پر قائم رہنے میں ہر خطرے کاڈٹ کر مقابلہ کیا، ہر نقصان اور تکلیف کو برداشت کیااور اپنے نفس اور دشمنانِ حق کے ساتھ مجاہدے کا حق ادا کیاتب ہی وہ دنیا کے پیشوااور امام بنے۔

بہادر لوگ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوتے ہیں

۶۔ شجاع و بہادر لوگ، یعنی وہ لوگ جو دشمن اور خطرات کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۞ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۞ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

یعنی "اس سے قبل کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے (راہِ حق میں) جنگ کی (لیکن) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ بے ہمت نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کمزوری دِکھائی اور نہ وہ (باطل کے آگے) سرنگوں ہوئے، اور اللہ (تعالیٰ) انہی صابروں کو محبوب رکھتاہے (جوراہِ راست پر ثابت قدم رہنے کے لیے پیش آنے والے مصائب اور مشکلات کو برداشت کرتے ہیں) اور (سختیوں اور مصیبتوں کے باوجود) ان کی زبانوں سے اس کے سواکچھ نہیں نکلتا تھا کہ: "اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے جوزیادتیاں ہوگئیں (انہیں معاف فرما) اور ہمارے قدموں کو (راہِ حق پر) جمادے اور قوم کفار (یعنی دشمنانِ حق کے مقابلہ) پر ہمیں فتح دے دے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں (دونوں جہانوں میں کامران وکامیاب کرکے) دنیا کا ثواب (یعنی دنیا کی خوشیاں اور فتح وکامیابی) بھی دے دیااور (اس سے) بہتر وعمدہ آخرت کا ثواب بھی دے دیااور اللہ تعالیٰ (ایسے) نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۶تا۱۴۸)

وھن ایسی سستی اور بزدلی کو کہا جاتا ہے جو موت کے خوف سے اور دنیا کی عیش اور زندگی کی محبت سے پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ وھن کی یہ تفسیر ایک روایت میں خود نبی کریم ﷺ سے منقول ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جبکہ دوسری (اُمتیں اور قومیں) آپس میں ایک دوسرے کو اس طرح تمہارے خلاف (لڑنے کے لیے) بلائیں گی اور تمہاری شان و شوکت کو مٹائیں گی، جیسا کہ کھانے کے دستر خوان پر جمع ہونے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے قاب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ سن کر کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ (ان کا ہمارے خلاف جمع ہونا اور ہم پر غالب ہو جانا) کیا اس سبب سے ہو گا کہ اس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس وقت تمہاری تعداد تو بہت ہو گی، لیکن تمہاری حیثیت پانی کے اس جھاگ کی سی ہو گی جو دریا اور نالوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن پیدا کر دے گا۔ اس پر کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ "وہن" کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: حُبُّ الدُّنۡیَا وَکَرَاھِیَّۃُ الۡمَوۡتِ دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری۔

(ابوداود، بیہقی، مشکوٰۃ: باب تغیر الناس، فصل دوم)

ضعف سے مراد یہاں بدنی اور جسمانی کمزوری نہیں بلکہ دل کی وہ کمزوری ہے جو وہن سے پیدا ہو جاتی ہو۔ استکانت اس دبنے اور اس ہار ماننے کا نام ہے جو دل کے ضعف کا نتیجہ ہو۔ جب کسی شخص کے اندر موت سے سخت نفرت اور زندگی اور دنیا کی عیش سے شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر وھن اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی بزدلی اس کے ارادے اور عمل میں کمزوری پیدا کرتی ہے۔ پھر اسی کمزوری اور ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہار مان لیتا ہے۔ اس آیت میں صبر کی اُس حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑی جس کا بیان پہلے گزر چکا۔

صبر عزم کی بلندی اور بہت بڑی ہمت کا کام ہے

صبر عزم کی بلندی اور بہت بڑی ہمت ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ

قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۞ ’’تم اپنے مال وجان میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور تم ضرور بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑے حوصلہ (اور ہمت) کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

(آل عمران: آیت ۱۸۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ حق کے لیے ٹکراؤ اور آزمائش کا ہونا ضروری ہے۔ اس کام میں تمہیں ایسے شدید حالات پیش آئیں گے جن میں مال وجان کا نقصان ہو گا اور اہلِ کتاب، مشرکین اور منکرینِ حق سے بڑے دکھ درد پہنچانے والی دل آزار باتیں سننا پڑیں گی۔ یہ دراصل تمہارے صبر و تقویٰ کا امتحان ہے۔ اگر ان باتوں کے باوجود تم حق پر ڈٹے رہے اور ان تمام مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہے تو یہ بڑی عزیمت، ہمت کا کام اور اُولوالعزم شخصیتوں کا مقام ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہی تلقین اور وصیت فرمائی تھی جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے: یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۞ ’’اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، اچھے کاموں کی نصیحت کیا کرو اور برائیوں سے روکو اور (اس کام میں) جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو، بے شک یہ حوصلہ (اور ہمت) کے کاموں میں سے ہیں۔‘‘ (سورۂ لقمان: آیت ۱۷)

دین پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو دینِ حق کی طرف بلانا، یہ دونوں صبر چاہتے ہیں۔ ان دونوں میں نفس و شیطان کے ایجنٹوں کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں، مشکلات اور مال وجان کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ جو شخص نفس وجذبات کو کنٹرول کر کے تمام تر مشکلات کو برداشت کرتا ہے اور خطرات کا مقابلہ کر کے حق پر ڈٹا رہتا ہے تو یہ بہت ہی عزیمت اور حوصلہ کا کام ہے۔

شجاعت اور بہادری کیا ہے؟

مذکورہ بالا آیتوں میں جنگ کے وقت دشمن کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنے، دشمن کے سامنے جان دینے، جنگ میں بھاگ جانے سے اپنے آپ کی حفاظت کرنے اور تمام خطرات کے مقابلے میں حق اور دعوتِ حق پر ڈٹے رہنے والے کو صابر کہا گیا ہے اور اس کو عزم کی بلندی اور ہمت کا کام کہا گیا ہے۔ صبر کی اس قسم کا اصطلاحی نام شجاعت اور بہادری ہے، یعنی شجاعت اور بہادری یہ ہے کہ دشمن اور خطرات ومصائب کا مقابلہ استقامت سے کیا جائے۔

بے خوفی کا نام شجاعت نہیں

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شجاعت اور بہادری بے خوفی کا نام نہیں کہ کوئی شخص ڈرے ہی نہیں بلکہ خوف سے نڈر ہو کر ضبطِ نفس اور موقع و محل کے مناسب اقدام کرنا شجاعت ہے۔ مثلاً کوئی شخص نتائج پر نگاہ رکھے اور اُن کے پیش آنے سے خوف زدہ ہو، مگر جب وہ نتائج سامنے آجائیں تو وہ استقامت سے ان کا مقابلہ کرے تو وہ شجاع اور بہادر ہے، بلکہ وہ ایسی حالت میں بھی بہادر سمجھا جائے گا کہ نتیجہ پر نگاہ رکھنے کے بعد وہ حکمت عملی کے تحت یہ فیصلہ کرے کہ خطرہ کے موقع سے اس وقت بچنا ہی بہترین طریقہ کار ہے اور اس کی ذمہ داری اور فریضہ اس کو یہ حکم دیتا ہو کہ اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ اپنے لشکر کو خطرے سے بچا کر پسپا ہو جائے، یا کچھ عرصہ کے لیے چھپ جائے، یا ہجرت کر کے دشمن کے مقابلہ کی تیاری کرے۔

غرض جب تک کوئی شخص موقع و محل کے مناسب خطرات اور مصائب کا مقابلہ کر کے بہترین کارگزار ثابت ہو تو وہ شجاع اور بہادر ہے، اور اگر اس نے موقع و محل کی مناسبت کے وقت بھی مقابلہ کرنا چھوڑ دیا، یا جس جگہ مقابلہ کرنا چاہیے تھا وہ وہاں سے بھاگ نکلا، یا جس جگہ اس کو فرار اختیار کرنا چاہیے تھا وہاں فرار نہ ہوا، تو ان تمام صورتوں میں اس شخص نے بے صبری اور بزدلی دکھلائی۔

بس سب سے بڑی بہادری اور شجاعت مصیبت کے وقت دل کا اطمینان اور حاضر حواسی ہے۔ بہادر وہ ہے کہ جب اس پر سختی آئے تو وہ اپنے اطمینان اور بیدارئ حواس کو نہ کھو بیٹھے، بلکہ ہوشیاری اور استقامت سے اس کا مقابلہ کرے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ اُس کے سامنے اُس کا بھائی کنویں میں

گر رہا ہے یا اُس کے گھر میں چور گھسے ہوئے ہیں یا اُس کے مکان میں آگ لگ گئی ہے، پس اس طرح کے خطرات اور حالات میں اس کی عقل گم ہو گئی اور وہ حواس باختہ ہو گیا اور حیران رہ گیا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اس حالت میں کیا کرے تو وہ شخص نامرد اور بزدل ہے۔ اگر وہ اپنے نفس کو قابو کرے اور ان امور کے لیے بہترین طریقۂ کار کو عمل میں لائے تو یہ شخص بلاشبہ بہادر ہے خواہ اس طریقہ کار کو اپناتے وقت وہ ڈر رہا ہو لیکن اس کے باوجود وہ خوف و خطرے کے نتائج سے نڈر ہو کر اپنے نفس کو قابو کرے اور موقع و محل کے مناسب عملی اقدام کرے۔

ظلم اور بے رحمی کا نام بہادری نہیں

اس سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ ظلم اور بے رحمی کا نام شجاعت اور بہادری نہیں، بلکہ بہادر اور شجاع وہ ہے جو ضعیفوں، یتیموں، مسکینوں اور مظلوموں پر مہربان ہو۔ جو لوگ بے رحم اور سنگ دل ہوتے ہیں وہ بہادر نہیں، بلکہ ظالم اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جان کے خطرے یا اپنے فقر و فاقے کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اُن میں ظالم، جابر کے مقابلے کی قوت نہیں ہوتی بلکہ کمزوروں پر ظلم و ستم کر کے سنگ دلی اور اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عمرو بن عَبدِوَد ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر باہر نکلا اور بلند آواز سے پکارا: مقابلہ کے لیے کون آتا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے کھڑے ہو کر کہا: یا نبی اللہ! میں اس کے مقابلہ کے لیے جاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عمرو ہے، بیٹھ جاؤ۔ پھر عمرو زور سے پکارا: کیا ہے کوئی مرد جو میرے مقابلہ کے لیے میدان میں آئے؟ اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہوئے کہنے لگا: کہاں گئی تمہاری وہ جنت جس کے بارے میں تم لوگ یہ کہتے ہو کہ تم میں سے جو مارا جاتا ہے وہ اس جنت میں داخل ہو جاتا ہے، تم لوگ میرے مقابلہ کے لیے ایک آدمی بھی نہیں بھیج سکتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہ! میں جاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ۔ عمرو نے تیسری مرتبہ پھر بلند آواز سے مقابلہ کے لیے آنے کی دعوت دی اور راوی نے اس کے اشعار کا بھی تذکرہ کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہ! میں جاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عمرو ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: چاہے عمرو ہو (میں جانے کو تیار ہوں)۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔ وہ یہ اشعار پڑھتے ہوئے اس کی طرف چلے:

لا تعجلنَّ فقد اَتاكَ   مُجِيبُ صَوتِكَ غَيرَ عَاجِزْ

ہرگز جلدی نہ کر کیونکہ تیری آواز کا جواب دینے والا آگیا ہے، جو عاجز نہیں ہے۔

فِي نيَّةٍ وَّ بصيرةٍ   والصِّدقُ مَنجی كُلِّ فَائزْ

یہ آنے والا سوچ سمجھ کر اور پکے ارادے کے ساتھ آیا ہے (یہ بات میں تم سے سچی کہہ رہا ہوں کیونکہ) سچ ہی ہر کامیاب ہونے والے کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔

اِنِّي لَاَرجُواَن اُقِيمَ   عَلَيكَ نَائِحَةَ الجَنَائِزْ

مجھے پوری اُمید ہے کہ مردوں پر نوحہ کرنے والیوں کو میں تیرے اوپر (نوحہ کرنے کے لیے) کھڑا کر دوں گا۔

مِن ضَربَۃٍ نَجلَاءِ   یَبقی ذِکرُھَا عِندَ الھَزَاھِزُ

میں تجھے (تلوار کی) ایسی لمبی چوڑی ضرب لگاؤں گا جس کا تذکرہ بڑی بڑی لڑائیوں میں بھی باقی رہے گا۔

عمرو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: میں علی ہوں۔ عمرو نے کہا: کیا تم عبد مناف (یہ ابو طالب کا نام ہے) کے بیٹے ہو؟ انہوں نے کہا: (ہاں!) میں علی بن ابی طالب ہوں۔ عمرو نے کہا: اے میرے بھتیجے! (میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے مقابلے کے لیے) تمہاری جگہ تمہارے چچاؤں میں سے کوئی چچا آئے جو عمر میں تم سے بڑا ہو کیونکہ مجھے تمہارا خون بہانا پسند نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: لیکن اللہ کی قسم! میں تمہارے خون بہانے کو برا نہیں سمجھتا ہوں۔ وہ غضبناک ہو کر اپنے گھوڑے سے نیچے اترا اور اپنی تلوار سونت لی۔ وہ تلوار آگ کے شعلے کی طرح چمک دار تھی۔ پھر وہ غصہ میں بھرا ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھال والی ڈھال لے کر اس کے سامنے آئے۔ عمرو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ڈھال پر تلوار کا ایسا زوردار وار کیا کہ تلوار ڈھال کو کاٹ کر ان کے سر تک جا پہنچی جس سے سر زخمی ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے کندھے پر اس زور سے تلوار ماری جس سے وہ زمین پر گر گیا اور (اس کے گرنے سے بہت سا) غبار اڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے اللہ اکبر کہنے کی آواز سنی جس سے ہم لوگ سمجھ گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قتل کر دیا ہے۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

اَعَلَیَّ تقتحِمُ الفَوَارِسُ ھٰکذا عَنِّی   وَعَنھُم اَخِّرُو اَصحَابِی

کیا گھوڑے سواریوں اچانک مجھ پر حملہ کر دیں گے؟ اے میرے ساتھیو! تم سب کو مجھ سے اور مجھ پر اچانک حملہ کرنے والوں سے پیچھے ہٹا دو (میں اکیلا ہی ان سے نمٹ لوں گا)۔

اَلْیَومَ یَمنَعُنِی الفِرارَ حَفِیظَتِی   وَمُصَمَّمٌ فِی الرَّأسِ لَیسَ بِنَابِی

میدانِ جنگ میں مجھے جو غصہ آتا ہے اس نے آج مجھے بھاگنے سے روکا ہوا ہے اور اس تلوار نے روکا ہے جس کا وار سر کاٹ کر آتا ہے اور خطا نہیں ہوتا۔

پھر یہ اشعار پڑھے:

عَبَدَ الحِجَارَةَ مِن سَفَاهِةِ رَأيِهِ   وَعَبَدتُّ رَبَّ مُحَمَّدٍ بِصَوَابِ

اس نے اپنی احمقانہ رائے سے پتھروں کی عبادت کی اور میں نے اپنی درست رائے سے محمد ﷺ کے رب کی عبادت کی۔

فَصَدَرتُ حِينَ تَرَكتُه مُتَجَدِّلاً   كَالجِذعِ بَينَ دَكَادِكٍ وَّرَوَابِ

جب میں اس کا کام تمام کرکے واپس آیا تو وہ زمین پر ایسے پڑا ہوا تھا جیسے کھجور کا تنا سخت زمین اور ٹیلوں کے درمیان پڑا ہوا ہو۔

وَعَفَفتُ عَن اَثوابِه وَلَو اَنَّنِي   كُنتُ المُقَطَّرَ بَزَّنِي اَثوَابِ

میں نے اس کے کپڑے نہیں لیے اور یوں میں پاکدامن رہا اور اگر میں گرجاتا تو وہ میرے کپڑے چھین لیتا۔

لَا تَحسَبَنَّ اللّٰهَ خَاذِلَ دِينِه   وَنَبِيِّه يَا مَعشَرَ الاَحزَابِ

اے (کافروں کی) جماعتو! یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اور اپنے نبی ﷺ کی مدد چھوڑ دیں گے۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی طرف چل پڑے اور ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ تم نے اس (عمرو بن عبدِ وَدّ) کی زرہ کیوں نہیں لی کیونکہ عربوں کے پاس اس زرہ سے بہتر زرہ نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے اس پر تلوار کا وار کیا، اس نے اپنی شرمگاہ کے ذریعہ مجھ سے بچاؤ کیا یعنی اس کی شرم گاہ کھل گئی اس وجہ سے مجھے شرم آئی کہ میں اپنے چچازاد بھائی کی اس حال میں زرہ اتارلوں۔ (حیات الصحابہ: ۶۹۱/۱-۶۸۸)

حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ کی بہادری

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر سب سے پہلے تلوار سونتنے والے حضرت زبیر بن العوّام رضی اللہ عنہ ہیں۔ ایک دن وہ دوپہر کو قیلولہ کر رہے تھے (یعنی آرام کر رہے تھے) کہ اچانک انہوں نے یہ آواز سنی کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیا گیا۔ (یہ سنتے ہی فوراً) سُتی ہوئی ننگی تلوار لے کر باہر نکلے۔ یہ اور حضور ﷺ دونوں ایک دوسرے کو بالکل آمنے سامنے آکر ملے۔ حضور ﷺ نے

پوچھا: اے زبیر! تمہیں کیا ہو گیا؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے سنا کہ آپ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا: پھر تمہارا کیا کرنے کا ارادہ تھا؟ انہوں نے عرض کیا: میرا یہ ارادہ تھا کہ میں (آنکھ بند کر کے) مکہ والوں پر ٹوٹ پڑوں۔ حضور ﷺ نے ان کے لیے دُعائے خیر فرمائی۔ انہی کے بارے میں اسدی شاعر نے یہ اشعار کہے ہیں:۔

هٰذاكَ اَوَّلُ سَيفٍ سُلَّ فِي غَضَبٍ   لِلّٰهِ سَيفُ الزُّبَيرِ المُرتَضٰى اَنفَا

حضرت زبیر مرتضیٰ سردار کی تلوار ہی وہ تلوار ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر غصہ کرنے میں سب سے پہلے سونتی گئی ہے۔

حَمِيَّةٌ سَبَقَت مِن فَضلِ نَجدَتِهٖ   قَد يَحبِسُ النَّجدَاتِ المُحبِسُ الاَرفَا

یہ دینی حمیت ہے جو ان کے زیادہ بہادر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوئی ہے اور کبھی زیادہ سننے والا کئی قسم کی بہادریوں کو جمع کر لیا کرتا ہے۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہونے کے بعد یہ شیطانی آواز سنی کہ حضرت محمد ﷺ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اس وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی عمر بارہ سال تھی۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اپنی تلوار سونت لی اور (حضور ﷺ کی تلاش میں) گلیوں میں بھاگنے لگے۔ حضور ﷺ اس وقت مکہ کے بالائی حصہ میں تھے۔ یہ وہاں ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہیں کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ بات سنی کہ آپ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تم کیا کرنے لگے تھے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کو گرفتار کرنے والوں کو اپنی اس تلوار سے مارنے لگا تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے آپ کے لیے اور آپ کی تلوار کے لیے دعا فرمائی اور ان سے فرمایا کہ واپس لوٹ جاؤ۔ یہ سب سے پہلی تلوار ہے جو اللہ کے راستہ میں سونتی گئی تھی۔ (حیات الصحابہ: ۶۹۷/۱-۶۹۶)

ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جنگ احد کے دن طلحہ بن ابی طلحہ عبدری مشرکوں کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے مسلمانوں کو اپنے مقابلہ پر میدان میں نکلنے کی دعوت دی۔ چنانچہ لوگ ایک دفعہ تو اس کی وجہ سے رک گئے (اس کے مقابلہ کے لیے جانے پر کسی نے ہمت نہ کی) پھر حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کے لیے نکلے اور چھلانگ لگا کر اس کے اونٹ پر اس کے ساتھ جا بیٹھے (اور اونٹ پر ہی لڑائی

شروع ہوگئی)۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے طلحہ کو اوپر سے نیچے زمین پر پھینک کر اسے اپنی تلوار سے ذبح کر دیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی اور فرمایا کہ ہر نبی کا کوئی (جان نثار) حواری ہوا کرتا ہے میرے حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہیں، اور فرمایا" چونکہ میں نے دیکھا تھا کہ لوگ اس کے مقابلہ میں جانے سے رک گئے تھے اس وجہ سے اگر یہ زبیر رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ میں نہ جاتے تو میں خود جاتا"۔ (حیات الصحابہ:۶۹۸/۱-۶۹۷)

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ نوفل بن عبد اللہ بن مغیرہ مخزومی نے غزوہ خندق کے دن دشمن کی صف سے باہر نکل کر مسلمانوں کو اپنے مقابلہ کے لیے نکلنے کی دعوت دی، چنانچہ اس کے مقابلہ کے لیے حضرت زبیر بن العوّام رضی اللہ عنہ نکلے اور اس پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کی وجہ سے ان کی تلوار میں دندانے پڑ گئے اور وہ واپس آتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

اِنِّی امْرُؤٌ اَحمِی وَاَحتَمِی   عَنِ النَّبِیِّ المُصطَفَی الاُمِّیِّ

میں ایسا آدمی ہوں کہ (دشمن سے) اپنی بھی حفاظت کرتا ہوں اور نبی اُمّی حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حفاظت کرتا ہوں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ ایک مشرک ہتھیار لگائے ہوئے آیا اور ایک اونچی جگہ چڑھ کر کہنے لگا کہ میرے مقابلے کے لیے کون آئے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں سے ایک آدمی سے کہا: کیا تم اس کے مقابلہ کے لیے جاؤ گے؟ اس آدمی نے کہا: یارسول اللہ! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء ہو تو (میں جانے کے لیے تیار ہوں)۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف) جھانک کر دیکھنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور ان سے فرمایا: (میری پھوپھی) صفیہ کے بیٹے، تم (مقابلہ کے لیے) کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس کی طرف چل پڑے اور جا کر اس کے برابر کھڑے ہو گئے۔ پھر دونوں ایک دوسرے پر تلوار کے وار کرنے لگے۔ پھر دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ پھر دونوں نیچے کو لڑھکنے لگے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بھی گڑھے میں پہلے گرے گا وہی مارا جائے گا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے (حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے) دعا کی۔ چنانچہ وہ کافر (گڑھے میں) پہلے گرا۔ پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس کے سینے پر جا گرے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ (حیات الصحابہ:۶۹۸/۱)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کی بہادری

حضرت حارث تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے شتر مرغ کے پر کی نشانی لگا رکھی تھی۔ ایک مشرک نے پوچھا کہ یہ شتر مرغ کے پر کی نشانی والا آدمی کون ہے؟ لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب ہیں تو اس مشرک نے کہا: یہی تو وہ آدمی ہے جنہوں نے ہمارے خلاف بڑے بڑے کارنامے کیے ہیں۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امیّہ بن خلف نے مجھ سے کہا: اے اللہ کے بندے! غزوۂ بدر کے دن جس آدمی نے اپنے سینے پر شتر مرغ کے پر کا نشان لگا رکھا تھا وہ کون تھا؟ میں نے کہا: وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ تھے۔ اُمیہ نے کہا: انہوں نے ہی تو ہمارے خلاف بڑے بڑے کارنامے کر رکھے ہیں۔ (حیات الصحابہ: ۱۰۷)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ اُحد کے دن لوگ لڑائی سے واپس آ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں میں نہ پایا۔ ایک آدمی نے کہا کہ میں نے ان کو اس درخت کے پاس دیکھا تھا۔ وہ یوں کہہ رہے تھے کہ میں اللہ کا شیر ہوں اور اس کے رسول کا شیر ہوں۔ اے اللہ! یہ ابو سفیان اور اس کے ساتھی جو کچھ فتنے لے کر آئے ہیں میں تیرے سامنے ان سب سے بَری ہونے کا اظہار کرتا ہوں اور مسلمانوں نے جو شکست کھائی ہے میں اس سے بھی بَری ہونے کا اظہار کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تشریف لے گئے۔ جب (شہادت کی حالت میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پیشانی دیکھی تو آپ رو پڑے۔ جب آپ نے دیکھا کہ ان کے کان، ناک وغیرہ کاٹ دیے گئے ہیں تو آپ سسکیاں لے کر رونے لگے۔

پھر آپ نے فرمایا: کیا کوئی کفن ہے؟ ایک انصاری نے کھڑے ہو کر ایک کپڑا ان پر ڈال دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام شہیدوں کے سردار حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہوں گے۔

حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ ضَمری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عبید اللہ بن عدی بن

خِیار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں باہر نکلے، پھر آگے باقی حدیث ذکر کی اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہاں تک ہم لوگ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے پاس جا بیٹھے اور ہم نے ان سے کہا کہ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں بتائیں کہ آپ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کیسے شہید کیا تھا؟ حضرت وحشی نے فرمایا: میں تمہیں یہ قصہ اسی طرح سناؤں گا جیسا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا۔

میں حضرت جبیر بن مُطعم کا غلام تھا۔ ان کا چچا طُعیمہ بن عدی غزوۂ بدر میں مارا گیا تھا۔ جب قریش جنگ احد کے لیے چلے تو جُبیر نے مجھ سے کہا: اگر تم میرے چچا کے بدلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دوگے تو تم آزاد ہو۔ میں ایک حبشی آدمی تھا اور حبشیوں کی طرح نیزہ پھینکا کرتا تھا اور میرا نشانہ بہت کم خطا جاتا تھا۔ میں بھی کافروں کے ساتھ اس سفر میں گیا۔ جب دونوں لشکروں میں مڈھ بھیڑ ہوئی تو میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھنے کے لیے نکلا اور میں بڑے غور سے انہیں دیکھتا رہا یعنی تلاش کرتا رہا۔ بالآخر میں نے ان کو لشکر کے کنارے پر دیکھ لیا (ان کے جسم پر گرد وغبار خوب پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے) وہ خاکستری رنگ کے اونٹ کی طرح نظر آرہے تھے اور وہ لوگوں کو اپنی تلوار سے اس زور سے ہلاک کررہے تھے کہ ان کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اللہ کی قسم! میں ان کے لیے تیار ہو رہا تھا انہیں قتل کرنا چاہتا تھا اور کسی درخت یا بڑے پتھر کے پیچھے چھپتا پھر رہا تھا تاکہ وہ میرے قریب آجائیں کہ اتنے میں سِباع بن عبد العزّٰی مجھ سے آگے ہو کر ان کی طرف بڑھا۔ جب حضرت حمزہ نے اس کو دیکھا تو اس سے کہا: او عورتوں کا ختنہ کرنے والی عورت کے بیٹے! اور یہ کہہ کر اس پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ ایک دم سر تن سے جدا کر دیا۔ ایسے نظر آیا کہ بلا ارادہ ہی سر کاٹ دیا۔

پھر میں نے اپنے نیزے کو ہلایا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا (کہ نیزہ نشانے پر جا کر لگے گا) تو میں نے ان کی طرف نیزہ پھینکا جو ان کی ناف کے نیچے جا کر اس زور سے لگا کہ دونوں ٹانگوں کے درمیان میں سے پیچھے نکل آیا۔ وہ میری طرف اٹھنے لگے لیکن ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ پھر میں نے ان کو اور نیزے کو اسی حال پر چھوڑ دیا یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر میں ان کے قریب گیا اور اپنا نیزہ لے لیا اور پھر اپنے لشکر میں واپس جا کر بیٹھ گیا۔ حضرت حمزہ کو قتل کرنے کے علاوہ مجھے اور کوئی کام نہیں تھا اور

میں نے ان کو اس لیے قتل کیا تھا کہ میں آزاد ہو جاؤں۔ چنانچہ جب میں مکہ آیا تو میں آزاد ہو گیا۔ پھر میں وہیں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو میں بھاگ کر طائف چلا گیا اور وہاں جا کر ٹھہر گیا۔ پھر طائف کا وفد مسلمان ہونے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں گیا تو سارے راستے مجھ پر بند ہو گئے اور میں نے کہا کہ شام چلا جاؤں یا یمن یا کسی اور جگہ۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ ایک آدمی نے مجھ سے کہا: تیرا بھلا ہو، اللہ کی قسم! جو بھی کلمۂ شہادت پڑھ کر حضرت محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو جاتا ہے حضرت محمد ﷺ اسے قتل نہیں کرتے ہیں۔ جب اس آدمی نے یہ بات مجھے بتائی تو میں (طائف سے) چل پڑا، یہاں تک کہ میں مدینہ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا (حضور ﷺ کو میرے آنے کا پتا نہ چلا بلکہ) جب میں آپ کے سرہانے کھڑا ہو کر کلمہ شہادت پڑھنے لگا تو آپ ایک دم چونکے۔ جب آپ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: کیا تم وحشی ہو؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ اور مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کیسے قتل کیا تھا؟ جب میں سارا واقعہ بیان کر چکا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: تیرا بھلا ہو، تم اپنا چہرہ مجھ سے چھپا لو، میں تمہیں آئندہ کبھی نہ دیکھوں (یعنی تم سامنے مت آیا کرو، اس سے مرے چچا کے قتل کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔) چنانچہ حضور ﷺ جہاں ہوا کرتے تھے میں وہاں سے ہٹ جایا کرتا تھا تاکہ حضور ﷺ کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور حضور ﷺ کی وفات تک میں ایسے ہی کرتا رہا۔

جب مسلمان یمامہ والے دن مسیلمہ کذّاب سے مقابلے کے لیے چلے تو میں بھی ان کے ساتھ گیا اور میں نے اپنے جس نیزے سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اس نیزے کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب دونوں لشکروں میں لڑائی شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ مسیلمہ کھڑا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور میں اس کو پہچانتا نہیں تھا۔ میں اسے مارنے کی تیاری کرنے لگا اور دوسری طرف سے ایک انصاری آدمی بھی اسے مارنے کی تیاری کرنے لگا۔ ہم دونوں اسی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی اور جب مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ نیزہ نشانے پر لگے گا تو وہ نیزہ میں نے اس کی طرف پھینکا جو اسے جا کر لگا اور انصاری نے بھی اس پر حملہ کیا اور اس پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تمہارا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے۔ اگر میں نے اسے قتل کیا ہے تو پھر میں نے ایک

تو وہ آدمی قتل کیا ہے جو حضور ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بہترین تھا، اور ایک وہ آدمی قتل کیا ہے جو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ برا تھا۔ (حیات الصحابہ: ۷۰۴/۱-۷۰۱)

اسی جیسی حدیث امام بخاریؒ نے حضرت جعفر بن عمرو سے روایت کی ہے اور اس میں یہ مضمون بھی ہے کہ جب دونوں لشکر جنگ کے لیے صف بنا کر کھڑے ہو گئے تو سباع لشکر سے باہر نکلا اور بلند آواز سے کہا کہ کوئی میرے مقابلہ پر آنے کے لیے تیار ہے؟ چنانچہ اس کے مقابلہ کے لیے حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لشکر سے باہر نکلے اور اس سے کہا: اے سباع! اے عورتوں کا ختنہ کرنے والی عورت اُمّ انمار کے بیٹے! کیا تم اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر رہے ہو؟ پھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے سباع پر ایک زور دار حملہ کر کے اسے ایسے مٹا دیا جیسے کہ گزرا ہوا دن ہوتا ہے۔

دو انصاری بچوں کا ابو جہل کو قتل کرنا

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور اور بڑے صحابہ میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں بدر کی لڑائی میں میدان میں لڑنے والوں کی صف میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں جانب انصار کے دو کم عمر لڑکے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ میں اگر قوی اور مضبوط لوگوں کے درمیان ہوتا تو اچھا تھا کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کر سکتے۔ میرے دونوں جانب بچے ہیں، یہ کیا مدد کر سکیں گے۔ اتنے میں ان دونوں لڑکوں میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: چچا جان! تم ابو جہل کو بھی پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں پہچانتا ہوں، تمہاری کیا غرض ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گالیاں بکتا ہے۔ اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں اس کو دیکھ لوں تو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہوں گا کہ وہ مر جائے یا میں مر جاؤں۔ مجھے اس کے اس سوال اور جواب پر تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نے یہی سوال کیا اور جو پہلے نے کہا تھا وہی اس نے بھی کہا۔ اتفاقاً میدان میں ابو جہل دوڑتا ہوا مجھے نظر پڑ گیا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ تمہارا مطلوب جس کے بارے میں تم مجھ سے سوال کر رہے تھے وہ جا رہا ہے۔ دونوں یہ سن کر تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے ایک دم بھاگے چلے گئے اور جا کر اس پر تلوار چلانی شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو گرا دیا۔

ف: یہ دونوں صاحبزادے معاذ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن جموح اور معوذ رضی اللہ عنہ بن عفراء ہیں۔

معاذ رضی اللہ عنہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں لوگوں سے سنتا تھا کہ ابو جہل کو کوئی نہیں مار سکتا، وہ بڑی حفاظت میں رہتا ہے۔ مجھے اسی خیال سے خیال تھا کہ میں اس کو ماردوں گا۔ یہ دونوں صاحبزادے پیدل تھے اور ابو جہل گھوڑے پر سوار تھا، صفوں کو درست کررہا تھا جس وقت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دیکھا۔ یہ دونوں دوڑے تو گھوڑے سوار پر براہِ راست حملہ مشکل تھا، اس لیے ایک نے گھوڑے پر حملہ کیا اور دوسرے نے ابو جہل کی ٹانگ پر حملہ کیا جس سے گھوڑا بھی گرا اور ابو جہل بھی گرا اور اٹھ نہ سکا۔ یہ دونوں حضرات اس کو ایسا کر کے چھوڑ آئے کہ اٹھ نہ سکے، وہیں پڑا تڑپتا رہے۔ مگر معوّذ بن عفراء رضی اللہ عنہ ان کے بھائی نے اور ذرا ٹھنڈا کر دیا کہ مبادا اُٹھ کر چلا جائے، لیکن بالکل انہوں نے بھی نہ نمٹایا۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بالکل ہی سر جدا کر دیا۔

معاذ رضی اللہ عنہ بن عمرو کہتے ہیں کہ جس وقت میں نے اس کی ٹانگ پر حملہ کیا تو اس کا لڑکا عکرمہ ساتھ تھا۔ اس نے میرے مونڈھے پر حملہ کیا جس سے میرا ہاتھ کٹ گیا اور صرف کھال میں لٹکا ہوا رہ گیا۔ میں نے اس لٹکے ہوئے ہاتھ کو کمر کے پیچھے ڈال لیا اور دن بھر دوسرے ہاتھ سے لڑتا رہا لیکن جب اس کے لٹکے رہنے سے دقت ہوئی تو میں نے اس کو پاؤں کے نیچے دبا کر زور سے کھینچا۔ وہ کھال بھی ٹوٹ گئی جس سے وہ اٹک رہا تھا اور میں نے اس کو پھینک دیا۔ (حکایاتِ صحابہ)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور حضرت سَمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کا مقابلہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب لڑائی کے لیے تشریف لے جاتے تو مدینہ منورہ سے باہر جانے کے بعد لشکر کا معائنہ فرماتے، ان کے احوال کو، ان کی ضرورتوں کو دیکھتے اور لشکر کی اصلاح فرماتے۔ کم عمر بچوں کو واپس فرمادیتے۔ یہ حضرات شوق میں نکل پڑتے۔ چنانچہ اُحد کی لڑائی کے لیے جب تشریف لے جانا ہوا تو ایک موقع پر جا کر لشکر کا معائنہ فرمایا اور نو عمروں کو لڑکپن کی وجہ سے واپس فرما دیا جن میں حضرات ذیل بھی تھے۔ عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب، عمرو بن حزم، اسید بن ظہیر، عرابۃ بن اوس، ابو سعید خدری، سمرۃ بن جندب، رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم کہ ان کی عمریں تیرہ چودہ برس کی تھیں۔

جب ان کو واپسی کا حکم ہوا تو حضرت خدیج رضی اللہ عنہ نے سفارش کی اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرا لڑکا رافع تیر چلانا بہت اچھا جانتا ہے اور خود رافع بھی اجازت کے شوق میں ابھر ابھر کر کھڑے ہوتے تھے کہ قد لمبا معلوم ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی تو سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اپنے سوتیلے باپ مرّۃ بن سنان سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رافع کو تو اجازت مرحمت فرمادی اور مجھے اجازت نہیں عطا فرمائی، حالانکہ میں رافع سے قوی ہوں۔ اگر میرا اور اس کا مقابلہ ہو تو میں اس کو پچھاڑ لوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا مقابلہ کرایا تو سمرۃ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو واقعی پچھاڑ لیا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرۃ کو بھی اجازت عطا فرمادی۔ اس کے بعد اور بچوں نے بھی کوشش کی اور بعض اوروں کو اور بھی اجازت مل گئی اس سلسلہ میں رات ہوگئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لشکر کی حفاظت کا انتظام فرمایا اور پچاس آدمیوں کو پورے لشکر کی حفاظت کے واسطے متعین فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہماری حفاظت کون کرے گا؟ ایک صاحب اٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: زکوان رضی اللہ عنہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا بیٹھ جاؤ۔ پھر فرمایا: ہماری حفاظت کون کرے گا۔ ایک صاحب اٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام دریافت کیا۔ عرض کیا: ابو سبع (سبع کا باپ)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ تیسری مرتبہ پھر ارشاد ہوا کہ ہماری حفاظت کون کرے گا؟ پھر ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نام دریافت کیا۔ انہوں نے عرض کیا: ابن عبد القیس (عبد قیس کا بیٹا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ارشاد ہوا کہ تینوں آدمی آجاؤ تو ایک صاحب حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے دونوں ساتھی کہاں گئے۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ تینوں دفعہ میں ہی اٹھا تھا۔ حضور نے دعا دی اور حفاظت کا حکم فرمایا۔ رات بھر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی حفاظت فرماتے رہے۔

ف: یہ شوق اور یہ ولولے تھے ان حضرات کے کہ بچہ ہو یا بڑا ہر شخص کچھ ایسا مست تھا کہ جان دینا مستقل مقصود تھا۔ اسی وجہ سے کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے بدر کی لڑائی میں بھی اپنے آپ کو پیش کیا تھا مگر اس وقت اجازت نہ مل سکی تھی، پھر احد میں پیش کیا جس کا قصہ ابھی گزرا۔ اس کے بعد سے ہر لڑائی میں شریک ہوتے رہے۔ احد کی لڑائی میں سینہ میں ایک تیر لگا، جب اس کو

کھینچا گیا تو سارا نکل آیا مگر بھال کا حصہ اندر بدن میں رہ گیا جس نے زخم کی صورت اختیار کی اور اخیر زمانہ میں بڑھاپے کے قریب یہی زخم ہرا ہو کر موت کا سبب بنا۔ (حکایات الصحابہ: ۱۵۰-۱۴۹)

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی بہادری روم کی لڑائی میں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۲۶ھ میں مصر کے پہلے حاکم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بجائے جب عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ حاکم بنائے گئے تو وہ روم کی لڑائی کے واسطے بیس ہزار کے مجمع کے ساتھ نکلے۔ رومیوں کا لشکر دو لاکھ کے قریب تھا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ رومیوں کے امیر جرجیر نے اعلان کیا کہ جو شخص عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے گا اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کروں گا اور ایک لاکھ دینار انعام بھی دوں گا۔ اس اعلان سے بعض مسلمانوں کو فکر ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا: یہ فکر کی بات نہیں ہماری طرف سے بھی اعلان کیا جائے کہ جو جرجیر کو قتل کرے گا اس کی بیٹی سے اس کا نکاح کیا جائے گا اور ایک لاکھ دینار انعام اور مزید یہ کہ اسی کو ان شہروں کا امیر بھی بنا دیا جائے گا۔ الغرض دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ جرجیر سارے لشکر کے پیچھے ہے اور لشکر اس سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ دو باندیاں مور کے پروں سے اس پر سایہ کیے ہوئی ہیں۔ انہوں نے غفلت کی حالت میں لشکر سے ہٹ کر اس پر تنہا جا کر حملہ کیا۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ یہ تنہا اس طرح بڑھے آرہے ہیں، کوئی پیغام صلح لے کر آئے ہیں مگر انہوں نے سیدھے پہنچ کر اس پر حملہ کر دیا اور تلوار سے سر کاٹ کر برچھے پر اٹھا کر لے آئے اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ف: حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نو عمر ہی تھے۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلی پیدائش مہاجرین میں ان کی ہی ہے۔ مسلمانوں کو ان کی پیدائش سے بہت خوشی ہوئی تھی اس لیے کہ ایک سال تک کسی مہاجر کے ہاں کوئی لڑکا نہ ہوا تھا تو یہود نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہم نے ان مہاجرین پر جادو کر رکھا ہے، ان کے ہاں لڑکا نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بچوں کو بیعت فرمانے کا نہیں تھا لیکن حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو سات برس کی عمر میں بیعت فرما لیا تھا۔ اس لڑائی کے وقت ان کی عمر چوبیس پچیس سال کی تھی۔ اس عمر میں دو لاکھ کے مجمع کو پھلانگ کر اس طرح سے بادشاہ کا سر کاٹ لانا معمولی چیز نہیں۔ (حکایات صحابہ: ۱۵۸-۱۵۷)

حضرت ابو دُجانہ سِماک بن خَرَشہ انصاری رضی اللہ عنہ کی بہادری

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد کے دن ایک تلوار لے کر فرمایا کہ یہ تلوار کون لے گا؟ کچھ لوگ تلوار لے کر اسے دیکھنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دیکھنے کے لیے نہیں دینا چاہتا ہوں بلکہ) تلوار لے کر کون اس کا حق ادا کرے گا؟ یہ سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت ابو دجانہ سماک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اسے لے کر اس کا حق ادا کروں گا چنانچہ (انہوں نے وہ تلوار لی) اور اس سے مشرکوں کے سر پھاڑنے لگے۔

حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے ایک تلوار پیش کی اور فرمایا: اس تلوار کو لے کر کون اس کا حق ادا کرے گا؟ حضرت ابو دجانہ سماک بن خرشہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں اسے لے کر اس کا حق ادا کروں گا، اس کا حق کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ تلوار دے دی۔ وہ (تلوار لے کر) نکلے تو میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ چنانچہ وہ جس چیز کے پاس سے گزرتے اسے پھاڑ دیتے اور اسے ہلاک کر دیتے۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے دامن میں چند (کافر) عورتوں کے پاس پہنچے۔ ان عورتوں کے ساتھ ہند بھی تھی جو (اپنے مردوں کو لڑائی پر ابھارنے کے لیے) یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

نحن بَنَاتُ طَارِقٖ   نَمشِي علی النَّمَارِقٖ

ہم طارق کی بیٹیاں ہیں، ہم گدّوں پر چلتی ہیں

وَالمِسکُ فِي المَفَارِقٖ   اِن تُقبِلُوا نُعَانِقٖ

اور (ہمارے سروں کی) مانگوں میں مشک کی خوشبو لگی ہوئی ہے۔ اگر تم (میدانِ جنگ میں) آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی۔

اَو تُدبِرُوا نُفَارِقٖ   فِرَاقَ غَیرِ وَامِقٖ

اور اگر تم (میدانِ جنگ سے) پیٹھ پھیرو گے تو پھر ہم تمہیں ایسے چھوڑ جائیں گی جیسے محبت نہ کرنے والا چھوڑ جاتا ہے کہ پھر واپس نہیں آتا۔

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہند پر حملہ کرنا چاہا تو اس نے (اپنی مدد کے لیے) میدان کی طرف زور سے آواز لگائی تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا تو میں اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں آپ کے سارے کام دیکھتا رہا ہوں اور مجھے آپ کے سارے کام پسند آئے ہیں لیکن مجھے یہ پسند نہیں آیا کہ آپ نے اس عورت کو قتل نہیں کیا۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس عورت نے (اپنی مدد کے لیے) آواز لگائی تھی لیکن کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں آیا تو مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے ایسی عورت کو قتل کروں جس کا کوئی مدد کرنے والا نہ ہو۔ (حیات الصحابہ رضی اللہ عنہم :۸۰۷/۱-۷۰۷)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بہادری

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ موتہ کے دن میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں اور میرے ہاتھ میں صرف ایک تلوار رہ گئی تھی جو یمن کی بنی ہوئی اور چوڑی تھی۔

حضرت اَوس بن حارثہ بن لام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہُرمُز سے زیادہ (مسلمان) عربوں کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ جب ہم مُسیلمہ اور اس کے ساتھیوں (کو ختم کرنے) سے فارغ ہوئے تو ہم بصرہ کی طرف روانہ ہوئے تو مقام کاظمہ پر ہمیں ہُرمُز ملا جو بہت بڑا لشکر لے کر آیا ہوا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے میدان میں نکلے اور اسے اپنے مقابلہ کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ مقابلہ کے لیے میدان میں آگیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ یہ خوشخبری حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو لکھی۔ جواب میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لکھا: ہُرمُز کا تمام سامان ہتھیار کپڑے گھوڑا وغیرہ حضرت خالد کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ہُرمُز کے ایک تاج کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی، کیونکہ اہل فارس جسے اپنا سردار بناتے اُسے لاکھ درہم کا تاج پہناتے تھے۔ (حیات الصحابہ ص:۷۱۸/۱)

سریہ موتہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کے نام تبلیغ اسلام کے لیے جو خطوط بھیجے تھے۔ ان میں ایک امیر بصریٰ شرحبیل بن عمرو غسانی کے نام بھی تھا۔ اس ظالم نے حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو (جو خط لے کر گئے تھے) قتل کر ڈالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث رضی اللہ عنہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے تین ہزار صحابہ کا ایک

لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرداری میں روانہ کیا۔ اس لشکر کو روانہ کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات فرمائیں وہ آج کل کے مہذب سپہ سالاروں کے لیے سبق حاصل کرنے کے قابل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

☆ ملک شام میں تم کچھ لوگوں کو گرجاؤں میں گوشہ نشین پاؤ گے تم ان سے نہ الجھنا۔

☆ کسی عورت کو قتل نہ کرنا۔

☆ کسی بچہ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔

☆ کسی بوڑھے کو نہ ستانا۔

☆ کسی درخت کو نہ کاٹنا۔

جب لشکرِ اسلام ملک شام میں مقام "موتہ" پر پہنچا تو وہاں دو لاکھ شامی اور رومی عیسائیوں سے مقابلہ ہوا۔ سردارِ لشکر حضرت زید رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سردار بنائے گئے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بڑی بہادری سے لڑے۔ جب ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں اسلامی جھنڈا لے لیا۔ جب بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو جھنڈے کو گود میں لے لیا اور اسی حال میں شہادت پائی۔ ان کے بعد حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سردار بنائے گئے لیکن انہوں نے بھی شہادت پائی۔ پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے سردار منتخب کیے گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی جنگی تدابیر سے عیسائیوں کو شکست دی اور اسلامی لشکر کو کامیاب لوٹا لائے۔

لشکر کے واپس آنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی خبر دے دی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

پہلے زید رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اٹھایا اور شہید ہو گئے، پھر جعفر رضی اللہ عنہ نے لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے سنبھالا اور وہ بھی شہید ہو گئے، پھر "خدا کی ایک تلوار" نے جھنڈے کو بلند کیا اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ یہ واقعہ ۸ ہجری کا ہے۔ (تاریخ ملت: ۸۶/۱-۸۵)

مہمات شام

۱۳ہجری میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شامیوں اور رومیوں کے خطرہ کو مٹانے کے لیے شام وفلسطین کی طرف ایک لشکر بھیجنے کا انتظام کیا۔ آپ نے اس لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصہ کا مستقل سردار مقرر کیااور اس کے حملہ آور ہونے کے لیے ایک علیحدہ سمت تجویز کی۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو حمص کی طرف، عمروبن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین کی طرف، یزید رضی اللہ عنہ بن سفیان کو دمشق کی طرف اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو اُردن کی طرف روانہ کیا گیا۔

سنہری نصیحتیں

خلیفۂ اسلام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک پیدل تشریف لے گئے اور رخصت کرتے وقت سرداران لشکر کو بہترین نصیحتیں فرمائیں۔ ان نصیحتوں میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ ہر حال میں خدا سے ڈرنا، وہ باطن کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ظاہر کو۔

☆ اپنے ماتحتوں سے اچھا سلوک کرنا۔

☆ جب انہیں نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرنا کیونکہ جب بات لمبی ہوتی ہے تو اس کا ایک حصہ دوسرے کو بھلا دیتا ہے۔

☆ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، دوسرے خود بخود اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔

☆ جب تمہارے پاس دشمن کے سفیر آئیں تو ان کی عزت کرنا۔

☆ اپنے بھید کو چھپانا تا کہ تمہارا انتظام درہم برہم نہ ہو۔

☆ ہمیشہ سچی بات کہنا تا کہ صحیح مشورہ ملے۔

☆ رات کو اپنے ساتھیوں کی مجلس میں بیٹھنا تا کہ تمہیں ہر قسم کی خبریں معلوم ہوں۔

☆ لشکر میں پہرہ چوکی کا عمدہ انتظام کرنا۔ کبھی کبھی اچانک پہنچ کر پہرہ داروں کے کام کی نگرانی بھی کرتے رہنا۔

☆ جھوٹوں کی صحبت سے بچنا، سچے اور وفادار ساتھیوں کی صحبت اختیار کرنا۔

☆ جن سے ملو اخلاص کے ساتھ ملنا اور بزدلی اور خیانت سے بچنا۔

☆ تم کچھ لوگوں کو دیکھو گے کہ دنیا سے بے تعلق اپنی عبادت گاہوں میں بیٹھے ہیں ان سے ہرگز نہ الجھنا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔

اسلامی فوج کے چاروں سردار اپنی اپنی فوج کو لے کر شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جابیہ پر، یزید رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان نے بلقاء پر، شرجبیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ نے بصرہ پر اور عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے عربہ پر پہنچ کر اپنا مورچہ قائم کرلیا۔ جب شامیوں اور رومیوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے ان کے ملک کو گھیر لیا ہے تو بہت پریشان ہوئے اور اپنے شہنشاہ ہرقل قیصر روم سے مدد مانگی۔

ہرقل کا مشورہ

ہرقل قیصر روم اس زمانے میں بیت المقدس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے تمام سرداروں کو جمع کیا اور ان سے کہا: "میری رائے تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے صلح کرلی جائے، شام کا آدھا خراج مسلمانوں کو دے دینا اور آدھا اپنے لیے بچالینا اس سے بہتر ہے کہ شام کا سارا خراج مسلمانوں کے حوالے کردیا جائے اور روم کے آدھے خراج سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔" مگر اس کے سرداروں نے اس کی نصیحت قبول نہ کی اور لڑنے پر اصرار کیا۔ ہرقل بیت المقدس سے روانہ ہو کر حمص آیا اور یہاں اس نے اپنی فوجیں جمع کیں۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسلامی فوج چار حصوں میں تقسیم ہے۔ اس نے بھی ہر حصہ کے مقابلے کے لیے الگ الگ فوج اپنے چار سرداروں کی ماتحتی میں روانہ کی۔ یہ فوج تعداد کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھی۔

ہرقل کا بھائی تذارق (۹۰،۰۰۰) نوے ہزار فوج کے ساتھ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے۔ جرجیر بن تورد (۵۰،۰۰۰) پچاس ہزار فوج کے ساتھ یزید کے مقابلہ کے لیے، قیقار بن نسطوس ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے اور دراقص (۴۰،۰۰۰) چالیس ہزار فوج کے ساتھ شرجبیل رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔

متحدہ مقابلہ

جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان کی فوج کے ہر حصہ کے مقابلہ کے لیے اس سے کئی گنا رومی فوج آرہی ہے اور دشمن کی تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کو الگ الگ پیس ڈالا جائے تو انہوں نے عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص سے مشورہ طلب کیا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ ہم سب کو یکجا ہو جانا چاہیے، اس صورت میں ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے ہر گز مغلوب نہ ہو سکیں گے۔ سب نے عمرو بن عاص کے مشورہ کو پسند کیا اور دربارِ خلافت سے اجازت طلب کی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی اور یہ بھی لکھ بھیجا کہ: "مسلمان تعداد کی کمی کے سبب کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے، البتہ اگر وہ گناہوں میں گھر گئے تو مغلوب ہو جائیں گے، لہٰذا انہیں گناہوں سے بچنا چاہیے۔"

ہرقل کو جب معلوم ہوا کہ اسلامی فوج یکجا ہو گئی ہے تو اس نے بھی اپنی فوج کو یکجا ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ رومی فوج نے وادئ یرموک کے کنارے مقام واقوصہ میں اپنا مورچہ جما لیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق اسلامی فوجیں بھی رومی فوجوں کے سامنے آکر جمع ہو گئیں اور انہوں نے رومیوں کا راستہ روک لیا۔ صفر ۱۳ ہجری سے ربیع الثانی ۱۳ ہجری تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں اور کسی کو دوسرے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی مدد

رومیوں کی پوزیشن بھی مضبوط تھی کیونکہ ان کے سامنے دریا تھا اور پس پشت پہاڑ، اور ان کی تعداد بھی زیادہ۔ لہٰذا مسلمانوں نے دربارِ خلافت میں درخواست کی کہ ان کو مدد بھیجی جائے۔ وہاں سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ وہ عراق کی مہم کو چھوڑ کر شام روانہ ہو جائیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ بن حارثہ کو عراق میں اپنا قائم مقام بنایا اور دس ہزار فوج لے کر نہایت تیزی کے ساتھ یرموک کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یرموک پہنچنے کی بہت جلدی تھی تاہم وہ راستہ میں اپنی تلوار کے جوہر برابر دکھاتے رہے۔ "ارک" پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے صلح کر لی، پھر "تدمر" پہنچے تو اہل تدمر قلعہ نشین ہو گئے اور آخر کار صلح کر لی۔

پھر ”قریتین“ پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو مغلوب کیا۔ پھر مرج راہط آئے تو غسانیوں کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر غوطہ پر حملہ کرکے اسے فتح کیا۔ پھر بصریٰ پہنچے تو وہاں کے باشندوں سے مقابلہ ہوا۔ اہلِ بصریٰ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمالیا، چنانچہ بصریٰ شام کا پہلا شہر ہے جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ اس طرح فتح کا پرچم اڑاتے ہوئے ربیع الآخر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ یرموک پہنچے۔ جیسے ہی اسلامی فوج کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی مدد حاصل ہوئی رومی فوج کو بھی مزید کمک پہنچ گئی۔ ایک مشہور رومی سردار ”باہان“ اپنے ساتھ بہت سے مذہبی رہنماؤں کو لے کر رومی فوج سے آملا۔ اب اسلامی فوج کی کل تعداد (۳۶) چھتیس ہزار ہوگئی اور رومی فوج کی کل تعداد دو لاکھ چالیس ہزار۔

جنگ یرموک

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ رومی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں اور پھر جنگی اصول کے مطابق اپنی فوجوں کو ترتیب دیئے ہوئے ہیں۔ مسلمان تعداد کے اعتبار سے ان سے کم ہیں اور پھر جتنے ہیں وہ بھی ایک جھنڈے تلے نہیں۔ اس صورت میں اندیشہ تھا کہ لڑائی بہت طول پکڑے اور پھر بھی دشمن کو نقصان نہ پہنچایا جاسکے۔ اس لیے آپ نے اسلامی لشکر کے سرداروں کو جمع کیا اور یہ تقریر فرمائی:

”یہ لڑائی ایک عظیم الشان مذہبی لڑائی ہے۔ آج ہمیں فخر اور نافرمانی کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے اور خالص اللہ کے لیے اپنی کوششیں صرف کر دینی چاہئیں۔ دیکھو! دشمن تنظیم و ترتیب کے ساتھ میدانِ جنگ میں موجود ہے اور تم متفرق و منتشر ہو۔ تمہارا یہ انتشار تمہارے لیے دشمن کے حملہ سے زیادہ نقصان دہ ہے اور دشمن کے لیے اس کی مدد سے زیادہ مفید ہے، بہتر یہ ہے کہ ساری فوج ایک امیر کی کمان میں دے دی جائے اور امارت فوج کو باری باری تقسیم کرلیا جائے۔ ایک دن ایک سردار امیر ہو اور دوسرے دن دوسرا۔ اگر یہ رائے پسند ہے تو آج مجھے امیر بن جانے دو۔“

اسلامی فوج کے سرداروں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند کیا اور انہیں امیر لشکر تسلیم کرلیا۔

اسلامی فوج کی تنظیم

رومی بڑی آن بان کے ساتھ میدان میں صف آراہوئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسلامی فوج کو بھی اس طرح ترتیب دیا کہ پہلے کبھی نہ دی گئی تھی۔ آپ نے کل فوج کو چالیس دستوں پر تقسیم کیا۔ کچھ دستے قلب میں رکھے، ان کا سردار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ کچھ دستے میمنہ پر رکھے، ان کا سردار عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ کچھ دستے میسرہ پر رکھے، ان کا سردار یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ کچھ دستوں پر قعقاع بن عمرو اور مذعور بن غدی وغیرہ کو سردار مقرر کیا۔ آپ نے ہر ہر دستے پر جس میں تقریباً ایک ایک ہزار سپاہی تھے الگ الگ افسر مقرر کیے۔

یہ افسر قلب، میمنہ و میسرہ کے سرداروں کے ماتحت تھے۔ ابو سفیان نقیب لشکر مقرر ہوئے۔ یہ ساری فوج میں پھر پھر کر تقریر کرتے تھے اور سپاہیوں کو جوش دلاتے تھے۔

کون زیادہ ہے؟

جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو اسلامی فوج میں سے ایک شخص نے کہا۔ ”رومی کس قدر زیادہ ہیں اور مسلمان کس قدر کم!“ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا یوں کہو:

”مسلمان کس قدر زیادہ ہیں اور رومی کس قدر کم۔“

اور پھر اس شخص سے کہا:

”زیادتی اور کمی کوئی چیز نہیں، فتح و شکست اصل چیز ہے۔“

آخر کار لڑائی چھڑی اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ خود قلب کے دستوں کو لے کر دشمن کی صفوں میں جا گھسے اور دشمن کی سوار فوج اور پیدل فوج کے درمیان حائل ہوگئے۔ دشمن کے سوار مسلمانوں کے حملوں کو برداشت نہ کرسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے انہیں بھاگنے کا راستہ دے دیا۔ اب پیدل فوج رہ گئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے دستوں کو لے کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ رومیوں نے محسوس کیا کہ گویا ان پر دیوار گر پڑی ہے۔ بھاگنے کا ارادہ کیا مگر جاتے کہاں، پیچھے پہاڑ تھا۔ بدحواسی کے عالم میں دریا کی طرف پلٹے اور غرق ہوگئے۔

طبری کے بیان کے مطابق ان دریا میں غرق ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ تلوار کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنے والوں کا شمار اس کے علاوہ ہے۔ مسلمان کل تین ہزار شہید ہوئے۔

موت کی بیعت

ابتدا میں جب رومی فوج نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو بعض اسلامی دستوں کے قدم اکھڑنے لگے تھے مگر عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ نے اس وقت بڑی جانبازی کا ثبوت دیا۔ عکرمہ نے چلّا کر کہا: "میں نے ہر میدان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کی ہے، بھلا میں آج پیٹھ دکھا سکتا ہوں؟ میرے ہاتھ پر کون بیعتِ موت کرنے کے لیے تیار ہے۔" حارث بن ہشام اور ضرار بن ازور وغیرہ چار سو جانبازان کی آواز پر میدان میں نکل آئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خیمہ کے سامنے اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ دشمن کا منہ پھیر دیا۔

دوسرے دن صبح کو عکرمہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عکرمہ رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا۔ یہ زخموں سے چور تھے اور دم توڑ رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک کا سر ران پر اور دوسرے کا اپنی پنڈلی پر رکھا اور ان کے چہرے سے گرد صاف کرتے اور حلق میں پانی ٹپکاتے رہے، اسی حالت میں ان دونوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر گئیں۔ رحمہا اللہ تعالیٰ

اس لڑائی میں مسلمان عورتوں نے بھی اپنا ایک الگ دستہ بنا کر مردانگی کے جوہر دکھائے۔ یہ لڑائی "جنگ یرموک" کے نام سے مشہور ہے اور تاریخ اسلامی میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اس لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد شام میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور پھر وہ آگے بڑھتے ہی چلے گئے۔

پیکرِ اخلاص

جنگ یرموک ابھی جاری ہی تھی کہ مدینہ سے قاصد ایک خط لے کر آیا اس خط میں لکھا تھا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ نئے خلیفہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ عبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کو سالارِ افواج مقرر کیا ہے۔

یہ خط سب سے پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ میں پہنچا، اسے پڑھ کر وہ ذرا بھی بد دل نہ ہوئے خاموشی کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو خبر دے دی کہ اب آپ میرے سردار ہیں اور میں آپ کا ماتحت اور اس خبر کو عام طور پر شہرت نہ دی کہ کہیں فوج میں بد دلی اور ہراس نہ پھیل جائے کسی نے آپ سے پوچھا کہ معزولی کی خبر سے آپ کے حملوں کے سختی میں ذرا فرق نہ آیا؟ آپ نے جواب دیا کہ:

میں خدا کے لیے لڑ رہا تھا نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کے لیے

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیماری اور وفات

۷ جمادی الاخری ۱۳ھ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بخار میں مبتلا ہوئے پندرہ روز تک برابر بخار کا سلسلہ جاری رہا، آخر کار ۲۱ جمادی الاخری ۱۳ھ کے شام کو ۶۳ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کی خلافت کی مدت دو سال تین مہینے دس روز ہوئی۔ وفات کے وقت آپ نے وصیت فرمائی کہ میری زمین فروخت کر کے وہ روپیہ ادا کر دیا جائے جو میں نے وظیفۂ خلافت کی صورت میں وصول کیا ہے چناں چہ اس کے بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں کی خبر پہنچی تو آپ بہت خوش ہوئے، آپ نے فرمایا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے کارناموں سے خود اپنے آپ کو سپہ سالار بنالیا ہے خدا ابو بکر رضی اللہ عنہ پر رحمتِ بیکراں نازل کرے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے کہ انہوں نے خالد رضی اللہ عنہ کو ان کے صحیح مرتبہ پر سرفراز کر دیا تھا۔

میں نے خالد رضی اللہ عنہ کو اس مرتبہ سے معزول کیا تو ان کی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں مسلماں ان کی شخصیت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں اور اسلامی فتوحات کو ان کی جنگی مہارت پر محمول نہ کریں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے عہدہ اور اختیارات میں اضافہ فرما دیا۔

......☆......☆......☆......

صابر متقی ہوتا ہے

جس شخص کے اندر صبر کی صفت ہو گی وہی حقیقی معنوں میں متقی اور پرہیز گار بن سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر سچے ایمان داروں اور وفاداروں کی جو خوبیاں بیان فرمائی ہیں اُن میں صبر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ فرمایا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞ ”اور خاص کر وہ لوگ جو سختی اور تکلیف اور جنگ (میں دشمن سے مقابلے) کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جو (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (حقیقی معنی میں) متقی ہیں۔“ (سورۃ البقرہ: آیت ۱۷۷)

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ اور ان پر مہربان ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہمیشہ حق پر جمنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے اور صابرین پر ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور مہربانیاں برستی ہیں اور یہی لوگ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۞
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۞
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۞
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۞

”اے ایمان والو! صبر اور نماز (کے ذریعے اللہ تعالیٰ) سے مدد طلب کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھتے نہیں۔ اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصانات سے اور آپ ایسے صابرین کو (دنیا و آخرت کی فتوحات، ترقیوں اور فلاح کی) خوش خبری سنا دیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کے

لیے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی شاباشیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ(حق کو) پانے (اور کامیاب ہونے) والے (اور اپنی منزل مقصود کو پہنچنے والے)ہیں۔"

(سورۃ البقرہ: آیت ۱۵۳تا۱۵۷)

ان آیتوں میں راہِ حق کے خطرات ومشکلات بھی بتائے گئے ہیں اور راہِ حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان آزمائشوں اور مشکلات ومصائب سے نمٹنے کے لیے اصل اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا ہے۔

مشکلات اور مصائب سے نجات

پہلے یہی بتایا کہ اس راہ میں مشکلات، خطرات اور رکاوٹیں آئیں گی۔ ان کا علاج یہ ہے کہ صبر اور نماز کو اپناؤ اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت حاصل کرو۔ ہر مشکل، ہر خطرے اور ہر مصیبت سے نجات کا واحد راستہ اللہ تعالیٰ (ہی کو پکارنا) ہے۔

یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ وہی شخص اس میں سکون اور اطمینان سے زندگی گزارے گا جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں ایسی زندگی بسر کرتا ہو جو اس کے خالق ومالک کو خوش کرنے والی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا تو اللہ تعالیٰ کی ہو اور اسباب ووسائل کسی اور کے ہوں؟ اسباب اور وسائل بھی تمام تر اللہ تعالیٰ ہی مہیا فرماتے ہیں، پھر بھی جو شخص اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کسی قانون ودستور کے خلاف چلے وہ بھلا کیسے خوش وخرم رہ سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! لہٰذا ہر مشکل اور ہر مصیبت کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے لپٹا جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی جائے نماز، یعنی فرض، واجب، نماز تہجد اور نفل نمازیں پڑھی جائیں اور ہر مشکل، رُکاوٹ، آفت اور مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مدد کو حاصل کیا جائے۔ نیز یہ کہ اپنے نفس کو قابو میں کر کے اللہ تعالیٰ کے احکامات وہدایات کی پوری پابندی کی جائے اور اس کی نافرمانی سے قطعی اجتناب کیا جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت شامل حال ہوتی ہے اور ایسے لوگ عین مشکل ومصیبت کے وقت بھی پر سکون اور مطمئن ہوتے ہیں اور دنیا وآخرت کی فتوحات، ترقیات، کامیابیاں انہی لوگوں کے

ہاتھ آتی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ یہاں معیت سے مراد نصرت اور مدد و تائید کی معیت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا وہ قُرب و محبت اور الفت بھی جس کی ٹھنڈک، لذت اور چاشنی کو دل کی آنکھ اور زبان پا لیتی ہیں۔ اس کے بعد دوسری آیت میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ حق کے قیام اور نفاذ میں جان کی بازی لگانی پڑتی ہے، لیکن جو شخص اس جدوجہد اور دشمنانِ حق کے ساتھ جنگ میں جان دیتا ہے وہ مرتا نہیں اور نہ اس کو مردہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ دائمی حیات اور زندگی پالیتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین رزق دیا جاتا ہے۔

موت کے بعد دوسری زندگی ہر انسان کو ملتی ہے لیکن...

مؤمن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ دنیا کی زندگی اصل زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب دنیا کی یہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ زندگی پہلے عالمِ قبر و برزخ میں اور پھر عالمِ آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ زندگی صرف مؤمن کو نہیں بلکہ ہر انسان کو ملتی ہے لیکن منکرین اور کفار کی یہ نئی زندگی چونکہ سخت عذاب والی ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ قابلِ ذکر نہیں البتہ ایمان والے لوگ قبر و برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے مطابق اس نئی زندگی کے سرور اور خوشیوں کو حاصل کرتے ہیں اور اہل ایمان میں سے جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی قبر اور برزخ کی زندگی کی کامیابیوں اور خوشیوں کا تو کوئی اندازہ اور تصور بھی اس دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ جس پسینے اور خون سے دینِ حق کی آبیاری ہو جائے وہ پسینہ اور خون کس قدر قیمتی ہو گا۔

ایمان کے لیے آزمائش ضروری ہے

اس کے بعد تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا بیان ہے، وہ یہ کہ دنیا میں ہر شخص کی آزمائش ضرور ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سنت کی نشاندہی مختلف مقامات پر فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۞ ”کیا لوگوں نے یہ گمان

کرر کھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے انہیں چھوڑ دیا جائے گا (اگر انہوں نے ایسا سمجھا ہے تو یہ انہوں نے بالکل غلط سمجھا ہے، ان سے ضرور امتحان لیا جائے گا) اور (یہ امتحان اور یہ آزمائش صرف ان کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ یہی ہوا) ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں (اور اِن کو بھی ضرور آزمائیں گے)، پس اللہ تعالیٰ ضرور ان لوگوں کو الگ (اور ظاہر) کر دے گا جو (اپنے دعوائے ایمان اور عہد میں) سچے ہیں اور ضرور ان لوگوں کو بھی جدا (اور ظاہر) کر دے گا جو (اپنے دعوائے ایمان میں کھوٹے اور) جھوٹے ہیں۔ (سورۃ العنکبوت: آیت ۲۔۳)

آزمائش کے فوائد

مذکورہ آیتوں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں آزمائش ضرور ہوگی اور اہلِ حق کے لیے یہ امتحان اور آزمائش ناگزیر ہے۔ اس میں بہت فائدے ہوتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں اور قوتیں آزمائش اور امتحان ہی سے پروان چڑھتی ہیں۔

۲۔ آزمائش سچوں اور کھروں کے کردار اور اخلاق کو پختہ اور بہتر سے بہترین بناتی ہے۔

۳۔ آزمائشوں کی وجہ سے خود سچوں کے اندر جو کھوٹ اور آمیزش ہوتی ہے وہ پاک صاف ہو جاتی ہے جیسا کہ سونے کو آگ میں تپایا جاتا ہے تو اس کا غل غش دور ہو کر چمک اُٹھتا ہے۔

۴۔ انہی آزمائشوں سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے اور یہی آزمائشیں عام لوگوں پر اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔

۵۔ اس کی وجہ سے جماعتِ حقہ کھوٹے اور جھوٹے لوگوں سے پاک صاف ہو جاتی ہے۔

۶۔ آزمائشوں میں کھرے ثابت ہونے والوں کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی، ترقی، فلاح اور دائمی جنت ہے، اور جو اس میں فیل ہو جاتے ہیں، کھوٹے ثابت ہوتے ہیں وہ دنیا میں بالآخر نیست و نابود ہوتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنتے ہیں۔

اس آیت میں جن چیزوں میں آزمائش کا بیان ہے ان میں پہلے خوف کو لایا گیا ہے۔ خوف میں پروپیگنڈوں کا خوف، ملامت کرنے والوں کی ملامت کا خوف، تکلیفیں جھیلنے کا خوف اور دشمنوں کے حملوں کا خوف سب شامل ہیں۔

دوسری آزمائش ''جوع''یعنی بھوک کی بھی ہے۔ اس سے مراد وہ معاشی مشکلات ہیں جو دشمنوں کی طرف سے معاشی اور غذائی ناکہ بندیوں اور اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے پیش آسکتی ہیں اور جو لوگ ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل اور ذرائع پر قابض ہوں اُن کی مخالفت کرنا، ان سے جھگڑنا اپنے اوپر گویا کہ بھوک کا دروازہ کھولنا ہوا، ایسی صورت میں دشمن ہر طرف سے معاشی اور غذائی ناکہ بندی کرے گا مثلاً: نوکری سے نکال دیا، اقتصادی پابندی لگائی، تجارت کو چلنے نہیں دیا یا لین دین بند کرایا وغیرہ وغیرہ۔

تیسری چیز اموال، جان اور ثمرات میں نقصان کی آزمائش ہے۔ جنگوں (اور جدوجہد) میں مال بھی لگتا ہے، جان بھی، اور رشتہ دار، بیٹے، بھائی، پوتے وغیرہ بھی شہید ہوتے ہیں۔ اس طرح اپنے پورے مال، اپنی جان اور اہل وعیال کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ گھر بار اور اپنی پکی فصلوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اپنے اموال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگانا پڑتا ہے۔ نیز جنگ اور بدامنی کی حالت میں اہلِ حق اپنے اموال یعنی فصلوں کی کاشت، ان کی حفاظت، اونٹ، گائے، بکری مال مویشیوں، تجارت، لین دین اور کاروبار وغیرہ کی نگہداشت سے بھی رہ جاتے ہیں، اس وجہ سے بھی اموال اور ثمرات میں نقصان کرتے ہیں۔ ''ثمرات'' میں نقصان کی آزمائش کو اموال کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال سے ایک زائد چیز اموال اور جان کا غلہ ہے اس راہ کی جدوجہد اور جنگ کی وجہ سے اس نعمت میں بھی کمی آسکتی ہے۔

گھبراؤ نہیں، آزمائشیں تمہاری ترقی کے لیے ہیں

مذکورہ بالا بیان سے جس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایمانی زندگی کے لیے آزمائش ضروری ہے، اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی آزمائش سے ترقی ہوتی رہتی ہے اور اس میں بہت سے فائدے ہیں، لہٰذا ان آزمائشوں سے گھبرانے کے بجائے ان سے بغل گیر ہوجانا چاہیے۔ ان آیتوں میں غور کریں تو وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٖ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ میں آزمائش کے بعد اور خوف وغیرہ سے پہلے بِشَيۡءٖ کو لایا گیا، اس میں مؤمن کے لیے تسلی اور خوش خبری ہے کہ ان آزمائشوں پر مستقبل میں جو ترقیاں، نعمتیں اور خوشیاں ملتی ہیں ان کے مقابلے میں یہ بہت قلیل ہیں۔ اس وجہ سے ان آزمائشوں سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہوں

بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ آیت کے آخر میں واضح طور پر ان لوگوں کو خوشخبری دے دی گئی جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں۔

مذکورہ آیتوں میں سے چوتھی آیت میں مؤمن کی ایک صفت اور حالت کو بیان کیا ہے کہ جب اس کو مشکل اور مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کیا کرتا ہے ،چنانچہ فرمایا: اَلَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿﴾ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں :ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

مؤمن کے قول کی حیثیت

اس آیت میں مؤمنین اور صابرین کا یہ قول نقل ہوا کہ وہ کہتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ تو یہ مؤمن کا قول ہے اور مؤمن کا قول صرف کسی زبانی تلفظ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک حقیقی قول اور بات ہوتی ہے جو مؤمن کے اندرونی جذبات، احساسات اور عقیدہ کی ترجمانی کرتی ہے اور اس کی پوری ہستی کی نمائندگی کرتی ہے وہ اس کی شخصیت اور عملی زندگی کی بولتی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ اس آیت میں یہ قول بھی مؤمن کے عقیدے کا اظہار ہے کہ اس کو ایک اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ دوسرا اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان دو حقیقتوں پر ایمان رکھتا ہے کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو راہِ حق سے نہیں ہٹا سکتی۔ جب کوئی اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ ہم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں اور اسی کے لیے مرنا اور جینا ہے اور پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور وہاں ہم کو ان تکالیف، مصیبتوں اور آزمائشوں پر انعامات ہی انعامات ملنے ہیں اور جنہوں نے ہم کو ایذا اور تکلیف پہنچائی ہے وہیں ان سے پورا پورا انتقام بھی لینا ہے، تو پھر وہ (مؤمن) کیوں گھبرائے؟ مؤمن تو اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر مصیبت کا بہت اطمینان وسکون سے استقبال کرتا ہے اور یہی کلمہ مؤمنین کی ڈھال اور سپر ہے، اس کے ذریعے وہ ہر مصیبت اور ہر مشکل کا مقابلہ کرتے ہیں۔

صابرین پر اللہ تعالیٰ کی شاباشیں، برکتیں اور رحمتیں برستی رہتی ہیں

مذکورہ آیتوں میں سے آخری پانچویں آیت میں مؤمنین کو جو خوش خبری دے دی گئی اس کی وضاحت اور تفصیل یہ ہے کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے صلوٰت اور رحمت برستی رہتی ہے۔ صلوٰت، صلوٰۃ کی جمع ہے، اس سے دنیا و آخرت میں قسم قسم کی عزت و تکریم، درجات کی بلندی، فتح مندی، کامیابی، تائیدات و نصرتیں، برکتیں، شاباشیں، اُلفت اور طرح طرح کی نوازشیں، مہربانیاں اور اللہ تعالیٰ کی خاص توجہ کا ہونا مراد ہے۔ رحمت سے خاص خاص مہربانیاں، صلاحیتوں اور روح کی خاص نشو و نما و ترقیات مراد ہیں اور ان کے بارے میں بتایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے، ان کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں اور وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ آمین!

علم اور دنیا کی امامت صبر پر ملتی ہے

جس قوم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ملتی ہے اس کو گویا پوری دنیا کی امامت اور خلافت کی کنجی مل جاتی ہے، مگر امامت اور پیشوائی کسی قوم اور جماعت کو اس وقت ملتی ہے جب وہ حق اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خاطر مشکلات اور مصائب برداشت کرکے اس پر جمی رہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فرماتے ہیں: وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ "اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے (یہ سب کچھ اس وقت ہوا) جبکہ انہوں نے صبر کیا (اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر نہایت استقامت سے جمے رہے) اور وہ ہماری آیتوں ہی پر یقین رکھتے تھے۔"

(سورۃ السجدہ: آیت ۲۴)

اس آیتِ کریمہ میں صبر کی اساس اور بنیاد بھی بتائی گئی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات، اس کی کتاب، آیتوں کی سچائی اور بہترین نتائج اور انجام پر پختہ عقیدہ اور یقین تھا، اس لیے وہ صبر کے امتحانات اور آزمائشوں میں پورے اترے اور نہایت استقامت سے کتابِ الٰہی پر جمے رہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ عروج اور قوموں کی صحیح قیادت اور امامت کتابِ الٰہی کے ثمرات اور نتائج میں سے

ہے اور بنی اسرائیل میں سے بھی امامت اور پیشوائی کے لیے وہی لوگ چنے گئے تھے جو کتابِ الٰہی پر مکمل اعتماد اور سچا یقین رکھتے تھے اور نہایت استقامت کے ساتھ اس کی پیروی کرتے تھے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو عارضی دنیوی لذتوں، راحتوں اور خوشیوں کو ٹھکراتے ہیں اور خطرات و مشکلات اور مصیبتوں کو برداشت کر کے حق پر جمے رہتے ہیں تو ان کو بالآخر بطورِ انعام یہی صلہ مل جاتا ہے کہ ان کو دنیا میں قیادت اور پیشوائی ملتی ہے اور آخرت میں ابدی ترقیاں، خوشیاں اور نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ یہ نعمتیں اس قوم کو اس وقت تک ملتی رہتی ہیں اور ان کے دشمن ذلیل خوار ہوتے ہیں جب تک وہ کتابِ الٰہی پر قائم رہتی ہے لیکن جب وہ کتابِ الٰہی پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے تو وہ بالآخر بحیثیتِ مجموعی دنیا میں بھی ذلیل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی وہی لوگ ذلیل کن عذاب سے دوچار ہوتے ہیں جنہوں نے کتابِ الٰہی پر عمل اور اس پر صبر واستقامت کو چھوڑ کر اس کو نظر انداز کیا ہو۔

حق کی خاطر صبر کرنے کا صلہ جنت ہے

حق کی خاطر صبر کرنا اور استقامت کے ساتھ حق پر ڈٹے رہنے کا صلہ آخرت میں جنت ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ، رحمن کے "بندں کی صفات اور ان کے کردار کو ذکر کر کے آخر میں فرماتا ہے۔" اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ "یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے (جنت کے) بالاخانے ملیں گے اور ان میں ان کا دُعا اور سلام کے ساتھ استقبال کیا جائے گا، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔" (سورۃ الفرقان: آیت ۷۵)

اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اچھے اوصاف پیدا کرنا اور ان کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس کے لیے صبر واستقامت کی ضرورت ہے۔

صبر کرنے والوں کو بے حد و بے حساب اجر ملے گا

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ "(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو!

اپنے رب سے تقویٰ اختیار کرو (اور یاد رکھو کہ) ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس دنیا میں اچھے اعمال کیے نیک صلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے، بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔" (سورۂ زمر: آیت ۱۰)

اس آیتِ کریمہ میں ایمان والوں کو ایمان و تقویٰ اور صبر کی ترغیب و تسلی اور خوشخبری دے دی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار بنائیں گے اور اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اچھا اور نیک صلہ ہے۔ اس راہ میں جو مصائب اور مشکلات پیش آئیں ان کو عزم اور ہمت سے برداشت کرو۔ اگر تم دیکھو کہ تمہارا ملک اور وطن تم پر تنگ کر دیا گیا ہے اور اس ملک اور وطن میں تمہارے لیے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے تو پھر بھی شکستہ دل اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے، کسی ایسی جگہ ہجرت کرو جہاں تم بے خوف وخطر اپنے رب کی پوری بندگی کر سکو، بلاشبہ یہ راہ بڑی سخت آزمائشوں کی ہے لیکن اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے جو بندے ان آزمائشوں میں حق پر ثابت قدم رہیں گے تو ان کو ان کا صلہ اور اجر بھی ان کی توقعات اور ان کے اندازوں سے بڑھ کر اتنا بے حساب ملے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ چند آیتیں بطورِ نمونہ پیش کیں جن سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ صبر واستقامت میں دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔ صبر میں انسان تھوڑی تکلیف اور کم نقصان کو برداشت کر کے بڑی تکلیف اور زیادہ نقصان و خسران سے بچ جاتا ہے اور بہت بڑے آرام و سکون اور ابدی خوشیوں کو حاصل کر لیتا ہے۔ صبر ہی ایسی نعمت ہے جس کی بدولت انسان کو قوتِ برداشت، غصہ پر قابو، لوگوں کی ایذارسائی سے حفاظت وغیرہ جیسی عظیم نعمتیں ملتی ہیں اور یہی صبر ہے جو انسان کو جلد بازی اور زود رنجی سے محفوظ کر کے اُسے بردباری، سنجیدگی اور نرمی کا خوگر بناتا ہے اور اسی صبر کی بدولت اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت و مدد ملتی ہے۔ صابر شخص پر آنے والی ہر تکلیف و مصیبت اس کے گناہوں کی الائشوں کو دھو دیتی ہے اور اس کے لیے قُربِ الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے، اس سے اُس کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی تکالیف و مصائب اس کے لیے دنیا وآخرت کی ترقیات اور سرخروئی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

صبر کون کر سکتا ہے؟

صبر کے متعلق چند فضائل سامنے لائے گئے۔ ان سے اگر ایک طرف صبر کی فضیلت اور اہمیت سامنے آئی تو دوسری طرف صبر اور صابر کی شکل وصورت بھی سامنے آئی۔ اس کے بعد اس بات کو جان لیں کہ صبر صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی خواہشات اس کی عقل کے تابع ہوں اور جو شخص جذبات وخواہشات کا غلام ہو وہ بدترین جانور ہے۔ حقیقی معنوں میں صبر وہی شخص کر سکتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ پر، اس کے قانون و دستور پر اور اس کے وعدوں پر یقین ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک چھوٹا بچہ یا کوئی دیوانہ ہے جس کو اپنی صحت اور علاج کی کوئی قدر وقیمت معلوم نہیں اور اس کے مقابلے میں ایک سمجھدار نوجوان ہے جس کو اپنی صحت اور علاج کی اہمیت اور پوری قدر معلوم ہے۔ دونوں ایک قسم کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ دونوں کے لیے ڈاکٹر نے کسی انجکشن، کڑوی دوا کا علاج اور سخت پرہیز تجویز کیا۔ اب ظاہر ہے کہ بچہ یا دیوانہ اپنے اختیار سے نہ انجکشن لگوائے گا اور نہ پرہیز کرے گا جبکہ نوجوان خود انجکشن لگوانے بھی جائے گا، کڑوی دوا بھی کھائے گا اور پرہیز بھی کرے گا۔

لیکن یہ نوجوان بھی اُس وقت کڑوی دوائی کھائے گا اور سخت انجکشن لگوائے گا جبکہ اس کو ڈاکٹر اور طبیب پر اعتماد ہو، ورنہ اگر اس کو ڈاکٹر اور طبیب پر اعتماد نہیں تو وہ بھی قطعاً کڑوی دوا کھانے، انجکشن لگوانے اور پرہیز کرنے کی سختی کو برداشت نہ کر سکے گا۔ اس طرح جو لوگ جذبات کے اندھے ہوں اور جن کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے وعدوں پر کامل یقین نہ ہو تو وہ حق کی خاطر نہ اپنے نفس وجذبات کو کنٹرول کر سکتے ہیں اور نہ وہ اندرونی اور خارجی دشمنوں (نفس وشیطان) کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا صبر اللہ تعالیٰ، اس کے قانون اور اس کے وعدوں پر اعتماد اور یقین ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ جس کا اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں، اُس کا دین اور اُس کے جذبات خواہشِ نفس کے تابع ہوں گے نہ کہ دینِ حق کے۔

انسان جس چیز کو اپنا نصب العین بناتا ہے اس کے لیے استقامت اختیار کرتا ہے

انسان جس مؤقف کو اختیار کرتا ہے یا جس چیز کا وہ طالب ہوتا ہے یا جس چیز کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے تو وہ اس چیز کے حصول کے لیے برابر مصروف رہتا ہے اور اس مطلوبہ چیز کی راہ میں جس قدر مشکلات اور مصائب آئیں ان کو برداشت کر کے اپنے نفس کو اپنے مقصد اور مؤقف پر جمائے رکھتا ہے۔

اس جمنے کا نام صبر ہے ، صبر ایسی استقامت ، ثابت قدمی اور نفس کے اندر ایسی قوت کا نام ہے جو نفسانی خواہشات، مشکلات اور مصائب کے جھیلنے سے مغلوب نہ ہو اور اپنی مطلوبہ چیز یا اپنے پسندیدہ مؤقف پر اپنے آپ کو جمائے رکھے۔ تو یہاں صبر کا خلاصہ یہ ہوا کہ نفسانی خواہشات اور مشکلات و مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے نفس کو مسلسل حق یعنی قرآن و سنت پر جمائے رکھے۔

یہ قوت کسی انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب اس کو حق اس قدر محبوب ہو کہ اس کے مقابلے میں نفسانی خواہشات اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب اور مشکلات کو ذرہ برابر اہمیت نہ دے اور حق سے اس قدر محبت انسان کے اندر تب ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کو یہ یقین ہو کہ یہ حق ہے۔ اس کا تعلق علم سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں پر یقین ہو جو اس نے حق کے اپنانے پر کیے ہیں اور ان نقصانات اور خسارے وتباہی کا یقین ہو جو حق کے چھوڑنے کی وجہ سے بالآخر وجود میں آنے والے ہیں۔

انسان کے اندر جو صبر کا خلق ہے اس کو نماز، ذکر، روزے اور ریاضت سے باقی رکھا جا سکتا ہے اور اس کو ترقی بھی دی جا سکتی ہے۔ جس شخص کے اندر صبر کی قوت نہیں اس کی دینی عمارت ریت کے ٹیلے پر ہے، اس کی یہ عمارت نفس کی خواہش کی ترغیب اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب پیش آنے کی وجہ سے دھڑام سے گر جاتی ہے۔ جس شخص کے اندر صبر کی یہ قوت موجود نہ ہو وہ دنیا میں کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔

صبر، عجز اور رونے کا نام نہیں

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ صبر عزم و جزم، استقامت اور اس مردانگی کا نام ہے جو مردِ مؤمن کا شیوہ اور صفت ہے۔ اس کے برعکس ذلت کی زندگی اختیار کرنا، باطل سے دبنا، باطل کے سامنے گڑگڑانا، ظالموں اور باطل پرستوں کے ظلم وزیادتی کو دیکھ کر مجبور اور بے بس بن کر آنسو بہانا صبر نہیں، بلکہ یہ وہ حالت ہے جو کمزوروں، بے بسوں اور مجبوروں کو پیش آتی ہے اور بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اُن کے پاس آنسو بہانے کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اے مؤمنو! اُٹھو سیدھے سیدھے مؤمن بنو، بداخلاقیوں، برائیوں اور بُرے جذبات سے اپنے آپ کو پاک کرو، ذکر واذکار، سجدوں، رکوع اور

ریاضت سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ خود بھی ہر ذی حق کو اس کا حق پورا دو اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید و تلقین کرو۔ اس راہ کی مشکلات و مصائب سے قطعاً نہ گھبراؤ، صبر کرو اور صبر کی تلقین کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

ایمانی زندگی اور صبر

مذکورہ بحث میں صبر کی حقیقت اور صبر کے فضائل بیان ہوئے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایمانی زندگی، زندگی کے ہر لمحہ میں صبر کا تقاضہ کرتی ہے۔ خواہ انسان کے انفرادی اعمال ہوں یا اجتماعی، سب میں صبر و ہمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ طاعات و عبادات ہوں یا معاملات کی صفائی، حقوق کی ادائیگی ہو یا مال و جان کی قربانی، میدانِ جنگ میں ثابت قدمی ہو یا جھوٹ، خیانت، غیبت اور بد نظری جیسے گناہوں سے پرہیز، تنظیمی اور جماعتی زندگی میں سمع و طاعت ہو یا جماعتی فیصلے اور ان کو بروئے کار لانا؛ سب کے سب بغیر صبر و ثبات کے ناممکن ہوتے ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ صبر جذبات و خواہشات کو قابو کر کے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کا نام ہے، تو اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نفس کو کچلے بغیر حقیقی معنوں میں صابر ہونا ناممکن ہے۔

نفس کو قابو کرنے یا کچلنے کا طریقہ

نفس کو قابو کرنے یا کچلنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو قابو کرنے کی مشق (تمرین) کو برابر جاری رکھا جائے اور اس کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔ کثرت سے روزے رکھنا، نوافل اور ذکر کی کثرت، نماز کو بتکلف صبر و سکون اور ظاہری و باطنی آداب کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرنا، بتکلف اللہ تعالیٰ کی خاطر مخلوق کی نفع رسانی کے لیے اپنے آرام اور اپنی لذت کو چھوڑنا، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی عزت کرنا، جماعتی فیصلوں کی پابندی کرنا، بتکلف موت کو کثرت سے یاد کرنا، آخرت کو سامنے رکھنا، دین پر چلنے والوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے (جنت اور انعامات کے) وعدوں اور مخالفین کی سزاؤں کو بار بار سامنے لانا، کم کھانے، کم بولنے اور کم سونے کی عادت ڈالنے کی کوشش کرنا اور صالح لوگوں کی صحبت کو ادب و احترام کے ساتھ اختیار کرنا؛ یہ چند چیزیں صبر کی بنیاد بنتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کا اہتمام کیا جائے اور ان کو سنجیدگی سے اختیار کیا جائے تو نفس کچلنا شروع ہو گا اور دل میں سوز اور یادِ الٰہی

پیدا ہو گی اور یہی یادِ الٰہی آپ کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دے گی۔ پھر یہی ریاضت اور مجاہدات آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن جائیں گے اور آپ حقیقی معنوں میں تواضع اور انکساری کے پیکر بن جائیں گے۔

اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور حقیقی یاد اُس دل میں آسکتی ہے جو متواضع ہو اور جس میں ذرہ برابر کبر اور بڑائی نہ ہو۔ اس کے برعکس جس دل میں کبر، بڑائی، عجب اور خود پسندی کی نفسیات ہوں وہ دل معرفتِ الٰہی اور حقیقی یادِ الٰہی سے محروم رہے گا۔

تواضع، انکساری اور بے نفسی کا تجربہ خاص حالات میں ہوتا ہے

یہ بھی یاد رہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بارے میں اس دھوکہ میں پڑ جاتا ہے کہ میرے اندر عاجزی اور بے نفسی آچکی ہے، حالانکہ ہنوز اس میں بہت کچھ کبر اور بڑائی کا مرض اور خواہشات کا غلبہ موجود ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ تو خاص حالات میں ہوتا ہے کہ کوئی بے نفس اور متواضع بنا ہے یا نہیں وہ یہ کہ اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عام حالات میں متواضع اور بے نفس نظر آتے ہیں مگر جب کوئی خاص حالت پیش آئے تو اچانک وہ جادۂ حق سے ہٹ جاتے ہیں، کبھی محبت یا نفرت کا مسئلہ اور کبھی عزت اور ذاتی مالی نقصان کا سوال ان کے اوپر چھا جاتا ہے، مثلاً: کسی کی محبت اس کو عدل اور حدودِ شرعیہ سے ہٹا کر دوسروں کے معاملے میں ظلم اور ناانصافی میں مبتلا کر دیتی ہے یا کسی کے ساتھ دشمنی اور نفرت اس کو ظلم اور ناانصافی پر اکساتی ہے اور اس کے معاملہ میں ظلم اور ناانصافی کا مرتکب ہو جاتا ہے یا اختلافی اُمور اور باہمی تنازعات میں عزت و وقار کا سوال اس کو حق کے اعتراف سے روک دیتا ہے، تو اس طرح کے خاص اور غیر معمولی حالات میں یہ خدا پرست اور متواضع شخص وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو (اللہ تعالیٰ اور آخرت سے) غافل اور بے دین لوگ عام حالات میں کرتے ہیں، حالانکہ جنت کی قیمت بے نفسی اور صبر ہے جس میں حق کی خاطر مال و جان، راحت و لذت، خواہشات و جذبات اور عزت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

بے نفسی اور صبر کا بڑا تجربہ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں ہوتا ہے

بے نفسی اور صبر کا بڑا تجربہ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں ہوتا ہے۔ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں وہی شخص اپنے آپ کو اچھی طرح پابند کر سکتا ہے جس کی خواہشات و جذبات اس کے قابو اور کنٹرول میں

ہوں، وہ لوگوں کی تنقید، ملامت اور تعریف سے بے پرواہ ہو، اس کی رائے پر عمل ہو یا نہ ہو، اس سے مشورہ لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو، اس کو عزت کا منصب ملا ہو یا نہ ملا ہو وہ ان باتوں میں قطعاً نہیں الجھتا بلکہ وہ ہر حال میں جماعتی اور تنظیمی زندگی میں وہ دوسروں سے زیادہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور زیادہ مال وجان، وقت اور عزت داؤ پر لگاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص جماعتی اور تنظیمی کاموں میں سستی دکھاتا ہے اور اپنے نجی اور ذاتی مفاد کے کاموں میں دلچسپی یا لوگوں کی تنقید، ملامت یا تعریف کی طرف کان لگائے رکھتا ہے اور ان چیزوں سے متاثر ہوتا ہے یا اس کو اپنی رائے سب سے اچھی لگتی ہے اور وہ منصب وغیرہ جیسی چیزوں میں الجھ جاتا ہے تو ایسا شخص ہرگز بے نفس اور صابر نہیں، ایسا شخص ہر وقت جماعت اور تنظیم میں بگاڑ پیدا کرتا رہے گا۔

طاقتور اور جنت کے مستحق لوگ

جو لوگ اس قدر بے نفس ہو چکے ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر کے اجتماعیت اور جماعت کے بندھن میں اپنے آپ کو باندھیں اور اس کے پابند ہو جائیں اور جماعتِ حقہ کے تحت اپنی تمام (دینی، اخلاقی اور معاملاتی) زندگی کو منظم کریں اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دین کے حوالے کریں تو یہی لوگ ہیں جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید و آخرت میں جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

بے پناہ قوت والی جماعت

ایسے لوگوں کی جماعت جو اپنی انانیت کو ختم کر کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے حوالے کر چکے ہوں اور اپنی تمام تر دینی و اخلاقی زندگی کو جماعتِ حقہ کے تحت منظم کیے ہوئے ہوں تو ایسی جماعت کے اندر عظیم قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان وہ تمام اسباب ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے توڑنے والے ہوں، کیونکہ جماعت اور اجتماعیت کو توڑنے والی چیز نفس پرستی، انانیت اور اپنی رائے پر اصرار ہے، جہاں یہ انانیت موجود ہو وہ اسلام برائے نام ہو گا، محض ریاکاری و نمائش ہو گی۔ ایسی جماعت میں اپنی غلطیاں دیکھنے کے بجائے دوسروں کی غلطیاں دیکھنے اور دوسروں کا احتساب کرنے کا رجحان غالب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعت باہمی اختلافات اور ٹکراؤ کا شکار

ہو جاتی ہے۔

اس کے بر عکس جب کسی جماعت میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کی فکر و طلب پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر انانیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جماعت ایک دوسرے کی خیر خواہی میں کوشاں رہتی ہے اور شکایتوں سے در گزر کرتی ہے، اس کی توجہ تعمیری کاموں، اچھے کاموں، حقوق کی ادائیگی اور ظلم کے روکنے کی طرف ہو جاتی ہے۔ ایسی جماعت میں ہر فرد کے اندر اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس بیدار رہتا ہے، ہر ایک پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتا ہے اور اس کا ہر فرد دوسروں سے زیادہ اپنے عیوب کی طرف اور دوسروں کے احتساب سے زیادہ اپنے احتساب اور اصلاح کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی بے نفس اور ذمہ دار جماعت پوری طرح متحد رہتی ہے اور جس ملک اور قوم میں ایسے لوگ قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں تو وہ خود بخود اس ملک اور قوم میں بلند مقام حاصل کرتے ہیں اور ایسی جماعت بالآخر پوری زمین پر حاکم اور غالب ہو کے رہتی ہے۔

جماعتی صبر کا بیان

جہاں تک جماعتِ حقہ کے افراد کے صبر کا تعلق ہے، دین کی خاطر اور اجتماعی طور پر سختیوں کے جھیلنے اور اس کی فضیلت کا بیان اور اس کی کچھ ضروری تفصیل دعوت کے باب میں بھی اور مذکورہ بالا قریب کے بیان میں بھی گزر چکی ہے۔ اگرچہ اس میں جماعتی صبر کے لیے بہت کچھ موجود تھا، لیکن جماعتی صبر کی اہمیت کو مد نظر رکھنے کی خاطر اس کے بعض گوشوں اور پہلوؤں کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ جماعت پھونک پھونک کے قدم رکھے اور کبھی بھی عاجلانہ اقدام نہ کرے۔

دینِ حق کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنا جماعتی بے صبری ہے

جب کوئی جماعت اپنی دعوت میں ایسے مواد بڑھا دیتی ہے جن کا تعلق دنیوی مفادات یا شان و شوکت یا لذت سے ہو تو یہ جماعت کی بے صبری کی دلیل ہے۔ ایسی صورت میں تھوڑے وقت میں اگرچہ لوگوں کا ہجوم تو بن جائے گا لیکن اس کا دینی نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔

دنیوی مفادات کی چند مثالیں

اب سوال یہ ہے کہ یہ دنیوی مفادات کیا ہیں؟ اور دنیوی لذت اور شان و شوکت کی کیا صورت ہوتی ہے؟ اس کے لیے چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں، مثلاً: بیانات میں اس بات پر زور دیا جائے کہ موجودہ اقتدار کو ہٹا کر اسلامی نظام کو نافذ کریں گے یا یوں کہا جائے کہ غریبو! اُٹھو، اقتدار چھین لو اور اپنی غربت کو دور کرو، یا وہ دعوت جس میں انتخابی اور ووٹ کی سیاست کی چاشنی اور کسی کا اُتار چڑھاؤ کا نشہ موجود ہو، یا اسلام کو عشق بازی کی صورت میں پیش کیا جائے، یا مسلمانوں سے دین کا کوئی ایسا مطالبہ کیا جائے جس میں اُن کی عزت بھی بنتی ہے اور اپنا مقررہ دنیاوی ڈھانچہ بھی باقی رہتا ہے اور وہ اُن کی دنیادارانہ زندگی سے کوئی ٹکراؤ بھی پیدا نہیں کرتا ہے، مثلاً: کوئی معمولی سی سبیل کھولنا یا کسی دینی ادارے میں کچھ چندہ دینا یا کبھی چھوٹی موٹی خیرات کرنا وغیرہ۔

ایسے امور کی وجہ سے عوام اپنے محبوب دنیوی مشاغل اور اپنی من چاہی زندگی میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سبیل اور چندہ وغیرہ کی وجہ سے اپنی نجات اور کامیابی کا یقینی انتظام کر لیا ہے، اس لیے ایسی دعوت اور ایسے بیانات عوام میں بہت جلد مقبول ہو جاتے ہیں اور ایسی تحریکوں کے ارد گرد عوام کی بھیڑ لگ جاتی ہے، لیکن ایسی تحریکات اور ایسے کاموں سے خاطر خواہ نتائج نہیں ملتے۔ ایسی تحریکوں اور ایسے بیانات میں شور اور دھوم دھام زیادہ ہوتی ہے لیکن ان کی وجہ سے اسلام کا غالب آجانا اور لوگوں کی زندگیوں میں حقیقی معنوں میں اسلام کا آجانا ناممکن ہے۔

عوام میں مقبول تحریک کے لیے ضروری نہیں کہ وہ حق بھی ہو

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی تحریک عوام میں مقبول ہو جائے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس وجہ سے لوگوں میں مقبول ہو کہ وہ اُن کی ذہنی سطح اور ان کے دنیوی مفادات کی سطح سے قریب ہو۔

اسلام میں زندگی کا مادہ پرستانہ نقشہ توڑنا پڑتا ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام میں مادہ پرستانہ نقشۂ زندگی کو توڑنا پڑتا ہے اور خالص خدا پرستانہ سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ اگر دین اور مذہب کو صرف ایک ضمیمہ کے طور پیش کیا جائے جس میں ان کی

مادہ پرستانہ زندگی کا سانچہ سالم رہے، یا دینِ اسلام کو عشق بازی کی صورت میں پیش کیا جائے، یا مذہب کے نام پر اقتدار کے اتار چڑھاؤ کا سلسلہ سامنے لایا جائے یا کسی قوم کے خلاف قوم وملک کو اکسایا جائے تو ایسی تحریکات بہت جلد مقبول ہو جاتی ہیں، لیکن ان تحریکات کی وجہ سے اسلام کا احیاء تو بہت دور کی بات ہے، ایک آدمی بھی حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا، کیونکہ اسلام نہ تو اُچھل کود کا نام ہے نہ دھوم دھام کا، نہ بڑے بڑے القاب اور نعروں کا اور نہ عشق بازی کا، بلکہ اسلام تو محبوب حقیقی کی محبت میں اپنے مال وجان، خواہشات وجذبات اور عزت کے قربان کرنے کا نام ہے، اس لیے جماعتِ حقہ کو چاہیے کہ کمزور بنیادوں سے اپنی دعوت کا آغاز نہ کریں، بلکہ خالص توحید وآخرت اور رسالت کی بنیاد پر دعوت چلائیں اور اسی دعوتی بنیاد اور اسلام کے باقی مراحل کو تعمیر کریں جیسا کہ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

احیائے اسلام کے نام پر اُٹھائی گئی تحریکات کا حال

ذرا غور کیجیے! کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں نے احیائے اسلام کے لیے بہت سی تحریکات اٹھائیں اور ان تحریکوں کو بڑی مقبولیت بھی حاصل ہوئی، مگر ان میں سے بعض تو اپنے اصل مقصد میں سو فی صد ناکام ہیں اور بعض سے اگرچہ اُمتِ مسلمہ کو فائدہ حاصل ہوا ہے اور ہو رہا ہے، لیکن اصل مقصود کہ اسلام کا احیاء ہو جائے اس میں تقریباً تمام کی تمام تحریکات ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تحریکوں نے احیائے اسلام کے لیے اس فطری ضابطہ کو اختیار نہیں کیا جسے اللہ تعالیٰ نے احیائے اسلام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

ان میں سے بہت سوں نے بہت اخلاص کے ساتھ کام کیا ہے، لیکن ان میں سے بعض نے خاموش تدبیر کے بجائے دھوم دھام سے اور شور کے ذریعے سے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی، بعض نے فطری رفتار سے چلنے کے بجائے عاجلانہ اقدام کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی اور تدریج کے بجائے چھلانگ کا طریقہ اختیار کیا، بعض نے بنیادی کام کیے بغیر اور بنیادی مراحل سے گزرے بغیر یوں ہی آسمان میں آرزوں کے محلات تعمیر کیے، بعض نے مراحل کا لحاظ کیا اور تدریج بھی اختیار کی مگر یہ سب برائے نام تھیں، اس لیے وہ اپنی قوت وطاقت کو منظم کیے بغیر بڑی بڑی کاروائیاں کرنے لگے۔ بعض تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کے بجائے پہلے دن سے زیادہ حاصل

کرنے کے درپے ہوگئے اور اس کے لیے انہوں نے دعوت کا آغاز ہی دنیا کی عزت اور مال وغیرہ سے کیا، یا باطل اور ظالم سے اتفاق واتحاد کو مقصد کے لیے اصل مانا۔ غرض یہ کہ انہوں نے فطری ضابطوں کے بجائے شوق وجذبات یا لوگوں کے جذبات اور خواہشات کالحاظ کیااور فطرت کے خلاف ضابطوں پر چل نکلے جس کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔

کامیابی کاراز صبر واستقامت میں ہے

حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ بنائی ہوئی دنیامقررہ ضابطہ پر چل رہی ہے اور اس میں وہی شخص اور وہی جماعت کامیاب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقررہ ضابطہ پر چل رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کاراز اپنی کتاب اور اپنے نبی کریم ﷺ کی بات ماننے اور صبر کے ساتھ فطرت کے مطابق چلنے میں رکھاہے اور اللہ تعالیٰ نے اس فطرت کو قرآن مجید میں واضح طور پر بیان فرمایااور نبی کریم ﷺ نے اس کو اپنے عمل کے ذریعے دکھایاہے۔

معقول تعداد میں افراد کی اصلاح سے پہلے قومی اصلاح بے صبری ہے

جولوگ معقول تعداد میں افراد کی اصلاح کیے بغیر قومی اصلاح اور قومی انقلاب لاناچاہتے ہیں وہ بے صبری کاثبوت دیتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قومی اصلاح کاراز افراد کی اصلاح اور نیک کردار کی تعمیر میں رکھاہے۔ قرآن مجید حضرات انبیاعلیہم السلام کی تاریخ اور خود نبی کریم ﷺ کی پوری دعوت اور عملی زندگی اس پر شاہد ہے۔ اس لیے جولوگ اجتماعی ہنگاموں اور اچھل کود وغیرہ کے ذریعے قوی اصلاح تک پہنچناچاہتے ہیں یہ ناممکن ہے۔ لہٰذاافراد کی اصلاح اور ان کے کردار کی تعمیر پر زور دیں۔

جلدبازی کامفہوم اور اقدامات میں صبر کی اور عاجلانہ اقدام سے پرہیز کی ضرورت

دینِ حق کی جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ عاجلانہ اقدام سے قطعی پرہیز کیاجائے۔ عاجلانہ اقدام اور جلدبازی یہ ہے کہ جس مقصد کوپانے کے لیے جو ابتدائی چیزیں اور ضروری شرائط ہوں اُن کی تکمیل کے بغیر قبل ازوقت اس مقصد کوپانے اور حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس بات کوچند مثالوں سے واضح کرتاہوں۔

۱۔ اگر کوئی کاشتکار اس خوف سے کہ کہیں میری فصل کو اولے، ژالہ باری یا طوفان برباد نہ کر دے، یہ عاجلانہ اقدام کرے کہ وہ فصل کو پکنے سے پہلے تھریشر میں ڈال دے تو ایسا کاشتکار اس فصل کے مقصد اور غلہ سے محروم ہو جائے گا۔

۲۔ اگر کوئی شخص شکار پر نشانہ لگائے بغیر یوں ہی گولی چلاتا ہے تو ایسا شخص ایک طرف شکار کو بھگاتا ہے اور دوسری طرف گولی کا نقصان کر کے اپنے مال کو ضائع کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فائدے کے بجائے اپنا نقصان کرتا ہے۔ غرض یہ کہ جب کسی چیز کی ابتدائی ضروری چیزوں اور شرائط کی تکمیل کیے بغیر اس چیز کو پانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایک عاجلانہ اقدام ہو گا جس کا نقصان بھگتنا پڑے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر وقت سے پہلے حاضر ہونا

اس کی ایک واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر قبل از وقت حاضر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے کوہ طور پر بلایا اور اس حاضری کے لیے میعاد مقرر فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شوق و محبت حد سے بڑھ گیا اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے آپ نے کوہ طور پر جانے میں عجلت سے کام لیا اور بنی اسرائیل کی دیکھ بھال اور نگرانی کی ذمہ داری اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو سونپی۔ وقت سے کچھ پہلے کوہ طور پر پہنچے مگر یہی تھوڑا سا عاجلانہ اقدام، جو تمام تر رضائے الٰہی کے شوق و محبت اور اللہ کی خوشنودی کے جذبے سے تھا، وہ بھی بغیر نتیجے کے نہ رہا۔ قوم کی قیادت ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کر رہے تھے۔ اس قوم کے اندر شریر اور مفسد لوگ موجود تھے اور قوم کے اجتماعی نظم وضبط پر حضرت ہارون علیہ السلام کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی، چنانچہ قوم کے شریر اور مفسد لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس جدائی اور غیابت سے فائدہ اُٹھایا اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ۞ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ "اور اے موسیٰ! اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر تم کو کس چیز نے اُبھارا۔ (موسیٰ نے) کہا:

وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں (اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری قوم میرے پیچھے ٹھیک میرے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ واللہ اعلم) اور اے میرے رب! میں تیری طرف جلدی فرطِ شوق ومحبت سے آیا ہوں تاکہ تو راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس ہم نے تمہارے (نکل جانے کے) بعد تمہاری قوم کو (صبر واستقامت کی) آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا ہے۔''

(سورۂ طٰہٰ: آیت ۸۳ تا ۸۵)

غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر نبی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام کرنے اور اس کے احکامات وہدایات کو حاصل کرنے کی محبت اور شوق وجذبہ کی وجہ سے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کوہِ طور پر پہنچے، لیکن آپ کا یہ اقدام وقت سے کچھ پہلے تھا، لہٰذا نہ تو اللہ تعالیٰ نے وقت سے پہلے آپ کو تورات کی تختیاں عنایت فرمائیں اور نہ ایسا ہوا کہ عاجلانہ اقدام کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ اخلاص اور نیک نیتی کی وجہ سے نہ نکلے۔

غزوۂ اُحد میں قبل از وقت گھاٹی چھوڑنے کا انجام

عاجلانہ اقدام کی ایک دوسری مثال احد کی جنگ میں قبل از وقت گھاٹی چھوڑنے کا واقعہ ہے۔ جنگ احد کے موقع پر احد کے پہاڑ کے ایک درّہ سے دشمنوں کے حملے کا خوف تھا، اس لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں پچاس تیر اندازوں کی جماعت اس درہ کی حفاظت اور نگرانی کے لیے مقرر فرمادی اور انہیں ہدایت فرمائی کہ خواہ ہم کو فتح حاصل ہو یا شکست، تم لوگ اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا۔ جب اس جنگ میں کفار نے شکست کھائی اور اپنا مال واسباب چھوڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے تو عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی گھاٹی چھوڑنے لگے۔ عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی مگر انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کا حکم تو لڑائی کے وقت کے لیے تھا، اب لڑائی ختم ہو چکی، ہم یہاں کھڑے ہو کر کیا کریں؟ اس کے بعد یہی ہوا کہ اس درہ کی طرف سے کفارِ مکہ کا شدید حملہ ہوا اور مسلمانوں کی جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی۔

اس واقعہ میں غور کریں کہ امیر کی نافرمانی اور خود نبی کریم ﷺ کی نافرمانی غلطی سے ہو گئی اور اس جماعت کی اکثریت سے عاجلانہ اقدام صادر ہوا تو اس کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل

ہو گئی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عاجلانہ اقدام سے قطعی طور پر پرہیز کریں ، اقامتِ دین اور اس کی جدوجہد کی راہ میں صبر اور انتظار کی روش کو اپنائیں، ورنہ بعض اوقات نیک ارادے اور نیت کے ساتھ بھی جو عاجلانہ اقدام کیا جاتا ہے وہ عظیم نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔

راہِ حق میں غلطی سے عاجلانہ اقدام ہو تو گھبرائیں نہیں

اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ راہِ حق میں ناکامی کا سوال ہی نہیں۔ اس میں بندہ جو کچھ کرتا ہے آخرت ہی کے لیے کرتا ہے اور جو شخص قاعدے کے مطابق آخرت کے لیے کام کرتا ہے وہ ہر حال میں کامیاب ہے، البتہ کبھی عاجلانہ اقدام سے نقصان ہو جاتا ہے لیکن وہ آزمائش اور نقصان بھی بہت بڑی خیر وخوبی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، مثلاً: اس کی وجہ سے کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور جماعت سے ایسے لوگوں کو پھینک دیا جاتا ہے جو کھوٹے ہوں، ورنہ اگر آزمائش نہ ہو تو کھرے اور کھوٹے کا کوئی پتا نہ چلے گا، اور اس سے کھروں اور سچوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور جس غلطی کی وجہ سے آزمائش آئے آئندہ کے لیے ایسی غلطیوں سے بچنے کا اہتمام ہوتا ہے، اور آزمائشوں کی وجہ سے سچوں کے کردار میں پختگی آجاتی ہے، ان کے اندر دکھ، درد اور مال ودولت کا نقصان برداشت کرنے کی قوت بڑھ جاتی ہے، پھر وہ اس طرح کی تکلیفوں اور نقصانات سے گھبراتے نہیں، لہٰذا جب بھی کوئی ایسی بات پیش آئے تو مایوس نہ ہوں اور نہ گھبرائیں، بلکہ استقامت سے اپنے کام کو جاری رکھیں، سابقہ خطاؤں پر ندامت اختیار کریں اور توبہ واستغفار کریں۔

قوت اور طاقت بڑھانے میں بے صبری سے بچیں اور اغیار اور بے دینوں کے تعاون سے کام ہرگز نہ چلائیں!

اپنی قوت اور طاقت کو بڑھانے میں بے صبری سے پرہیز کریں۔ اس باب کی بے صبری یہ ہے کہ قوت اور طاقت بڑھانے کے لیے ایسے اسباب کو اختیار کیا جائے جو تمہاری طاقت وقوت کو اپنے حق میں استعمال کریں جیسا کہ غیر اسلامی قوتوں سے امداد حاصل کرنا۔ لہٰذا اغیار اور بے دینوں کے تعاون سے کام

ہر گز نہ چلائیں، اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کی بے صبری اور جلد بازی ہو گی کہ آپ اپنے اور اپنی جماعت کے اندر قوت پیدا کرنے کا انتظار نہیں کرتے اور اسی وجہ سے دوسروں کا سہارا اور تعاون حاصل کر کے کام چلاتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح جماعت جلد قوت پکڑے گی اور جلد ہی دشمنانِ حق سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے گی، لیکن یہ آپ کی خام خیالی ہوتی ہے، یہ بے صبری ہے کیونکہ ایسی صورت میں آپ کو اسباب جنگ اور مال و دولت وغیرہ تو مل سکیں گے لیکن اس کی وجہ سے جماعت کے اندر قوت و استحکام پیدا نہ ہو گا اور نہ جماعت خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے گی، وہ ہمیشہ دوسروں کی بیساکھیوں پر چلے گی اور غیروں کے چندوں سے کام چلائے رکھے گی۔ نیز اس طرح جماعت مقصد حق کے حصول سے رہ جائے گی اور اس کا انجام یہ ہو گا کہ اس جماعت کی وجہ سے کفر اور بے دینی کو فروغ ہو گا۔

مسلمانوں کی افواج اور ان کی عسکری تنظیمیں اغیار کے کام آتی ہیں

اس بات کو اچھی طرح جاننا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کی فوج اور مسلمانوں کی عسکری تنظیموں کا حال دیکھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قوم میں ایمان و تقویٰ کے ساتھ عسکری قوت ہو وہ غالب ہوتی رہے گی، لیکن آج کل مسلم حکومتوں کی افواج غیر مسلم حکومتوں سے تعاون مانگتی ہیں اور ان کے تحت اپنا فوجی فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ نیز مسلمانوں کے اندر بہت سے درد مند دل ایسے ہیں جنہوں نے عسکری تنظیمیں بنائی ہیں، لیکن وہ بھی انہی مسلم افواج سے تعاون حاصل کرتی ہیں اور ان کے ماتحت اپنی عسکری تنظیم کو منظم کرتی ہیں جو خود غیر مسلم حکومتوں کے سہارے جیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی افواج اور مسلمانوں کی نیک دل عسکری تنظیمیں دشمن کے کام آتی ہیں۔ یہ جوانمرد اور بہادر ہر جگہ اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں لیکن ان کی بہادری سے غیر مسلم حکومتیں پھلتی پھولتی ہیں۔

اغیار کی امداد کو زہر قاتل سمجھو

غرض یہ کہ غیروں کی وفاداری کے وعدوں اور ان سے امداد حاصل کرنے کی قطعاً لالچ نہ کریں۔ اغیار کی امداد کو اور ایسی مسلم افواج، جو غیر مسلم حکومت کے سہارے جیتی ہوں، اُن کی امداد کو جماعتِ حقہ اور احیائے دین کے لیے زہرِ قاتل سمجھیں۔ درختوں کے پتے کھائیں، پیٹ پر پتھر باندھیں

مگر غیروں کے سہارے نہ جئیں۔ اگر تعاون حاصل کرنا ہو تو صرف نیک مسلمان افراد سے اور اپنی جماعت کے افراد سے حاصل کریں۔ کبھی تمہارے دل مخلوق پر سہارا اور بھروسہ نہ کریں، بھروسہ اور اعتماد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت پر رہے۔ نماز، ذکر، ریاضت اور صبر کے ہتھیار کو بنیادی ہتھیار قرار دیں اور انہی بنیادوں پر ایسے ہمدردانہ اور عادلانہ عسکری نظام بروئے کار لائیں جو صاف صاف قرآن مجید کے تابع ہو، جو سب سے زیادہ انسانیت کے لیے نافع اور مفید ہو۔ ہمیشہ اپنے آپ کو انسانیت کے لیے مفید ترین ثابت کرتے رہیں، کسی کا خون بلا سخت ضرورت کے نہ بہائیں اور نہ جذباتی طور پر کوئی عاجلانہ اقدام کریں۔

بہت سی عسکری تنظیمیں خود اپنی جماعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں

اگر ایسا نظام قائم ہو تو منزل آپ کے سامنے ہو گی۔ اسلام اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی زمین پر غالب ہو کے رہیں گے، ورنہ اگر اغیار کے سہارے جینا شروع کیا اور انہی بنیادوں پر عسکری تنظیمیں بنائیں تو یہ عسکری تنظیمیں خود جماعت کے مسلمانوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیں گی۔ ایسی تنظیمیں مسلمانوں کے بجائے غیروں کے کام آئیں گی اور مسلمان پہلے سے بھی زیادہ ٹکڑیوں اور ریاستوں میں تقسیم ہو کے رہ جائیں گے۔ اس طرح وہ دشمنانِ اسلام کے لیے پہلے سے زیادہ نوالۂ تر بنیں گے اور وہ پہلے سے زیادہ مقدار میں مسلم قوم کے خون کو چوس کر پھلتے پھولتے رہیں گے۔

اگر آپ واقعۃً آنکھ، کان اور دل و دماغ رکھتے ہیں تو ذرا عرب ممالک جو اسلام کا مرکز ہیں اُن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں تو مذکورہ بالا حقائق سورج سے زیادہ واضح نظر آ جائیں گے۔ جب انہوں نے ایمان و تقویٰ کی راہ میں کمزوری دکھائی، نماز و ذکر اور صبر کے اہتمام کو چھوڑا اور آخرت کے بجائے دنیا کی طرف بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اغیار کو ان پر اس طرح مسلط کیا کہ ان کو خبر بھی نہ رہی۔ پھر خود اغیار کے مکر و فریب سے ان پر فوج کشی جاری رہی اور یہ نادان انہی اغیار پر اعتماد کرتے رہے اور اُن ہی سے امداد حاصل کرتے رہے جنہوں نے اپنے ہاتھوں یہ جنگیں اٹھائی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی دجالیت اور مکر و فریب سے جزیرۂ عرب میں داخل ہو گئے ہیں اور اب وہ حکمرانوں کے بعد عرب عوام کے ایمانی و اخلاقی اقدار کو بھی لوٹ رہے ہیں اور جزیرۂ عرب کے تمام مال و دولت اور ان تمام ذرائع آمدنی میں سے

رس نکال کر خود ان سے اپنے قومی وجود کو بڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں صبر اور شکر کرنے والا بنائے اور ایمان و تقویٰ کی راہ پر قائم و دائم رکھے۔ آمین!

راہِ حق میں صبر کے واقعات

جب آدمی اپنے نفس کی بندگی اور تمام لوگوں اور چیزوں کی بندگی سے آزاد ہو جاتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اختیار کرلیتا ہے اور اسے اپنے اوپر پوری طرح نافذ کرتا ہے، اور اس پر بس نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے تو یہ خالص بندگی کی دعوت اور اس کا عملی نفاذ؛ یہ دونوں چیزیں مل کر اُن لوگوں کو چیلنج کرتی ہیں جو اپنی زندگی کو غیر اللہ کی بندگی میں گزارتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی بندگی اور حق کے ساتھ باطل کو ملانے والے اور کسی طرح شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایسی بے آمیز (خالص) دعوت اور حق جب سامنے آتا ہے تو عناد پرست لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کو بھی طرح طرح کے پروپیگنڈوں سے حق کے خلاف ابھارتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ بے آمیز دعوت اور حق عجیب اور نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے بے آمیز دعوت اور نمونہ حق کو طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن ایمان والا برابر حق پر جما رہتا ہے۔ اس کے متعلق بطورِ نمونہ چند واقعات پڑھ لیجیے:

حضور ﷺ کا اللہ کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے سختیوں اور تکالیف کا برداشت کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی خاطر جتنی تکلیف مجھے پہنچائی گئی اتنی کسی کو نہیں پہنچائی گئی، اور جتنا مجھے اللہ کی وجہ سے ڈرایا گیا اتنا کسی کو نہیں ڈرایا گیا اور مجھ پر تیس دن اور تیس راتیں مسلسل ایسی گزری ہیں کہ میرے اور بلال رضی اللہ عنہ کے پاس کسی جاندار کے کھانے کے قابل صرف اتنی چیز ہوتی جو بلال کی بغل کے نیچے آجائے (یعنی بہت تھوڑی مقدار میں ہوتی تھی)۔

حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قریش ابو طالب کے پاس آئے اور کہا: اے ابو طالب! آپ کا بھتیجا (حضور ﷺ) ہمارے گھروں اور ہماری مجلس میں ہمارے پاس آتا ہے اور ہمیں ایسی باتیں سناتا ہے جن سے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو ہمارے پاس آنے سے روک دیں۔ تو ابو طالب نے مجھ سے کہا: اے عقیل! اپنے چچازاد بھائی کو ڈھونڈ کر میرے پاس لاؤ

چنانچہ میں آپ ﷺ کو ابو طالب کی ایک کوٹھڑی میں سے بلا کر لایا۔

آپ ﷺ میرے ساتھ چل رہے تھے، آپ سایہ میں چلنا چاہتے تھے (کیونکہ دھوپ تیز تھی) لیکن راستہ میں سایہ نہ مل سکا، یہاں تک کہ آپ ﷺ ابو طالب کے پاس پہنچ گئے۔ تو آپ ﷺ سے ابو طالب نے کہا: اے میرے بھتیجے! اللہ کی قسم! جیسے کہ تم کو خود بھی معلوم ہے میں تمہاری ہر بات مانتا ہوں، تمہاری قوم والوں نے آکر یہ کہا کہ تم کعبہ میں اور ان کی مجلسوں میں جاکر اُن کو ایسی باتیں سناتے ہو جن سے ان کو تکلیف ہوتی ہے، اگر تم مناسب سمجھو تو ان کے پاس جانا چھوڑ دو۔ آپ ﷺ نے اپنی نگاہ کو آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا کہ جس کام کو دے کر مجھے مبعوث کیا گیا ہے، اُس کو چھوڑنے کی میں بالکل قدرت نہیں رکھتا ہوں جیسے کہ تم میں سے کوئی سورج میں سے آگ کا شعلہ لانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس پر ابو طالب نے کہا: میرا بھتیجا کبھی غلط بات نہیں کہتا، تم سب بھلائی کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔

حضور ﷺ سے ابو طالب نے کہا: اے میرے بھتیجے! آپ کی قوم میرے پاس آئی ہے اور اس نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں، تم مجھ پر بھی ترس کھاؤ اور اپنی جان پر بھی، اور اتنا بوجھ مجھ پر نہ ڈالو جس کو نہ میں اٹھا سکوں اور نہ تم۔ لہٰذا تم اپنی قوم کو وہ باتیں کہنی چھوڑ دو جو ان کو ناگوار لگتی ہیں۔ اس سے حضور ﷺ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ کے بارے میں آپ ﷺ کے چچا کی رائے بدل گئی ہے اور وہ اب آپ ﷺ کی مدد چھوڑ کر آپ ﷺ کو قوم کے حوالے کرنے والے ہیں اور اب ان میں آپ کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: اے میرے چچا! اگر سورج میرے دائیں ہاتھ میں اور چاند میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیا جائے تو بھی میں اس کام کو چھوڑنے والا نہیں ہوں (میں اس کام میں لگا رہوں گا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو غالب کر دے یا اس کام کی کوشش میں میری جان چلی جائے۔ اتنا کہہ کر حضور ﷺ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آپ ﷺ رو دیئے اور وہاں سے پشت پھیر کر چل دیئے۔ جب ابو طالب نے دیکھا کہ حضور ﷺ اپنے کام پر اتنے پختہ ہیں (کہ اس کے لیے جان تک قربان کرنے اور چاند سورج تک اٹھا لینے کو تیار ہیں) تو انہوں نے حضور ﷺ کو پکارا: اے میرے بھتیجے! آپ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابو طالب نے کہا: آپ اپنا کام کرتے رہیں اور جیسے دل چاہتا ہے کرتے رہیں، اللہ کی قسم! میں کسی وجہ سے بھی تمہارا کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے صرف ایک ہی دن دیکھا کہ قریش کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں اپنی چادر ڈال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زور سے کھینچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئے۔ لوگوں میں ایک شور مچ گیا۔ سب نے یہ سمجھا کہ آپ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے پیچھے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا، اور وہ یہ کہتے جا رہے تھے: کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ پھر کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر نماز پوری فرمائی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو کفار کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے۔ آپ نے فرمایا: اے جماعت قریش سن لو! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، مجھے تمہاری طرف تمہیں ذبح کرنے کے لیے ہی بھیجا گیا ہے (یعنی نہ ماننے والے ہمارے ہاتھوں آخر قتل ہوں گے) اور آپ نے اپنے ہاتھ کو اپنے حلق پر پھیر کر ذبح ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ تو ابو جہل نے کہا: آپ تو نادان نہیں ہیں (لہذا ایسی سخت بات نہ کہیں، برداشت سے کام لیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تو بھی ان میں سے ہے (جو آخر قتل ہوں گے)۔ (حیاۃ الصحابہ، حصہ اول: ۳۴۲تا۳۴۳)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف فرما تھے اور ابو جہل بن ہشام، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ابی معیط، امیہ بن خلف اور دو اور آدمی؛ کل سات کافر حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں لمبے لمبے سجدے کر رہے تھے۔ ابو جہل نے کہا کہ تم میں سے کون ایسا ہے جو فلاں جگہ جائے جہاں فلاں قبیلہ نے جانور ذبح کر رکھا ہے اور اس کی اوجھڑی ہمارے پاس لے آئے، پھر ہم وہ اوجھڑی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ڈال دیں گے۔ ان میں سے سب سے زیادہ بدبخت عقبہ بن ابی معیط گیا اور اس نے وہ اوجھڑی لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر ڈال دی، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں تھے۔ میں وہاں کھڑا تھا، مجھ میں بولنے کی بھی ہمت نہیں تھی، میں تو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے جانے لگا کہ اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ خبر سنی۔وہ دوڑی ہوئی آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں سے اوجھڑی کو انہوں نے اتارا۔ پھر قریش کی طرف متوجہ ہو کر اُن کو برا بھلا کہنے لگ گئیں۔ کافروں نے ان کو کچھ جواب نہ دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت کے مطابق سجدہ پورا کر کے سر اٹھایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو تین مرتبہ یہ بد دعا کی: اے اللہ! تو قریش کی پکڑ فرما، عتبہ، عقبہ، ابو جہل اور شیبہ کی پکڑ فرما۔ پھر آپ مسجد حرام سے باہر تشریف لے گئے۔ راستہ میں آپ کو ابوالبختری بغل میں کوڑا دبائے ہوئے ملا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پریشان دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جانے دو۔ اس نے کہا: خدا جانتا ہے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ بتادیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پیش آیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور کوئی بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ یہ تو مجھے بتائے بغیر نہیں چھوڑے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سارا واقعہ بتادیا کہ ابوجہل کے کہنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اوجھڑی ڈالی گئی۔ ابو البختری نے کہا: آؤ مسجد چلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو البختری چلے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ پھر ابوالبختری ابوجہل کی طرف متوجہ ہو کر بولا: اے ابوالحکم! کیا تمہارے ہی کہنے کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اوجھڑی ڈالی گئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ ابوالبختری نے کوڑا اٹھا کر اس کے سر پر مارا۔ کافروں میں آپس میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ ابوجہل چلایا: تم لوگوں کا ناس ہو، تمہاری اس ہاتھا پائی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فائدہ ہو رہا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان دشمنی پیدا ہو جائے اور وہ اور ان کے ساتھی بچے رہیں۔ ①

حضرت یعقوب بن عتبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفا پہاڑی پر تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک سامنے سے آکر ابوجہل نے آپ کا راستہ روک لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تکلیف پہنچائی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شکاری آدمی تھے اور اس دن وہ شکار کرنے گئے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

① بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ نے ابوالبختری والے قصہ کو مختصر نقل کیا اور صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اوجھڑی ڈالنے کے بعد وہ لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ امام احمد کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان ساتوں کافروں کو دیکھا کہ یہ سارے جنگ بدر کے دن قتل کیے گئے۔

ساتھ ابو جہل نے جو کچھ کیا وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ (شکار سے) واپس آئے تو ان کی بیوی نے ان سے کہا: اے ابو عمارہ! جو کچھ ابو جہل نے (آج) تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیا ہے اگر تم اسے دیکھ لیتے (تو نہ جانے تم اس کے ساتھ کیا کرتے۔ یہ سن کر) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بڑا غصہ آیا۔ چنانچہ وہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنی گردن میں کمان ٹکائے ہوئے اسی طرح چل دیے اور مسجد (حرام) میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے ابو جہل کو قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے پایا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے ابو جہل کے سر پر زور سے کمان ماری اور اس کا سر زخمی کر دیا۔ قریش کے کچھ لوگ کھڑے ہو کر حضرت حمزہ کو ابو جہل سے روکنے لگے۔ حضرت حمزہ نے کہا: (آج سے) میرا بھی وہی دین ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی قسم! میں اپنی اس بات سے نہیں پھروں گا۔ اگر تم (اپنی بات میں) سچے ہو تو مجھے اس سے روک کر دیکھ لو۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بہت قوت حاصل ہوئی اور مسلمان اپنے کام میں اور زیادہ پکے ہوگئے۔ اب قریش ڈرنے لگے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب حضرت حمزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرور حفاظت کریں گے۔ (حیاۃ الصحابہ، حصہ اول: ۳۴۷ تا ۳۴۹)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ لکھتے ہیں:

نبوت مل جانے کے بعد نو برس تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تبلیغ فرماتے رہے اور قوم کی ہدایت اور اصلاح کی کوشش فرماتے رہے، لیکن تھوڑی سی جماعت کے سوا جو مسلمان ہوگئی تھی اور تھوڑے سے ایسے لوگوں کے علاوہ جو باوجود مسلمان نہ ہونے کے آپ کی مدد کرتے تھے، اکثر کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچاتے تھے، مذاق اڑاتے تھے اور جو ہو سکتا تھا اس سے درگزر نہ کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی ان ہی نیک دل لوگوں میں تھے جو باوجود مسلمان نہ ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر قسم کی مدد فرماتے تھے۔ دسویں سال میں جب ابو طالب کا بھی انتقال ہوگیا تو کافروں کو اور بھی ہر طرح کھلے مہار اسلام سے روکنے اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کا موقع ملا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے طائف تشریف لے گئے کہ وہاں قبیلہ ثقیف کی بڑی جماعت ہے، اگر وہ قبیلہ مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کو ان تکلیفوں سے نجات ملے اور دین کے پھیلنے کی بنیاد

پڑ جائے۔

وہاں پہنچ کر قبیلہ کے تین سرداروں سے، جو بڑے درجے کے سمجھے جاتے تھے، گفتگو فرمائی اور اللہ کے دین کی طرف بلایا اور اللہ کے رسول کی یعنی اپنی مدد کی طرف متوجہ کیا، مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ دین کی بات کو قبول کرتے یا کم سے کم عرب کی مشہور مہمان نوازی کے لحاظ سے ایک نووارد مہمان کی خاطر مدارات کرتے، صاف جواب دے دیا اور نہایت بے رُخی اور بد اخلاقی سے پیش آئے۔ ان لوگوں نے یہ بھی گوارانہ کیا کہ آپ ﷺ یہاں قیام فرمالیں۔ جن لوگوں کو سردار سمجھ کر بات کی تھی کہ وہ شریف ہوں گے اور مہذب گفتگو کریں گے، اُن میں سے ایک شخص بولا کہ اوہو! آپ ہی کو اللہ نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ دوسرا بولا کہ اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور ملتا ہی نہیں تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتے۔ تیسرے نے کہا: میں تجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ اگر تو واقعی نبی ہے جیسا کہ دعویٰ ہے تو تیری بات سے انکار کر دینا مصیبت سے خالی نہیں اور اگر جھوٹ ہے تو میں ایسے شخص سے بات کرنا نہیں چاہتا۔

اس کے بعد ان لوگوں سے ناامید ہو کر حضور اکرم ﷺ نے اور لوگوں سے بات کرنے کا ارادہ فرمایا کہ آپ ﷺ تو ہمت اور استقلال کے پہاڑ تھے، مگر کسی نے بھی قبول نہ کیا، بلکہ بجائے قبول کرنے کے حضور ﷺ سے کہا کہ ہمارے شہر سے فوراً نکل جاؤ اور جہاں تمہاری چاہت کی جگہ ہو وہاں چلے جاؤ۔ حضور اکرم ﷺ جب ان سے بالکل مایوس ہو کر واپس ہونے لگے تو ان لوگوں نے شہر کے لڑکوں کو پیچھے لگا دیا کہ آپ ﷺ کا مذاق اُڑائیں، تالیاں پیٹیں اور پتھر ماریں۔ حتی کہ آپ ﷺ کے دونوں جوتے خون کے جاری ہونے سے رنگین ہو گئے۔ حضور اقدس ﷺ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ جب راستہ میں ایک جگہ ان شریروں سے اطمینان ہوا تو حضور ﷺ نے یہ دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ اِلٰى بَعِيْدٍ يَّتَجَهَّمُنِيْ اَمْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِيْ وَلٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِيْ غَضَبَكَ اَوْ يَحِلَّ عَلَيَّ

سَخُطُكَ لَكَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ۔

(کذافی سیرۃ ابن ہشام قلت واختلفت الروایات فی الفاظ الدعاء کما فی قرۃ العیون)

"اے اللہ ! تجھی سے شکایت کرتا ہوں میں اپنی کمزوری اور بیکسی کی اور لوگوں میں ذلت ورسوائی کی۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی ضعفاء کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے، کسی اجنبی بیگانہ کے جو مجھے دیکھ کر ترش رو ہوتا ہے اور منہ چڑھاتا ہے یا ایسے دشمن کے کہ جس کو تو نے مجھ پر قابو دے دیا۔ اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے، تیری حفاظت مجھے کافی ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کے طفیل جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو گئیں اور جس سے دنیا اور آخرت کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو، تیری ناراضگی کا اس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہو، نہ تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔"

مالک الملک کی شان قہاری کو اس پر جوش آنا ہی تھا کہ حضرت جبرئیلؑ نے آکر سلام کیا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کی وہ گفتگو جو آپ سے ہوئی سنی اور ان کے جوابات سنے، اور ایک فرشتہ کو جس کے متعلق پہاڑوں کی خدمت ہے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ جو چاہیں اس کو حکم دیں۔ اس کے بعد اس فرشتہ نے سلام کیا اور عرض کیا کہ جو ارشاد ہو میں اس کی تعمیل کروں۔ اگر ارشاد ہو تو دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دوں جس سے یہ سب درمیان میں کچل جائیں یا اور جو سزا آپ تجویز فرمائیں۔

حضور ﷺ کی رحیم و کریم ذات نے جواب دیا کہ میں اللہ سے اس کی امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ مسلمان نہیں ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اللہ کی پرستش کریں اور اس کی عبادت کریں۔

ف۔ یہ ہیں اخلاق اس کریم ذات کے جس کے ہم لوگ نام لیوا ہیں کہ ہم ذرا سی تکلیف سے، کسی کی معمولی سی گالی دے دینے سے ایسے بھڑک جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر اس کا بدلہ نہیں اترتا۔ ظلم پر ظلم اس پر کرتے رہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں اپنے محمدی ہونے کا، نبی کے پیرو بننے کا۔ نبی کریم ﷺ اتنی سخت تکلیف اور مشقت اٹھانے کے باوجود نہ بددعا فرماتے ہیں نہ کوئی بدلہ لیتے ہیں۔ (حکایات صحابہ ۹ تا ۱۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم مجھ کو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دیکھتیں جب ہم دونوں غار (ثور) پر چڑھے تھے (تو عجب منظر دیکھتیں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدموں سے خون ٹپک رہا تھا اور میرے دونوں پاؤں (سن ہو کر) پتھرا گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں سے خون ٹپکنے کی وجہ یہ ہے کہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم ننگے پاؤں چلنے کے عادی نہیں تھے (اور اس موقع پر ننگے پاؤں چلنا پڑا تھا)۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱/۳۵۷)

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا اسلام اور مصائب

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی مشہور صحابی ہیں جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ مؤذن رہے۔ شروع میں ایک کافر کے غلام تھے۔ اسلام لے آئے جس کی وجہ سے طرح طرح کی تکلیفیں دیے جاتے تھے۔ امیۃ بن خلف جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، اُن کو سخت گرمی میں دوپہر کے وقت تپتی ہوئی ریت پر سیدھا لٹا کر ان کے سینہ پر پتھر کی بڑی چٹان رکھ دیتا تھا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں اور کہتا تھا کہ یا اس حال میں مر جائیں اور زندگی چاہیں تو اسلام سے ہٹ جائیں مگر وہ اس حالت میں بھی اَحد اَحد کہتے تھے یعنی معبود ایک ہی ہے۔ رات کو زنجیروں میں باندھ کر کوڑے لگائے جاتے اور اگلے دن ان زخموں کو گرم زمین پر ڈال کر اور زیادہ زخمی کیا جاتا تاکہ بے قرار ہو کر اسلام سے پھر جائیں یا تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ عذاب دینے والے اُکتا جاتے، کبھی ابو جہل کا نمبر آتا کبھی امیۃ بن خلف کا، کبھی اوروں کا، اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا کہ تکلیف دینے میں زور ختم کر دے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں دیکھا تو اُن کو خرید کر آزاد فرمایا۔

ف: چونکہ عرب کے بُت پرست اپنے بتوں کو بھی معبود کہتے تھے اس لیے ان کے مقابلے میں اسلام کی تعلیم توحید کی تھی جس کی وجہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان پر ایک ہی ایک کا ورد تھا۔ یہ تعلق اور عشق کی بات ہے۔ ہم جھوٹی محبتوں میں دیکھتے ہیں کہ جس سے محبت ہو جاتی ہے اس کا نام لینے میں لُطف آتا ہے، بے فائدہ اس کو رٹا جاتا ہے تو اللہ کی محبت کا کیا کہنا جو دین اور دنیا میں دونوں جگہ کام آنے والی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہر طرح سے ستایا جاتا تھا، سخت سے سخت تکلیفیں پہنچائیں جاتی تھیں، مکہ کے لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ وہ اُن کو گلی کوچوں میں چکر دیتے پھریں اور یہ تھے کہ ”ایک

ہی ایک'' کی رٹ لگاتے تھے۔اسی کا یہ صلہ ملا کہ پھر حضور ﷺ کے دربار میں مؤذن بنے اور سفر و حضر میں ہمیشہ اذان کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد مدینہ طیبہ میں رہنا اور حضور ﷺ کی جگہ کو خالی دیکھنا مشکل ہو گیا اس لیے ارادہ کیا کہ اپنی زندگی کے جتنے دن ہیں جہاد میں گزار دوں، اس لیے جہاد میں شرکت کی نیت سے چل دیے۔ ایک عرصہ تک مدینہ منورہ لوٹ کر نہیں آئے۔ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی، حضور ﷺ نے فرمایا: بلال رضی اللہ عنہ !یہ کیا ظلم ہے، ہمارے پاس کبھی نہیں آتے تو آنکھ کھلنے پر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے اذان کی فرمائش کی۔لاڈلوں کی درخواست ایسی نہیں تھی کہ انکار کی گنجائش ہوتی۔اذان کہنا شروع کی اور مدینہ میں حضور ﷺ کے زمانے کی اذان کانوں میں پڑ کر کہرام مچ گیا۔عورتیں تک روتی ہوئی گھروں سے نکل پڑیں۔چند روز قیام کے بعد واپس ہوئے اور ۲۰ ھ کے قریب دمشق میں وصال ہوا۔ (حکایات صحابہ ۱۳ تا ۲۴)

حضرت خباب رضی اللہ عنہ بن الارت کی تکلیفیں

حضرت خباب رضی اللہ عنہ بن الارت بھی انہی مبارک ہستیوں میں ہیں جنہوں نے امتحان کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تھا اور اللہ کے راستہ میں سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں۔شروع ہی میں پانچ چھ آدمیوں کے بعد مسلمان ہو گئے تھے، اس لیے بہت زمانہ تک تکلیفیں اٹھائیں۔لوہے کی زرہ پہنا کر ان کو دھوپ میں ڈال دیا جاتا، جس سے گرمی اور تپش کی وجہ سے پسینوں پر پسینے بہتے رہتے تھے۔اکثر اوقات بالکل سیدھا گرم ریت پر لٹا دیا جاتا جس کی وجہ سے کمر کا گوشت تک گل کر گر گیا تھا۔یہ ایک عورت کے غلام تھے، اس کو خبر پہنچی کہ یہ حضور اقدس ﷺ سے ملتے ہیں تو اس کی سزا میں لوہے کو گرم کر کے ان کے سر کو اس سے داغ دیتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرصہ کے بعد اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے ان تکالیف کی تفصیل پوچھی جو ان کو پہنچائی گئیں۔انہوں نے عرض کیا کہ میری کمر دیکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمر دیکھ کر فرمایا کہ ایسی کمر تو کسی کی دیکھی ہی نہیں۔انہوں نے عرض کیا کہ مجھے آگ کے انگاروں پر ڈال کر گھسیٹا گیا، میری کمر کی چربی اور خون سے وہ آگ بجھی۔ان حالات کے باوجود جب اسلام کو ترقی

ہوئی اور فتوحات کا دروازہ کھلا تو اس پر رویا کرتے تھے کہ خدانخواستہ ہماری تکالیف کا بدلہ کہیں دنیا ہی میں تو نہیں مل گیا۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف عادت بہت ہی لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ رغبت وڈر کی نماز تھی، میں نے اس میں اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کی تھیں، دوان میں سے قبول ہوئیں اور ایک کو انکار فرمادیا۔ میں نے یہ دعا کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے، یہ قبول ہوگئی۔ دوسری یہ دعا کی کہ ان پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے، یہ بھی قبول ہوگئی۔ تیسری یہ دعا کی کہ ان میں آپس میں لڑائی نہ ہو، یہ بات منظور نہیں ہوئی۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا انتقال ۳۷ ھ میں ہوا اور کوفہ میں سب سے پہلے صحابی یہی دفن ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا گزر ان کی قبر پر ہوا تو ارشاد فرمایا: اللہ خباب رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ اپنی رغبت سے مسلمان ہوا اور خوشی سے ہجرت کی اور جہاد میں زندگی گزار دی اور مصیبتیں برداشت کیں۔ مبارک ہے وہ شخص جو قیامت کو یاد رکھے اور حساب کتاب کی تیاری کرے اور گزارے کے قابل مال پر قناعت کرے اور اپنے مولیٰ کو راضی کرے۔

ف: حقیقت میں مولیٰ کو راضی کرلینا انہی لوگوں کا حصہ تھا کہ ان کی زندگی کا ہر کام مولیٰ ہی کی رضا کے واسطے تھا۔ (حکایات صحابہ ۱۶ تا ۱۷)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے بڑے ناز کے پلے ہوئے اور مالدار لڑکوں میں تھے۔ ان کے باپ ان کے لیے دو دو سو درہم کا جوڑا خرید کر پہناتے تھے۔ نو عمر تھے، بہت زیادہ ناز و نعم میں پرورش پاتے تھے۔ اسلام کے شروع ہی زمانے میں گھر والوں سے چھپ کر مسلمان ہوگئے اور اسی حالت میں رہتے، کسی نے ان کے گھر والوں کو خبر کر دی، انہوں نے ان کو باندھ کر قید کر دیا۔ کچھ روز اسی حالت میں گزرے اور جب موقع ملا تو چھپ کر بھاگ گئے اور جو لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے ان کے ساتھ ہجرت کر کے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آکر مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی اور زہد و فقر کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ایسی تنگی کی حالت تھی کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے، حضرت مصعب رضی اللہ عنہ سامنے سے گزرے، ان کے پاس صرف ایک چادر تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور ایک جگہ بجائے کپڑے کے چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ ان کی اس حالت اور اس پہلی حالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضور ﷺ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ غزوۂ احد میں مہاجرین کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا، جب مسلمان نہایت پریشانی کی حالت میں منتشر ہو رہے تھے تو یہ جمے ہوئے کھڑے تھے۔ ایک کافر ان کے قریب آیا اور تلوار سے ہاتھ کاٹ دیا کہ جھنڈا گر جائے اور مسلمانوں کو گویا کھلی شکست ہو جائے۔ انہوں نے فوراً دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کو بھی کاٹ ڈالا۔ انہوں نے دونوں بازوؤں کو جوڑ کر سینے سے جھنڈے کو چمٹا لیا کہ گرے نہیں۔ اس نے اُن کے تیر مارا جس سے شہید ہو گئے، مگر زندگی میں جھنڈے کو نہ گرنے دیا۔ اس کے بعد جھنڈا گرا جس کو فوراً دوسرے شخص نے اُٹھا لیا۔ جب ان کو دفن کرنے کی نوبت آئی تو صرف ایک چادر ان کے پاس تھی جو پورے بدن پر نہیں آتی تھی۔ اگر سر کی طرف ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کی طرف کی جاتی تو سر کھل جاتا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چادر کو سر کی جانب کر دیا جائے اور پاؤں پر اذخر کے پتے ڈال دیے جائیں۔

ف: یہ آخری زندگی ہے اس نازک اور نازوں میں پلے ہوئے کی جو دو سو درہم کا جوڑا پہنتا تھا کہ آج اس کو کفن کی ایک چادر بھی پوری نہیں ملتی اور اس پر ہمت یہ کہ زندگی میں جھنڈا نہ گرنے دیا، دونوں ہاتھ کٹ گئے مگر پھر بھی اس کو نہ چھوڑا۔ بڑے نازوں کے پلے ہوئے تھے مگر ایمان ان لوگوں کے دلوں میں کچھ اس طرح سے جمتا تھا کہ پھر وہ اپنے سوا کسی چیز کا بھی نہ چھوڑتا تھا۔ روپیہ پیسہ، راحت و آرام غرض ہر قسم کی چیزوں سے ہٹا کر اپنے میں لگا لیتا تھا۔ (حکایات صحابہ: ص ۷۷ تا ص ۷۸)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا مشقّتیں برداشت کرنا

حضرت محمد بن ابراہیم تیمی کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کو ان کے چچا حکم بن ابو العاص بن اُمیہ نے پکڑ کر رسی میں مضبوطی سے باندھ دیا اور کہا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ کر ایک نئے دین کو اختیار کرتے ہو؟ اور اللہ کی قسم! جب تک تم اس دین کو نہیں چھوڑو گے میں اس وقت تک تمہیں بالکل نہیں کھولوں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں اس دین

کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ جب حکم نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دین پر بڑے پکّے ہیں تو ان کو چھوڑ دیا۔ (حیاۃ الصحابہ، جلد اول: ص ۳۶۸)

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا سختیاں برداشت کرنا

حضرت ابوالاسود کہتے ہیں کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ آٹھ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے ہجرت کی۔ ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ دیتے اور ان کو آگ کی دھونی دیتے اور کہتے: کفر کی طرف لوٹ آؤ۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے: میں کبھی کافر نہ ہوں گا۔

حضرت حفص بن خالد کہتے ہیں کہ موصل سے ایک بڑی عمر کے بزرگ ہمارے پاس آئے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ میں ایک سفر میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ ایک چٹیل میدان میں ان کو نہانے کی ضرورت پیش آگئی جہاں نہ پانی تھا نہ گھاس اور نہ کوئی انسان۔ انہوں نے کہا: (میرے نہانے کے لیے) ذرا پردے کا انتظام کردو۔ میں نے ان کے لیے پردے کا انتظام کیا۔ (نہانے کے دوران) اچانک میری نگاہ ان کے جسم پر پڑ گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے سارے جسم پر تلوار کے زخموں کے نشان ہیں۔ میں نے ان سے کہا: میں نے آپ کے جسم پر اتنے زخموں کے نشانات دیکھے ہیں کہ اتنے میں نے کسی کے جسم پر نہیں دیکھے ہیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم نے دیکھ لیا؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ان میں سے ہر زخم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں لگا ہے اور اللہ کے راستہ میں لگا ہے۔ حضرت علی بن زید کہتے ہیں کہ جس آدمی نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اس نے مجھے بتایا کہ ان کے سینے پر آنکھ کی طرح نیزے اور تیر کے زخموں کے نشان تھے۔ (حیاۃ الصحابہ، جلد اول: ص ۳۷۰ تا ۳۷۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی بھوک

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سخت دھوپ میں دوپہر کے وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی وہ بھی اپنے گھر سے تشریف لائے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس وقت کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے فرمایا کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اسی بے چینی نے مجھے بھی مجبور کیا۔

یہ دونوں اسی حال میں تھے کہ حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنے دولت کدہ سے تشریف لائے اور ان سے دریافت کیا کہ تم اس وقت کہاں آئے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اسی مجبوری سے میں بھی آیا ہوں۔ یہ تینوں حضرات اٹھ کر حضرت ابو ایوب انصاری رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہ خود تو موجود نہیں تھے ان کی اہلیہ نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دریافت کیا کہ ابو ایوب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہ کہاں ہیں؟ بیوی نے عرض کیا کہ حضور ابھی آتے ہیں ۔اتنے میں ابو ایوب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہ آگئے اور جلدی سے کھجور کا ایک خوشہ توڑ کر لائے۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: سارا خوشہ کیوں توڑ لیا اس میں سے پکی پکی کیوں نہ چھانٹ لیں۔ انہوں نے عرض کیا: حضرت! اس خیال سے توڑ لیا کہ پکی اور ادھ پکی اور خشک وتر ہر قسم کی سامنے ہو جائیں جس کی رغبت ہو۔ ان حضرات نے ہر قسم کی کھجوریں اس خوشہ میں سے نوش فرمائیں۔

اتنی دیر میں حضرت ابو ایوب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہ نے بکری کا بچہ ذبح کر کے جلدی سے کچھ حصہ آگ پر بھونا، کچھ ہانڈی میں پکایا اور ان حضرات کے سامنے لا کر رکھا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ذرا سا گوشت ایک روٹی میں لپیٹ کر ابو ایوب کو دیا کہ یہ فاطمہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا کو دے آؤ۔ اس نے بھی کئی دن سے ایسی کوئی چیز نہیں کھائی۔ وہ جلدی سے دے آئے۔

ان حضرات نے گوشت، روٹی کھایا۔ اس کے بعد حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: (اللہ کی اتنی نعمتیں کھائیں) گوشت اور روٹی اور کچی کھجوریں، پکی کھجوریں، یہ فرماتے ہوئے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ارشاد فرمایا کہ یہی وہ نعمتیں ہیں جن سے قیامت میں سوال ہو گا۔ صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم کو یہ سن کر بڑا شاق ہوا (کہ ایسی سخت بھوک کی حالت میں یہ چیزیں بھی باز پرس کے قابل ہیں)۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: بے شک ہیں، اور اس کی تلافی یہ ہے کہ جب شروع کرو تو بسم اللہ کے ساتھ شروع کرو اور جب ختم کرو تو یہ دعا پڑھو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هُوَ اَشْبَعَنَا وَاَنْعَمَ عَلَیْنَا وَاَفْضَلَ یعنی تمام تعریفیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں کہ اسی نے ہم کو (محض اپنے فضل سے) پیٹ بھر کر عطا کیا اور ہم پر انعام فرمایا اور بہت زیادہ عطا کیا۔ (فضائل صدقات: ۳۹۳/۲ تا ۳۹۴)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی بھوک

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں ہم لوگوں نے بڑی تنگی سے اور بڑی تکلیفوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ جب تکلیفیں آنے لگیں تو ہم نے ان پر صبر کیا اور ہمیں تنگی اور تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی اور ہم نے خوشی خوشی ان پر صبر کیا۔ میں نے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں اس حال میں دیکھا ہے کہ میں ایک رات پیشاب کرنے نکلا، جہاں میں پیشاب کر رہا تھا وہاں سے میں نے کسی چیز کی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سنی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ اونٹ کی کھال کا ایک ٹکڑا تھا جسے میں نے اُٹھا لیا، پھر اسے دھو کر جلایا، پھر اسے دو پتھروں کے درمیان رکھ کر پیس کر سفوف سا بنا لیا، پھر اسے پھانک کر میں نے پانی پی لیا اور میں نے تین دن اسی پر گزارے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عربوں میں سب سے پہلے میں نے اللہ کے راستے میں تیر چلایا ہے۔ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں جایا کرتے تھے۔ ہمارا کھانا صرف ببول اور کیکر کے پتے ہوا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ بکریوں کی طرح مینگنیاں کیا کرتے تھے جو علیحدہ علیحدہ ہوتیں، (خشک ہونے کی وجہ سے) ان میں چپکاہٹ نہ ہوتی۔ (حیاۃ الصحابہ، جلد اول: ص ۴۰۴ تا ۴۰۵)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کا کھانا کھلانا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ خندق کھود رہے تھے کہ اتنے میں ایک سخت چٹان ظاہر ہوئی (جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے ٹوٹ نہ سکی)۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ خندق میں ایک سخت چٹان ظاہر ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں خود اترتا ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ مبارک پر (بھوک کی وجہ سے) پتھر بندھا ہوا تھا کیونکہ تین دن سے ہم لوگوں نے کوئی چیز نہیں چکھی تھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کُدال لے کر اس زور سے اس چٹان پر ماری کہ وہ ریت کے ڈھیر کی طرح ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے گھر جانے کی اجازت دیں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی)۔

میں نے گھر جا کر اپنی بیوی سے کہا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید بھوک کی ایسی حالت دیکھی ہے کہ جس کے بعد میں رہ نہیں سکا، کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ اس نے کہا: کچھ جَو اور بکری کا ایک بچہ

ہے۔ میں نے بکری کا وہ بچہ ذبح کیا اور اس کا گوشت تیار کیا، اس نے جو پیس کر اس کا آٹا گوندھا، پھر ہم نے گوشت ہانڈی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ اتنے میں آٹا بھی خمیر ہو کر روٹی پکنے کے قابل ہو گیا اور ہانڈی بھی چولہے پر پکنے والی ہو گئی۔ پھر میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں جا کر عرض کیا: میں نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا ہے یارسول اللہ ! آپ تشریف لے چلیں اور ایک دو اور آدمی بھی ساتھ ہو جائیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا: کھانا کتنا ہے؟ میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ نے فرمایا: بڑا عمدہ کھانا ہے اور بہت زیادہ ہے اور اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آجاؤں نہ وہ ہانڈی چولہے سے اتارے اور نہ روٹی تنور سے نکالے۔ پھر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: اُٹھو (کھانے کے لیے چلو)، چنانچہ مہاجرین اور انصار کھڑے ہو کر حضور ﷺ کے ساتھ چل پڑے۔

میں جب گھر پہنچا تو میں نے بیوی سے کہا: تیرا بھلا ہو، حضور ﷺ اپنے ساتھ مہاجرین و انصار اور دوسرے حضرات کو لے کر تشریف لا رہے ہیں۔ میری بیوی نے کہا: کیا تم سے حضور ﷺ نے پوچھا تھا (کہ کھانا کتنا ہے؟)۔ میں نے کہا: ہاں (پھر حضور ﷺ سب کو لا رہے ہیں تو اب وہی سب کے کھانے کا انتظام کریں گے۔ جب حضور ﷺ ان کے گھر پہنچ گئے تو صحابہ سے) حضور ﷺ نے فرمایا: اندر آجاؤ اور بھیڑ نہ کرو اور حضور ﷺ روٹی کے ٹکڑے کر کے اس پر گوشت رکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیتے جاتے۔ حضور ﷺ جب ہانڈی سے گوشت اور تنور سے روٹی لیتے تو انہیں ڈھانک دیتے۔ اسی طرح آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو گوشت ہانڈی سے نکال کر اور روٹی توڑ توڑ کر دیتے رہے، یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے اور کھانا پھر بھی بچ گیا اور (میری بیوی سے) حضور ﷺ نے فرمایا: اب تم بھی کھالو اور دوسروں کے گھروں میں بھی بھیج دو، کیونکہ تمام لوگوں کو بھوک لگی ہوئی ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث اس سے زیادہ مکمل طور پر نقل کی ہے۔ اس میں مضمون اس طرح ہے کہ جب حضور ﷺ کو کھانے کی مقدار کا علم ہوا تو تمام مسلمانوں کو کہا: اُٹھو اور جابر کے ہاں چلو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ اعلان سن کر اللہ ہی جانتا ہے کہ مجھے کتنی شرم آئی اور میں نے دل میں کہا کہ میں نے تو صرف ایک صاع جَو اور ایک بکری کے بچے سے کھانے کا انتظام کیا ہے اور حضور ﷺ ہمارے ہاں اتنی ساری مخلوق کو لے کر آرہے ہیں۔ پھر میں نے گھر

جا کر بیوی سے کہا: آج تو تم رسوا ہو گئی ہو کیونکہ حضور ﷺ تمام خندق والوں کو لے کر آ رہے ہیں۔ میری بیوی نے کہا: تم سے حضور ﷺ نے پوچھا تھا کہ کھانا کتنا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ میری بیوی نے کہا: اب تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانیں (ہمیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں)۔ بیوی کی اس بات سے میری بڑی پریشانی دور ہو گئی۔ پھر حضور ﷺ گھر تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے فرمایا: تم کام کرتی رہو اور گوشت میرے حوالے کر دو۔ حضور ﷺ روٹی کا ثرید بنا کر اس پر گوشت ڈالتے جاتے اور اسے بھی ڈھانک دیتے اور اسے بھی (یعنی روٹیوں اور گوشت دونوں کو ڈھانک دیتے)۔ آپ ﷺ اسی طرح لوگوں کے سامنے رکھتے رہے یہاں تک کہ تمام حضرات سیر ہو گئے اور تنور اور ہانڈی اب بھی پورے بھرے ہوئے تھے۔ پھر حضور ﷺ نے میری بیوی سے فرمایا کہ اب تم خود بھی کھاؤ اور دوسرے گھروں میں بھی بھیجو۔ چنانچہ وہ خود بھی کھاتی رہی اور سارا دن گھروں میں بھیجتی رہی۔

ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو اور زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے اور اس کے آخر میں یہ ہے کہ راوی کہتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا کہ کھانا کھانے والوں کی تعداد آٹھ سو تھی یا فرمایا کہ تین سو تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ خندق کی طرف تشریف لے گئے تو مہاجرین اور انصار صبح صبح سخت سردی میں خندق کھود رہے تھے اور ان کے پاس غلام نہیں تھے جو ان کو یہ کام کر دیتے، حضور ﷺ نے ان کی تھکن اور بھوک کو دیکھ کر فرمایا:

اللھم ان عیش عیش الاخرۃ　　فاغفر الانصار والمھاجرہ

”اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، لہٰذا آپ انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما دیں۔“

صحابہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجهاد ما بقینا ابدا

”ہم نے محمد ﷺ سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ جب تک دنیا میں رہیں گے جہاد کرتے رہیں گے۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار مدینہ کے ارد گرد خندق کھود رہے تھے اور اپنی کمر پر مٹی اُٹھا کر باہر لا رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الاسلام ما بقینا ابدا

ترجمہ: ہم لوگوں نے محمد ﷺ سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ جب تک دنیا میں رہیں گے اسلام پر چلتے رہیں گے۔ حضور ﷺ ان کے جواب میں یہ فرماتے تھے:

اللّٰھُمَّ اِنَّہ لَاخَیرَ اِلَّا خَیرَ الاٰخِرَہ فَبَارِکْ فِی الانصارِ وَالمھاجرہ

اے اللہ! اصل بھلائی تو آخرت کی بھلائی ہے اس لیے انصار اور مہاجرین میں برکت عطا فرما

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو مٹھی جَو اس پگھلی ہوئی چربی میں ان حضرات کے لیے تیار کیے جاتے جس کا ذائقہ بدلا ہوا ہوتا اور پھر ان کے سامنے رکھ دیے جاتے اور یہ حضرات بھوکے ہوتے (اس لیے کھا جاتے) حالانکہ یہ کھانا بدمزہ، حلق میں اٹکنے والا اور کچھ بدبودار ہوتا۔

(حیاۃ الصحابہ: ۴۱۴/۱ تا ۴۱۵)

سریۃ العنبر میں فقر کی حالت

نبی اکرم ﷺ نے رجب ۸ھ میں سمندر کے کنارے ایک لشکر تین سو آدمیوں کا، جن پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر بنائے گئے تھے، بھیجا۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک تھیلی میں کھجوروں کا توشہ بھی ان کو دیا۔ پندرہ روز ان حضرات کا وہاں قیام رہا اور توشہ ختم ہوگیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے، جو اس قافلہ میں تھے، مدینہ منورہ میں قیمت ادا کرنے کے وعدہ پر قافلہ والوں سے اونٹ خرید کر ذبح کرنا شروع کیے اور تین اونٹ روزانہ ذبح کرتے مگر تیسرے دن امیر قافلہ نے اس خیال سے کہ سواریاں ختم ہوگئیں تو واپسی بھی مشکل ہو جائے گی ذبح کی ممانعت کی اور سب لوگوں کے پاس اپنی اپنی جو کچھ کھجوریں موجود تھیں جمع کر کے ایک تھیلی میں رکھ لیں اور ایک ایک کھجور روزانہ تقسیم فرمادیا کرتے جس کو چوس کر یہ حضرات پانی پی لیتے اور رات تک کے لیے یہی کھانا تھا۔

کہنے کو مختصر سی بات ہے مگر لڑائی کے موقع پر جب کہ قوت اور طاقت کی بھی ضرورت ہو، ایک کھجور پر دن بھر گزار دینا دل وجگر کی بات ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جب یہ قصہ لوگوں کو حضور ﷺ کے بعد سنایا تو ایک شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت ایک کھجور کیا کام دیتی ہوگی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی قدر جب معلوم ہوئی جب وہ بھی نہ رہی کہ اب بجز فاقہ کے کچھ نہ تھا۔ درخت کے خشک پتے جھاڑتے اور پانی میں بھگو کر کھالیتے۔ مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے اور ہر تنگی کے بعد اللہ تعالیٰ جل

شانہ کے یہاں سے سہولت ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان تکالیف اور مشقتوں کے بعد سمندر میں سے ایک مچھلی ان لوگوں کو پہنچائی جس کو عنبر کہتے ہیں، اتنی بڑی کہ اٹھارہ روز تک یہ حضرات اس میں سے کھاتے رہے اور مدینہ منورہ پہنچنے تک اس کا گوشت توشوں میں ساتھ تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے جب سفر کا مفصل قصہ سنایا گیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کا ایک رزق تھا جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔

ف: مشقتیں اور تکالیف اس دنیا میں ضروری ہیں اور اللہ والوں کو خاص طور پر پیش آتی ہیں، اسی وجہ سے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ مشقت میں رکھا جاتا ہے۔ پھر جو سب سے افضل ہوں پھر ان کے بعد جو بقیہ میں افضل ہوں۔ آدمی کی آزمائش اس کی دینی حیثیت کے موافق ہوتی ہے اور ہر مشقت کے بعد اللہ کی طرف سے اس کے لطف و فضل سے سہولت بھی عطا ہوتی ہے۔ یہ بھی غور کیا کریں کہ ہمارے بڑوں پر کیا کیا گزر چکا اور یہ سب دین ہی کی خاطر تھا۔ اس دین کے پھیلانے میں، جس کو آج ہم اپنے ہاتھوں سے کھو رہے ہیں، ان حضرات نے فاقے کیے، پتے چابے، اپنے خون بہائے اور اس کو پھیلایا جس کو ہم آج باقی بھی نہیں رکھ سکتے۔ (حکایاتِ صحابہ:۴۹تا۵۰)

......☆......☆......☆......

شکر کا بیان

اخلاقِ حسنہ میں سے شکر بہترین خلق ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو مقصود بالذّات ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو محفوظ کر لیتا ہے اور مزید نعمتوں اور انعامات کے دروازے اپنے اوپر کھول لیتا ہے۔ یہی ایمان کی بنیادی صفت ہے اور اس سے گوناگوں اچھے اخلاق کی شاخیں نکلتی ہیں۔

شکر کسے کہتے ہیں؟

شکر اظہارِ نعمت، اعترافِ نعمت اور احسان مندی کو کہتے ہیں۔

اعترافِ نعمت اور احسان مندی صحیح طور پر تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دل، زبان اور عمل سے احسان کرنے والے کی قدر کی جائے یعنی :

۱۔ دل میں محسن کے لیے محبت اور قدر شناسی کا جذبہ ہو۔

۲۔ زبان سے احسان کرنے والے کے احسان کا اعتراف اور اس کی مدح و تعریف ہو۔

۳۔ اپنے عمل سے احسان مندی کا ثبوت ہو۔

مثلاً: کسی شخص نے آپ کے ساتھ کوئی احسان کیا تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ اس شخص کی دل سے قدر کریں، زبان سے اس کا اعتراف کریں کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ احسان کیا ہے یا اُس شخص کی تعریف کریں اور اپنے عمل سے اس کا ثبوت بھی دیں، مثلاً اس احسان کے بدلے اس کی کوئی خدمت یا کوئی مالی امداد یا کم از کم بوقت ضرورت اپنی طاقت کے مطابق اس کی کوئی خدمت کریں یا کسی اور طریقے سے اس کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ برتیں۔

شکر کا وسیع مفہوم

کہا جاتا ہے کہ دینِ اسلام کی تمام تعلیمات پر پختگی سے عمل کرنا شکر کے مفہوم میں داخل ہے۔ یعنی ساری عبادتیں شکر ہیں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے حسن و سلوک اور نیک برتاؤ کرنا شکر ہے، اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ جگہوں میں مثلاً فقیروں، مسکینوں کو دینے اور مخلوقِ الٰہی کی خیر میں

خرچ کرنا مال و دولت کا شکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علم کو دوسرے لوگوں تک کسی ذریعے سے پہنچانا علم کا شکر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی طاقت سے کمزوروں کی مدد و نصرت کرنا طاقت کا شکر ہے۔ غرض دینِ اسلام اور شریعت کی جس قدر تعلیمات ہیں، ان پر پوری طرح عمل کرنا، شریعت میں جن چیزوں کے سوچنے کا حکم و فضیلت یا اجازت ہے اُن کو سوچنا اور جن باتوں اور چیزوں کے پڑھنے، بولنے، دیکھنے اور کرنے کا حکم و فضیلت یا اجازت نہیں ہے اور اُن امور کے سوچنے، بولنے اور کرنے سے روکا گیا ہے ان سے رکنا؛ یہ سب کے سب شکر کے دائرہ میں آتے ہیں۔ یعنی تمام شرعی احکام کی بجا آوری اور منکرات سے بچنا، یہ سب کچھ جذبہ شکر کے نتائج و ثمرات ہیں اور جس شخص میں جس قدر یہ جذبہ بڑھا ہوا ہو گا وہ اسی قدر زیادہ فرمانبردار ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر کیسے ادا کیا جا سکتا ہے؟

ایک بندے کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ محسنِ حقیقی، خالقِ کائنات یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکے، کیونکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں برس رہی ہیں۔ اگر کوئی انسان دل، زبان اور عمل سے شکر ادا کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ پھر اسی قلبی، زبانی اور عملی شکر کے بدلے میں اُسے مزید انعامات ملتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کوئی انسان کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا بدلہ دے سکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ بہت ہی مہربان اور قدر دان ہے اس لیے جس شخص کے دل میں شکر اور قدر دانی کا جذبہ ہو تو اللہ تعالیٰ کو وہ بہت محبوب ہوتا ہے اور جو بندہ کھلی ناشکری نہیں کرتا یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بے جا استعمال نہیں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اختیار کرتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ایسا بندہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شکر گزار بندہ لکھ دیا جاتا ہے۔

شکر کے پانچ اجزاء

اس مختصر تمہید کے بعد اس بات کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے پانچ چیزیں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ دل کا شکر، زبان کا شکر، اعضاء (عمل) کا شکر، بندوں کا شکر، عجز کا اعتراف۔

(۱) دل کا شکر

دل کا شکر یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت پر ایمان ویقین اور یہ احساس ہو کہ مجھے جس قدر نعمتیں ملی ہیں یا ملتی ہیں، یہ سب کچھ منعم و محسنِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، اس میں اس کے ساتھ نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اور جس قدر نعمتیں مجھے ملی ہیں اور ملتی رہتی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں ان کا مستحق ہوں یا مجھ میں کوئی ذاتی کمال ہے، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے ملتی رہتی ہیں۔ اس حقیقت پر یقین اور اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ منعم اور محسنِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا جذبہ بیدار ہو گا اور اس کی محبت و عظمت دل میں پیدا ہو گی۔ یہ یقین اور احساس جس قدر بڑھے گا اسی قدر محبت، عظمت اور وفاداری میں اضافہ ہو گا۔ جس کا دل جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت اور اس کی وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو گا، جس قدر حق سے محبت اور باطل سے بغض رکھے گا، اسی قدر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت رکھے گا اور اسی کے لیے بغض و نفرت رکھے گا۔ یہی قلبی احساس، قدر دانی اور محبت کا جذبہ اصل شکر ہے اور یہ اظہار شکر کی بنیاد ہے۔

اس کے بعد آنے والے جو اَجزا بیان کیے جاتے ہیں وہ سب کے سب اسی جذبہ کے نتائج اور ثمرات ہیں۔

(۲) زبان کا شکر

یعنی جب دل میں صحیح قدر دانی و محبت موجود ہو تو اس جذبہ و احساس کی وجہ سے زبان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اس کی تعریف کرنا اور الحمد للہ کہنا زبان کا شکر ہے۔

(۳) اعضاء اور عمل کا شکر

جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر دانی کا جذبہ اور اللہ کی محبت موجود ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کی ناراضگی کے راستوں میں خرچ نہیں کرے گا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے دماغ سے بجائے حرام کاریوں کے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سوچے گا، آسمان و زمین اور دوسرے مظاہرِ فطرت میں غور و فکر کرے گا اور وہی کچھ سوچے گا جس سے اس کا مالک راضی ہو، زبان سے غیبت

اور جھوٹ کے بجائے قرآن مجید کی تلاوت، ذکر اللہ اور درود شریف (وغیرہ) جیسی اچھی باتوں کا اہتمام کرے گا، آنکھوں سے فحش تصویروں، فحش کتابوں اور بد نظری وغیرہ کے بجائے حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے نشانات دیکھے گا اور کانوں سے غیبت اور گانوں بجانوں کے بجائے سبق آموز باتیں، قرآن مجید، اذان وغیرہ سنے گا۔ اس طرح وہ اللہ کے دیے ہوئے تمام اعضائے بدن سے وہی کام لے گا جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو اور حرام وناجائز امور سے پرہیز کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتوں کو وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی وپسند کے مطابق ٹھیک استعمال کرے گا۔

شکر کے متعلق قرآن مجید کی چند آیتیں

اب زبانی اور عملی شکر کے متعلق بطورِ نمونہ قرآن مجید کی چند آیتوں کو پڑھ لیجیے۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ

"بلکہ (صرف) اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ"۔

(سورۂ زمر: آیت ۶۶)

اس آیت میں شرک سے اجتناب اور پوری بندگی کا حکم دے دیا گیا ہے اور اس کے بعد شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ فرما کر بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کی خالص اور پوری بندگی کرنا اللہ تعالیٰ کے شکر کی ادائیگی ہے۔ اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا "اے آلِ داؤد! (ان نعمتوں کے) شکریہ میں نیک عمل کیا کرو"

(سورۂ سباء: آیت ۱۳)

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞

"اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تاکہ تم شکر کرو"۔ (سورۂ نحل: آیت ۷۸)

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اور اس طرح دوسری آیتوں میں انسان کو عطا کردہ اعضاء اور صلاحیتوں کو بیان کر کے اس کو شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے کہ وہ دل ودماغ سے حقیقت کو سمجھے اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی، عظمت اور اس کی حکمتوں کو سوچے، اپنے خالق کی نعمتوں اور احسانات کا اعتراف کرے

اور اس کی ربوبیت، یکتائی اور کبریائی کو تسلیم کرے اور صحیح فکر و عمل اختیار کرنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی صلاحیتیں دی ہیں جو بذاتِ خود بھی بہت بڑی نعمتیں اور بے انتہا نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام جسمانی اعضاء اور تمام صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا والے کاموں میں لگا کر اللہ تعالیٰ کا قلبی، زبانی اور عملی شکر ادا کرے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی ایک دعا میں کہتے ہیں کہ: رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ یعنی "اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، اور یہ کہ میں ایسے نیک کام کرتا رہوں جو تجھے پسند ہوں"۔

(سورۂ نمل: آیت ۱۹)

اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ نیک عمل کی توفیق بھی مانگی گئی تاکہ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور نعمتوں کی ناقدری کرکے اس کی نافرمانی میں لگا دوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شکر کی ادائیگی صرف زبانی چیز نہیں بلکہ شکر یہ ہے کہ احسان مندی اور قدر دانی کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب عمل بھی ہو۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ شیطان کی بات کو یوں نقل کرتے ہیں: قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۞ یعنی (شیطان نے) کہا: جیسا کہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا، میں بھی ضرور (انسانوں کو سیدھے راستے سے ہٹا کر گمراہ کرنے کے لیے) ان کی تاک میں تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ پھر ان کے پاس ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے آؤں گا اور (ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالوں گا اور بد عملی میں مبتلا کرنے کی کوشش کروں گا جس کی وجہ سے) تُو اکثر (انسانوں کو) ان میں سے شکر گزار نہیں پائے گا (یعنی اکثر تیرے نافرمان ہو جائیں گے)۔

(سورۂ اعراف: آیت ۱۶،۱۷)

یہاں اللہ تعالیٰ کی فرمانبر داری کے لیے ''شکر'' اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبر دار بندے کے لیے لفظِ ''شاکر'' استعمال کیا جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکر کی ادائیگی کے لیے صرف زبانی شکریہ کافی نہیں بلکہ صحیح احسان مندی اور شکریہ ہے کہ انسان کے اندر قدر دانی اور احسان مندی کے دلی جذبات بھی ہوں اور پھر ان کے مطابق و مناسب اس کا قول و عمل بھی ہو۔

(۴) بندوں کا شکریہ ادا کرنا

اگرچہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا حکم اور دینِ اسلام کی تعلیمات میں سے ہے لیکن اس کو علیحدہ اس لیے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت جس مخلوق کے ذریعے مل جائے اس کا شکریہ ادا کرنا یا اس کی قدر دانی کرنا شرک ہے، نہ یہ شرک ہے اور نہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، بلکہ بندوں کا شکریہ ادا کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ جو نعمت اس کے ہاتھ سے مل گئی ہے وہ اس کی کوئی ذاتی ملکیت تھی، بلکہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔جو کوئی کسی کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

جو مخلوق اللہ تعالیٰ کی نعمت کا واسطہ اور اس کے پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے (خواہ اس نعمت کا تعلق دنیوی چیزوں جیسے مال و طعام وغیرہ سے ہو یا دینی امور مثلاً علم و عرفان وغیرہ سے) اس مخلوق اور ذریعہ کا شکر یعنی قدر دانی کرنا مثلاً: کسی نے مالی امداد کی یا کوئی خدمت کی تو اس کا شکریہ ادا کرنا، اس کے ساتھ وفاداری کا رویہ رکھنا وغیرہ۔ اسی طرح استاد کی قدر دانی کرنا، اس کا احترام کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت دینِ اسلام کے پہنچانے کا ذریعہ محمد رسول اللہ ﷺ جو ہمارے اس قدر خیر خواہ اور اس قدر ہم پر مہربان ہیں جس قدر ہم خود اپنی جانوں کے خیر خواہ اور مہربان نہیں، تو ان سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت رکھنا، ان کی تعظیم و احترام کرنا اور ان پر درود شریف بھیجنا وغیرہ ان کے ساتھ وفاداری ہے۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت جس ذریعے سے مل جاتی ہے اس ذریعہ اور مخلوق (اللہ تعالیٰ کے بندوں) کی قدر دانی بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر دانی ہے، کیونکہ اس نعمت پر خوشی کی وجہ سے تو اس ہاتھ اور اس سبب کی قدر دانی کی جاتی ہے جس ہاتھ یا جس راہ سے وہ نعمت مل گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْناً عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا یعنی "اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکید کی ہے (کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے) اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا پھر دو سال اس کے دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو وصیت اور تاکید کی) کہ میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا شکر (قدردانی) کرو، (آخر کار تمہیں) میرے پاس لوٹ کر آنا ہے اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات ہرگز نہ مان"۔

(سورۂ لقمن: آیت ۱۵،۱۴)

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ "جو شخص لوگوں کا شکر بجا نہیں لاتا وہ اللہ تعالیٰ کا (بھی) شکر ادا نہیں کرتا"۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص انسان کے احسانات کا شکریہ ادا نہیں کرتا اور اپنے محسن کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے یا اس کے احسان کو یاد نہیں رکھتا، گویا وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا بھی ناشکرا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کا شکریہ بھی اس سے قبول نہیں کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تابعداری کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ ان انسانوں کا، جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ظاہری واسطہ بنے ہیں، شکریہ ادا کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دینے والے ہاتھ کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور اپنے محسن کے احسان کو یاد نہیں رکھتا، اور نہ اقرار کرتا ہے تو اس شخص کے اندر جذبۂ شکر کا فقدان ہے اور اس میں کفرانِ نعمت اور احسان فراموشی کی عادت موجود ہے۔ اس لیے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکے گا۔

بہرحال قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتوں اور حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جن ذریعوں اور واسطوں سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملتی ہیں ان واسطوں کی قدردانی بھی ضروری ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جس چیز یا جس بندے کے ذریعے جس قدر بڑی نعمت مل جاتی ہے اس قدر اس ذریعے اور بندے کا احسان و شکریہ اور اس کی قدردانی کا حق بھی زیادہ ہو گا، مثلاً سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ ہم

تک دینِ اسلام پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور یہ دینِ اسلام ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کا مثل کوئی ہے نہ ہو سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے زیادہ تعظیم، محبت اور قدر دانی رسول اللہ ﷺ کی ہو گی۔ اس کی پورا بیان محبت الرسول ﷺ کے بیان میں تفصیل سے آئے گی۔

(۵) شکر سے اپنے عجز کا اعتراف

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو سمجھ جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کا جس قدر قلبی، قولی اور عملی شکر ادا کرتا ہوں آخر یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بخشش سے ہو سکتا ہے، تو ہر شکر کے لیے توفیق پر بھی شکر ادا کرنا چاہیے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی تعلیمات پر پوری محنت کے ساتھ عمل کرنے کے بعد بھی یہی کہہ دے کہ اے اللہ! مجھ سے کچھ نہ بن پڑا، یہی عجز کا اعتراف ہی شکر کی ادائیگی ہے اور یہی شکر گزاری اور بندگی ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ یعنی "اے اللہ! میں تیری رضا وخوشنودی کے ساتھ تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری عافیت کے ساتھ تیرے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ میں تیری تعریف نہیں کر سکتا، تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے خود اپنی ذات کی تعریف کی ہے"۔ (مسلم)

مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! یہ میرے بس میں نہیں ہے کہ (کما حقہ) تیری ثناء وصفت اور تعریف بیان کر سکوں، اس لیے اس کے سوا کیا کہوں، بس تو ویسے ہی ہے جیسے تو نے اپنی ذات کی تعریف خود کی ہے، یعنی میری تعریف سے تو بالاتر ہے۔ نیز حضرت داوٗد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں تیرا شکر کیسے ادا کر سکتا ہوں جبکہ (قلبی، قولی اور عملی) شکر (کی توفیق و قدرت جو آپ کی طرف سے مجھے ملتی ہے وہ) بھی تیری بخشی ہوئی نعمت ہے (تو اس پر مستقل شکر واجب)۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ:

اَلْاٰنَ شَكَرْتَنِیْ حِیْنَ علمت ان النعمة مِنِّیْ

اے داوٗد! اب تُو نے شکر ادا کر دیا۔ جبکہ تو نے اس بات کو جان لیا کہ تمام نعمتیں (جن میں نیک

ارادوں، نیکی اور عمل کی توفیق و قدرت بھی شامل ہے) میری طرف سے ہے (اسی حقیقت کو معلوم کرنا، اور اس پر یقین کرنا، اور شکر کی ادائیگی سے عجز کا اعتراف کرنا ہی اللہ تعالیٰ کے شکر کی اصل حقیقت ہے)۔

(ابن کثیر، روح المعانی وغیرہ)

اللہ تعالیٰ کے شاکر اور شکور ہونے کا مطلب

قرآن مجید کئی جگہوں پر شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں شاکر اور شکور کو بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے انتہا قدر دان ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ذرہ برابر نیکی کی بھی پوری قدر کرتا ہے اور نہایت فیاضی کے ساتھ بندوں کو ان کے نیک کاموں کے بدلے ان کی نیکیوں سے زیادہ اجر و ثواب اور انعام دیتا ہے۔ اسی توفیق و قدرت کو اللہ تعالیٰ سے مانگا جاتا ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا سے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وَقَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ " اور (سلیمان نے) کہا: اے میری پروردگار! مجھے اس بات کی توفیق دے دیں کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں۔

(سورۂ نمل: آیت ۱۹)

شکر کی ضد کفر اور کفرانِ نعمت ہے

شکر کی ضد (الٹ) کفر ہے، یا یوں کہیں کہ شکر کے مقابلہ میں کفر یا کفرانِ نعمت (ناشکری) ہے، یعنی نعمت کو چھپانا یا احسان پر پردہ ڈالنا اور اس کا اعتراف نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کا دل سے احسان مند نہ بننا، اور زبان سے ان کا اعتراف نہ کرنا، اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر اور کفران نعمت ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً: آدمی یا تو اللہ تعالیٰ کا احسان ہی نہ مانے اور نعمت کو اپنی قابلیت اور کمال کا نتیجہ یا اپنا خاندانی حق سمجھے، یا اس کو حقیقی طور پر کسی اور کا عطیہ سمجھے، یا کسی اور کو اس میں حصہ دار مان لے، یا منعِمِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی اُمید رکھے یا طلب کرے، یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے خلاف استعمال کرے؛ یہ سب کفرانِ نعمت میں داخل

ہیں۔ یہی کفرانِ نعمت اور ناشکری ہے جو ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کفر و شرک کی صورتوں میں ظاہر ہو جاتی ہے اور انسان کو بالآخر خالص کفر و شرک میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ کی ابدی نعمتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ اب شکر و کفر اور کفرانِ نعمت کے متعلق قرآن مجید سے بطورِ نمونہ صرف دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں کہ قرآن مجید میں شکر کے مقابلہ میں کفر اور کفر کے مقابلہ میں شکر کے لفظ بولے گئے ہیں۔ فَاذْكُرُونِىٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا۟ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ۞ ”یعنی پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا، اور میرا شکر کرو اور میرا کفر (یعنی ناشکری) نہ کرو“۔ (سورۃ البقرہ: آیت ۱۵۲)

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۞

”بے شک ہم نے اس (یعنی انسان) کو راستہ بتا دیا، یا تو وہ شکر گزار ہوا یا کافر (یعنی ناشکرا) ہوا“۔

لفظ کفر اسلام میں بدترین لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت شکر ہو گی۔

شاکر کون؟

مذکورہ بالا بحث سے شکر کے متعلق یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرنے یا الحمد للہ پڑھنے سے شکر کا حق ادا ہو جاتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرے، لیکن اس کے دل میں قدردانی اور احسان مندی کا کوئی جذبہ نہ ہو اور اُس جذبہ کے مطابق اُس کا قول و عمل نہ ہو، تو وہ شخص منعم و محسن حقیقی اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور احسان مندی کے اظہار و اعتراف میں جھوٹا ہے۔ شاکر تو وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اُٹھا لے جائے، وہ اسے اپنا کمال یا غیر اللہ کی عطا نہیں سمجھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور عطا ہی سمجھتا ہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اُس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر مرکوز رہتی ہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں (یہ ظاہر ہے کہ بندے پر ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں ہیں بلکہ اگر کوئی مصیبت بھی پیش آ جاتی ہے اس میں بھی بندے کا فائدہ ہوتا ہے کیونکہ اس پر صبر کرنے سے ثواب ملتا ہے اور اِس سے اُس کے درجات بلند ہوتے ہیں، تو یہ بھی نعمت ہے اور اس کے ساتھ نفس کی اصلاح و تربیت ہوتی ہے اور کبھی اس مصیبت کا کوئی عمدہ بدلہ دنیا میں بھی مل جاتا ہے)۔

ایسے شخص کو ہر حال میں شکر کی توفیق ملتی ہے، وہ ہر حال میں شکر ادا کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سے اس کا دل لبریز ہوتا ہے، مالی و جانی عبادات کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق العباد کو پورا پورا ادا کرتا ہے۔ غرض وہ قلبی، قولی اور عملی شکر کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہوتا ہے۔ پھر اس دلی، زبانی اور عملی شکر گزاری کے باوجود وہ یہی کہتا ہے کہ یا اللہ! میں تیرا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں، کیونکہ وہ اس شکر و عمل کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے۔ چونکہ شکر کی توفیق ملنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا بذاتِ خود ایک نعمت ہے، اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ اب اس نعمت (شکر کی توفیق) کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے، گویا ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے، تو ایسی حالت میں وہ متحیر ہو جاتا ہے کہ ایک بندہ شکر کی ابتدا کیسے کرے اور اس کو انجام کیسے دے، سوائے اس کے کہ وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کرے کہ میں تیرا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں اور میرے بس میں نہیں کہ کما حقہٗ تیری بندگی کروں اور تیری ثنا و صفت بیان کروں۔ اگر وہ اللہ کی راہ میں جان بھی قربان کر دے تو بھی اس کی صدا یہ ہوتی ہے کہ۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شکر کی فضیلت و اہمیت اور ناشکری کی مذمت

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ایک اہم عبادت ہے اور اسی کے مطابق دنیا و آخرت کی نعمتیں ملتی ہیں۔ جو شخص جس قدر شاکر اور قدر دان ہے اور جو اس میں جس قدر بڑھا ہوا ہو گا، اُسی قدر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کے دروازے اس پر کھولتا رہے گا۔ شکر کی اہمیت و فضیلت اور کفر و کفرانِ نعمت کی مذمت اور وعیدوں سے قرآن مجید اور احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

شکر گزاری اور راہِ مستقیم

ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًاؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝ یعنی "بے شک ابراہیم (اپنی شخصیت میں) ایک پوری اُمت تھے، اللہ تعالیٰ کے پورے فرمانبردار تھے، یکسوئی سے حق کی

طرف متوجہ تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ اس کی نعمتوں کے (ہر لمحہ) شکر گزار تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں سیدھی راہ دِکھائی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ شکر گزاری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اختیار کر کے یکسوئی کے ساتھ صرف اور صرف اُسی کی طرف متوجہ ہوا جائے، اور تمام غلط راستوں کو یک لخت چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی تعلیمات پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

اور دلی قدر دانی و احسان مندی ہی وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے انسان پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور رحمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور یہی جذبۂ شکر ہے جو انسان کو سیدھی راہ پر چلانے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کی قوت اس کے اندر پیدا کرتا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی بنیاد ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

شکر میں دنیا و آخرت کی مصیبتوں اور عذاب سے نجات ہے

شکر ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۞ یعنی" اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب و سزا دے کر کیا کرے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ النساء: آیت ۱۴۷)

اس آیتِ کریمہ میں ایمان سے پہلے شکر کو لا کر اس حقیقت کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ شکر ہی سچے ایمان کا سرچشمہ ہے اور آخر میں فرمایا کہ: وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا "اور اللہ تعالیٰ تو بڑا قدر دان اور جاننے والا ہے۔"

اس میں اس اصل عظیم کی طرف اشارہ فرمایا کہ سزا و جزا اور عذاب و ثواب اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ (العیاذ باللہ) کوئی جذباتی ذات ہے کہ جب کسی کی زبانی جمع خرچ سے خوش ہوا تو یوں ہی انعام دیا اور جب جوش انتقام میں آیا تو عذاب دے دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کے لیے قانون بنا رکھا ہے۔ یہ عذاب و ثواب اعمال کا قدرتی خاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نہ عذاب دینے میں کوئی نفع ہے اور نہ ثواب دینے سے اُس کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کی تعلیمات

وہدایت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے، تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے اور وہ بڑا اقدر دان بھی ہے۔ اُس کے شکر، ایمان و عمل اور اُس کی کوششوں کو قبول فرما کر اُس کو بھرپور جزا وثواب دے گا۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی کامیابی اور اطمینان و سکون شکر گزاری میں ہے۔

شاکر شخص مطمئن ہوتا ہے

بلاشبہ جس شخص کے اندر شکر کا جذبہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ دنیا میں بھی اطمینان اور سکون میں رہتا ہے اور یہی جذبہ جنت کا مستحق بننے کے لیے بھی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جس کے اندر جذبۂ شکر کا فقدان ہوتا ہے اُس کو کبھی چین اور اطمینان نہیں ملتا، کیونکہ اس کو جو کچھ ملا ہے اُس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ اُس کو ملا نہیں اُس کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت غیر مطمئن رہتا ہے اور اسی جذبۂ شکر کے فقدان کی وجہ سے وہ دنیا میں بھی بے چین اور بے اطمینان رہتا ہے اور آخرت کی دائمی خوشیوں اور جنت سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے شاکر اور مؤمن بندوں میں شامل فرمائے۔

مؤمن کے لیے ہر حال میں خیر ہی خیر ہے کیونکہ وہ صابر اور شاکر ہوتا ہے

بلاشبہ مؤمن ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے، وہ کسی حال میں گھبراہٹ یا اتراہٹ کا شکار نہیں ہوتا، کیونکہ دنیا میں دکھ و غم بھی ہے اور راحت و خوشی بھی ہے، شادی بھی ہے اور غمی بھی، سردی بھی ہے اور گرمی بھی، خوشگواری بھی اور ناخوشگواری بھی، اور مؤمن اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور اُسی کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا حال یہ ہونا چاہیے کہ جب کوئی تکلیف اور مصیبت پیش آجائے تو وہ مایوسی اور سراسیمگی کے شکار نہ ہوں، بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اس کا استقبال کریں اور سمجھیں کہ یہ سب کچھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی ہم کو اس دکھ اور پریشانی سے نجات دلانے والا ہے۔ اسی طرح جب ان کے حالات اچھے اور سازگار ہوں اور اُن کی پسند کی چیزیں اُن کو مل رہی ہوں اور خوشی و شادمانی کے اسباب میسر ہوں

تو بھی وہ اس کو اپنا کمال اور اپنی طاقت و قوت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اس وقت بھی اپنے دل میں اس یقین کو تازہ رکھیں کہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی عطا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی بخشی ہوئی نعمت چھین سکتا ہے۔ اس لیے ہر نعمت پر اُس کا شکر ادا کریں، یہ اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح سے صبر و شکر کی تعلیم و ترغیب دی ہے۔ اس تعلیم پر عمل کرنے کا ایک ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے وابستہ رہتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا اور رنج و غم کے تسلسل سے بھی اس کی عملی قوتیں ختم نہیں ہو سکتیں، اور نہ وہ راحت اور سازوسامان پر غرور و گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے۔ اِس طرح اُس کا ہر حال خیر ہی خیر بن جاتا ہے اور آخرت کے لیے ذخیرہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے سراسر خیر اور برکت ہے۔ اگر اس کو خوشی اور راحت و آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کیلیے خیر ہی خیر ہے۔ (مسلم، مشکوۃ: باب الصبر)

شکر مزید نعمتوں کے دروازے کھولتا ہے

شکر میں انسان ہی کا نفع اور فائدہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان کے پاس موجود نعمت محفوظ ہو جاتی ہے اور مزید نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۞ یعنی ”اور یاد رکھو! جب تمہارے رب نے (تمہیں اس قانونِ الٰہی سے) خبردار کیا کہ اگر تم نے (میری نعمتوں کا) شکر کیا تو میں اور نوازوں گا، اور اگر تم نے (میری نعمتوں کی ناقدری اور) ناشکری کی تو یقیناً میری سزا بہت سخت ہے۔

(سورۂ ابراہیم: آیت ۷)

ایک حدیث شریف میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ بہترین مال ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل، اور ایمان پر مدد کرنے والی مؤمنہ بیوی ہے۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ ومشکواۃ)

اس میں شک نہیں کہ نعمت کی قدر دانی کی توفیق اللہ کی بہت بڑی نعمت اور توفیق ہے کیونکہ شکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ موجودہ نعمت کو باقی اور محفوظ رکھتا ہے اور اپنی نعمتوں کو بڑھا دیتا ہے اور شکر کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرّب اور اس کے قُرب کا ذریعہ ہے اور اس پر آخرت کی دائمی زندگی میں اجر و ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا خدا کا شکر بندے کے لیے ہی مفید ہے، اللہ تعالیٰ کسی کی شکر گزاری کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۞ یعنی "اور جو کوئی شکر کرتا ہے، اُس کا شکر اُس کے لیے ہی مفید ہے، اور جو کوئی ناشکری کرے تو (اس کی ناشکری اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ) میرا رب تو غنی بھی ہے اور کریم بھی۔ (سورۃ النمل: آیت ۴۰)

یعنی وہ بے نیاز ہے، کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے، نہ کسی کا شکر اُس کی خدائی میں اضافہ کرتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری سے اللہ تعالیٰ کی خدائی میں نقصان آتا ہے لہٰذا شکر کا تمام تر فائدہ بندہ کے لیے ہی ہے اور شکر گذاری کی تاکید جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی ہے وہ صرف اس لیے تاکہ وہ اپنی رحمت اور فضل و کرم سے تم پر مزید اور دائمی انعامات کے دروازے کھول دے۔

اللہ تعالیٰ کی نشانیاں صابرین وشاکرین کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ان لوگوں کے لیے مفید اور سبق آموز ثابت ہوتی ہیں جن میں صبر و شکر کی دونوں صفتیں موجود ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۞ یعنی "کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں، تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ بے شک اس میں (بہت سی) نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو صبر، شکر کرنے والا ہو"۔

(سورۃ لقمٰن: آیت ۳۱)

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں صبر اور شکر دونوں صفات پائی جاتی ہیں، یہی لوگ ہیں جو حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ شرک اور بد اعمالیوں سے اجتناب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور پوری فرمانبرداری اور بندگی پر ہر حال میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ احسان فراموش اور نمک حرام ہیں اور جو لوگ حق پا کر اُس پر جمتے نہیں اور ثابت قدم نہیں رہتے، تو ایسے کمزور اخلاق والے

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اُس کی نشانیوں کو پالیں تو بھی یہ اخلاقی کمزوریاں انہیں اِن سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتیں۔

شرک اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے

ناشکری ایک ایسا مرض ہے جس سے بالآخر کفر و شرک اور نفاق جیسی بربادیوں میں انسان پڑ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ ۝

یعنی "اور ان لوگوں نے اُس (اللہ تعالیٰ) کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جز (اولاد یا صفات میں شریک) بنادیا ہے، بے شک انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے۔ (سورۃ الزخرف: آیت ۱۵)

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے جیل کے ساتھیوں کو دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں: مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝

"ہمیں یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں، یہ ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔ (یوسف: آیت ۳۸)

شرک کی بنیاد ناشکری ہے اور ناشکری کی صفت ہی انسان کو شرک کے اندھیروں میں گم کر دیتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعای کا ارشاد ہے قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ " آپ کہہ دیجیے ! کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے، جبکہ تم اُس کو پکارتے ہو گڑگڑا کر بھی اور چپکے چپکے بھی کہ اگر للہ تعالیٰ نے ہم کو نجات دے دی اس (مصیبت) سے تو ہم (اس کے) شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے۔ آپ کہہ دیجیے: اللہ تعالیٰ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر تکلیف سے، مگر تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ (سورۃ الانعام: آیت ۶۴،۶۳)

اس آیتِ کریمہ میں ظلمات سے مراد مصائب اور آفات ہیں اور خفیہ کے مقابلے میں تضرع کے معنی اظہارِ عاجزی یعنی گڑگڑانے اور آہ وزاری کے ساتھ التجا اور فریاد کرنے کے ہیں۔

انسان کی فطرت میں صرف ایک رب کی شہادت موجود ہے

اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے کے لیے ایک اہم حقیقت کو سامنے رکھیں، وہ یہ کہ انسان کی فطرت میں صرف ایک ہی مالک ورب اللہ تعالیٰ کی شہادت موجود ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا جن چیزوں پر اعتماد کرتا ہے اور جن کو اِلٰہ بناتا ہے اور ان کے سہارے جیتا ہے اُن کی کوئی شہادت اس کی فطرت میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان سخت نازک حالات سے دوچار ہو جاتا ہے اور مجبوری کے آخری نقطے پر پہنچ جاتا ہے تو اس وقت تمام ظاہری اسباب کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور وہ اُن تمام مصنوعی خیالات اور تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے جن کے سہارے وہ جیتا ہے۔ اُس وقت اُس کے سامنے صرف ایک ہی خالق ومالک اللہ تعالیٰ کی قوت اور سہارا ہوتا ہے اور وہ صرف اُسی خدا کو گڑگڑا کر بھی اور چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، جس کی شہادت وہ اپنی فطرت کے اندر پاتا ہے۔ مگر ناشکرے انسان کا حال یہ ہے کہ جب مجبوری کی حالت دور ہو جاتی ہے تو وہ پھر ظاہری اسباب کے چکر میں پھنس جاتا ہے اور خالص اللہ تعالیٰ کے سہارے جینے کے بجائے اپنی ظاہری تدبیر اور اسباب واصنام وغیرہ کے سہارے جینے لگتا ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا حال بھی عجیب ہے کہ جب تم کسی آفت اور مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہو، تب تو تم گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہو اور یہ عہد کرتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس آفت اور مصیبت سے بچالیا تو ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا جواب دلوایا کہ وہی اللہ تو ہے جو تمہیں اس آفت اور مصیبت سے بھی نجات دیتا ہے جس کے لیے تم نے اللہ تعالیٰ کو پکارا ہے اور دوسری تمام آفتوں اور مصیبتوں سے بھی وہی نجات دیتا ہے، خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، اور خواہ تم نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کو پکارا ہو یا نہ پکارا ہو، بہر حال تمہیں مصائب اور آفات سے نجات دینے والا صرف وہی ہے، مگر تمہارا حال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں توحید کی ایک اہم نفسیاتی دلیل بھی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ جب انسان سخت مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اُس وقت اُس کے دوسرے تمام سہارے سراب اور بے حقیقت ثابت ہو جاتے ہیں۔ اس میں دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ شرک

صرف یہ نہیں کہ آدمی بتوں کو پوجے، یا کسی فرشتے و انسان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھے، یا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انسانوں میں سے سرکش قوتوں کی اطاعت کرے، بلکہ یہاں شرک کے مقابلے میں شکر کو لا کر یہ بھی بتا دیا کہ انسان کی خود پرستی اور تکبر و غرور بھی شرک ہے۔ جو شخص ناشکری اور تکبر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنا استحقاق، اپنی ذاتی کوشش کا ثمرہ اور اپنی تدبیر و قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس لیے تو وہ اکڑتا ہے اور فخر کی نفسیات میں مبتلا ہوتا ہے۔ جس شخص کے دماغ میں یہ خناس سما جاتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا کی خدائی میں شریک کرتا ہے۔ اسی خبیث ذہنیت کو سورۂ کہف آیت ۳۲ تا ۳۸ میں کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

اس سے توحید کی حقیقت بھی سامنے آگئی، وہ یہ کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون وہدایت پر سہارا اور بھروسہ کرے، صرف اور صرف اُسی کے سہارے اپنی پوری زندگی بسر کرتا رہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر توحید کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

توحید اور شکر کے پردے میں ناشکری اور شرک

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ شکر ایک جذبہ اور صفت ہے۔ یہ صفت نعمت اور منعِم حقیقی کو پہچاننے سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ الفاظ شکر اور توحید کے ہوتے ہیں مگر انھی الفاظ کے اندر ناشکری اور شرک کے جذبات چھپے ہوئے ہوتے ہیں، مثلاً: کسی شخص کے پاس مال و دولت اور اولاد کی کثرت ہے اور وہ کسی پر اپنی برتری جتانے کے لیے یہ کہتا ہے کہ شکر الحمد اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے کثرتِ مال و اولاد سے نوازا ہے، میں یوں کروں گا اور یوں کروں گا۔ شکر کے ایسے الفاظ حقیقت میں فخر کی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنی خود پرستی اور فخر کی نفسیات کو الفاظِ شکر کے لباس میں چھپاتا ہے۔ اس طرح بعض لوگ دینی کاموں میں لگے رہتے ہیں اور زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارا یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے، لیکن اُن کے یہ دینی کام دنیاوی منصب اور عزت کے حصول کے لیے ہوتے ہیں اور وہ ان کاموں پر لوگوں سے عزت اور داد و دہش حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں، حالانکہ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ عزت و ذلت اور نفع و نقصان کا مالک صرف ایک اللہ رب العالمین ہے وہ نہ فخر میں مبتلا ہوگا اور نہ کسی مخلوق سے خوف و امید کا رشتہ رکھے گا۔ اس کے خوف اور امید

کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں مؤمن اور شاکر بنائے۔

ناشکر گزار اور ناقدرا شیطان کا بھائی ہے

جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کرتا ہے اور اُن کو بے جا خرچ کرتا ہے، وہ شیطان کا بھائی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝ "بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ (سورۂ اسراء: آیت ۲۷)

ناشکرا بندہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں

اللہ تعالیٰ کو ناشکرا بندہ پسند نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ۝ "یقیناً اللہ تعالیٰ کسی دغاباز اور ناشکر گزار کو پسند نہیں کرتا"۔ (سورۃ الحج: آیت ۳۸)

کفر اور ناشکری کی سزا

ہر انسان کو اُس کی ناشکری کے بقدر سزا اور عذاب ملتا ہے۔ کفار، جو سخت درجے کے ناشکرے ہیں، اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ۝ "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ اُن پر قضا آئے گی کہ مر جائیں (اور مرنے کی وجہ سے عذاب سے خلاصی پائیں) اور نہ ہی ان سے ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، اسی طرح ہم ہر ناشکرے کو سزا دیا کرتے ہیں"۔

(سورۂ فاطر: آیت ۳۶)

ناشکری کا علاج

۱۔ شکر کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہر ملنے والی نعمت کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ہی دی ہے، اس نعمت کے عطا کرنے میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ جب تک تم کسی درمیانی سبب اور رابطہ کو دیکھتے ہو اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ نعمت دینے میں اس کا بھی کوئی دخل ہے، اُس وقت تک تمہیں شکر کی پوری کیفیت حاصل نہ ہو گی۔

۲۔ اپنے ظاہر و باطن اور ارد گرد اللہ تعالیٰ کے پھیلے ہوئے انعامات کا تصور کریں۔

۳۔ شکر کے فضائل اور ناشکری کی وعیدوں کو پڑھیں اور سنیں اور ان کو دہرائیں، خصوصاً اس آیتِ کریمہ کو بہت زیادہ سوچیں: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۞ "اور یہ شکر صرف دنیوی خوشحالیوں پر نہیں بلکہ جب کوئی دین کا کام کریں مثلاً نماز وغیرہ پڑھیں تو بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس کی توفیق سے ہوا اور اپنی کمزوریوں پر استغفار کریں۔

(سورۂ ابراہیم: آیت ۷)

۴۔ دنیوی لحاظ سے، یعنی جسم، صحت اور مال و اسباب وغیرہ کے لحاظ سے اپنے سے کم تر لوگوں کو دیکھیں اور دینی لحاظ سے اُن لوگوں کو دیکھیں جو زیادہ دین دار ہیں تو ان شاء اللہ شکر کی کیفیت بھی پیدا ہو گی اور نیک عمل کی توفیق بھی ملتی رہے گی۔

۵۔ تکلف سے فکری، دلی، زبانی اور عملی شکر کا اہتمام شروع کریں، آہستہ آہستہ شکر کی عادت بن جائے گی۔

جس قدر سوچیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے۔ آسمان و زمین کی چیزوں میں غور و فکر کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی بے انتہا نعمتوں کو سوچیں گے اس قدر قلبی شکر میں اضافہ ہو گا، فکر اور دل کا شکر بڑھے گا، اور پھر اس کے مطابق جس قدر زبان سے الحمد للہ کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے ادا کریں گے اس قدر زبان کا شکر بڑھے گا، اور جس قدر اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے، نیکیوں کا اہتمام کریں گے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے مسکینوں اور محتاجوں وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال و دولت کو خرچ کریں گے، اپنی قوت اور طاقت کو کمزوروں کی امداد میں صرف کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے شکر میں جس قدر اس کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک میں بڑھیں گے اس قدر عملی شکر میں اضافہ ہو گا۔ اس بات پر یقین رکھیں کہ یہی شکر ہے جس کے مطابق انسان کو جنت کے انعامات ملیں گے اور اسی کے بقدر وہاں ہر آن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہو گا۔

۶۔ نعمت خواہ چھوٹی ہو یا زیادہ، مثلاً کانٹا چبھا، اُس کو نکالا، یا بجلی چلی گئی، پھر دوبارہ آگئی، اس پر جو بھی خوشی و راحت حاصل ہو جائے دلی شکر گزار رہیں اور زبان سے الحمد للہ کہیں۔

شکر کا خلاصہ

نعمت کے اظہار اور اعتراف کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ دل میں تصور کریں کہ میرے اللہ نے مجھ پر نوازش فرمائی ہے تو میں دل سے اُس منعِم حقیقی کا احسان مند ہوں۔

۲۔ زبان سے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر کریں، الحمد الله کہیں۔

۳۔ اعضاء سے شکر کریں، یعنی جب اللہ تعالیٰ انعام واکرام فرمائے تو اُس کی عبادت اور اطاعت میں اورزیادہ مشغول ہو جائیں اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضیات صرف شریعتِ مطہرہ میں معلوم کی جاسکتی ہیں۔

۴۔ جو مخلوق اللہ تعالیٰ کی نعمت کا واسطہ بن جائے (خواہ اس نعمت کا تعلق دنیوی چیزوں سے ہو جیسے مال وطعام وغیرہ یا دینی امور سے ہو جیسے علم و عرفان وغیرہ) اس کی قدر دانی کریں اور اس کا شکریہ ادا کریں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

جس نے لوگوں کی ناشکری کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ واسطے کی قدر دانی، احترام اور بطورِ واسطہ اس کی احسان مندی تو ضروری ہے لیکن نعمت کسی مخلوق کی طرف منسوب نہ کریں اور نہ کسی نعمت میں کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا حصہ دار بنائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو پوری طرح دوسروں سے منسوب کرنا یا ان میں کسی غیر کو حصہ دار بنانا دراصل اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا ہے۔

شکر کے واقعات

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا شکر

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ایک دن (مسجد سے باہر نکلے اور اپنے بالاخانے کی طرف تشریف لے گئے، پھر اندر جاکر قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدے میں گر گئے اور اتنا لمبا سجدہ کیا کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے سجدے میں ہی آپ ﷺ کی روح قبض کر لی ہے۔ میں آپ ﷺ کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ پھر آپ ﷺ نے سجدے سے سر اُٹھایا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ میں نے کہا: عبد الرحمن (رضی اللہ عنہ)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوا؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اتنا لمبا سجدہ کیا کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے سجدے میں ہی آپ ﷺ کی روح قبض کر لی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے یہ بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جو آپ ﷺ پر درود بھیجے گا میں اس پر رحمت بھیجوں گا، جو آپ ﷺ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلام بھیجوں گا، اس لیے میں شکریہ ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔

نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا شکر

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سائل حضور ﷺ کی خدمت میں آیا۔ حضور ﷺ کے فرمانے پر اسے ایک کھجور دے دی گئی۔ اس نے وہ کھجور پھینک دی۔ پھر ایک اور سائل آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے بھی ایک کھجور دے دو۔ اس نے کھجور لے کر کہا: سبحان اللہ! حضور ﷺ کی طرف سے ایک کھجور (یہ تو بہت بڑی نعمت ہے، اس کی اس کیفیت سے خوش ہو کر) حضور ﷺ نے باندی سے فرمایا: اُمّ سلمہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ان کے پاس جو چالیس درہم ہیں وہ اس سائل کو دے دیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سائل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ حضور ﷺ نے اسے ایک کھجور دے دی۔ اس آدمی نے کہا: سبحان اللہ! نبیوں میں سے اتنے بڑے نبی اور وہ ایک کھجور صدقہ میں دے رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس ایک کھجور میں

بہت سارے ذرّے ہیں۔ پھر حضور ﷺ کے پاس دوسرا سائل آیا۔ حضور ﷺ نے اسے بھی ایک کھجور دی۔ اس نے (خوش ہو کر) کہا: یہ کھجور مجھے نبیوں میں سے ایک نبی کی طرف سے ملی ہے، جب تک میں زندہ رہوں گا یہ کھجور میرے پاس رہے گی، اور مجھے امید ہے کہ اس کی برکت ہمیشہ ملتی رہے گی۔ پھر حضور ﷺ نے (لوگوں کو) اس کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ مالدار ہو گیا۔

حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (مکہ اور مدینہ کے درمیان) ضبحنان مقام کے پاس سے گزرے تو فرمانے لگے: میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں (بچپن میں اپنے والد) خطّاب کے جانور اس جگہ چرایا کرتا تھا لیکن اللہ کی قسم! میری معلومات کے مطابق وہ سخت مزاج اور درشت گو تھے۔ پھر میں حضرت محمد ﷺ کی امت کا والی بن گیا، پھر یہ شعر پڑھا:

لَاشَيْئَ فِيْمَا تَرَىٰ اِلَّا بَشَاشَتُهٗ　　يَبْقَى الْاِلٰهُ وَيُوْدِى الْمَالُ وَالْوَلَدُ

"جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اس میں (ظاہری) بشاشت کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اللہ کی ذات باقی رہنے والی ہے باقی تمام مال اور اولاد فنا ہو جائے گی۔"

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اونٹ سے فرمایا: چل۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میرے پاس دو سواریاں لائی جائیں ایک شکر کی دوسری صبر کی تو مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ میں کس پر سوار ہوا۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسے مصیبت زدہ آدمی کے پاس سے گزرے جو کوڑی، نابینا، بہرا اور گونگا تھا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کیا تمہیں اس میں اللہ کی کوئی نعمت نظر آرہی ہے؟ ساتھیوں نے کہا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس میں بھی اللہ کی نعمت ہے، کیا آپ لوگ دیکھ نہیں رہے کہ یہ پیشاب کرلیتا ہے، پیشاب قطرہ قطرہ کر کے نہیں آتا ہے اور نہ مشکل سے نکلتا ہے بلکہ آسانی سے نکلتا ہے، یہ بھی اللہ کی زبردست نعمت ہے۔

حضرت ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! میں اپنی ساری جان اور سارا مال تیرے راستے میں خرچ کرنا چاہتا ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگ خاموش کیوں نہیں رہتے؟ اگر کوئی مصیبت آجائے تو صبر کرو اور اگر عافیت ملے تو شکر کرو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ بات میں نے خود سنی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک آدمی نے سلام کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا تم کیسے ہو؟ اس نے کہا میں آپ کے سامنے اللہ کی تعریف بیان کرتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی جواب میں تم سے سننا چاہتا تھا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یہ لکھا کہ جتنی دنیا ملے اس پر قناعت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو روزی زیادہ دیتے ہیں اور بعض کو کم۔ وہ اس طرح ہر ایک کو آزمانا چاہتے ہیں لہٰذا جسے روزی زیادہ دی ہے اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کا شکر کیسے ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کا جو حق بندے پر فرض بنتا ہے اس کی ادائیگی یہ ہے کہ بندہ اس کا شکر ادا کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں شکر والوں کے لیے اللہ کی طرف سے ہمیشہ نعمتیں بڑھتی رہتی ہیں لہٰذا تم نعمتوں کی زیادتی طلب کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ: "اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ نعمت دوں گا۔" (سورۃ ابراہیم: آیت ۷)

حضرت سلیمان بن موسیٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کو کسی نے بتایا کہ کچھ لوگ برائی میں مشغول ہیں آپ رضی اللہ عنہ ان کے پاس جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہاں گئے تو دیکھا کہ وہ لوگ تو سب بکھر چکے ہیں البتہ برائی کے اثرات موجود ہیں تو انہوں نے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے ان لوگوں کو برائی پر نہ پایا اور ایک غلام آزاد کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نعمت ملنے پر فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور شکر ادا کرنے سے نعمت اور بڑھتی ہے۔ شکر اور نعمت کا بڑھنا ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ جب بندہ شکر ادا کرنا چھوڑے گا تب اللہ کی طرف سے نعمت کا بڑھنا بند ہو گا۔

حضرت محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی کے لیے شکر کا دروازہ تو کھول دے اور اپنی طرف سے نعمت بڑھانے کا دروازہ بند کر دے اور دعا کا دروزاہ تو کسی کے لیے کھول دیں اور قبولیتِ دعا کا دروازہ بند رکھیں اور توبہ کا دروازہ تو کسی کے لیے کھول دیں اور مغفرت کا دروازہ بند رکھیں میں تمہیں (اس کی تائید میں) اللہ کی کتاب یعنی قرآن

میں سے پڑھ کر سناتا ہوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: ’’مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست کو قبول کروں گا۔‘‘ (سورہ مومن:۶۰)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝: ’’اور جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان کا ضرر کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا۔‘‘ (سورہ نساء:۱۱۰)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں صبح اور شام اس حال میں کروں کہ لوگ مجھ پر کوئی مصیبت نہ دیکھیں تو میں مصیبت سے محفوظ رہنے کو اپنے اوپر اللہ کی طرف سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کی نعمت صرف کھانا اور پینا ہی ہے تو اس کی سمجھ کم ہے اور اس کا عذاب نزدیک آچکا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو بندہ خالص پانی پیے اور وہ پانی بغیر کسی تکلیف کے اندر چلا جائے اور پھر بغیر کسی تکلیف کے (پیشاب کے ذریعہ سے) باہر آجائے تو اس پر شکر ادا کرنا واجب ہو گیا ہے۔

جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما شہید کر دیئے گئے تو (ان کی والدہ محترمہ) حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وہ چیز گم ہو گئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمائی تھی اور ایک تھیلے میں رکھی رہتی تھی تو وہ اسے تلاش کرنے لگیں تو جب وہ چیز مل گئی تو سجدے میں گر پڑیں۔ (حیاۃ الصحابہ حصہ دوم:۷۵۳ تا ۵۷)

......☆......☆......☆......

حیا کا بیان

حیا دراصل اس قوت اور صفت کا نام ہے جو کسی شخص پر رسوائی کا داغ لگنے کے خوف اور ندامت کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو بات یا کام ایسا ہے جس کے کر گزرنے میں انسان رسوا ہو سکتا ہے، ایسا کام یا ایسی بات کرنے سے طبیعت میں جو انقباض پیدا ہوتا ہے اور جو خوف طاری ہوتا ہے کہ اس کے کرنے سے عیب لگ جائے گا یا ملامت کی جائے گی تو اس قسم کا خوف طاری کرنے، انقباض اور رکاوٹ ڈالنے والی قوت اور صفت کا نام شرم و حیا ہے۔

صفتِ حیا کے نتائج

صفت حیا کی وجہ سے انسان خیر کی طرف اقدام کرتا ہے اور شر و برائی کے کام اور بات سے بچنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے، اس لیے اخلاقِ حسنہ میں سے حیا ایک ایسی صفت اور قوت ہے جو بلند اخلاق کا محرک اور باعث ہوتی ہے اور رذائل و برے اخلاق سے روکتی ہے۔

حیا کی اقسام

حیا کی بڑی بڑی قسمیں دو ہیں:

۱۔ فطری اور پیدائشی حیا۔

اس میں انسان کے کسب و عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدائشی طور پر انسان کے اندر رکھی گئی ہے۔

۲۔ کسبی حیا۔

حیا کی دوسری قسم وہ ہے جو مجاہدوں، محنتوں اور ریاضتوں سے پیدا ہوتی ہے۔

عمل کے اعتبار سے حیا کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اپنے آپ سے حیا

اس کی تشریح یہ ہے کہ جس شخص کے اندر فطری حیا محفوظ ہو اور اس نے اس کو ہنوز داغ دار اور کمزور نہ کیا ہو تو ایسے شخص کو لوگ دیکھیں یا نہ دیکھیں بہر حال وہ عیب اور ملامت والا کام نہیں کرتا

اور ایسے کام کے کرنے میں خود اپنے آپ سے شرماتا ہے۔

(۲) لوگوں سے حیا

جب کوئی شخص تنہائیوں میں کوئی عیب اور ملامت والا کام کرتا ہے یا بُرے ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو اس کی قوت حیا میں کمزوری آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ تنہائیوں میں تو غلط اور عیب کے کاموں کو کر گذرتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے ایسے کاموں کے کرنے سے شرم محسوس کر کے رُک جاتا ہے جن کو لوگ معیوب سمجھتے ہیں، اور جو لوگ اپنے اس جوہرِ حیا کو اس قدر برباد کر دیتے ہیں کہ ان کو ڈنڈے اور سزا کے سوا کوئی اور چیز بُرے اور معیوب کام سے نہ روک سکے ایسے لوگ دوسرے لوگوں کے سامنے بھی برائی اور عیب والے کاموں میں کوئی باک و شرم محسوس نہیں کرتے۔

(۳) اللہ تعالیٰ سے حیا

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنی قوتِ حیا کو کسب و عمل سے بڑھاتا ہے تو لوگ دیکھیں یا نہ دیکھیں بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں کو پورا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں اور جن باتوں سے روکا ہے ان سے رکتا ہے اور کسی ذی حق کے حق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کی اقسام و درجات

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کی بڑی بڑی قسمیں اور درجے دو ہیں:

(۱) حیا کا ابتدائی درجہ

یہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کی وہ قسم اور درجہ ہے جو عام طور پر پکے اور سچے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ وہ یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ہدایات سے انحراف کرنے سے شرم آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں اور کسی نہ کسی مرتبہ میں اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کی صفت ان میں پیدا ہو چکی ہوتی ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ سے حیا کا ادنیٰ مقام ہے اور ابتدائی درجہ ہے۔

(۲) حیا کی اعلیٰ قسم اور اعلیٰ درجہ

یہ حیا کی وہ اعلیٰ قسم اور اعلیٰ درجہ ہے جس کو حدیث کے الفاظ میں ”احسان“ بھی کہا جاتا ہے اور اس کو حق الحیا (یعنی اللہ تعالیٰ سے حیا کا صحیح حق ادا کرنا) بھی کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَن تَعۡبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ یعنی ”احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو“۔ (بخاری، مسلم)

یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کرو کہ گویا وہ تمہارے سامنے ہے اور تمہاری ہر حرکت اور سکون کو دیکھ رہا ہے۔ اس مقامِ احسان کو حضرات صوفیاء مقامِ مشاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

حیا کے اعلیٰ درجہ کی تفصیل

حیا کے اس اعلیٰ درجہ کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر اللہ تعالیٰ کی یاد، اُس کی محبت اور عظمت اس طرح چھا جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدوس اور ذوالجلال ذات گویا اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ جس شخص کو یہ کیفیت حاصل ہو جائے اور اس کا یہ تصور پختہ ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اُس کے احکامات کی تعمیل کے لیے بے چین و بے قرار ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی سے لرزاں و ترساں رہتا ہے۔

ایسے شخص کے دل و دماغ میں شریعت کے خلاف سوچنے کی ہمت نہیں رہتی، اس کی آنکھوں، کان، زبان اور تمام اعضاء سے وہی کام صادر ہوتے ہیں جو عین اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے خیالات، ارادے، اقوال اور افعال تمام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں اور اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی نظروں میں دنیا کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ دنیا کی تمام عارضی لذتیں، زینتیں اس کو لہو لعب نظر آنے لگتی ہیں۔

حیا کے اعلیٰ درجے کے حصول کی ترغیب

حیا کے اس اعلیٰ قسم اور درجے کے حصول کی ترغیب خود نبی کریم ﷺ نے دی ہے کہ بندے کو

چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرے جیسے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ہے۔

چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (اے مسلمانو)! "اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسے اس سے حیا کرنے کا حق ہے"۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّا لَنَسْتَحْيِيْ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شکر ہے، الحمد اللہ! ہم تو اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں (یعنی نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں کی تعمیل کرتے ہیں، اور اس نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے اُن سے اجتناب کرتے ہیں)"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ ذَاكَ وَلٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ اَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى وَتَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰى وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِيْنَةَ الدُّنْيَا فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰ يَعْنِيْ مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ "یہ اصل شرمانا نہیں (جو تم سمجھ رہے ہو) بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں (جو افکار و خیالات اور آنکھ، کان، زبان وغیرہ) جو کچھ ہے ان سب کی حفاظت (اور نگہداشت) کرو، اور پیٹ اور جو کچھ غذا (اور فرج اور نفسانی خواہشات) اس میں محفوظ ہیں ان سب کی (ناجائز باتوں سے) حفاظت کرو، اور موت اور موت کے بعد بدن کے گل سڑ جانے (اور قبر میں جو حالت ہونی ہے اس) کو یاد رکھو اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے (یعنی اس کو اپنا مقصد بنائے) وہ دنیا کی زیب و زینت اور عیش و عشرت کو چھوڑ دے گا (اور اس چند روزہ زیب و زینت کے مقابلے میں آگے آنے والی دوسری زندگی کی کامیابی کو پسند اور اختیار کرے گا۔) پس جس نے یہ سب کچھ کیا تو (سمجھو) کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا۔ (ترمذی ۲۴۵۸)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا جو حق ہے وہ اس سے ادا نہ ہوگا کہ صرف قانونی اور دستوری طور پر احکامات کو بجالایا جائے اور حرام کاموں سے اپنے آپ کو بچایا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دائمی استحضار حاصل ہو، دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی یاد و عظمت رچ بس گئی ہو، جیسے: کوئی شرمیلا انسان اپنے بڑوں کے سامنے فضول اور عیب والے کام کرنے سے شرماتا ہے، اسی طرح وہ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کرے کہ اللہ تعالیٰ میرے دل و دماغ اور میرے خیالات کو دیکھ رہا ہے،

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کے دل و دماغ میں شریعت کے خلاف سوچنے کی ہمّت نہیں رہے گی۔ اس کی آنکھ، کان، زبان، اس کا کمانا، لگانا، کھانا اور شرم گاہ سب پاک ہو جائیں گے اور اس کی ہر حرکت و سکون اللہ تعالیٰ کی مرضی اور خوشنودی کے مطابق ہو جائے گی۔ اس کے ظاہری، باطنی تمام اعضاء اور قوتیں عین اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں صرف ہوتی رہیں گی، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

اس حدیث کے آخری حصے سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے شرم و حیا کرنے کا حق وہی شخص ادا کر سکتا ہے جس کی نظر میں دنیا اور اس کی عیش و عشرت کی کوئی قیمت باقی نہ رہے اور اس نے دنیا کے بجائے آخرت کو اپنا مقصد بنا لیا ہو اور موت اور اس کے بعد کی منزلیں اور مرحلے اس کو ہر وقت یاد رہتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کا سرچشمہ

اللہ تعالیٰ سے حیا اُس محسنِ اعظم پر ایمان و یقین، اس کی معرفت اور اس کی عظمت و جلال کا ثمرہ و نتیجہ ہوتا ہے۔ جس قدر نورِ ایمان اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت دل پر چھائی رہے گی، اسی قدر اللہ تعالیٰ سے شرم و حیا آئے گی اور اس قدر اللہ تعالیٰ سے شرم و حیا کرنے کا حق ادا ہوتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنا کسبی ہے

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وصفِ حیا انسان میں پیدائش ہی سے فطری طور پر ہوتا ہے، اگر اس کی مناسب اور ٹھیک تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین اور اس کے قُرب و رضا کے لیے صحیح ریاضت اور مجاہدات سے اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ انسان احسان کے اعلیٰ درجات اور مقامات کو پالیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حیا کی ابتدا تو فطری اور پیدائشی طور پر ہوتی ہے مگر اس عظیم وصف کو بچانا، اس کی حفاظت کرنا اور اس میں ترقی کرنا کسبی اور عملی ہے۔

جوہرِ حیا و شرم کی حفاظت اور اس کی نگرانی سخت ضروری ہے۔ اس وصف میں اگر غلط صحبت یا بعض نادانیوں سے کچھ ضعف اور کمزوری آئی ہے تو مایوس نہ ہوں بلکہ توبہ کر کے از سرِ نو شرم و حیا والے کاموں کو اختیار کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ شرم و حیا کی یہ قوت پھر سے بحال ہو جائے گی اور اس میں ترقی بھی

ہو گی۔

یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہے کہ جو لوگ غلط صحبت کا شکار ہوتے ہیں ان کے اندر بے حیائی کی جرأت بڑھتی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو کنٹرول نہ کریں تو رفتہ رفتہ اس عظیم وصف سے محروم ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

اس لیے شریعتِ مطہرہ نے اس عظیم وصف کی حفاظت اور نگرانی اور اس میں ترقی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں بطورِ نمونہ چند حدیثوں کو نقل کرتے ہیں، ان کو پڑھ لیجیے۔

(۱) بالکل تنہائی میں بھی ننگا نہ ہو جایا کریں

حضرت بہز بن حکیم کا بیان ہے کہ ان کے دادا نے فرمایا کہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا نبی اللہ ﷺ! ہم اپنے ستر کا کون سا حصہ کھول سکتے ہیں اور کون سا نہیں کھول سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے ستر چھپاؤ بجز اپنی بیوی یا اپنی باندی کے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر مجھے غسل کی ضرورت پیش آئے اور اس وقت لوگ موجود ہوں تو پھر کیا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ کسی کی نظر تم پر نہ پڑے تو نہ پڑنے دو۔ میں نے پوچھا: اچھا یہ فرمائیے کہ جب ہم میں سے ایک شخص تنہا ہو، وہاں کوئی اور نہ ہو (کیا وہ تنہائی میں ننگا ہو سکتا ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فَا للّٰہ اَحَقُّ اَن يُّسْتَحْيٰى مِنْهُ "پس اللہ تعالیٰ کی ذات (تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس) سے شرم و حیا انسانوں سے زیادہ ضروری ہے۔

(ترمذی)

اس حدیث میں سمجھایا گیا کہ مؤمن کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کا تصور اس قدر غالب اور راسخ ہونا چاہیے کہ تنہائیوں میں بھی اپنے آپ کو گرمی وغیرہ کی شدت سے ننگا نہ کرے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ستر اور غیر ستر دونوں برابر ہیں، وہ ہمارے بدن کی اندرونی چیزوں اور ان حصوں سے بھی باخبر ہے اور ان کو دیکھ رہا ہے جو خود ہمارے علم میں بھی نہیں اور ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں، مگر ننگے پن سے بندہ کے اختیاری آداب و لحاظ میں تو فرق پڑتا ہے اس لیے بندہ پر لازم ہے کہ وہ اپنے اختیاری آداب کا خوب اہتمام کرے۔

(۲) فرشتوں سے شرم کریں

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِيَّاكُمْ وَالتَّعَرِّىَ فَاِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَّا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْغَائِطِ وَحِيْنَ يُفْضِى الرَّجُلُ اِلٰى اَهْلِهٖ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَاَكْرِمُوْهُمْ ”عریانی سے سخت پرہیز کرو، کیونکہ تمہارے ساتھ وہ فرشتے بھی رہتے ہیں جو کسی وقت تم سے جدا نہیں ہوتے بجز دو وقتوں کے: ایک پاخانہ کے وقت دوسرا اس وقت جبکہ آدمی اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے پس ان سے شرم کرو اور ان کا احترام اور لحاظ کرو“۔ (ترمذی)

(۳) حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کے پاس سے گزرے اور وہ اس وقت اپنے بھائی کو زیادہ حیا کرنے کے بارے میں سمجھا رہا تھا اور ملامت کر رہا تھا کہ زیادہ شرم نہیں کرنی چاہیے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ ” اس کو (اس حال پر) رہنے دو (اور اس کو غلط نصیحت نہ کرو) کیونکہ حیا تو ایمان کا ایک شعبہ (یا پھل و نتیجہ) ہے“۔

(بخاری و مسلم، مشکوۃ)

مطلب یہ ہے کہ وہ صحابی رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کو زیادہ حیا کرنے سے منع کر رہے تھے، مثلاً: کہہ رہے تھے کہ جو شخص زیادہ حیا کرنے لگتا ہے وہ رزق اور علم حاصل کرنے سے رہ جاتا ہے اور وہ لوگوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں بھائیوں کے پاس سے گذرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت اور ملامت کرنے والے کی باتیں سنیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو غلط نصیحت نہ کرو، اس کو اپنی حیا پر چھوڑ دو، کیونکہ حیا تو ایمان کا پھل اور شعبہ ہے۔ اگر اس کی وجہ سے بالفرض دنیا کے کچھ مفادات فوت بھی ہو جائیں تو اسی کی وجہ سے آخرت کے درجے بے انتہا بڑھ جائیں گے۔

(۴) حیا خیر و بھلائی لاتی ہے

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْحَيَاءُ لَا يَاْتِىْ اِلَّا بِخَيْرٍ ”حیا صرف خیر (اور بھلائی) ہی کو لاتی ہے“۔ (بخاری و مسلم مشکوۃ)

(۵) حیا برائی سے روکتی ہے

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی نبوتوں کی (صحیح اور اُصولی) باتوں میں سے لوگوں نے جو کچھ پایا ہے اس میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ: اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ "جب تم میں شرم و غیرت باقی نہ رہے تو پھر جو چاہو کرو۔ (بخاری مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جو چیز خیر کے اقدام پر اُبھارتی ہے اور بُری باتوں سے باز رکھتی ہے وہ حیا ہے، اور جب کسی میں شرم و غیرت باقی نہ رہے تو اب اس کو ذلیل حرکات اور بُرے کاموں سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ بلاشبہ جس شخص کے حیا اور غیرت کا جنازہ نکل جاتا ہے تو وہ بہت ہی ذلیل حرکات کرنے لگتا ہے۔ جانوروں کی طرح ہر جائز و ناجائز کو اختیار کرتا ہے۔ اس کو نہ اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے اور نہ لوگوں سے۔ وہ ہر قسم کے گناہ اور بے حیائی پر جرّی ہو جاتا ہے۔ اب جانور کو صرف ڈنڈے کے زور سے وقتی طور پر باز رکھا جاسکتا ہے، جوں ہی ڈنڈے کو ہٹایا جائے گا، پھر سے وہی بے حیائی اور وہی بے شرمی ہو گی۔

(۶) حیا جنت میں لے جانے والی ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ وَالْاِيْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ

حیا (شرم) ایمان کا پھل و نتیجہ (یا شعبہ) ہے اور ایمان کا نتیجہ جنت ہے، اور بے حیائی بدی سے پیدا ہوتی ہے اور بدی کا نتیجہ دوزخ کی آگ ہے۔ (احمد و ترمذی، مشکوٰۃ)

۷۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْحَيَاءَ وَالْاِيْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِيْعاً فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ "بے شک حیا اور ایمان دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ (اور پیوست و اکھٹے) رہتے ہیں، جب ان دونوں میں سے کوئی ایک اُٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اُٹھالیا جاتا ہے۔ (بیہقی مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے والا شخص دینی مسائل پوچھے گا

حیا اور شرم کے سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جو لوگ حقیقت کا اظہار نہیں کر سکتے،

لوگوں کے حقوق میں کوتاہی کرتے ہیں، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور حتی الوسع مظلوم کی مدد نہیں کرتے، ظالم کا ہاتھ نہیں روکتے اور اپنے زعم میں یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے یا دینی مسائل پوچھنے سے شرماتے ہیں، یہ لوگ دراصل نفس کے دھوکے کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ حیا نہیں بلکہ عجز، ضعف اور بزدلی ہے۔ یہ ایک قسم کی خرابی اور نقصان ہے۔ جس شخص پر اللہ تعالیٰ سے حیا غالب ہو وہ دینی مسائل، درس و تدریس، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مظلوموں کی مدد، ظالم کی سرکوبی، سچی گواہی اور حقیقت کے اظہار میں کبھی کمزوری اور سستی نہیں دکھائے گا، اور لوگوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے احکامات و ہدایات کا زیادہ لحاظ رکھے گا۔ جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تعلیم و تعلّم وغیرہ کے فرائض پورے کیے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے مرد اور عورتیں ایسے دینی مسائل پوچھتے تھے جو جٹ اور گنوار لوگوں کی نظروں میں بھی معیوب سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایسا شخص تھا جس کی مذی بڑی کثرت سے خارج ہوتی تھی۔ چونکہ آپ ﷺ کی صاحبزادی (یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) میرے نکاح میں تھیں اس لیے آپ ﷺ سے براہِ راست مسئلہ پوچھنے سے مجھے حیا دامن گیر ہوئی تو میں نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم یہ مسئلہ دریافت کرلو۔ انہوں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: يَغْسِلُ ذَكَرَهُ وَيَتَوَضَّأُ "صرف عضو خاص کو دھو کر وضو کرلینا کافی ہے"۔ (بخاری و مسلم، مشکوۃ)

دیکھیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک طرف تو ایسے انداز میں مسئلہ دریافت کیا کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے بارے میں پتا نہ چلے اور براہِ راست بات کرنے کے بجائے دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مسئلہ معلوم کرلیا۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ امت تک پہنچایا۔

نیز ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انصار کی عورتیں بھی خوب عورتیں ہوتی ہیں جن کو دینی مسائل سیکھنے میں شرم دامن گیر نہیں ہوتی۔ (بخاری)

مُروّت: حیا اور شرافت کی ایک قسم

البتہ مُروّت شرم و حیا اور شرافت کی ایک قسم ہے، مثلاً: مسائل پوچھنے اور اپنا حق مانگنے وغیرہ جیسے امور میں مروت کا لحاظ رکھنا چاہیے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکور بالا روایت میں مسئلہ پوچھنے میں شرافت اور مروت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ خود مسئلہ نہیں پوچھا بلکہ دوسرے کی وساطت سے معلوم کیا، یا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ "یہ باتیں (میرے) نبی کے لیے باعث اذیت تھیں، لیکن وہ تم سے شرم کرتے تھے (اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے) اور اللہ تعالیٰ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا ہے۔ (سورۃ الاحزاب: آیت ۵۳)

وہ کون سی باتیں تھیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعثِ اذیت تھیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی مروت والی شخصیت تھے کہ ان کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان کا بیان خود قرآن مجید میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے ہاں کھانے پر بلاتے تھے۔ ان میں بعض لوگ ایسے تھے کہ جب اُن کو معلوم ہو جاتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کچھ پک رہا ہے تو وہ بِن بلائے پہنچ جاتے، اور جن لوگوں کو دعوت کے لیے بلایا جاتا ان میں سے بعض وقت سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پہنچ کر بیٹھ جاتے، اور بعض لوگ ایسے تھے جو کھانے سے فارغ ہو چکنے کے بعد مجلس جما لیتے اور نہ ختم ہونے والی باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ اس زمانے میں عام طور پر صورتِ حال یہ تھی کہ مہمانوں کے لیے مستقل حجرے نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ عورتوں کو ایک طرف کر کے زنانہ مکان میں کھانا کھلانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان بے اعتدالیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکلیف ہوتی تھی، کیونکہ جو مسافر نہ ہوں، بلکہ وہیں رہتے ہوں اور وہ بِن بلائے اچانک کسی گھر میں عین کھانے کے وقت آئیں اور کھانے سے پہلے آکر صاحبِ خانہ کو مشغول رکھیں یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے، تو ایسے وقت میں صاحبِ خانہ مشکل میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ اچانک آئے ہوئے بہت سے آدمیوں کا انتظام ہر وقت ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ پھر جن کو بلایا جائے وہ کھانا تیار ہونے سے پہلے پہنچ جائیں تو ان کو بٹھانے کا مسئلہ، اہل و عیال کو زیادہ دیر تک دوسری طرف رکھنا وغیرہ، اور اسی طرح کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا عادۃً

میزبان کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے، خصوصاً جبکہ کھانا زنانہ مکان میں کھلایا جارہا ہو۔

یہ تمام امور ایسے ہیں جو ایک عام آدمی کے لیے بھی باعثِ تکلیف ہوتے ہیں، پھر وہ شخصیت جس کے ذمے لوگوں کی اصلاح کی ذمہ داری ہو اور وہ یہی چاہتا ہو کہ لوگ سنور جائیں اور ایک دوسرے کے لیے رحمت بنیں نہ کہ زحمت دینے والے، تو ایسی شخصیت کو ان بے اعتدالیوں سے جس قدر تکلیف ہو سکتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ صرف اُنہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کے اندر انسانیت کی اصلاح کی تڑپ موجود ہو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ کو بعض لوگوں کی ان بے اعتدالیوں سے بہت تکلیف پہنچتی تھی، مگر چونکہ خود آپ ﷺ کے گھر آئے ہوئے مہمان تھے اس لیے اس حالت میں ان کو ادب سکھانے میں شرم وحیا مانع ہوتی تھی اور آپ ﷺ شرم ولحاظ کے سبب ان کو نہیں ٹوکتے تھے۔ اب کوئی دوسرا ہی ہو سکتا تھا کہ وہ ان کو ٹوکے اور اُن کو ادب سکھائے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو براہِ راست ٹوکا اور تمام مسلمانوں کو مہمانی اور میزبانی کے کچھ آداب بتلادیے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ آداب عام حالات کے اعتبار سے ہیں ورنہ اگر عادت سے یہ معلوم ہو کہ کھانے کے بعد دیر تک باہمی باتوں میں مشغول رہنا میزبان کے لیے باعثِ تکلیف نہیں، بلکہ وہ خود چاہتا ہے تو پھر بیٹھنے میں مضائقہ نہیں۔ نیز یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی کریم ﷺ کے بارے میں جو یہ فرمایا کہ وہ تم سے حیا کرتے ہیں، یہ آپ ﷺ کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ آپ ﷺ کی ایک پسندیدہ خصلت اور آپ کی انتہائی درجہ شرافت اور مروت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ نہایت کریم النفس، شریف اور ذی مروت ہیں۔ اس وجہ سے خود اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان کی بے اعتدالیوں پر متنبہ فرمایا ہے اور آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ میری یہ ہدایات لوگوں کو سنائیں۔ ان آیتوں میں یہ تعلیم بھی موجود ہے کہ جو لوگ شرافت اور حیا کی وجہ سے اپنے معاملہ میں کسی سے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے جو مروت کے خلاف ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ وہ اُن لوگوں کو سلیقے سے سمجھائیں اور ان (بامُروّت لوگوں) کو اذیت دینے سے باز رکھیں۔

بے حیائی کا علاج

بے حیائی کے علاج کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور پر عمل کریں:

۱۔ ہر بد خلقی مثلاً بے جا غصہ، تکبر، بخل وغیرہ کا علاج یہ ہے کہ ہمیشہ اس کا الٹ کیا جائے۔ اپنے اوپر جبر کر کے غصہ کے بجائے تحمل، تکبر کے بجائے عاجزی، اور بخل کے بجائے سخاوت کو اختیار کیا جائے، اسی طرح ہر بد خلقی کی ضد کو تکلف کے ساتھ اختیار کیا جائے آخر کار بد خلقی کی ضد یعنی نیک خلقی طبیعت کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی حال حیا کا ہے کہ حیا اور مروت والے اُمور قصداً کیے جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ حیا اور مروت میں ترقی ہو گی۔

۲۔ شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کریں اور اپنے اوپر یہ فکر سوار کرنے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے کرتوت دیکھ رہا ہے اور میرے دل و دماغ کے خیالات کو جانتا ہے۔

۳۔ حیادار اور با مروت لوگوں کی صحبت اختیار کریں، بے حیا اور بے مروت لوگوں کی صحبت سے پرہیز کریں۔

۴۔ کسی صالح مردِ مؤمن، نیک سیرت شیخ اور صوفی کی صحبت میں رہیں اور اس کی شاگردی اختیار کریں۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاداری

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے جو پردہ میں بیٹھی رہتی ہو۔ آپ ﷺ کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپ ﷺ کو ناگوار ہوتی تو آپ شرم کی وجہ سے ناگواری کا اظہار (زبان مبارک سے) نہ کرتے، ہم اس کو آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے معلوم کر لیتے تھے۔ (بحوالہ صحیحین)

رسول اللہ ﷺ کبھی کوئی فحش بات زبان سے نہ نکالتے۔ (بحوالہ صحیح بخاری)

رسول اللہ عورتوں سے زبانی بیعت لیتے، کسی (غیر) عورت کے ہاتھ کو آپ ﷺ نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ (بحوالہ صحیح بخاری)

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ کو کبھی کسی شخص کے بارے میں کسی برائی کی اطلاع ملتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا نام لے کر یہ نہ فرماتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایسا کہتے ہیں، یا ایسا کرتے ہیں۔ شرم و حیا کی وجہ سے ناپسندیدہ کام کرنے والے کا نام نہ لیتے۔ (بحوالہ سنن ابی داؤد)

اگر کوئی خطا کار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پشیمانی کا اظہار کرتا اور عفو و تقصیر کی درخواست کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا سے گردن مبارک جھکا لیتے تھے۔ (شمائل کبریٰ بحوالہ ترمذی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں شرم و حیا کی صفت بدرجہ کمال پائی جاتی تھی۔ فی الحقیقت آپ شرم و حیا کے پیکر جمیل تھے۔ کبھی کسی پر طعن و تشنیع نہ فرماتے، کیونکہ اسے بھی شرم و حیا کے خلاف سمجھتے تھے، بازاروں سے گزرتے تو خاموشی سے نظریں نیچے جھکا کر چلتے، قہقہہ لگا کر کبھی نہ ہنستے، ہنسنے کے موقع پر بھی اکثر زیرِ لب تبسم پر اکتفا فرماتے۔

حیا کے واقعات

۱۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب گھر میں بھی ہوتے اور دروازہ بھی بند ہوتا تھا، پھر بھی غسل کے دوران پانی ڈالنے کے لیے پورے کپڑے نہ اتارتے تھے، اور شدتِ حیا کی وجہ سے پیٹھ کو سیدھا کر کے کھڑے نہ ہوتے تھے۔ (حلیۃ الاولیاء، ذکر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ: ج۱، ص ۵۶)

۲۔ حضرت ابو مجلز فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اندھیری رات میں غسل کرتا ہوں۔ کپڑے اٹھانے کے لیے بھی پیٹھ کو سیدھا کر کے کھڑا نہ ہوتا ہوں، اپنے رب سے حیا کی وجہ سے۔ (حلیۃ الاولیاء، ذکر ابی موسیٰ اشعری: ج۱، ص ۲۶۰)

۳۔ حضرت عبادہ بن نسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو پانی میں بغیر ازار کے کھڑے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مر جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر مر جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر مر جاؤں، پھر زندہ کیا جائے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے، اس طرح کے کام سے۔ (حیاۃ الصحابہ)

۴۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک صحابیہ حضرت اُم خلاد رضی اللہ عنہا کے بیٹے حضرت خلاد رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی قریظہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ ایک یہودی عورت نے اپنے مکان کی چھت سے ان پر بھاری پتھر گرادیا جس کے صدمے سے شہید ہوگئے۔ والدہ کو خبر ملی تو اس سانحہ کی تفصیل جاننے کے لیے رسول اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ عقل و خرد پر بجلی گرادینے والے اس صدمے کے باوجود انہوں نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ بارگاہِ نبوی میں جو لوگ حاضر تھے اُن میں سے کسی صاحب نے کہا: بی بی! تمہارا بیٹا قتل ہوگیا ہے، حیرت ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر نقاب ڈال رکھا ہے؟ حضرت ام خلاد رضی اللہ عنہا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا شرم وحیا بھی کھودوں۔ (اصلاحِ باطن کے ستر روحانی پرہیز: ۹۹)

۵۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا کہ کیا میں تمہیں جنتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ عورت ہے، رنگ سے کالی، رسول ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ مجھے مرگی کا مرض ہے اور اس کی وجہ سے میرے جسم کا کچھ حصہ کھل جاتا ہے، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کیجیے کہ میرا جسم نہ کھلے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو چاہے تو صبر کرے اور تیرے لیے جنت ہوگی، اور اگر تو چاہے تو تمہارے لیے عافیت کی دعا کرلیتا ہوں۔ اس عورت نے کہا کہ میں صبر کرلوں گی، لیکن آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیجیے کہ میرا جسم نہ کھلے، تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔ (حلیۃ الاولیاء: ج۲، ص۷۲)

۶۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے غیر مسلموں کے ایک قلعے پر حملہ کیا اور اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ لمبا ہوگیا اور قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ جب قلعے کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان بڑی ثابت قدمی سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک سازش تیار کی، وہ یہ کہ ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہم قلعے کا دروازہ آپ کے لیے کھول رہے ہیں، آپ اپنی فوج کو لے کر شہر میں داخل ہو جائیں، اور یہ سازش کی کہ شہر کا دروازہ جس طرف کھلتا تھا وہاں بہت لمبا بازار تھا، جس کی دونوں طرف دکانیں تھی اور وہ بازار شاہی محل پر جاکر ختم ہوتا تھا۔ انہوں نے عورتوں کو مزیّن اور آراستہ کرکے دونوں طرف ہر دکان پر ایک ایک عورت کو بٹھا دیا اور ان عورتوں کو یہ تاکید کردی کہ اگر یہ

مجاہدین داخل ہونے کے بعد تمہیں چھیڑنا چاہیں تو انکار مت کرنا اور رکاوٹ مت ڈالنا۔

یہ منصوبہ تیار کر کے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس شہر آنے کے لیے پیغام بھیجا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سوچ میں پڑ گئے کہ اب تک یہ مقابلہ کرتے رہے اور اب اچانک ان کا ارادہ بدل گیا، چنانچہ سارے لشکر کو جمع کیا اور خطبہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دشمن نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور وہ ہمیں داخل ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ آپ لوگ بے شک داخل ہوں، لیکن میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں، اس آیت کو پڑھتے ہوئے اور اس پر عمل کرتے ہوئے داخل ہوں۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لِّلْمُؤْ مِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ

”آپ مؤمنوں سے کہہ دیجیے کہ نظریں جھکالو اور شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔“ (سورۃ النور: آیت ۳۰)

چنانچہ لشکر قلعے کے اندر اس شان سے داخل ہوا کہ ان کی نگاہیں نیچی تھیں اور اسی حالت میں پورے بازار سے گزر گئے اور کسی نے دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور شاہی لشکر تک پہنچ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے۔ (اصلاحی خطبات: ج۱۵، ص ۱۷۳)

۷۔ حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ، مشہور محدّث ہیں۔ ایک مرتبہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے، تو جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ ان کے ساتھی کسی کام کے لیے شہر گئے تو وہ خیمہ میں اکیلے تھے۔ اتنے میں ایک خوبصورت عورت ان کے خیمے میں آئی اور کچھ مانگنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے کچھ کھانا اس کو دینا چاہا، تو اس عورت نے برملا کہا کہ میں آپ سے وہ کچھ چاہتی ہوں جو ایک عورت مرد سے چاہتی ہے۔ حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ نے یہ سنا تو سمجھ گئے کہ شیطان نے میری عمر بھر کی محنت ضائع کرنے کے لیے اس عورت کو بھیجا ہے۔ وہ خوفِ خداوندی سے زاروقطار رونے لگے۔ اتنا روئے کہ وہ عورت شرمندہ ہو کر واپس چلی گئی۔ حضرت سلیمان بن یسارؒ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مصیبت سے جان چھوٹی۔

رات کو جب حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ سوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی خواب میں زیارت ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ مبارک ہو، تم نے ولی ہو کر وہ کام کیا جو ایک نبی نے کیا تھا۔

(حیا اور پاکدامنی: ۳۰)

۸۔ ایک مرتبہ دہلی میں سخت قحط پڑا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے کھیتوں میں فصل نہ ہوئی اور درختوں

پر پھل بھی نہ ہوئے۔ لوگ کھانے کے لیے روٹی کو ترسنے لگے۔ ہر شخص بارِش کی دعائیں مانگتا مگر آسمان پر بادل نظر نہ آتے۔ علمائے شہر نے مشورہ کیا کہ شہر کے سب لوگ ایک دن کھلے میدان میں جمع ہوں، عورتوں، بچوں اور جانوروں کو بھی ساتھ لائیں۔ میدان میں نمازِ استسقاء ادا کرنے کے بعد اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور بارش کی دعا کریں۔ حسبِ پروگرام لوگ شہر کے باہر جمع ہو گئے۔ سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ نے سب کے چہروں کو جھلس کر رکھ دیا، پر نماز ادا کی گئی۔ مردوں، عورتوں نے رو رو کر بارش کی دعا مانگی مگر آسمان پر دور دور تک بادل کا نشان نظر نہ آیا۔ معصوم بچے تڑپنے لگے، جانور بھی پانی کو ترسنے لگے۔ لوگوں کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ صبح سے عصر تک یہ عمل جاری رہا مگر اُمید کی کرن نظر نہ آئی۔

جس وقت دعا مانگتے ہوئے مخلوقِ خدا خوب رو رہی تھی اس وقت ایک مسافر نوجوان اس میدان کے قریب سے گزرا۔ اس نے اونٹ کی مہار پکڑی ہوئی تھی۔ خود پیدل چل رہا تھا، جبکہ اونٹ پر کوئی پردہ نشین عورت سوار تھی۔ اس مسافر نے اتنے لوگوں کو آہ و زاری کرتے دیکھا تو اونٹ کو ایک جگہ روکا اور قریب کے لوگوں سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ جب اُسے حقیقتِ حال کی خبر ہوئی تو وہ اونٹ کے قریب گیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ابھی ہاتھ نیچے نہیں آئے تھے کہ چھم چھم بارش برسنے لگی۔ ایک عالم نے اس نوجوان مسافر سے کہا کہ آپ کتنے خوش نصیب اور مستجاب الدعوات انسان ہیں۔ اس مسافر نے جواب دیا کہ در حقیقت اونٹ پر میری والدہ سوار ہیں، میں نے اپنی والدہ کی چادر کا ایک کونہ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے پروردگارِ عالم! یہ میری نیک پاکدامن والدہ ہیں۔ آپ کو ان کی پاکدامنی کا واسطہ دیتا ہوں، اپنے بندوں پر بارش برسا دیجیے۔ ابھی میرے ہاتھ نیچے نہیں آئے تھے کہ بارش برسنے لگی۔

(حیا اور پاکدامنی: ۳۶)

......☆......☆......☆......

رحم، ترس اور مہربانی کا بیان

رحم، مخلوق پر ترس کھانا انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے۔ رحمٰن (بے حد مہربان) اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صرف وہی رحمن ور حیم ہے۔ اس کی صفتِ رحمانیت کا فیضان پوری کائنات پر ہو رہا ہے۔ جس میں جس قدر فیضان اور رحم و مہربانی کی تجلی اپنے اندر جذب کرنے کی استعداد، صلاحیت اور قوت ہے یا جو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی قدر اس میں رحم و مہربانی کے کام نظر آتے ہیں۔ یہ رحم صرف انسانوں میں نہیں بلکہ جانوروں میں بھی دکھائی دے رہا ہے۔ بدترین سے بدترین جانور اور درندہ بھی اپنے بچوں پر رحم کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحم کا فیضان ہے۔ اس پوری کائنات کا وجود اور اس کا حسن و کمال اور بقاسب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر اور جلوے ہیں۔ جس شخص میں اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ رحم اور شفقت کا جتنا عکس پایا جاتا ہے وہ اتنا ہی مبارک ہے اور اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہے، اور جو جس قدر سخت دل اور بے رحم ہے وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور احسان سے محروم اور دور ہے۔

رحم کیا ہے؟

عربی میں رحم، دل کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کے لیے شفقت اور احسان کا ارادہ جوش میں آجائے۔ اسی چیز کو ہم ترس اور مہربانی کہتے ہیں۔ جس شخص میں یہ چیز پائی جاتی ہے اُسے رحم دل کہتے ہیں اور جس کا دل اس صفت سے خالی ہو اس کو بے رحم اور سنگ دل کہا جاتا ہے۔

اسلام اور رحم دلی

دینِ اسلام کی تعلیمات اور احکامات پر اگر نظر ڈالی جائے تو ان میں دو قسم کی تعلیمات نمایاں طور پر نظر آجائیں گی۔ ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے والے، اس سے محبت بڑھانے والے اور اس کے تعظیمی احکام، جن کو حقوق اللہ کہتے ہیں۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کی مخلوق پر مہربانی اور احسان کرنے کے احکامات، جن کو حقوق العباد کہتے ہیں۔ یہ دونوں باہم مربوط اور جڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا نماز، روزہ، حج اور ذکر واذکار؛ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق، تقویٰ اور محبت بڑھانے کے احکام ہیں۔ ان

کا ثمرہ، پھل اور نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کی مخلوق پر مہربانی کرے اور ان کے حقوق کی پوری ادائیگی کرے۔ مثلاً ماں، باپ کو حکم ہے کہ وہ اولاد کے حقوق ادا کریں اور اولاد کو حکم ہے کہ والدین کے حقوق ادا کریں حتیٰ کہ جانوروں پر ترس کھانے کی تعلیم اور ان کے حقوق بھی دینِ اسلام نے بتلائے ہیں، ان تمام حقوق کی کماحقہٗ ادائیگی اسی وقت ہوسکتی ہے جب انسان کا دل رحم، مہربانی اور ترس کھانے کی صفت سے متصف ہو، ورنہ سنگ دل شخص اپنا حق وصول کرنے میں تو پیش پیش ہوتا ہے، لیکن حقوق کی ادائیگی سے جی چراتا ہے۔ یاد رہے کہ جو شخص حقوق العباد کی ادائیگی نہیں کرتا اگرچہ وہ حقوق اللہ کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام کرتا ہے تو اس اہتمام میں ضرور کوئی کھوٹ اور دھوکہ ہے اور یہ صرف نمائشی دین داری ہے نہ کہ حقیقی۔

قرآن وحدیث میں رحم دلی کی فضیلت اور سنگ دلی کے برے نتائج

اب رحم و مہربانی کی فضیلت اور سنگ دلی کی مذمت کی تفصیل کے بارے میں قرآن مجید اور حدیث شریف سے کچھ پیش کرتے ہیں:

ا۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی گئی ہے۔ یہ اگر ایک طرف اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربان ذات کے نام اور اس کے بھروسے پر کوئی کام شروع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ رحم اور مہربانی فرمائے گا کہ وہی بے حد مہربان ہے، نیز ان سورتوں میں جس قدر تعلیمات ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ انسان ہی کے فائدے کے لیے ہیں، تو دوسری طرف بسم اللہ یہ اشارہ بھی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہے تو اس کے بندے بھی مہربان ہونے چاہییے۔ اگر آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "سخی کے بیٹے" یا "غیرت مند کے بیٹے" تو اس جملے میں یہ ترغیب ہوتی ہے کہ "تو بھی سخاوت کر" اور "تو بھی غیرت کر"۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ کی ابتدا میں دیکھ لیجیے، کہ الحمدللہ رب العالمین کے فوراً بعد الرحمٰن الرحیم ہے، نیز قرآن مجید میں بعض مرتبہ جب اچھے بندوں کی صفت اور مدح بیان کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: عباد الرحمٰن یعنی "رحمان کے بندے"۔ اس میں بھی یہی ترغیب ہے۔

۲۔ سورۂ بقرۃ کی ابتدائی آیات پر نظر ڈالیں، اُن میں ہے:الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ”جو غیب (کی حقیقتوں) پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر) خرچ کرتے ہیں“۔

(سورۃ البقرۃ : آیت ۳)

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا ارشاد میں نجات وفلاح کی جو راہ بتلائی گئی ہے وہ غیبی حقائق پر ایمان لانے کے بعد نماز کا حکم ہے جس کا شمار حقوق اللہ میں ہوتا ہے، اور جس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا حکم زکوٰۃ (یعنی جو کچھ مال اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر خرچ کرتے ہیں، تو یہ) حقوق العباد کے متعلق ہے اور یہ مخلوق پر مہربانی کرنا ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں ستر سے زیادہ جگہوں میں حکمِ نماز کے ساتھ متصل ہی زکوٰۃ کا حکم آیا ہے ان میں بھی اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائیگی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھانے کا حکم ہے تو دوسری طرف مخلوق پر مہربانی کا ہے۔

۳۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنا، اور ماں باپ سے احسان (اچھا سلوک) کرنا، (نیز) رشتہ داروں، یتیموں اور محتاجوں سے بھی (اچھا سلوک اور مہربانی کرنا)، اور لوگوں سے اچھی اور بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دے دینا“۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۸۳)

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں دیکھیں کہ گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بندگی، تعلق اور محبت بڑھانے والی چیز (یعنی نماز) کا حکم ہے تو دوسری طرف مخلوقِ الٰہی پر مہربانی اور اس کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم ہے۔

۴۔ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَالسَّآئِلِیۡنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ”یہی نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی تو ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، آخرت

کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر اور سب پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور اس کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرنے لیے خرچ کرتے ہیں۔ نیز نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۷۷)

اس آیتِ کریمہ کی پوری تشریح صداقت کے بیان میں آرہی ہے۔ اس میں غور کریں تو یہی معلوم ہوگا کہ سارا کمال یہ نہیں ہے کہ کوئی کسی طرف منہ پھیر لے اور نماز پڑھے، بلکہ اس کے ساتھ چند بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ غیبی حقائق پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ نماز جیسی عبادات کا اہتمام کیا جائے، حقوق العباد کی ادائیگی کی جائے، مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور اس پر ترس کھایا جائے۔

۵۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۞ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۞ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۞ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۞ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۞ "متقی لوگ یقیناً جنتوں اور چشموں میں ہوں گے، ان کے رب نے جو عطا کیا ہوگا وہ اس کو (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے، وہ اس (دن) سے پہلے (دنیا کی زندگی میں) نیکوکار تھے۔ (وہ خوش بخت لوگ راتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کرتے تھے اور) بہت کم سوتے تھے، اور (پھر) آخری رات میں (اللہ تعالیٰ سے) معافی مانگا کرتے تھے، اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم لوگوں کا حق تھا (یعنی اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال و دولت میں صرف اپنے آپ اور اپنی اولاد کو حق دار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے محتاج بندوں اور جو ان کی مدد کے محتاج ہوں، ان کو بھی وہ حق دار سمجھ کر ان پر مہربانی کرنے کا التزام کیا کرتے تھے)"۔

(سورۃ الذاریات: آیت ۱۵ تا ۱۹)

مذکورہ بالا آیات میں غور کریں تو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے گی کہ جنت کے مزے ان لوگوں کو ملیں گے جو ایک طرف حقوق اللہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھانے والی بدنی عبادات کا اہتمام کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے تمام حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔

۶۔ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۞ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۞ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۞ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۞ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۞ "بے شک نیک لوگ (جنت میں) ایسی شراب کے جام پئیں گے جن میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ تعالیٰ کے بندے پئیں گے (اور جہاں جہاں چاہیں گے) اس چشمہ کو آسانی سے بہا کر لے جائیں گے۔ (یہ وہ لوگ ہوں گے) جو اپنی نذریں اور منتیں پوری کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کی مصیبت اور برائی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں، اور (اپنی زبان یا زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ) ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو بدلہ لینا چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گزاری (اور شاباش وغیرہ)"۔ (سورۃ الدھر: آیت ۵ تا ۹)

یہاں دیکھیے ایک طرف اللہ تعالیٰ پر ایمان، آخرت پر ایمان اور تعلق مع اللہ کا ذکر ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی کا۔

جہنمیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

۷۔ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۞ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۞ "اس لیے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ، جو عظمت والا ہے، پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا"۔

(سورۃ الحاقۃ: آیت ۳۳ تا ۳۴)

یہاں بھی جہنمی شخص کے جہنم میں پھینک دیے جانے کی دو وجوہات بتلائی گئی ہیں:

الف۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔

ب۔ وہ صرف بخیل و کنجوس ہی نہ تھا بلکہ اتنا سنگ دل تھا کہ دوسروں کو مسکین کے کھانا کھلانے اور مخلوق پر مہربانی کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔

۸۔ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۞ كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۞ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۞ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا ۞ وَتُحِبُّونَ

الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۞ ”اور جب اللہ تعالیٰ انسان کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ (ایسا) ہرگز نہیں، بلکہ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، اور مسکین کے کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے، اور میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو“۔ (سورۃ الفجر: آیت ۱۶ تا ۲۰)

یہاں ذلت، رسوائی، تنگی اور دلی پریشانیوں کی ایک وجہ یہ بھی بتلائی گئی ہے کہ یتیموں، مسکینوں اور دوسرے لوگوں کا حق مارا جائے اور مہربانی کی راہ چھوڑ کر بخل اور سنگ دلی کی راہ، جس میں سود، سٹہ، چوری، بخل سب داخل ہیں، اپنائی جائے۔

۹۔ وَمَآ اَدۡرٰكَ مَا الۡعَقَبَةُ۞ فَكُّ رَقَبَةٍ۞ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ۞ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ۞ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ۞ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ۞ ”اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ دشوار گزار گھاٹی (جس پر چل کر انسان حقیقی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے وہ کٹھن راستہ) کیا ہے؟ وہ (کٹھن اور نجات و ترقی کی راہ یہ ہے کہ) کسی کی گردن کو (غلامی سے) چھڑانا ہے، یا بھوک کے دن میں کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے ہوں اور جو ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور نصیحت کرتے ہیں اور (اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر) رحم و مہربانی کرنے کی وصیت اور نصیحت کرتے ہیں“۔

(سورۃ البلد: آیت ۱۲ تا ۱۷)

مذکورہ بالا آیات میں اس کٹھن راستے کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے جس میں انسان اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان سے لڑ کر حقیقی بلندیوں سے مزید بلندیوں پر پہنچتا ہے، یہی انسان کے لیے کامیابی کا راستہ ہے اور یہی اس کے لیے شایانِ شان ہے۔ اس راستے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا میں مخلوقِ الٰہی پر رحم و مہربانی کی راہ اپنا لے، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرے۔ نیز یہ کہ دوسروں کو بھی یہ وصیت اور نصیحت کرے کہ وہ پورے دین پر صبر و استقامت سے چلیں اور مخلوق پر مہربانی کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں، یہ بھی مخلوقِ الٰہی پر ایک قسم کی رحم و مہربانی ہے“۔

۱۰۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۙ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۙ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۙ ''پس جس نے (اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی میں مال) دیا اور (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے) ڈرتا رہا، اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی، تو ہم اس کے لیے آسانی (یعنی جنت کی راہ) کو آسان کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ہدایات سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلا دیا تو ہم اس کے لیے سخت (یعنی جہنم کی) راہ کو آسان کر دیں گے اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا جبکہ وہ (جہنم اور ہلاکت کے گڑھے میں) گرے گا۔ (سورۃ الیل: آیت ۵ تا ۱۱)

مذکورہ بالا آیت میں دو مختلف گروہوں کا بیان ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو فطرت کے مطابق چل کر حقیقی بلندیوں یعنی جنت تک پہنچ جاتا ہے، اس کی صفات یہ ہیں:

ایک بات یہ کہ بخل و سنگ دلی کے بجائے سخاوت اور رحم دلی کی راہ کو اختیار کرتا ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کرتا ہے، اور اپنے مال کو اچھے اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مدد کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اور اس کی زندگی کے تمام اعمال پر وہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اس کی رضا تلاش کرتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اچھی بات یعنی کلمۂ توحید (جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی پوری ہدایت اور تعلیمات سمٹ کر آجاتے ہیں، اس کلمہ اور اس کی تفصیلات) کی تصدیق کرتا ہے۔

یہ گروہ ایسی فطری راہ پر چل رہا ہے جو اس کو حقیقی بلندی، کامیابی اور جنت تک پہنچا دے گی۔

اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے جو سنگ دلی اور زر پرستی میں پوری طرح مبتلا ہے، اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے اور پرہیزگاری کے بجائے اللہ تعالیٰ سے بے نیازی اور بے پروائی کی راہ اختیار کرتا ہے۔

یہ گروہ ایسی راہ پر چل رہا ہے جو انسان کو ذلت و پستی اور جہنم کے گڑھوں میں پھینک دیتی ہے۔

۱۱۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۙ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۙ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يَقُوْمُ

النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "بربادی ہے کمی کرنے والوں کے لیے، جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب (لوگوں کو) ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو (ان کو) گھٹا کر دیتے ہیں، کیا ان لوگوں کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائیں جائیں گے، جس روز تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (سورۃ التطفیف: آیت ۱تا۶)

اپنا حق پورا پورا لینا اور لوگوں کا حق نقصان کے ساتھ ادا کرنا رحم کے خلاف اور سنگ دلی ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ مخلوق پر مہربانی نہیں کرتے اور ان کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے تو گویا ان لوگوں کا آخرت پر یقین نہیں ہے جیسا کہ سورۂ ماعون میں بھی اسی بات کو لایا گیا ہے۔

۱۲۔ اَرَاَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ "کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے، پس وہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، تو ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے، جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو دکھلاوا کرتے ہیں، اور ضرورت کی چیزیں (مثلاً کلہاڑی، ہانڈی، جیسی استعمال کی چیزیں یا نمک جیسی چھوٹی چھوٹی چیز) بھی (لوگوں کو) نہیں دیتے ہیں"۔

(سورۃ الماعون: آیت ۱تا۷)

دین سے مراد دینِ اسلام بھی لیا جاسکتا ہے اور اس سے مراد روزِ جزا اور قیامت بھی ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یتیموں، محتاجوں اور بے کسوں کی خبر نہ لینا، ان پر رحم نہ کرنا، مخلوقِ الٰہی پر رحم کے بجائے بے رحمی کرنا اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرنا دینِ اسلام یا روزِ آخرت کے جھٹلانے کا نتیجہ اور پھل ہے۔ اس طرح بخل اور سنگ دلی ان لوگوں کا شیوہ ہے جو دینِ اسلام یا روزِ آخرت کو نہیں مانتے، نیز اگر آدمی اپنے آپ کو نمازی سمجھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اس قدر تعلق اور محبت بھی نہیں جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم اور اس کے ساتھ ہمدردی رکھے تو ایسا شخص نماز کی حقیقت سے بہت دور ہے، اس کو نماز کا پھل اور نتیجہ مل ہی نہیں سکتا، اس کے نتیجے اور پھل سے وہ بالکل ناواقف ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں ان لوگوں کے لیے سخت تنبیہ موجود ہے جو اسلام کے نام لیوا ہیں اور نمازی بھی، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ نہیں رکھتے اور اس قدر بخیل اور سنگ دل ہوتے ہیں کہ وہ مخلوق پر چھوٹی چھوٹی مہربانیوں سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ مخلوق کی حقیر سی خدمت بھی نہیں کرتے، ایسے نمازیوں اور نمازی کہلانے والوں کا حال بھی گویا ان بدبختوں کی طرح ہے جو دینِ اسلام یا قیامت کے دن سے انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں ورنہ قرآن مجید ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جن میں مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور ان پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور بخل و سنگ دلی سے منع کیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد بطورِ نمونہ چند احادیثِ شریفہ کو بھی پڑھ لیجیے۔

رحم و ہمدردی کی فضیلت، اور بے رحمی و سنگ دلی کے متعلق چند احادیث

۱۔ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ یعنی "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔"

(بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، وہ فرماتے تھے: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ "رحمت (یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم و شفقت کرنے کے جذبے) کو کسی کے دل سے نہیں نکالا جاتا بدبخت کے دل سے ہی نکالا جاتا ہے (یعنی کافر یا فاجر شخص ہی ایسا ہے کہ جس کا دل سخت ہوتا ہے اور اس کا دل مخلوقِ الٰہی کے درد سے خالی ہوتا ہے)"۔ (احمد و ترمذی)

۳۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ یعنی "رحم کرنے والوں اور دوسروں پر ترس کرنے والوں پر "رحمٰن" رحم کرتا ہے، لہٰذا تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" (ابوداؤد و ترمذی)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ وَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ یعنی "مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں

سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبہ (یعنی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔"
(بیہقی و مشکوٰۃ)

یہ چند احادیث بطورِ نمونہ بیان کی گئی ہیں ورنہ احادیث میں مخلوق پر رحم و مہربانی کی جو فضیلت اور اس پر ظلم کرنے کی جو مذمت آئی ہے اس کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ مخلوق اور زمین پر بسنے والوں میں انسانوں کے تمام طبقات تو شامل ہیں ہی بلکہ اس میں انسانوں کے ساتھ جانور بھی شامل ہیں ۔ بہت سی احادیث میں صراحۃً جانوروں پر ترس کھانے کا حکم بھی فرمایا ہے حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بات بتلادی ہے کہ جانور مثلاً کتے پر رحم کرنے والا ایک شخص اس رحم اور مہربانی کی وجہ سے جنت کا مستحق ہو گیا۔ اس کے برعکس بلی پر ظلم کرنے والی عورت جہنمی بن گئی۔ اس کا بیان "جانوروں کے حقوق" میں ملے گا[1]۔

مخلوق پر رحم اور اس کی خدمت کا جذبہ بہت ہی اعلیٰ ہے

بلاشبہ جذبۂ رحم اور شفقت بہت ہی اعلیٰ جذبہ ہے۔ کسی غمگین اور مصیبت زدہ کو پا کر دل میں رقت پیدا ہو جانا، اس کے لیے تڑپنا، کسی پریشان حال یا غریب و مسکین کو دیکھ کر اُس پر ترس آجانا، اس کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا، اس کی مدد و تعاون کرنا اور بلا غرض مخلوق کی خدمت کرنا یہ سب کچھ اس جذبۂ ترحم کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ یہی جذبہ انسان کو مخلوقِ خدا کی ایذا رسانی سے دور رکھتا ہے اور نفع رسانی پر اُبھارتا ہے۔

مخلوقِ الٰہی کے جس قدر حقوق بیان کیے جاتے ہیں اور قرآن و حدیث میں ان کی ادائیگی پر جس قدر انعامات کا وعدہ کیا گیا ہے، یا سخاوت کے جس قدر فضائل آئے ہیں یہ سب حقوق، سخاوت اور خدمت اسی جذبۂ رحم کی تفصیلات ہیں۔ اس کے برعکس مخلوقِ الٰہی اور حقوق العباد میں کوتاہی کرنے پر جس قدر عذاب کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں وہ سب کچھ اسی جذبہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں جو مخلوقِ الٰہی کے ساتھ ظلم اور اس کے حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] حقوق و آداب کے نام سے حضرت مفتی صاحب کی کتاب چھپ چکی ہے۔ زین

رحم کے آثار یا علامات

جب انسان کے دل میں رحم اور مہربانی کا جذبہ ہوتا ہے تو وہ اس سے ہر عمل میں ظاہر ہو گا، مثلاً: مسکینوں سے محبت و شفقت سے پیش آنا، اُن کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اُن کو کھانا کھلانا، اُن کے فقر وفاقہ کو دور کرنے کے لیے حتی الوسع کوشش کرنا، یتیموں کی شفقت و محبت کے ساتھ پرورش کرنا، اچھائی کا حکم دینا ، برائی سے روکنا، ظالم کو دبانا اور مجرموں کو سزا دے کر ان کو جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرنا، ان کے جرائم اور ایذا رسانیوں سے شریف لوگوں کی حفاظت کرنا، مظلوموں کی مدد کرنا، ہر قسم کے ظلم کو ختم کر کے رحم اور عدل و انصاف والا معاشرہ بنانے کے لیے جدوجہد کرنا، مسلمانوں کی باہمی ناچاقیوں کو ختم کر کے ان کے درمیان صلح کرانا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، بڑوں کی عزت کرنا، اچھا سلوک کرنا، انسان تو کیا جانوروں پر بھی رحم اور ترس کھانا اور جانوروں کے ذبح اور مارنے میں بھی احسان و رحمت کا ظاہر ہونا۔ غرض یہ کہ جب انسان میں مہربانی آجاتی ہے اور جذبۂ رحم اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے تو اس سے تمام مہربانی والے کام خود بخود صادر ہونے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صحیح اور کامل بندگی کب ہو گی؟

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ جب تک خدمت گزاری نہ ہو، مخلوق پر رحم اور ترس نہ ہو اس وقت تک صحیح معنوں میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہو سکتی اور کوئی شخص اس وقت تک مخلوق کی خدمت سچائی کے ساتھ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ متواضع اور منکسر المزاج نہ ہو۔ مخلوق کی خدمت تو وہی کر سکتا ہے جس میں ''انانیت'' اور خود پسندی نہ ہو اور وہ یہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں، لہٰذا میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں، اور جس کا خیال یہ ہو کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (یعنی میں اس سے بہتر ہوں) تو اس شیطان کے بھائی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کو ایذا رسانی سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ میں سب سے بہتر ہوں، لہٰذا سب کو چاہیے کہ میری خدمت کریں، میں کسی کی خدمت کیوں کروں۔

غرض صحیح معنوں میں بندگی تب ہی ہو سکتی ہے جب انسان میں دو چیزیں آجائیں:

ایک یہ کہ شعائر اللہ (یعنی اوامر، احکامات، حدوداور تمام اشیاء جن کو اللہ تعالیٰ سے خصوصی نسبت ہو؛ ان سب) کی تعظیم و احترام ہو جو صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت دل پر چھائی ہوئی ہو۔

دوسری بنیاد مخلوقِ خدا پر شفقت کرنا(یعنی اس پر ترس کھانا) اس کی خدمت کرنا ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تواضع کا جذبہ ہو۔

ان دونوں بنیادوں کی اصل اللہ تعالیٰ سے صحیح اور قوی تعلق ہے۔ جس کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ کامل درجہ کا مؤمن اور اعلیٰ درجہ کا بندہ بن جاتا ہے۔ جس شخص کا جس قدر اللہ تعالیٰ سے صحیح اور قوی تعلق ہو گا وہ اسی قدر مخلوقِ الٰہی پر شفقت کرنے والا اور ترس کھانے والا ہو گا جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرنے والا ہو۔ (بیہقی و مشکوٰۃ)

رحم اور خدمت گزاری کے فوائد

خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق پر ترس کھانے اور اس کی خدمت کرنے میں بہت بڑے فوائد ہیں۔ شریعت میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس پر بہت اجر وثواب کے وعدے ہیں۔ مخلوقِ خدا پر مہربانی، رحم وشفقت کرنے اور لوگوں کی خدمت کرنے میں کچھ ایسی خاصیتیں ہیں جو اور کسی عبادت میں نہیں۔ اس سے نفس کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے، بڑائی اور گھمنڈ دماغ سے نکل جاتا ہے، عاجزی اور تواضع آجاتی ہے، اچھے اخلاق، تہذیب اور آداب پیدا ہو جاتے ہیں اور خدا کی خاص رحمت کے مستحق بس وہی نیک دل بندے ہوتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے رحم وشفقت ہو۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ خدا تک پہنچنے کا بہتر اور نزدیک تر راستہ مخلوقِ خدا کو راحت و آرام پہنچانے سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سنگ دلی اور مخلوق پر ترس نہ کھانا ایک زبردست روحانی مرض ہے اور انسان کی بد بختی کی بہت بڑی نشانی ہے۔ بدبخت انسان ان تمام فائدوں سے محروم رہتا ہے جو ایک رحم دل انسان کے لیے ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے سخت عذاب ہو گا اور اللہ رحمن کی رحمت سے محروم

رہیں گے۔

رحم کی صورت میں دوسروں پر ظلم

یاد رہے کہ احسان و رحم اس وقت رحم و احسان سمجھا جائے گا جبکہ کسی پر رحم کرنے میں کسی دوسرے شخص یا قوم کا حق نہ مارا جائے، بصورتِ دیگر یہ رحم، ظلم اور خیانت ہو گا، اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱۔ مدرسہ کا ایک فقیر مدرِّس اور معلِّم اپنے درس کے کام کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا، نہ صحیح پڑھاتا ہے اور نہ اس سے طلباء کو کوئی فائدہ ہے، یہاں بظاہر اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحم کا تقاضا یہ ہے کہ اس فقیر مدرِّس کو برقرار رکھا جائے لیکن اس کو باقی رکھنے میں طلبا پر ظلم اور بے رحمی ہے، ایسی صورت میں مدرسہ کے طلبا کا حق مارا جاتا ہے، لہٰذا یہاں فقیر مدرِّس کو ہٹانا نہ صرف یہ کہ طلبا پر رحم ہے بلکہ مدرسہ کے مال کو بھی بے جا اور ناحق خرچ سے بچانا ہے اور خیانت سے بھی بچنا ہے اگرچہ فقیر بھی ضرور اچھے سلوک کا مستحق ہے مگر اس کی امداد مدرسہ سے نہیں کسی دوسرے جائز طریقے سے کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی منصب اور عہدے پر کسی ایسے شخص کو فائز کرنا جو اس کا اہل نہ ہو، یہ اگرچہ ایک فرد کے حق میں قابلِ رحم سمجھا جاتا ہے لیکن دوسری طرف اپنی قوم اور ملک کے لوگوں پر ایک عظیم ظلم، بے رحمی اور ان کے ساتھ خیانت ہے۔

۲۔ اگر کوئی مزدور کسی شخص کو ہوٹل کے مالک کی اجازت کے بغیر مفت کھانا کھلاتا ہے تو یہ بھی اگرچہ اس شخص پر رحم و احسان کرتا ہے، لیکن احسان اور رحم کا یہ طریقہ غلط ہے، کیونکہ دوسری طرف یہ مالک کا حق مارنا اور اس پر ظلم کرنا ہے اور اس کے مال و نوکری میں خیانت کرنا ہے۔ اگر یہ مزدور کسی پر احسان کرنا چاہتا ہے تو اپنے پاس سے کرایہ ادا کرکے اس کے ساتھ احسان کرے نہ کہ دوسروں کی ملکیت میں ناجائز اور ناحق تصرف کرے۔ اسی طرح کسی بھی نوکر یا ملازم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ گاڑی یا کمپنی یا دکان میں سے کسی کے ساتھ ایسا احسان کریں جس کی مالک نے اجازت نہیں دی اگر وہ اس طرح کوئی بے جا احسان کرتا ہے تو یہ مالک کے ساتھ ظلم اور خیانت ہے۔

۳۔ جس شخص کا اعلانیہ جرم اسلامی عدالت میں ثابت ہو جائے، ایسے مجرم کو سزا نہ دینا اگرچہ مجرم پر رحم سمجھا جاتا ہے، لیکن ایسے جرم کو معاف کرنا پوری قوم کے حق کو مارنا ہے لہٰذا ایسے اعلانیہ جرم میں رحم کا تقاضا یہ ہے کہ بجائے ایک فرد کے پوری قوم پر رحم کھایا جائے اور مجرموں کو سخت سزائیں دے کر قوم اور ملک کے مال و دولت، عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔

سانپ، بچھو کو مارنا یا ظالموں کا ہاتھ ظلم سے روکنا بھی مخلوق پر رحم ہی ہے

غرض یہ کہ خدمت اور رحم دلی کے مختلف مواقع ہوتے ہیں، کبھی کسی کو سزا دینا اس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے جیسے اولاد یا شاگرد کو مناسب ڈانٹنا، البتہ حد سے زیادہ ڈانٹ بے رحمی اور ظلم میں شمار ہو گا یا کسی کو اس لیے سزا دینا کہ دوسرے لوگ اس کے شر اور تکلیف سے بچ جائیں جیسے چور، ڈاکوؤں اور دوسرے مجرموں کو سزا دینا، قاتلوں کو قصاص میں قتل کرنا یہ عوام اور رعایا کے ساتھ رحم ہی کا تقاضا ہے۔ اگر مجرموں کو سزا نہ دی جائے تو بے چارے عوام ظالموں کے مظالم اور مجرمین کے جرائم کا اور زیادہ نشانہ بنیں گے۔ اسی طرح سانپ، بچھو جیسے موذی جانوروں کو مار ڈالنے کا حکم شریعتِ مطہرہ میں موجود ہے، یہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں کفار کے ساتھ لڑنا، جھگڑنا بے رحمی نہیں، بلکہ انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اس سے قوانینِ جاہلیت کو مٹایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلند کیا جاتا ہے۔ حکمِ الٰہی کے نفاذ سے مظلوم انسانیت کی دادرسی ہوتی ہے، رشد و ہدایت کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے وہ رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں جو کہ دعوتِ حق اور نفاذِ حق کی راہ میں حائل ہوں۔ اس کے متعلق مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ جہاد کے بیان میں آئے گی۔

مہربانی کی تعلیم اور مسلمانوں کی اکثریت

افسوس یہ ہے کہ مخلوق پر مہربانی اور اس پر ترس کھانے کی دینِ اسلام میں اس قدر اہمیت کے باوجود مسلمان اس سے غافل ہو گئے ہیں، بلکہ بظاہر دیندار لوگ بھی مخلوقِ الٰہی کے ساتھ رحم و شفقت کا معاملہ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں، ان میں نقصان کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلم قوم عمومی طور پر ذلت اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت

فرمائے اور ہمارے دلوں کو رحم سے بھر دے اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اس کے بعد سنگ دلی اور بے رحمی کے علاج کو بھی پڑھ لیجیے:

بے رحمی اور سنگ دِلی کا علاج

۱۔ مخلوقِ خداوندی کے ساتھ ہر قسم کی خیر خواہی، ان کو ہر قسم کی سہولت پہنچانے اور ان کی خدمت کرنے کا تکلف سے اہتمام کریں البتہ خدمات مختلف ہیں، استعداد اور قوتیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ضرورتیں بھی۔ اس لیے جو جائز خدمت اور ضرورت آپ سے کسی دوسرے کی پوری ہو سکے اور جس قدر ہو سکے اس کو سر انجام دینے کی کوشش کریں، مثلاً: آپ کو معلوم ہوا کہ فلاں جگہ ایک ایسا شخص رہتا ہے جو بہت غربت اور مسکنت میں وقت گزارتا ہے، لیکن کسی سے سوال نہ کرنے کی وجہ سے کسی کو اس کے حال کی خبر نہیں ہے تو اس کی غربت اور مسکنت دور کیے بغیر نہ چھوڑیں۔ ایک تو خود اس کی مدد کریں اگر آپ خود بھی کمزور ہیں اور اس کی پوری خبر نہیں لے سکتے تو جتنا آپ سے ہو سکے وہ تو ضرور کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے حال سے خبر دار کریں۔ اگر کوئی محتاج اور بے کس ہے یا بیمار ہے تو اس کی خدمت یہ بھی ہے کہ اس کو علاج کے لیے کچھ رقم دی جائے اور یہ بھی ہے کہ اسے حکیم یا ڈاکٹر کے پاس پہنچایا جائے اور یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ لگ جائے، پانی وغیرہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ دیا کرے۔ حکیم یا ڈاکٹر کے لیے اس کی خدمت یہ ہے کہ وہ اس کا علاج خیر خواہی سے کریں اور جس قدر ہو سکے اس کے ساتھ تعاون کریں۔ غرض یہ کہ جس شخص کی قدرت میں جس قسم کی خدمت ہو وہ اس کرنے میں دریغ نہ کرے۔ اگر کسی محتاج اور مصیبت زدہ کی کچھ بھی خدمت کرنی آپ کے بس میں نہیں تو اس کے لیے دعا کرنا بھی اس کے ساتھ تعاون ہو گا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یا اللہ! آپ ہی اپنے اس بندے پر رحم فرمائیں اور اس سے اس مصیبت کو رفع فرمادیں وغیرہ۔

لوگوں کی خدمت بیمار پرسی، خبر گیری بہ تکلف کریں، رفتہ رفتہ خدمت کی عادت پڑ جائے گی۔

اسی طرح دوسرے رحم دلی کے کام بہ تکلف کیا کریں تو دل میں رحم کا مادہ پیدا ہو جائے گا، مثلاً: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا، اس پر شفقت کرنا، کسی محتاج کی رفع احتیاج کرنا، مساکین کو کھانا کھلانا، یہ سب جذبہ رحم کے

آثار ہیں۔ یہی اعمال اگر بہ تکلف کر لیے جائیں توان شاء اللہ تعالیٰ ان کے کرنے والے کے دل میں رحم کی یہ کیفیات پیدا ہو جائیں گی۔ اسی طرح کوئی بھی کیفیت یا نیک جذبہ اگر پیدا کرنا ہو تو اس کی ایک تدبیر یہ ہے کہ اس جذبے کے جو آثار و نتائج ہوں ان کو بہ تکلف اختیار کرلے ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ بعد وہ جذبہ یا وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور یہی علاج نبی کریم ﷺ نے بھی بتلایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اِمْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ "یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو"۔ (مسند احمد)

یعنی مہربانی کے کاموں کو اپناؤ تو مہربانی دل میں جڑ پکڑ لے گی۔

۲۔ حقوق العباد کی ادائیگی (یعنی جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بتلائے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنے) کا خوب اہتمام کریں، کسی کا حق نہ چھوٹنے پائے۔ حقوق العباد کا بیان حقوق و آداب نامی کتاب میں موجود ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے رحم دلی اور مخلوق کی خدمت گزاری کی دعا کرے اور مہربانی کا جو کام کرے اس پر فخر نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مہربانی کے کام کرنے کی توفیق دی۔

کسی پر شفقت اور اس کی خدمت کے شرائط و آداب

۱۔ جو کام مخلوق کی فائدہ رسانی کے لیے کریں اسے نیک دلی اور ہنسی خوشی سے کریں۔

۲۔ خدمت میں کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، نہ کسی پر احسان ہو اور نہ اس میں خود نمائی اور ریا ہو۔

۳۔ جس کی خدمت کرنی ہو، اس کی طبیعت کے جائز رجحان کے مطابق ہو، مثلاً: اگر اس کو کچھ پیش کرنا ہو تو اس کی طبیعت، مزاج اور اس کی ضرورت کو مد نظر رکھیں، اس کا مزاج معلوم کریں اگر وہ بیمار ہے یا تھکا ہوا ہے اور اس کو آرام پہنچانے کے لیے دبانے کی ضرورت ہو تب بھی اس کا مزاج معلوم کریں۔ غرض کسی کے ساتھ ہمدردی، اس پر شفقت اور اس کی خدمت ایسی کرنی چاہیے کہ اس سے وہ خوش ہو جائے، اس کو فائدہ ہو اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

۴۔ مخلوق کی خدمت اور اس پر ترس کھانے والے کاموں کی انجام دہی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں

اور جو کوتاہی ہو اس پر پشیمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں۔ اگر کبھی خدمت اور رحم دلی کے کام انجام دینے میں کسی کو ایذا یا نقصان پہنچے تو اس سے معافی مانگیں، معذرت کریں اور جو نقصان ہوا ہو اس کا تاوان بھی دیں البتہ اگر وہ معاف کر دے اور تاوان نہ مانگے تو اس اچھے برتاؤ پر اس کا شکریہ ادا کریں۔

۵۔ مخلوق پر شفقت اور اس پر ترس کھانے اور خدمت کرنے والے کاموں کو سیکھیں تاکہ صحیح طرح خدمت کر سکیں۔ بعض امور ایسے بھی ہیں جو مخلوق کی خدمت سمجھے جاتے ہیں، لیکن وہ دنیا یا آخرت میں نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں جیسے کوئی کسی کی خدمت منشیات پلانے سے کرے یا مثلاً کسی خطرناک مجرم کو سزا دیے بغیر چھوڑ دے یا کسی یقینی بدعتی اور ملحد کی تکریم و تعظیم کرے جس کی وجہ سے دوسرے عوام اس کے دام تزویر اور بدعت میں پھنس جائیں، اس طرح کی خدمت بجالانے میں شریعتِ مطہرہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس کے بعض احکام اسی کتاب میں آچکے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمالیں۔

مؤمن کے رحم و مہربانی اور ایثار کے واقعات

ایثار اپنی ضرورت کے وقت دوسرے کو ترجیح دینے اور اپنی ضرورت کے بجائے دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کا نام ہے۔

مؤمن مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک اور اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتا ہے اور مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ اگرچہ ہر مؤمن کے اندر صفتِ رحم بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے لیکن انبیا علیہم السلام میں یہ صفت اس پیمانے پر ہوتی ہے کہ وہ مخلوق خدا کے لیے ایسے تڑپتے ہیں جیسے کہ مچھلی کو پانی سے باہر نکال دیا جائے۔ پھر خصوصاً حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے تمام مؤمنوں کے سردار سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی کا حال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "اور ہم نے آپ کو تو بس جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

(سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۷)

یاد رہے کہ رحم و مہربانی صرف نرمی یا کسی کو کچھ دینے کا نام نہیں، بلکہ رحم کا اثر انسان کے ہر ہر

عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کی عزت، یتیموں، بیواؤں، محتاجوں اور فقیروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان، بندوں کے حقوق کی ادائیگی، مخلوق کی خدمت، سخاوت، دوسروں کو بھلائی اور نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے بچانے کی کوشش کرنا تاکہ لوگ دنیا و آخرت کی ناکامیوں اور بربادیوں سے بچ سکیں، اس طرح مظلوم کی مدد کرنا، ظالم کا ہاتھ ظلم سے روکنا اور ضرورت پڑے تو باطل اور ظلم کے خلاف جہاد اور آپریشن کرنا؛ یہ اور اس طرح کے تمام امور رحمت کے دائرے میں داخل ہیں۔

نبی کریم ﷺ بچپن ہی سے رحم دلی، وفاداری، راست گوئی، سچائی، دیانت داری، نیک چلنی، صفائی معاملات اور غریبوں، محتاجوں کے ساتھ ہمدردی وغیرہ جملہ اخلاقِ محمودہ میں اس قدر مشہور تھے کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم والوں نے امین کا لقب دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے رسول ﷺ پر ایمان اور قرآن مجید اور اس کی تعلیمات پر ایمان ویقین کا اثر جن پر ہوا، ان لوگوں کی مہربانی کے کچھ واقعات ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رحم ومہربانی کے واقعات

۱۔ ایک دفعہ ایک قافلہ مدینہ منورہ میں آیا اور شہر کے باہر اترا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی خبر گیری اور حفاظت کے لیے خود تشریف لے گئے۔ پہرہ دیتے پھرتے تھے کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے۔ دیکھا کہ ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ ماں کو تاکید کی کہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ادھر سے گزرے تو بچے کو روتا پایا۔ غیظ میں آکر فرمایا: تو بڑی بے رحم ماں ہے۔ اس نے کہا: تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں، خواہ مخواہ مجھ کو دق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا ہے کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے، میں اسی غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رقت ہوئی اور کہا: ''ہائے عمر رضی اللہ عنہ! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔'' اسی دن سے منادی کرادی کہ بچے جس دن پیدا ہوں اسی تاریخ سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔

۲۔ اسلم (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، اس) کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کے لیے نکلے۔ مدینہ سے ۳ میل پر صرار ایک مقام ہے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکار ہی ہے اور

دو تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی۔ اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے ان کے بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھادی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وقت اٹھے اور مدینہ میں آکر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو، اسلم نے کہا: میں لیے چلتا ہوں، فرمایا: ہاں! لیکن قیامت کے دن میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود چولہا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا: خدا تم کو جزائے خیر دے، سچ یہ ہے کہ امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ۔

۳۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خلافت کے زمانہ میں بسا اوقات رات کو چوکیداری کے طور پر شہر کی حفاظت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی حالت میں ایک میدان میں گزر ہوا، دیکھا کہ ایک خیمہ بالوں کا بنا ہوا لگا ہے جو پہلے وہاں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب وہاں بیٹھے ہیں اور خیمہ سے کچھ کراہنے کی آواز آرہی ہے۔ سلام کرکے ان صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ایک مسافر ہوں، جنگل کا رہنے والا ہوں، امیر المؤمنین کے سامنے کچھ اپنی ضرورت پیش کرکے مدد چاہنے کے واسطے آیا ہوں۔ دریافت فرمایا کہ یہ خیمہ میں سے آواز کیسی آرہی ہے؟ ان صاحب نے کہا: میاں جاؤ اپنا کام کرو۔ آپ نے اصرار فرمایا کہ نہیں! بتادو، کچھ تکلیف کی آواز ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب ہے، دردِ زہ ہو رہا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کوئی دوسری عورت بھی پاس ہے۔ انہوں نے کہا: کوئی نہیں۔

آپ وہاں سے اٹھے اور مکان تشریف لے گئے اور اپنی بیوی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ایک بڑے ثواب کی چیز مقدر سے تمہارے لیے آئی ہے۔ انہوں نے پوچھا: کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک گاؤں کی رہنے والی بے چاری تنہا ہے، اس کو دردِ زہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہاں ہاں! تمہاری صلاح ہو تو میں تیار ہوں، اور کیوں نہ ہوتیں کہ یہ بھی آخر حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ہی صاحبزادی

تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ولادت کے واسطے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہو، تیل، گودڑ وغیرہ لے لو اور ایک ہانڈی اور کچھ گھی اور دانے وغیرہ بھی ساتھ لے لو۔ وہ لے کر چلیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود پیچھے پیچھے ہو لیے۔

وہاں پہنچ کر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تو خیمہ میں چلی گئیں اور آپ نے آگ جلا کر اس ہانڈی میں دانے اُبالے، گھی ڈالا۔ اتنے میں ولادت سے فراغت ہو گئی۔ اندر سے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے آواز دے کر عرض کیا: امیر المؤمنین! اپنے دوست کو لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دیجیے۔ امیر المؤمنین کا لفظ جب ان صاحب کے کان میں پڑا تو وہ بڑے گھبرائے۔ آپ نے فرمایا: گھبرانے کی بات نہیں۔ پھر وہ ہانڈی خیمہ کے پاس رکھ دی کہ اس عورت کو بھی کچھ کھلا دیں۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے اس کو کھلایا، اس کے بعد ہانڈی باہر رکھ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بدو سے کہا کہ لو تم بھی کھاؤ، رات بھر تمہاری جاگنے میں گزر گئی۔ اس کے بعد اہلیہ کو ساتھ لے کر گھر تشریف لے آئے اور ان صاحب سے فرمایا کہ کل آنا تمہارے لیے انتظام کر دیا جائے گا۔

ف: ہمارے زمانے کا کوئی بادشاہ یا رئیس نہیں کوئی معمولی حیثیت کا مال دار بھی ایسا ہے جو غریب کی ضرورت میں مسافر کی مدد کے واسطے اس طرح بیوی کو رات کو جنگل میں لے جائے اور خود اپنے آپ چولھا دھونک کر پکائے۔ مال دار کو چھوڑیئے کوئی دین دار بھی ایسا کرتا ہے؟ سوچنا چاہیے کہ جن کے نام لیوا ہیں اور ان جیسی برکات کی ہر بات میں امید رکھتے ہیں کوئی کام بھی ہم ان جیسا کر لیتے ہیں۔

(حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم: ٦٩)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مہربانی

حضرت سعید بن ابی ہلال رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جُحفہ مقام پر قیام فرمایا اور وہ بیمار بھی تھے۔ انہوں نے کہا: مچھلی کھانے کو میرا دل چاہ رہا ہے۔ ان کے ساتھیوں نے بہت تلاش کیا، بس ایک مچھلی ملی۔ ان کی بیوی حضرت صفیہ بنت ابی عبید نے اس مچھلی کو لیا اور اسے تیار کر کے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اتنے میں ایک مسکین اُن کے پاس آیا۔ انہوں نے اس مسکین سے کہا کہ تم یہ مچھلی لے لو۔ اس پر ان کی بیوی نے کہا: سبحان اللہ! ہم نے بڑی مشقت اٹھا کر یہ مچھلی خاص طور پر آپ

کے لیے تیار کی ہے (اس لیے اسے تو آپ خود کھائیں)، ہمارے پاس سامان ہے، اس میں سے اس مسکین کو دے دیں گے۔ انہوں نے (اپنا نام لے کر) کہا: عبداللہ کو یہ مچھلی بہت پسند آرہی ہے (اس لیے اس مسکین کو یہی مچھلی دینی ہے)۔ (اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ: ۲/۲۹۷)

ابن سعد نے اس جیسی روایت ذکر کی ہے، اس میں یہ ہے کہ ان کی بیوی نے کہا: ہم اس مسکین کو ایک درہم دے دیتے ہیں، یہ درہم اس مچھلی سے زیادہ اس کے کام آئے گا، آپ یہ مچھلی کھائیں اور اپنی چاہت پوری کریں۔ انہوں نے کہا: میری چاہت وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔

(اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ: ۴/۱۲۲، من طریق عمر ابن سعد بنحوہ واخرجہ ابن سعد عن حبیب بن ابی مرزوق مع زیادۃ بمعناہ)

بکرے کی سری کا گھوم پھر کر لوٹ آنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک صحابی کو کسی شخص نے بکری کی سری ہدیہ کے طور پر دی۔ انہوں نے خیال فرمایا کہ میرے فلاں ساتھی زیادہ ضرورت مند ہیں، کنبہ والے ہیں، وہ اور ان کے گھر والے زیادہ محتاج ہیں، اس لیے ان کے پاس بھیج دی۔ ان کو ایک تیسرے صاحب کے متعلق یہی خیال پیدا ہوا اور ان کے پاس بھیج دی۔ غرض اسی طرح سات گھروں میں پھر کر وہ سری سب سے پہلے صحابی رضی اللہ عنہ کے گھر لوٹ آئی۔

ف: اس قصہ سے ان حضرات کا عام طور سے محتاج اور ضرورت مند ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہر شخص کو دوسرے کی ضرورت اپنے سے مقدم معلوم ہوتی تھی۔ (حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم: ۶۸)

صحابہ رضی اللہ عنہم کا دوسروں کی وجہ سے پیاسے مرنا

حضرت ابو جہم بن حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یرموک کی لڑائی میں میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا کہ وہ لڑائی میں شریک تھے، اور ایک مشکیزہ پانی کا اپنے ساتھ لیا کہ ممکن ہے وہ پیاسے ہوں تو پانی پلادوں۔ اتفاق سے وہ ایک جگہ اس حالت میں پڑے ہوئے ملے کہ دم توڑ رہے تھے اور جان کنی شروع تھی۔ میں نے پوچھا: پانی کا گھونٹ دوں؟ انہوں نے اشارے سے ہاں کی۔ اتنے میں دوسرے صاحب نے، جو قریب ہی پڑے تھے اور وہ بھی مرنے کے قریب تھے، آہ کی۔ میرے چچازاد بھائی نے آواز سنی تو مجھے ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس پانی لے کر گیا۔ وہ ہشام رضی اللہ عنہ بن ابی العاص تھے۔ ان

کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ان کے قریب ایک تیسرے صاحب اسی حال میں پڑے دم توڑ رہے تھے، انہوں نے آہ کی۔ ہشام رضی اللہ عنہ نے مجھے ان کے پاس جانے کا اشارہ کر دیا۔ میں ان کے پاس پانی لے کر پہنچا تو ان کا دم نکل چکا تھا۔ ہشام رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا تو وہ بھی جان بحق ہو چکے تھے۔ ان کے پاس سے اپنے چچازاد بھائی کے پاس لوٹا تو اتنے میں وہ بھی ختم ہو چکے تھے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ف: اس قسم کے متعدد واقعات کتبِ حدیث میں ذکر کیے گیے ہیں۔ کیا انتہا ہے اس ایثار کی کہ اپنا بھائی دم توڑ رہا ہو اور پیاسا ہو، ایسی حالت میں کسی دوسرے کی طرف توجہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اس کو پیاسا چھوڑ کر دوسرے کو پانی پلانے چلا جائے اور ان مرنے والوں کی روحوں کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و فضل سے نوازیں کہ مرتے وقت بھی جب ہوش و حواس سب ہی جواب دے دیتے ہیں، یہ لوگ ہمدردی میں جان دیتے ہیں۔

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا رحم

ان کے پاس ایک خچر تھا جس کو ان کا غلام کرایہ پر چلاتا تھا، کرایہ کی آمدنی معمولاً روزانہ ایک درہم تھی۔ ایک دن غلام ڈیڑھ درہم لایا، تو بولے کہ یہ اضافہ کیونکر ہوا؟ اس نے کہا: آج بازار تیز تھا۔ بولے: نہیں! تم نے جانور سے زیادہ کام لیا، اس کو اب تین دن آرام کرنے دو۔

(سیرۃ عمر بن عبد العزیز:۷۹)

ڈاک کے جانوروں کے متعلق حکم دیا تھا کہ ان کے کوڑے کی نوک میں چُبھنے والا لوہا نہ لگایا جائے اور ان کے منہ میں بھاری لگام نہ دی جائے۔ (کتاب الخراج:۱۱۵)

مصر کے عامل حیان کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مصر میں بار برداری کے اونٹوں پر ہزار رطل وزن کا بوجھ لادا جاتا ہے، اب میرے اس خط کے پہنچنے کے بعد مجھ کو یہ معلوم نہ ہو کہ کسی اونٹ پر چھ سو رطل سے زیادہ کا بوجھ لادا گیا۔ (سیرۃ ابن الحکم:۱۶۶)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا صدقہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں دو گونیں (دو بڑے بڑے بورے) درہموں کی بھر کر پیش کی گئیں جن میں ایک لاکھ سے زیادہ درہم تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے طباق منگایا اور ان کو بھر بھر

کر تقسیم فرمانا شروع کر دیا اور شام تک سب ختم کر دیے، ایک درہم بھی باقی نہ چھوڑا۔ خود روزہ دار تھیں۔ افطار کے وقت باندی سے کہا کہ افطار کے لیے کچھ لے آؤ۔ وہ ایک روٹی اور زیتون کا تیل لائیں اور عرض کرنے لگیں کہ کیا اچھا ہوتا کہ ایک درہم کا گوشت ہی منگا لیتیں، آج ہم روزہ گوشت سے افطار کر لیتے۔ فرمانے لگیں :اب طعن دینے سے کیا ہو، اُس وقت یاد دلاتی تو میں منگا لیتی۔

ف: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اس قسم کے نذرانے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرات کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے کیونکہ وہ زمانہ فتوحات کی کثرت کا تھا۔ مکانوں میں غلہ کی طرح اشرفیوں کے انبار پڑے رہتے تھے اور اس کے باوجود اپنی زندگی نہایت سادہ اور نہایت معمولی گزاری جاتی تھی، حتیٰ کہ افطار کے واسطے بھی ماما کے یاد دلانے کی ضرورت تھی۔ پچیس ہزار روپے کے قریب تقسیم کر دیا اور یہ بھی خیال نہ آیا کہ میرا روزہ ہے اور گوشت بھی منگانا ہے۔

آج کل اس قسم کے واقعات اتنے دور ہو گئے ہیں کہ خود واقعہ کے سچا ہونے میں تردد ہونے لگا، لیکن اس زمانہ کی عام زندگی جن لوگوں کی نظر میں ہے ان کے نزدیک یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات کچھ بھی تعجب کی چیز نہیں۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بہت سے واقعات اس کے قریب قریب ہیں۔ ایک دفعہ روزہ دار تھیں اور گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک فقیر نے آکر سوال کیا۔ خادمہ سے فرمایا کہ وہ ایک روٹی اس کو دے دو۔ اس نے عرض کیا کہ افطار کے لیے گھر میں کچھ بھی نہیں۔ فرمایا: کیا مضائقہ ہے، وہ روٹی اس کو دے دو، اس نے دے دی۔ **(حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم:۱۱۳)**

محمد بن منکدر رحمہ اللہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی سخت حاجت کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس اس وقت بالکل کچھ نہیں ہے، اگر میرے پاس دس ہزار بھی ہوتے تو سب کے سب تمہیں دے دیتی مگر اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خالد بن اسد کے پاس سے دس ہزار کا ہدیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچا۔ فرمانے لگیں کہ میری بات کا بہت جلد امتحان لیا گیا، جب ہی ابن المنکدر کے پاس آدمی بھیجا اور ان کو بلا کر وہ ساری رقم ان کے حوالہ کر دی، جس میں سے ایک ہزار میں انہوں نے ایک باندی خریدی جس کے پیٹ سے تین لڑکے محمد، ابو بکر اور عمر پیدا ہوئے۔ تینوں کے تینوں مدینہ منورہ کے عابد لوگوں میں شمار ہوتے

تھے۔ (تہذیب التہذیب)

کیا ان تینوں کی عبادت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حصہ نہ ہو گا کہ وہی ان کے وجود کا سبب ہوئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سخاوت کے واقعات ان کے ابا جان رضی اللہ عنہ کی طرح احاطہ سے باہر ہیں۔ تمیم بن عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ (اپنے والد کی خالہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ انہوں نے ستّر ہزار درہم تقسیم کیے اور وہ خود پیوند لگا ہوا کُرتہ پہن رہی تھیں۔ (اتحاف)

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ایثار

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور اپنی حاجت پیش کر کے کچھ مدد چاہی اور سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: تیرے سوال کی وجہ سے جو مجھ پر حق قائم ہو گیا ہے وہ میری نگاہ میں بہت اونچا ہے اور تیری جو مدد مجھے کرنا چاہیے وہ میرے نزدیک بہت زیادہ مقدار ہے، اور میری مالی حالت اس مقدار کے پیش کرنے سے عاجز ہے جو تیری شان کے مناسب ہو، اور اللہ کے راستہ میں تو آدمی جتنا بھی زیادہ سے زیادہ خرچ کرے وہ کم ہے، لیکن میں کیا کروں، میرے پاس اتنی مقدار نہیں ہے جو تیرے سوال کے شکر کے مناسب ہو۔ اگر تو اس کے لیے تیار ہو کہ جو میرے پاس موجود ہے اس کو تو خوشی سے قبول کر لے اور مجھے اس پر مجبور نہ کرے کہ میں اس مقدار کو کہیں سے حاصل کروں جو تیرے مرتبہ کے مناسب ہو اور تیرا جو حق مجھ پر واجب ہو گیا ہے اس کو پورا کر سکوں تو میں بخوشی حاضر ہوں۔ اس سائل نے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے! جو کچھ آپ دیں گے اسی کو قبول کر لوں گا اور اس پر شکر گزار ہوں گا اور اس سے زیادہ نہ کرنے میں آپ کو معذور سمجھوں گا۔

اس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے خزانچی سے فرمایا کہ ان تین لاکھ درہموں میں سے (جو تمہارے پاس رکھوائے تھے) جو بچے ہوں لے آؤ۔ وہ پچاس ہزار درہم لائے (کہ اس کے علاوہ سب خرچ کر چکے تھے)۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پانچ سو دینار (اشرفیاں) اور بھی تو کہیں تھے۔ خزانچی نے عرض کیا کہ وہ بھی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ بھی لے آؤ۔ جب یہ سب کچھ آگیا تو اُس سائل سے کہا کہ کوئی مزدور لے آؤ جو ان کو تمہارے گھر تک پہنچا دے۔ وہ دو مزدور لے کر آئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے وہ سب کچھ ان کے حوالہ کر دیا اور اپنے بدن مبارک سے چادر اتار کر مرحمت فرمائی کہ ان

مزدوروں کی مزدوری بھی تمہارے گھر تک پہنچانے کی میرے ذمہ ہے، لہٰذا یہ چادر فروخت کرکے ان کی مزدوری میں دے دینا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو اب کھانے کے لیے ایک درہم بھی باقی نہیں رہا، آپ نے سب کا سب ہی دے دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات سے اس کی قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے مجھے اس کا بہت ثواب دے گا۔ سب کچھ دے دینے کے بعد جب کہ اپنے پاس کچھ بھی نہ رہا اور مقدار بھی اتنی زیادہ تھی پھر اس کا قلق اور اس کی ندامت تھی کہ سائل کا حق ادا نہ ہو سکا۔ (بحوالہ احیاء العلوم)

رحم و مہربانی اور ایثار کے متفرق واقعات

۱۔ ابوالحسن انطاکی خراسان کے شہروں میں ایک جگہ "رَیّ" ہے، وہاں رہتے تھے۔ ایک دن تیس آدمیوں سے زیادہ مہمان آ گئے اور روٹی تھوڑی تھی۔ تیاری کا موقع نہ تھا۔ رات کا وقت تھا، انہوں نے جتنی روٹیاں موجود تھیں، سب کے ٹکڑے کیے اور دستر خوان پر ان کو پھیلا کر سب کو بٹھایا اور چراغ گل کر دیا اور سب کے سب نے کھانا شروع کر دیا۔ سب کے منہ چلانے کی آواز آتی تھی۔ جب دیر ہو گئی، گویا سب بالکل فارغ ہو گئے تو چراغ جلایا گیا اور دستر خوان اٹھایا گیا۔ اس میں وہ سارے ٹکڑے بدستور رکھے تھے۔ سب ہی خالی منہ چلاتے رہے، کسی نے بھی اس خیال سے نہ کھایا کہ اچھا ہے دوسرے ہی کا کام چل جائے گا۔ (اتحاف)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مدینہ منوّرہ کے ایک باغ پر گزرے۔ اس باغ میں ایک حبشی غلام باغ کا رکھوالا تھا، وہ روٹی کھا رہا تھا اور ایک کتا اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ ایک لقمہ بنا کر اپنے منہ میں رکھتا تو ویسا ہی ایک لقمہ بنا کر اس کتے کے سامنے ڈالتا۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اس منظر کو کھڑے دیکھتے رہے۔ جب وہ غلام کھانے سے فارغ ہو چکا تو یہ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سے دریافت کیا کہ تم کس کے غلام ہو؟ اس نے کہا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وارثوں کا غلام ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے تمہاری ایک عجیب بات دیکھی۔ اس نے عرض کیا: آقا! تم نے کیا دیکھا؟ فرمانے لگے کہ تم جب ایک لقمہ کھاتے تھے ساتھ ہی ایک لقمہ اس کتے کو دیتے تھے۔ اس نے عرض کیا کہ یہ کتا کئی

سال سے میرا ساتھی ہے اس لیے ضروری ہے کہ میں کھانے میں بھی اس کو اپنا ساتھی رکھوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کتے کے لیے تو اس سے کم درجہ کی چیز بھی بہت کافی تھی۔ غلام نے عرض کیا: مجھے اللہ جل شانہ سے اس کی غیرت آتی ہے کہ میں کھاتا رہوں اور ایک جاندار آنکھ مجھے دیکھتی رہے۔

حضرت ابن جعفر رضی اللہ عنہ اس سے بات کرکے واپس تشریف لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وارثوں کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اپنی ایک عرض لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ انہوں نے کہا: کیا ارشاد ہے ضرور فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں باغ میرے ہاتھ فروخت کردو۔ انہوں نے عرض کیا کہ جناب کی خدمت میں وہ ہدیہ ہے اس کو بلا قیمت قبول فرمالیں۔ فرمانے لگے کہ میں بغیر قیمت لینا نہیں چاہتا۔ قیمت طے ہو کر معاملہ ہو گیا۔ پھر حضرت ابن جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس میں جو غلام کام کرتا ہے اس کو بھی لینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے عذر کیا کہ وہ بچپن سے ہمارے ہی پاس پلا ہے، اس کی جدائی شاق ہے مگر عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر انہوں نے اس کو بھی ان کے ہاتھ فروخت کردیا۔

یہ دونوں چیزیں خرید کر اس باغ میں تشریف لے گئے اور اس غلام سے فرمایا کہ میں نے اس باغ کو اور تم کو خرید لیا ہے۔ غلام نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ شانہ آپ کو یہ خریداری مبارک فرمائے اور برکت عطا فرمائے، البتہ مجھے اپنے آقاؤں سے جدائی کا رنج ہوا کہ انہوں نے بچپن سے مجھ کو پالا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم کو آزاد کرتا ہوں اور یہ باغ تمہاری نذر ہے۔ اس غلام نے عرض کیا کہ پھر آپ گواہ رہیں کہ یہ باغ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وارثوں پر وقف کردیا۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی اس بات پر اور بھی تعجب ہوا اور اس کو برکت کی دعائیں دے کر واپس آ گیا۔

(مسامرات)

یہ تو مسلمانوں کے اسلاف کے غلاموں کے کارنامے ہیں (تو اس سے اندازہ لگائیں کہ اسلاف کے رحم کا حال کیا ہوگا)۔

۳۔ ایک قریشی سفر میں جارہے تھے۔ راستہ میں ایک بیمار فقیر ملا جس کو مصائب نے بالکل ہی عاجز کر رکھا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ کچھ میری مدد کرتے جاؤ۔ ان قریشی صاحب نے اپنے غلام سے کہا کہ

جو کچھ تمہارے پاس خرچ ہے وہ سب لے آؤ۔ اس غلام نے جو کچھ تھا جس کی مقدار چار ہزار درہم تھی وہ اس فقیر کی گود میں ڈال دیا۔ وہ فقیر ان کو لے کر ضعف کی وجہ سے اٹھ بھی نہ سکا۔ اس بڑی مقدار کے ملنے پر خوشی میں اس کے آنسو نکل آئے۔ قریشی کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس نے اس مقدار کو کم سمجھا اس پر رو رہا ہے۔ اس سے پوچھا: کیا اس وجہ سے رو رہے ہو کہ یہ بہت کم مقدار ہے (مگر میرے پاس اس وقت اس کے سوا اور کچھ نہیں)۔ فقیر نے کہا: نہیں، اس پر نہیں رو رہا ہوں، اس پر رو رہا ہوں کہ تیرے کرم سے کتنی زمین کھا رہی ہے۔ (اتحاف) جب ایک ناواقف سائل کے سوال پر تیرے کرم کا یہ حال ہے کہ سفر کی حالت میں بھی جو موجود تھا سب دے دیا تو اس سے حضرت کے کرم کا اندازہ ہو گیا۔

۴۔ ایک مرتبہ ایک شخص اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور جا کر کہا کہ میرے ذمہ چار سو درہم قرض ہو گیا، تجھ سے مدد چاہنے آیا ہوں۔ اس نے فوراً چار سو درہم وزن کر کے دے دیے۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کو مال کے جانے کا صدمہ ہوا۔ وہ کہنے لگی: اگر اتنی گرانی تھی تو دینے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں اس پر رو رہا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ تعلقات کے باوجود اس کے حال کی خود خبر کیوں نہ رکھی۔ اس کو مجھ سے مانگنے کی نوبت کیوں آئی۔ (اتحاف)

۵۔ عبداللہ بن عامر بن کریز رحمہ اللہ نے حضرت خالد بن عقبہ رضی اللہ عنہ اموی سے ان کا مکان اپنی ضرورت سے نوے ہزار درہم میں خریدا۔ جب وہ فروخت ہو گیا اور خالد رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کو اس کی خبر ہوئی تو ان کو رنج اور صدمہ بہت ہوا۔ رات کو کچھ رونے کی آواز ابن عامر رحمہ اللہ کے کان میں پڑی۔ اپنے گھر کی مستورات سے پوچھا کہ یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ خالد کے گھر والوں کو اپنے مکان کے فروخت ہونے کا صدمہ ہو رہا ہے۔ اسی وقت ابن عامر رحمہ اللہ نے اپنے غلام کو ان کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ مکان تمہاری نذر ہے اور قیمت جو میں دے چکا ہوں وہ بھی اب واپس نہ ہو گی۔ یہ مکان میری طرف سے تمہاری نذر ہے۔

(اتحاف)

۶۔ عبدالملک بن مروانؒ نے حضرت اسماء بن خارجہ رحمہ اللہ سے پوچھا کہ مجھے تمہاری بعض عادتیں

بہت اچھی پہنچی ہیں، تم اپنے معمولات مجھے بتاؤ۔ انہوں نے عذر کر دیا کہ میری کیا عادت اچھی ہو سکتی ہے، دوسروں کی عادتیں بہت بہت اچھی ہیں ان سے دریافت کریں، مگر جب انہوں نے اصرار سے قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ مجھے تین چیزوں کا ہمیشہ اہتمام رہا۔ ایک یہ کہ کبھی کسی بیٹھنے والے کی طرف میں نے پاؤں نہیں پھیلایا۔ دوسرے جب میں نے کھانا پکایا اور اس پر لوگوں کو بلایا تو ان کھانے والوں کا میں نے اپنے اوپر احسان اس سے بہت زیادہ سمجھا جتنا میرا اُن پر ہو۔ تیسرے جب مجھ سے کسی ضرورت مند نے کوئی سوال کیا میں نے اس کے دینے میں کسی مقدار کو بھی زائد نہیں سمجھا (جو کچھ دیا، اس کو ہمیشہ کم ہی سمجھتی رہی)۔ (اتحاف)

۷۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بہت بیمار ہوگئے تو حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نذر (منت) مانی کہ اگر یہ تندرست ہو جائیں تو شکرانہ کے طور پر تین تین روزے دونوں حضرات رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ شانہ کے فضل سے صاحبزادوں کو صحت ہوگئی۔ ان حضرات نے شکرانہ کے روزے رکھنے شروع فرما دیے، مگر گھر میں نہ سحر کے لیے کچھ تھا نہ افطار کے لیے۔ فاقہ پر روزہ شروع کر دیا۔ صبح کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک یہودی کے پاس تشریف لے گئے جس کا نام شمعون تھا کہ اگر تو کچھ اون دھاگہ بنانے کے لیے اجرت پر دے دے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اس کام کو کر دے گی۔ اس نے اون کا ایک گٹھر تین صاع جَو کی اجرت طے کر کے دے دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس میں سے ایک تہائی کاتا اور ایک صاع جَو اجرت کے لے کر ان کو پیسا اور پانچ نان اس کے تیار کیے۔ ایک ایک اپنا میاں بیوی کا، دو (۲) دونوں صاحبزادوں کے اور ایک باندی کا جس کا نام فِضّہ تھا۔ روزہ میں دن بھر کی مزدوری اور محنت کے بعد جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹے تو کھانا کھانے کے لیے دستر خوان بچھایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹکڑا توڑا ہی تھا کہ ایک فقیر نے دروازہ سے آواز دی کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والو! میں ایک فقیر مسکین ہوں، مجھے کھانا دو، اللہ جل شانہ تمہیں جنت کے دستر خوان سے کھانا کھلائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھ روک لیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: ضرور دے دیجیے۔ وہ سب روٹیاں اس کو دے دیے اور گھر والے سب کے سب فاقہ سے رہے۔

اسی حال میں دوسرے دن کا روزہ شروع کر دیا۔ دوسرے دن پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دوسری تہائی اون کی کاتی اور ایک صاع جَو کی اجرت لے کر اس کو پیسا، روٹیاں پکائیں اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ کر تشریف لائے اور سب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک یتیم نے دروازہ سے سوال کیا اور اپنی تنہائی اور فقر کا اظہار کیا۔ ان حضرات نے اس دن کی روٹیاں اس کے حوالہ کر دیں اور خود پانی پی کر تیسرے دن کا روزہ شروع کر دیا اور صبح کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اون کا باقی حصہ کاتا اور ایک صاع جَو کارہ گیا تھا وہ لے کر پیسا، روٹیاں پکائیں اور مغرب کی نماز کے بعد جب کھانے بیٹھے تو ایک قیدی نے آکر آواز دی اور اپنی سخت حاجت اور پریشانی کا اظہار کیا۔ ان حضرات نے اس دن کی روٹیاں اس کو دے دیں اور خود فاقہ سے رہے۔

چوتھے دن صبح کو روزہ تو تھا نہیں لیکن کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں صاحبزادوں کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، بھوک اور ضعف کی وجہ سے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہاری تکلیف اور تنگی کو دیکھ کر مجھے بہت ہی تکلیف ہوتی ہے، چلو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ بھوک کی شدت سے آنکھیں گڑ گئی تھیں، پیٹ کمر سے لگ رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے سینہ سے لگایا اور حق تعالیٰ شانہ سے فریاد کی۔ اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۂ دہر کی آیات وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ لے کر آئے اور اس پروانۂ خوشنودی کی مبارک باد دی۔ (مسامرات اول)

۸۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کے متعلق حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

”میں نے بارہا دیکھا کہ کھانے کا وقت ہوتا تو سارے طلبہ سے کہتے کہ اپنے اپنے کھانے لے آؤ، اور جب مختلف قسم کے کھانے سب لے آتے، کسی کو دال ملی، کسی کو ساگ، کوئی گوشت لایا اور کوئی ترکاری تو اپنے گھر سے بھی کھانا منگاتے اور پاک طشت یا کونڈے میں سب کھانوں کو مخلوط کرکے فرماتے، کھاؤ بسم اللہ۔ طلبہ کی اکثر دعوتیں کیا کرتے اور خفیہ طور پر ان کی تمام ضروریات حالیہ پوری فرماتے۔

یتامیٰ، بیوگان، یگانہ وبیگانہ، محتاجوں کی پوشیدہ طریق سے اتنی خدمت کرتے کہ سننے والا حیران رہ جائے۔ سادگی اور اپنے نفس کی طرف سے استغنا کا یہ عالم تھا کہ شاید گھر میں پانچ روپے کا غلہ بھی ایک دفعہ نہیں ڈلوایا مگر مصارف خیر پر خرچ کا یہ عالم تھا کہ جس وقت انتقال ہوا تو آٹھ ہزار روپے کے مقروض تھے اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کس مد میں قرض ہوا۔

حضرت مولانا یوسف متالا زید مجدہم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ:

رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ سہارنپور کے پہلے ہفتے میں حضرت نور اللہ مرقدہ کے پاس ایک روز ایک لاکھ روپے کی رقم آئی۔ حضرت رحمہ اللہ نے تین دن میں ساری رقم مساجد و مدارس وغیرہ میں عطیہ فرمادی۔ غالباً مولانا نصیر الدین صاحب رحمہ اللہ مرحوم کو حضرت رحمہ اللہ کی ایک کتاب کی طباعت کے لیے کچھ رقم درکار تھی، انہوں نے تیسرے دن آکر رقم کا مطالبہ کیا۔ حضرت رحمہ اللہ نے مسکرا کر فرمایا کہ ابھی تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے، کہیں سے کچھ آئے گا، تب دیں گے (بہ روایت مولانا یوسف متالا صاحب جو حضرت رحمہ اللہ کی معذوری کی وجہ سے رقم کی آمد اور خرچ میں واسطہ تھے)۔

سستے زمانے میں ایک دفعہ جب کہ مہمانوں کے اخراجات کے منتظم نے حضرت رحمہ اللہ کو بتایا کہ چالیس ہزار خرچ ہوگئے جس میں مہمانوں کا خرچ اور عطایا سب شامل ہیں۔ اس قدر خرچ پر حضرت سے کسی نے تعجب کا اظہار کیا تو حضرت اقدس نے فرمایا کہ:

"اگر ذاکرین کے اس مجمع میں سے کسی کے منہ سے ایک دفعہ بھی اخلاص سے اللہ کا پاک نام نکل گیا ہوگا تو میرا سارا خرچ وصول ہوگیا۔" (حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی:۲۹۵)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا انسانیت پر جو رحم اور ترس تھا اس کا اس سے بھی اندازہ لگائیے کہ اس کے بعد گرانی کے دور میں صرف ایک رمضان شریف میں پونے دو لاکھ سے کچھ اوپر خرچ ہوا۔

انبساط اور مسرت وخوشی کے ساتھ حضرت والا کا یہ فیض (مادی وروحانی) جاری وساری رہتا

ع تیرا فیض کہاں عام نہیں ساقی

۹۔ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ کے والد حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ کے متعلق مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

مولانا اپنی زندگی عزلت، گمنامی اور عبادت میں گزار رہے تھے۔ خود مرزا الٰہی بخش صاحب کو ان کے مرتبہ کا احساس اس وقت ہوا جب مولانا کے مستجاب الدعوات ہونے کا ان کو ذاتی تجربہ ہوا۔

ذکر و عبادت، آئے گئے مسافروں کی خدمت، قرآن مجید اور دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا۔ خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ہوتے، اُن کا بوجھ اُتار کر رکھ دیتے، اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی، میں اس قابل نہ تھا۔ عام اجتماع و ہجوم کے زمانہ میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے اور رضائے الٰہی اور قربتِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلقِ خدا کی راحت رسانی اور خدمت میں مشغول رہتے۔

مولانا ہر وقت ذاکر و باخدا رہتے تھے۔ مختلف اوقات و حالات کے متعلق حدیث میں جو اذکار و اوراد آئے ہیں ان کی پابندی کرتے تھے اور آپ کو مرتبہ احسان حاصل تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے طریق سلوک کے حصول کی خواہش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں، جو اس طریق اور ان ذکر و اذکار کا مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید پڑھنے کے بعد یوں کہے کہ قاعدہ بغدادی میں نے نہیں پڑھا اس کو بھی پڑھ لوں۔ (دینی دعوت:۴۶)

۱۰۔ حضرت مولانا الیاس دہلوی رحمہ اللہ کو انسانیت اور اس کی خدمت اور اس پر ان کا جو رحم تھا وہ اس قدر شدید تھا کہ ان کے متعلق حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

مولانا کا سا درد اور بے قراری دیکھنے میں نہیں آئی، جس شخص نے نہیں دیکھا وہ تصور نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات ماہی بے آب کی طرح تڑپتے، آہیں بھرتے اور فرماتے: ”میرے اللہ! میں کیا کروں کچھ ہوتا نہیں، کبھی کبھی دین کے اس درد اور اس فکر میں بستر پر کروٹیں بدلتے اور بے چینی بڑھتی تو اٹھ اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ ایک رات والدہ مولانا یوسف صاحب نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ نیند نہیں آتی؟

فرمایا: کیا بتلاؤں اگر تم کو وہ بات ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے، دو ہو جائیں۔ بعض اوقات دیکھنے والوں کو ترس آتا اور تسکین دیتے۔ بعض مرتبہ اس جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ معلوم ہوتا سینے میں تنور گرم ہے، حمیتِ اسلامی اور جذبات کا ایک طوفان برپا ہے، زبان ساتھ نہیں دیتی اور الفاظ مساعدت نہیں کرتے، بعض مرتبہ پورا دردِ دل کہنے کے بعد غالب کے مشہور شعر کو بڑی لطیف ترمیم کے ساتھ پڑھتے:

؎ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

کبھی سامعین کے اضطراب اور وحشت کا خیال کر کے خاموش ہو جاتے لیکن یہ شعر (جو حضرت مجدد رحمہ اللہ نے بہت سے خطوط کے آخر میں بار بار لکھا ہے) حسب حال ہوتا:

؎ اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اس کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ان کے زمانہ کے لوگ مجنون کیوں کہتے تھے اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کی تنبیہ کی بار بار ضرورت کیوں پیش آتی تھی۔ اس درد و بے قراری سے عہدِ سلف کے اولو العزم انسانوں کے سوز و اضطراب کا اندازہ ہوتا تھا کہ دین کے انحطاط و تنزل اور اپنے زمانے کی ویرانی کا ان کو کیسا احساس تھا اور دین کی وہ کیا غیرت و حمیت تھی جس نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے قلم سے یہ شعر نکلوایا:

؎ آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں گم شدے ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

مولانا رحمہ اللہ پوری کوشش کے بعد بھی جب اس کام کی ضرورت اور تحریک کی حقانیت کے مقابلہ میں ان مساعی کو دیکھتے تھے جو دین کے فروغ کے لیے عمل میں لائی جارہی ہیں تو ان کو بہت ناکافی سمجھتے تھے اور ادائے حق میں تقصیر و کوتاہی پر مواخذہ کا خوف طاری ہو جاتا تھا اور یہی ان کے درد و بے قراری کا سبب تھا۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ”جس قدر حق تعالیٰ نے مجھ پر اس بارے میں حق کا وضوح فرمادیا ہے اس کے مقابلہ میں اپنی مساعی، اپنے درد اور اپنی آواز کی کچھ نسبت نہیں پاتا، لہٰذا کرم ہو تو اس کے شایانِ شان ہے اور اگر عدل ہو تو کوئی صورت نجات کی نہیں“۔ (دینی دعوت:۱۸۸تا۱۹۰)

......☆............☆............☆............☆......

سچائی اور امانت داری کا بیان

صدق: قول و عمل میں مطابقت کو صدق کہتے ہیں اور صدیق عربی زبان میں سچائی اور راستبازی میں درجۂ کمال تک پہنچنے والے کے لیے مستعمل ہے، یعنی سچ اور سچائی کا ایسا خوگر اور پیکر جس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔

جھوٹ: جھوٹ صدق اور صداقت کی ضد ہے یعنی جھوٹ قول و عمل میں عدمِ مطابقت کو کہتے ہیں، یعنی جو قول خلاف واقعہ ہو اسے جھوٹ کہا جاتا ہے اور جو عمل اندرون کے مطابق نہ ہو، اس کو جھوٹا عمل یا عملی جھوٹ کہا جاتا ہے، اس میں عہد و پیمان کی ضد، غدر، عہد شکنی، وعدہ خلافی اور امانت کی ضد خیانت بھی شامل ہیں۔

امانت داری اور خیانت

ہر وہ ذمہ داری جو کسی پر بھروسہ کر کے اس کے سپرد کی جائے یا بالفاظ دیگر ہر وہ ذمہ داری جو انسان اپنے ذمہ لے لیتا ہے، وہ اس کے پاس امانت ہے، اس کو ٹھیک جوں کا توں ادا کرنا امانت داری ہے اور خیانت بالکل اس کی ضد ہے، یعنی کسی کا حق ادا نہ کرنا یا ادا کرنا مگر ایمان داری سے نہیں بلکہ اس میں کوتاہی یا نقصان کر کے ادا کرنا خیانت ہے۔

وعدہ اور عہد و پیمان

وعدہ اور عہد کے معنی قول و اقرار کرنے کے ہیں جیسے کوئی دوسرے کے ساتھ یہ اقرار کرے کہ میں فلاں وقت آؤں گا یا تمہارا فلاں کام کروں گا یا فلاں چیز دوں گا وغیرہ وغیرہ ، اگر وعدہ اور عہد دو طرفہ ہو، مثلاً: دو آدمی یا دو جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کریں کہ فلاں کام کریں گے یا نہیں کریں گے تو اسے معاہدہ کہتے ہیں۔

جھوٹ اور خیانت کی تفصیل و مذمت

تمام رذائل اور برے اخلاق میں سے بد ترین اور مذموم ترین چیز جھوٹ ہے، خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ انسان کے سارے اختیاری افعال و اعمال پر اعتماد اور بھروسہ

اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے افعال، اعمال اس کے اندرون اور واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لیے جھوٹ ہی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی بنیاد اور سرچشمہ ہے، کیونکہ انسان کے اندر کی بات تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی یقینی طور پر نہیں جانتا، ایک شخص دوسرے شخص کے متعلق اگر جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے قول اور عمل سے اسے ظاہر کر دے، اب اگر وہ اپنی بات جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے قول یا عمل سے اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو ایسی صورت میں وہ لوگوں کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرتا ہے۔ جھوٹ اور خیانت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو دوسرے جرائم اور خباثتوں پر آمادہ کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق فرماتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۞

"اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ (تعالیٰ) اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان دار نہیں (اپنے زعم میں) اللہ تعالیٰ اور ایمانداروں کو دھوکہ دیتے ہیں حالاں کہ وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں اور وہ سمجھتے نہیں، ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر (ان کے بُرے کرتوت یعنی جھوٹ وغیرہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری بڑھا دی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ: آیت ۸ تا ۱۰)

بلاشبہ کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا جرم ہے، مگر یہاں دردناک عذاب کا سبب جھوٹ بولنے کو قرار دیا گیا تو اس آیتِ کریمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہی جھوٹ اصل جرم تھا جس نے بالآخر ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا اور یہی جھوٹ وہ مرض اور خباثت ہے جو تمام برائیوں کی جڑ اور بنیاد بن سکتا ہے اس لیے قرآن مجید میں جھوٹ کی گندگی کو بت پرستی کی گندگی کے ساتھ ملا کر دونوں سے سخت پرہیز کی تعلیم دے دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۞ "بت پرستی کی نجاست سے بچو اور جھوٹ سے بچو۔" (سورۃ الحج: آیت ۳۰)

بلکہ یہی جھوٹ کی بری خصلت ہے جو بالآخر انسان کے ضمیر کو ختم کر کے اسے راکھ بنا دیتی ہے اور جب ضمیر مر جاتا ہے تو حق کی قبولیت کی استعداد اور صلاحیت باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے پھر وہ حق اور ہدایت کی روشنی کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے اور اس پر حق اور ہدایت کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۞ ”بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں کرتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہو۔“ (سورۂ زمر: آیت ۳)

حضرت صفوان بن سلیم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! ہو سکتا ہے“ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ مؤمن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! ہو سکتا ہے“ پھر آپ سے پوچھا گیا: کیا مؤمن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لا (نہیں ہو سکتا)۔“ (مشکوٰۃ)

نیز حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَی الْخِلَالِ کُلِّھَا اِلَّا الْخِیَانَۃَ وَالْکِذْبَ ”مؤمن جھوٹ اور خیانت کے سوا ہر خصلت پر پیدا کیا جا سکتا ہے۔“ (مشکوٰۃ)

ایمان امانت سے مشتق ہے جو خیانت کی ضد ہے اس لیے ایمان اور خیانت جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دروغ گوئی کی عادت نفاق کا شعبہ ہے۔ ایمان یک رخی کا طالب ہے اس لیے دورخا پن اسلام و ایمان کے ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ اس لیے مؤمن نہ خیانت کا عادی ہو سکتا ہے اور نہ دروغ گوئی کا تو حدیث کا مطلب یہی ہے کہ جھوٹ اور خیانت کے سوا دوسری برائیاں، کمزوریاں مؤمن میں ہو سکتی ہیں لیکن جھوٹ اور خیانت جیسی خالص منافقانہ عادتیں اس میں نہیں ہو سکتیں اور نہ یہ ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔

جھوٹ کی اقسام اور صورتیں

۱۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے یا عمل سے جس کا اظہار کیا جائے اگر وہ واقعہ اور یقین کے مطابق نہ ہو تو جھوٹ ہے۔ خلافِ واقعہ بات اگر یقین اور علم کے مطابق ہے تو اس کو اصطلاح میں خطاء اور غلط کہتے ہیں، عربی زبان میں اس کے لیے خطاء بھی مستعمل ہے اور اس کے لیے ”کذب“ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس صورت میں یہ اگرچہ یقین کے مطابق ہے لیکن خلاف واقعہ

ہونے کی وجہ سے اس کو خطاء یانادانستہ جھوٹ کہاجاتاہے اور اسی کو اردو زبان میں غلط کہاجاتاہے۔ مثلاً مسجد میں سہیل کابھائی زید آیالیکن اس کو صادق نے سمجھا کہ یہ "سہیل" ہے، اب صادق سے کوئی پوچھے کہ مسجد میں کون آیاہے ؟تووہ کہہ دے کہ "سہیل"۔اور جب وہ دوسرے شخص مثلاً "عادل" سے پوچھتاہے کہ صادق کہتاہے کہ مسجد میں "سہیل" آیاہے یہ ٹھیک کہتاہے تووہ اس کے جواب میں یہ کہے گا کہ نہیں اس کو مغالطہ ہواہے، بلکہ وہ سہیل کابھائی "زید" ہے۔

اہلِ عرب یہاں بھی "کذب" کالفظ استعمال کرتے ہیں، اس کی مثالیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باتوں میں ملتی ہیں کہ ان کوکسی نے کہاکہ فلاں صحابی نے توفلاں بات کے متعلق یہ کہاہے تواس نے جواب میں کہاکہ کذب فلان (یعنی فلاں سے خطا ہوگئی ہے) حالانکہ یہ بات ایسی نہیں تھی بلکہ ایسی تھی تو یہاں بات خلاف واقعہ توہے لیکن صادق کے یقین اور گمان کے خلاف نہ تھی بلکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہ سہیل ہے نہ کہ زید اس صورت میں اس کے دل وزبان میں توہم آہنگی ہے، لیکن اس کی بات خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ اگر خلاف واقعہ بات قصداً کی جائے یاکوئی ایسا عمل قصداً کیاجو اس کے اندرون کے مخالف ہوتو یہ سب جھوٹ ہے، مثلاً زید نے سلیم سے کہاکہ آپ نے فلاں کام کیاہے ؟۔ اس نے کہا: ہاں۔ حالانکہ اس نے وہ کام نہیں کیا تھا یامثلاً کسی نے کہاکہ میں نے پہلے روز کا چاند دیکھاہے، حالانکہ اس نے دیکھانہیں، یاایک شخص دوسرے شخص کے متعلق کہتاہے کہ فلاں نے یہ نامناسب کام کیاہے حالانکہ وہ اس بات کو سمجھتاہے کہ اس نے نہیں کیاہے لیکن وہ اس پر جھوٹ باندھتاہے، یاکوئی زبان سے کہتاہے کہ میں مسلمان ہوں حالانکہ وہ اسلام کودل سے سچا اور حق مذہب ماننے میں متردد ہے یانہیں مانتا؛ پس عمل سے جس بات کا اظہار کیاجائے، زبان سے جو بات کہی جائے اور وہ قول وعمل اس کے اندرون علم کے خلاف ہوتو یہ سب جھوٹ ہے، لیکن بعض دفعہ جھوٹ کی شدت اور نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ اس کانام بدل جاتاہے یااس کے ساتھ دوسری صفت کا اضافہ کیاجاتاہے جیساکہ جھوٹی شہادت، جھوٹی قسم، افتراء اور تہمت باندھنا(یعنی کسی پر جھوٹاالزام لگانااور جھوٹ باندھنا) یاچغل خوری، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت یہ ساری جھوٹ کی اقسام ہیں۔ اب اختصار کے ساتھ ان کے متعلق قرآن مجید اوراحادیث شریفہ سے کچھ ملاحظہ کیجیے۔

زبانی اور بے ضرر جھوٹ کی مذمت

جھوٹ ایسی گندگی اور نجاست ہے کہ اگر کوئی خوش طبعی اور لوگوں کو ہنسانے کے لیے بھی بولتا ہے تو اس بے ضرر جھوٹ کی بھی حدیثوں میں سخت مذمت آئی ہے۔ چنانچہ حضرت بہز بن حکیم اپنے دادا کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَيْلٌ لِّلَّذِيْ يُحَدِّثُ بِالْحَدِيْثِ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ فَيَكْذِبُ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ یعنی ”افسوس اور ہلاکت ہو اس شخص پر جو بات کرے تو جھوٹ اس لیے بولے تاکہ اس سے لوگوں کو ہنسائے، افسوس اس شخص پر، افسوس اس شخص پر۔“ (احمد، ترمذی)

دیکھیے! خوش گپی کے موقع پر محض لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جو جھوٹ بولا جاتا ہے جس سے بظاہر کسی کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا، اس کی اس قدر مذمت آئی ہے تو ضرر دِہ اور نقصان پہنچانے والی غلط بیانی اور جھوٹ کی گندگی کا حال کیا ہوگا، نیز حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهٖ ”جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔“

(ترمذی، مشکوۃ: باب حفظ اللسان)

جس طرح مادی چیزوں کی تلخی، شیرینی اور بدبو ہوا کرتی ہے اسی طرح باتوں اور اعمال میں بھی تلخی و شیرینی، خوشبو اور بدبو ہوتی ہے۔ خوشبو اور بدبو روحانیات کے عالم میں محسوسات میں سے ہیں، اس لیے اس کو فرشتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے بعض صاحب روحانیت بندے بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح عام لوگ پھلوں، پھولوں وغیرہ کی خوشبو یا گندگی کی بدبو محسوس کرتے ہیں۔

جھوٹ بولنا سخت خیانت ہے

حضرت سفیان بن اسید حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا: كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَهٗ بِهٖ كَاذِبٌ ”یعنی یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے (مسلمان) بھائی سے کوئی بات بیان کرو اور وہ تم کو اس میں سچا جانے جبکہ حقیقت میں تم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔“ (ابوداؤد، مشکوۃ)

مطلب یہ ہے کہ جھوٹ تو گناہ ہے ہی مگر بعض صورتیں اس کی بہت ہی سنگین ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شخص تم پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے، تمہیں بالکل سچا سمجھتا ہے اور تم اس کے اعتبار اور حسنِ ظن سے فائدہ اٹھا کر اس سے جھوٹ بولو۔

بلا تحقیق سنی سنائی بات پھیلانا بھی جھوٹ ہے

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان سچ، جھوٹ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص جھوٹ پھیلانے کے جرم کے ساتھ لوگوں میں اسی طرح بے اعتبار ہو جاتا ہے جس طرح جان بوجھ کر جھوٹ بولنے والا شخص قابلِ اعتبار نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ نے انسان کے اس فعل کو بھی جھوٹ بتلایا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ”آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (بلا تحقیق) کہتا پھرے۔“ (مسلم)

جھوٹی گواہی کی مذمت

حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز پڑھی جب اس سے فارغ ہو گئے تو یکدم کھڑے ہو گئے اور فرمایا: عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ”جھوٹی گواہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دینے کے برابر کر دی گئی۔“ (ابن ماجہ ۲۲۷۳)

یہ بات آپ ﷺ نے تین بار (مکرر) ارشاد فرمائی اور پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ”یعنی بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو صرف اللہ تعالیٰ کے ہو کر کسی کو اس کے شریک نہ کرتے ہوئے۔“

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں گواہی ہے، جب آدمی کسی بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو وہ دراصل اپنے بیان کی سچائی پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا دیتا ہے اور جب کسی بات یا معاملہ پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کر

دیا جائے اور وہ خلاف واقعہ ہو تو اس کی سنگینی کا حال کیا ہو گا؟ جبکہ قسم کے بغیر جھوٹ کی گندگی اور اس کی بدبو اس قدر سخت ہے کہ اس سے فرشتے دور تک بھاگتے ہیں تو اس پر مرتب ہونے والے نتائج روحانی لحاظ سے اور آخرت کے اعتبار سے کس قدر گھناؤنے اور ذلیل کن ہوں گے۔ منافقوں کا حال بتلا کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِتَّخَذُوْا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ۞ ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے پس وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں تو ان کے لیے ذلیل کن عذاب ہے۔''

(مجادلہ: آیت: ١٦)

جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِاللّٰہِ وَأَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞ ''بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اقرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) حقیر معاوضہ لیتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف (نظر عنایت سے) دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' (آل عمران: آیت: ٧٧)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثَلٰثَۃٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِم وَلَا یُزَکِّیْھِم وَلَھُم عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ فَقَرَأَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَ اَبُوْذَرٍّ خَابُوا وَخَسِرُوْا مَنْ ھُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلِفِ الْکَاذِبِ ''تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان پر نظر عنایت فرمائے گا اور نہ ان کو گناہ اور گندگیوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ لوگ نامراد ہوئے اور خسارے میں پڑے یارسول اللہ! یہ تین کون کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا تہبند (متکبروں اور مغروروں کی طرح) حد سے نیچے لٹکانے والا، احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا چلانے والا۔''

(مسلم ١٧١، مشکوۃ: باب المساھلۃ فی المعاملۃ)

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيْرًا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَإِنْ قَضِيْبٌ مِنْ اَرَاكٍ ”جس شخص نے (عدالت میں) قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق ناجائز طور سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لیے دوزخ کی آگ واجب کر دی ہے اور جنت کو اس پر حرام کر دیا ہے۔ (اہل مجلس میں سے) کسی شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو (پھر بھی یہی عذاب اور سزا ہو گی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر چہ پیلو کی ٹہنی ہی ہو۔ (لیکن قسم کھا کر ناجائز طور سے حاصل کی ہو تو اس کے لیے یہی عذاب ہے)

(مسلم ۲۱۸، مشکوٰۃ: باب الاقضیۃ والشہادات)

بہتان، کسی پر جھوٹ باندھ کر تہمت لگانے کی مذمت

سب سے خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق، عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل پڑ جائے، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے زیادہ سخت ہے اور اس سختی کی وجہ سے اس کا نام بدل دیا جاتا ہے اور اس کو ”بہتان“ (یعنی جھوٹی تہمت) کہا جاتا ہے، بلکہ بعض بہتان اور تہمتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا بلکہ صرف شرارت کی وجہ سے کسی بے گناہ آدمی پر اس لیے تھوپی جاتی ہیں تاکہ بدنام ہو جائے۔ قرآن مجید نے اس کا نام ”افک“ رکھ دیا ہے، دونوں یعنی بہتان اور افک جھوٹ ہونے کے علاوہ درجۂ شرافت اور انسانیت سے گزرے ہوئے ہیں اس کا گناہ اور جرم اس قدر شدید ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر یا بغیر جانے بوجھے اس بہتان کے پھیلانے میں شریک ہو جاتے ہیں تو وہ بھی گنہگار ہو جاتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ ”اور جو لوگ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو بغیر ان کے کسی گناہ کے (ان پر غلط الزام، تہمت اور جھوٹ باندھ کر اس کی وجہ سے ان کو) تکلیف دیتے ہیں (اور دل دُکھاتے ہیں) تو وہ بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لیتے ہیں۔“ (احزاب:۵۸)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ”جو لوگ پاک دامن بے خبر مؤمن

عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔"

(نور: آیت :۲۳)

بہتان اور تہمت کا پھیلانا بھی ممنوع ہے

کسی مسلمان کے متعلق بری بات سن کر اس کو دوسروں تک بلا تحقیق پہنچانا ممنوع ہے۔ ایسی بات کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے معاملہ میں حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ ایک پاکیزہ مسلمان کے متعلق بری بات سن کر اس کی تردید کریں، بلا تحقیق اس کو مانیں ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسی بات کے متعلق فرماتے ہیں: لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۞ "جب تم نے یہ (بری) بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔" (سورۂ نور: آیت ۱۲)

اور ایسی باتوں کے متعلق تعلیم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۞ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۞ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞

"یعنی جب تم یہ (بے اصل) بات ایک دوسرے سے نقل کرنے لگے اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہنے لگے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی اور معمولی بات سمجھتے تھے (کہ ہم نے جیسے سنا ویسے بلا تحقیق دوسروں کو نقل کیا) حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی سخت بات تھی (یعنی بہت بڑا گناہ تھا کہ بلا تحقیق ایسی بات کو چلایا جس سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچی) اور تم نے جب ایسی (بے اصل) بات سنی تو کیوں نہ (فوراً) بول اُٹھے کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا لائق نہیں، سبحان اللہ! یہ تو ایک عظیم بہتان ہے اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مؤمن ہو تو پھر کبھی ایسا نہ کرنا کہ بلا تحقیق اور علم

لوگوں میں کسی غلط بات کو پھیلاؤ۔ (سورۂ نور: آیت: ۱۵ تا ۱۷)

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کا دوسرے مسلمان پر یہی حق ہے کہ وہ اس کے بارے میں حسنِ ظن اور نیک گمان رکھے، اور جب تک کسی معاملے کے متعلق پکا ثبوت نہ مل جائے اس وقت تک ہر مسلمان کو بے گناہ سمجھنا چاہیے، اور جب تک کسی گناہ اور جرم کی معقول دلیل نہ مل جائے اس وقت تک کسی پر جرم اور گناہ کا الزام نہ لگایا جائے، اور جب تک کسی کے متعلق کسی جرم اور گناہ کا پورا ثبوت مہیا نہ ہو اس وقت تک اس الزام کا دوسرے تک پہنچانا مسلمان کے شایانِ شان نہیں، بلکہ اس کا انکار کرنا چاہیے اور یہ کہہ دینا چاہیے کہ ایسی بلا دلیل بات تو ہمارے لیے زبان سے نکالنا بھی لائق اور جائز نہیں یہ تو ایک بہت بڑی تہمت ہے، کیونکہ ایک آدمی کا مسلمان ہونا خود بخود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلام کے حدود کا خیال رکھے گا اور گناہوں سے مکمل پرہیز کرتا ہوگا۔ ایک شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس نے بغیر کسی معقول شبہ اور دلیل کے ایک مسلمان پر بلاوجہ ایک گناہ کا الزام لگایا۔ بلکہ اس طرح کے معاملات میں غیر جانبدارانہ رویہ بھی جائز نہیں ہے کہ آدمی اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرے کہ دوسرا مسلمان بھائی بدنام ہو رہا ہے مجھے اس مسئلے سے کیا سروکار، ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ حتی الامکان اپنے مسلمان بھائی کی مدافعت کرنی چاہیے، کیوں کہ ہر مسلمان پر اپنے دوسرے بھائی کی عزت و آبرو کی حفاظت فرض ہے، ایک طرف قرآن و سنتِ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ہدایت کو سامنے رکھیں دوسری طرف اپنے معاشرہ کو، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا عمل بالکل قرآن و سنت کے برعکس جا رہا ہے، دوسری پارٹیوں اور لوگوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے والی افواہیں پھیلانا آج کل ایک مستقل فن اور ایک نہایت کامیاب بلکہ سب سے زیادہ کامیاب پیشہ بن گیا ہے۔

اخبار و رسائل وہی ہیں جو اس طرح کی افواہیں بنانے اور ایجاد کرنے میں سب سے زیادہ تیز ہوں۔ اور بہت سے مسلمانوں کے فسادِ مزاج کا حال یہ ہے کہ وہ اسی طرح کی چیزوں کو پڑھتے ہیں اور ان کی ہر بات مان کر معاشرہ میں پھیلاتے ہیں۔ اگر ہم واقعی مسلمان بننا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ جب بھی کوئی شخص ہمیں کسی کے بارے میں بری خبر دے تو ہم فوراً اس سے ثبوت اور دلیل کا مطالبہ کریں اور کوئی بات سن کر اس کو دہرانے نہ لگیں بلکہ خبر دینے والے سے کہیں کہ شریعت کے مطابق گواہ لے آؤ اگر وہ

اپنی بات کے حق میں گواہ نہ لائے اور کوئی پکی دلیل وشہادت پیش نہ کرے تو خبر دینے والا خود بڑا مجرم ہے کیوں کہ کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ بلا ثبوت کسی کے اوپر الزام اور عیب لگانے لگے، اس کا پورا بیان غیبت اور وہم وگمان کے بیان میں موجود ہے۔

جھوٹا وعدہ یا وعدہ خلافی

وعدہ خلافی یعنی زبان دے کر اس کے خلاف کرنا بہت بڑا گناہ جھوٹ اور خیانت ہے۔ ایفائے عہد، وعدہ پورا کرنا یعنی زبان اور عمل کی ہم آہنگی کا نام سچائی ہے، اس کی ضد اور مخالف کا نام غدر، دھوکا اور فریب ہے۔ ایفائے عہد انسانیت کے مخصوص فرائض میں بہت بڑا فرض ہے، جو شخص اپنے وعدہ اور عہد وپیمان کا لحاظ نہیں رکھتا وہ درحقیقت شرفِ انسانیت سے محروم ہوتا ہے۔ ایفائے عہد اور وعدہ کو پورا کرنے کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی عظیم خوبیوں اور خصوصیات میں اس کو بھی شمار کیا ہے، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ۞ "اور قرآن مجید میں اسماعیل کا ذکر بھی کر بلاشبہ وہ وعدہ کا سچا تھا اور (اللہ تعالیٰ کا) رسول ونبی تھا۔"

(سورہ مریم: آیت ۵۴)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا یعنی "اپنے عہد کو پورا کرو بے شک عہد کی باز پرس ہوگی۔" (اسراء: آیت: ۳۴)

اس عہد میں ہر قسم کے عہد وپیمان شامل ہیں اس میں وہ عہد وپیمان بھی شامل ہیں، جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالم غیب میں لیے ہیں اور اس میں وہ بھی داخل ہیں جو اس نے اپنے نبیوں کے واسطے اپنی شریعت کی شکل میں ہم سے لیے ہیں۔ اس میں وہ وعدے اور معاہدے بھی شامل ہیں جو ہم ایک دوسرے سے زبانی اقرار یا تحریر کی شکل میں کرتے ہیں، اور وہ عہد اور وعدے بھی اس میں شامل ہیں جو بغیر کسی تحریر واقرار کے معاشرے میں عُرفاً اور عادۃً عہد مانے اور جانے جاتے ہیں (اس کی ایک مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وہ بلا تحریر واقرار وعدہ بھی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عبد اللہ بن ابی الحمساء سے ہوا جیسا کہ اس کا بیان آگے ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا) ان تمام وعدوں اور عہد وپیمان کے بارے

میں قیامت میں باز پرس ہوگی۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَآیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔" (مائدہ: آیت: ۱)

یہاں ہر قسم کے ایفائے عہد مراد ہیں، خواہ وہ خالق ومالک اللہ رب العالمین اور بندوں کے درمیان ہوں یا بندوں کے آپس میں ہوں خواہ ان کا تعلق دینی امور سے ہو یا دنیاوی معاملات سے ہو سب اس میں شامل ہیں اور سب کی پابندی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، البتہ وہ وعدہ جس کے پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

عہد اور معاہدہ

ان آیاتِ کریمہ کا مطلب واضح ہے البتہ ان میں عہد کا لفظ بھی آیا ہے جسے مسلمان کی امتیازی صفت بتلایا گیا ہے۔ اس کی کسی قدر تشریح مناسب سمجھتا ہوں۔

عہد کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی کام اور معاملہ کے سلسلہ میں قرار پائے۔ اس کا پورا کرنا فرض اور اس کے خلاف کرنا غدر اور دھوکہ ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وعدہ کہتے ہیں مثلاً کوئی کسی سے کہے کہ میں تمہارا فلاں کام کروں گا یا تمہارے پاس آؤں گا یا کوئی چیز دوں گا یا فلاں جگہ دونوں ملیں گے وغیرہ ، اس کا پورا کرنا شرعاً لازم ہے۔ بلا عذرِ شرعی کے اس کے خلاف کرنا سخت گناہ ہے۔

معاہدہ اور وعدہ میں فرق

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کے پورا کرنے پر دوسرا آدمی اس کو بذریعۂ عدالت بھی مجبور کر سکتا ہے۔ اور وعدہ پورا کرنے کے لیے کسی کو بذریعہ عدالت مجبور نہیں کیا جا سکتا البتہ دیانۃً اور شرعاً اس کا پورا کرنا بلا عذر شرعی کے ضروری ہے۔

وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا عذاب

عہد شکنی کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۞ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ

وَاَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۞

یعنی "ہاں کیوں نہیں؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور پرہیز گار بن گیا بے شک (وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بنے گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف (نظرِ عنایت سے) دیکھے گا اور نہ انہیں (گناہوں کی آلودگیوں سے) پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔" (سورۂ آل عمران: آیت:۷۶ تا ۷۷)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عہد اور قسموں کو حقیر قیمت پر فروخت کرنا تو باعثِ دردناک عذاب ہے، لیکن اگر کوئی منہ مانگے دام دے تو بیچنا جائز ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں بہت عارضی اور حقیر ہے، لہٰذا کسی قیمت پر بھی اللہ تعالیٰ کے عہد اور قسموں کو مت بیچو، کیونکہ دنیا کے سارے خزانے بھی اس کے مقابلہ میں حقیر ترین معاوضہ ہیں۔ عہد اللہ سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔

اَیۡمَان سے مراد وہ عام عہد وپیمان ہیں جن پر اجتماعی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسنِ ظن کی خوش حال اور پر امن فضا بنتی ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پوار کرتے ہیں اور اس کی پوری فرمانبرداری کر کے اس کی عائد کردہ حدود اور حقوق کی پوری رعایت کرتے ہیں اور ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں تو ایسے لوگ متقی اور پرہیز گار ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے پرہیز گاروں سے محبت رکھتے ہیں اور ان کو دوست رکھتے ہیں، اس کے برعکس جو شخص نفسانی خواہشات اور دنیا کی حقیر مفادات و لذات مال و عزت اور منصب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے عائد کردہ حقوق اور حدود کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ گویا آخرت دے کر دنیا خرید لیتا ہے اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہو گا، اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نہ رحمت کی نظر سے دیکھے گا اور نہ اس کو پاک وصاف کر کے جنت کا اہل بنائے گا۔ اور وہ دنیا اور آخرت میں ذلیل ورسوا ہو گا اور عذاب کا مستحق ہو گا۔

قیامت کے دن عہد شکن لوگوں کی عظیم رسوائی

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْغَادِرَ یُنْصَبُ لَهٗ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُقَالُ هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ "کہ قیامت کے دن عہد توڑنے والے (کی رسوائی) کے لیے ایک نشان کھڑا کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کی علامت ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لیے ایک نشان ہو گا۔ جس کے ذریعے وہ پہچانا جائے گا کہ یہ عہد شکن اور دھوکہ باز ہے۔ (دیکھیے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (قیامت کے دن عہد شکن (کی ذلت اور رسوائی) کے لیے اس کے سرین کے ساتھ ایک نشان ہو گا جو اس کے عہد شکنی کے بقدر بلند کیا جائے گا (یعنی اس کی جتنی زیادہ عہد شکنی ہو گی اس قدر وہ نشان اور اس کی تشہیر زیادہ ہو گی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خبردار! کوئی عہد شکن عہد شکنی کے اعتبار سے امیر عام (یعنی حکمران وقت) سے زیادہ نہیں (یعنی حکمران کی عہد شکنی سب سے بڑی عہد شکنی ہے)۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

بدعہدی نفاق پیدا کرتی ہے

قرآن مجید یہ بتلاتا ہے کہ بدعہدی نفاق پیدا کرتی ہے چنانچہ منافقوں کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۞ یعنی "نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن تک کہ جس دن اللہ تعالیٰ سے ملیں گے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔" (توبہ: آیت: ۷۷)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی جو نشانیاں بتلائی ہیں ان میں ایک نشانی یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ

وعدہ کر کے اسے پورا نہیں کرتا۔

ایفائے عہد کی عملی تعلیم

نبی کریم ﷺ کے عمل سے ایفائے عہد اور وعدہ کی اہمیت کو سمجھ لیجیے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن ابی الحمساء کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے آپ ﷺ سے (کسی چیز کو) خریدا اور اس کے کچھ حصہ کی ادائیگی مجھ پر باقی رہ گئی۔ میں نے کہا کہ آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں لیکن مجھے اپنے کاموں نے ایسا مشغول کر لیا کہ میں آپ کے معاملہ کو بالکل بھول گیا۔ تین روز کے بعد جب یاد آیا تو بقیہ مال لے کر وہاں حاضر ہوا تو دیکھا آپ اس جگہ تین روز سے میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَيَّ أَنَا هٰهُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُكَ یعنی "تم نے مجھے (وفائے عہد کی) زحمت اور محنت میں ڈال رکھا ہے اور میں تین روز سے یہیں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔" (ابو داؤد)

آپ ﷺ کا اتنے طویل انتظار کی مشقت برداشت کرنا صرف اس احساس کے تحت تھا کہ اس نے کہا کہ میں ابھی یہاں آتا ہوں تو جب تک وہ یہاں نہ آئے اس وقت تک اس کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ جب وہ آئے گا اور مجھے نہ پائے گا تو وہ مشقت اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا، لہٰذا نبی کریم ﷺ کا اس قدر طویل انتظار اپنی بقایا چیز وصول کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ صرف اس لیے تھا کہ جب عبد اللہ بن ابی الحمساء نے آنے کا وعدہ کیا تو ان کے وعدہ کے مقابلے میں گویا آپ کی طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ آپ اس کے آنے تک مقرر جگہ پر انتظار فرمائیں گے۔ یہ اس عہد اور وعدہ کی ایک مثال ہے جو بغیر تحریر و اقرار کے عادۃً اور عرفاً نبی کریم ﷺ کی طرف سے ہوا۔

وعدہ خلافی اور بد عہدی بہت ہی بری عادت ہے، بلکہ شریعتِ مطہرہ میں تو ایفائے عہد اور سچائی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ بچوں کے معاملہ میں بھی اس کو توڑنے سے پرہیز کی ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں چھوٹا تھا ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا کہ آجاؤ میں تجھے کچھ دوں گی رسول اللہ ﷺ نے میری والدہ سے فرمایا تم نے اس کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو کھجور

دینے کا ارادہ کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا یاد رکھو کہ اگر تم اس وقت اس بچے کو کوئی چیز نہ دیتی تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔ (ابوداؤد، مشکوۃ: باب الوعد)

بچوں کے بہلانے کے لیے جھوٹا وعدہ اور جھوٹ معمولی بات سمجھی جاتی ہے، لیکن آپ ﷺ نے بتلایا کہ یہ بھی جھوٹ ہے اور زبان کو کسی طرح جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے، اس کے علاوہ اس میں اولاد کے اخلاق پر بھی بہت اثر ہوتا ہے، ماں باپ اگر بچوں کے سامنے جھوٹ بولیں گے اگرچہ ان کا مقصد صرف بہلاوا ہی ہو پھر بھی بچے جھوٹ بولنا سیکھیں گے اور جھوٹ بولنے میں کوئی قباحت نہ سمجھیں گے۔ یہی حال دوسری بد اخلاقیوں کا ہے۔ بچوں کے سامنے گالیاں دینا یا بچوں کو گالیاں دینا یا ان کے سامنے کوئی اور بری حرکت کرنا بچوں میں بد اخلاقی پیدا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

وعدہ پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ خلافِ شریعت نہ ہو

خلاصہ یہ کہ ایفائے عہد، وعدے کو پورا کرنا اسلامی اخلاق و آداب کا ایک بنیادی تقاضا ہے اور اس کے برخلاف وعدہ خلافی ایک بہت بڑا عیب ہے، جو شخص اپنے وعدہ اور عہد کو پورا نہ کرے وہ اسلام اور معاشرہ دونوں کی نظر میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا جو وعدے اور معاہدے شریعتِ مطہرہ کے خلاف نہ ہوں ان کو پورا کرنا واجب ہے اور جو شریعت کے خلاف ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم کرنا واجب ہے۔

دورُخے پن کی مذمت

دورخا پن (یعنی دہرا رویہ رکھنا) ایک قسم کی منافقت ہے، دورخہ شخص اصل میں منافق صفت آدمی کو کہا جاتا ہے، یہ وہ شخص ہے جو کسی کے حق میں مخلص نہ ہو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے، جب کسی کے سامنے بات کرے تو اس طرح کہ مخاطب یہ سمجھے کہ یہ میرا بڑا دوست ہمدرد اور ہم فکر ہے اور جب اس کے پیٹھ پیچھے بات کرے تو زبان سے ایسے الفاظ نکالے جو اس کے لیے تکلیف کا باعث ہوں۔ اسی طرح وہ شخص بھی دورخا ہوتا ہے جو آپس میں اختلاف اور مخاصمت رکھنے والے دو آدمیوں میں سے ہر ایک کی منہ دیکھی بات کرے، ایک کے پاس جائے تو اس کی پسند کی باتیں کرے اور وہ یہ سمجھے کہ یہ میرا

دوست ہے اسی طرح دوسرے کے پاس جائے تو اس کی مرضی اور خواہش کی بات کرے اور وہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے غرض یہ کہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اس کی محبت ظاہر کرے اور دوسرے کی برائی کرے اور اس طرح دونوں ہی اس کے بارے میں غلط فہمی کے شکار رہیں اور ہر ایک یہ سمجھتا رہے کہ یہ میرا دوست، ہمدرد اور مددگار ہے اور میرے مخالف کا دشمن اور بدخواہ، حالانکہ وہ اس رویہ کی وجہ سے دونوں کا بدخواہ ہوتا ہے اور اس کے اس رویے سے ہر دو فریق ایک دوسرے سے اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بلاشبہ اس طرح کا دورخا پن بہت خطرناک، گھناؤنا جرم اور جھوٹ ہے، ایسا شخص بالآخر دنیا میں بھی ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں سخت وعید آئی ہے، چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تَجِدُوْنَ النَّاسَ مَعَادِنَ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا وَتَجِدُوْنَ خَيْرَ النَّاسِ فِيْ هٰذَا الشَّانِ أَشَدُّهُمْ لَهٗ كَرَاهِيَةً وَتَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِيْ يَأْتِيْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَيَأْتِيْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ

”تم لوگوں کو کانوں کے مثل پاؤ گے ان میں سے جو جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جبکہ انہیں دین کا سمجھ ہو اور (حکومت واقتدار و منصب کے لیے) لوگوں میں سے بہتر تم اس شخص کو پاؤ گے جو اس چیز (یعنی اقتدار و منصب) سے سخت متنفر ہو اور تم لوگوں میں سے سب سے بدتر دورخے (دورویہ) کو پاؤ گے جو ان کے پاس ایک رخ اور رویہ لے کر جائے اور دوسروں کے پاس دوسرا رخ اور رویہ لے کر جائے“۔ (بخاری ومسلم)

حضرت محمد بن زید سے روایت ہے کہ چند افراد نے ان کے دادا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ جب ہم بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے روبرو کچھ اور باتیں کرتے ہیں اور جب باہر نکل جاتے ہیں تو ان باتوں کے خلاف کچھ اور باتیں کرتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا نِفَاقًا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس بات کو نفاق سمجھتے

تھے"

(بخاری ریاض الصالحین باب ۲۵۹)

اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ كَانَ ذَا وَجْهَيْنِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهُ يَوْمُ الْقِيَامَةِ لِسَانَانِ مِنَ النَّارِ " جو شخص دنیا میں دو رخا (یعنی دو رویہ) ہو گا قیامت کے دن اس کے (منہ میں) آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔ (دارمی مشکوۃ باب حفظ اللسان)

اس حدیث کو ابو داؤد نے بھی کتاب الادب میں نقل کیا ہے، بلاشبہ جو شخص دورویہ ہوتا ہے وہ سخت جھوٹا شخص ہوتا ہے وہ اپنے دورخے پن اور دورویے کے سبب لوگوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے، اور ایسا شخص بالآخر دنیا میں بھی ذلیل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچا بنادے اور ہر قسم کے جھوٹ اور نفاق سے بچائے رکھے۔ آمین

ایفائے عہد کے واقعات

حضور اقدس ﷺ کا ایفائے عہد

حضور اقدس ﷺ نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ "اللہ اکبر" آج اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں اور حضور ﷺ کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد صاحب یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مسلمان ہونے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابو جہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی۔ اس وقت ابو جہل اپنے لشکر کے ساتھ حضور ﷺ سے لڑنے کے لیے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابو جہل سے ہوئی تو اس نے پکڑلیا اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں۔ ابو جہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے اس لیے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا: ہمارا مقصد تو صرف حضور ﷺ کی ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابو جہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا، چنانچہ ابو جہل نے آپ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اس وقت حضور ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

اب اندازہ لگائیں کہ حق وباطل کا پہلا معرکہ (غزوۂ بدر) ہورہا ہے اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان" فرمایا یعنی حق وباطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا معرکہ۔ وہ معرکہ ہورہا ہے جس میں جو شخص شامل ہوگیا وہ "بدری" کہلایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں "بدری" صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے اور "اسمائے بدریین" بطورِ وظیفہ پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ بدریین جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشن گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی (جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا) بخشش فرمادی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

بہر حال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابو جہل نے پکڑ لیا تھا اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے اور پھر درخواست کی کہ یارسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لیے ہم نے وعدہ کر لیا۔ لیکن آج آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔

لیکن سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں! تم وعدہ کر کے آئے ہو، زبان دے کر آئے ہو اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرو گے لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے اس لیے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کی کتنی پاس داری کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً: یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں، یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالت عذر ہے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے، وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے اس لیے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں، باقی افراد میں سے کسی نے ڈنڈا اُٹھایا ہے اور کسی نے پتھر۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے جا رہا ہے اس لیے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لیے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں ہو رہا ہے بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لیے ہو رہا ہے، تو حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے، گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج جو ہم لوگوں کی ساری کوششیں بے کار

جارہی ہیں اور ساری محنت بے اثر ثابت ہورہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ گناہ کرکے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کرکے اسلام کو نافذ کریں۔ ہمارے دل ودماغ پر ہر وقت تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، چلو شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو یہ کام کرلو۔

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا گیا ہے اس کو نبھایا جائے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر میں شرکت جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لیے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے ایفائے عہد۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایفائے عہد

۱۔ ہرمزان وہ شخص تھا جس نے مسلمانوں کو تکلیف واذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب وہ گرفتار کرکے لایا گیا تو آپ نے شریعت کے مطابق پہلے اُس پر اسلام پیش کیا، جسے اُس نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اُسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

ہرمزان نے ایک چال یہ چلی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل کرنے کا فیصلہ تو کرہی چکے ہیں، تھوڑا سا پانی منگوادیجیے جسے میں پی سکوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پانی منگوایا۔ جب پانی آگیا تو اس نے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ پانی پینے کے دوران کہیں جلاد مجھ پر تلوار نہ چلا دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نہیں! جب تک تم پانی نہ پی چکو گے قتل نہ کیے جاؤ گے"۔ ہرمزان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر مکمل بھروسہ تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُن کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے وہ اُس پر پوری طرح کاربند رہیں گے۔ اُس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ پانی پینے کے بجائے زمین پر پھینک دیا اور بولا: "اب آپ مجھے قتل نہیں کرسکتے، کیونکہ اب اس پانی کا پینا ممکن نہیں اور اس پانی کے پی لینے تک آپ نے مجھے امان دے رکھی ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے اس مکر سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن آپ نے اپنی اس مؤمنانہ شان کے مطابق کہ مؤمن جب وعدہ کرتا ہے تو اُسے پورا کرتا ہے،

ہرمزان کو آزاد کر دیا۔ ہرمزان نے اپنی ذہانت استعمال کر کے اپنی گردن تو چھڑا لی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس برتاؤ نے اُسے ہمیشہ کے لیے اپنا اسیر بنالیا، اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ اُس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی وعدے کو نبھا کر ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔

(حکایات وواقعات: ۳۰۳ بحوالہ حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات: ۲۴۳، ۲۴۴)

۲۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری جان ومال کی حفاظت کریں گے اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کروگے (”جزیہ“ ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے)۔ چنانچہ جب معاہدہ ہوگیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا جس کے لیے بیت المقدس میں متعین فوج کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں اس لیے وہاں سے اُن کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تجویز تو بہت اچھی ہے، فوجیں وہاں سے اٹھا کر محاذ پر بھیج دو لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں اُن سب کو ایک جگہ جمع کرو اور اُن سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان ومال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس کام کے لیے ہم نے یہاں فوج ڈالی ہوئی تھی۔ لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے اس لیے ہم آپ کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطورِ ٹیکس ادا کیا ہے وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے اور اب آپ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔ یہ مثالیں ہیں اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کرسکتی جس نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایفائے عہد

اگر آج اس کی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی، انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط پروپیگنڈے کیے ہیں اللہ تعالیٰ بچائے، آمین۔ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں ان کا ایک قصہ سن لیجیے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے اس لیے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی۔ روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور ایک تاریخ متعین کر لی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں روم کی سرحد پر لے جا کر ڈال دوں تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو اس وقت میں فوراً حملہ کر دوں۔ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گی پھر کہیں جا کر لشکر روانہ ہو گا اور یہاں آنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہو گا، لہٰذا وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اگر میں اپنا لشکر سرحدوں پر ڈال دوں اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دوں گا تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا اور حملہ کے لیے تیار ہو گئے۔ جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لیے کہ وہ لوگ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر اور بستیوں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ لشکر آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو۔ جب وہ گھڑ سوار قریب آیا تو

اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں: اللہ اکبر اللہ اکبر قفوا عباد اللہ قفوا عباد اللہ "اللہ کے بندو! ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو! ٹھہر جاؤ"۔ جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمر بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ: وفاء لا غدر، وفاء لا غدر "یعنی مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے غداری نہیں، عہد شکنی نہیں ہے"۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمر بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد سے اندر بھی داخل کر دیا تھا۔ یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی، اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحُلَّنَّ عَهْدًا وَلَا يَشُدَّنَّهُ حَتّٰى يَمْضِيَ اَمَدُهُ اَوْ يُنْبَذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ یعنی "جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو اُس وقت تک عہد نہ کھولیں اور نہ باندھیں، یہاں تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا اُن کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیں کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لیے جائز نہیں تھا"۔ (ترمذی: کتاب الجهاد، باب فی الغدر، حدیث: ۱۵۸۰)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ ایک فاتح لشکر ہے جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے اور فتح کے نشے میں چور ہے، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے وعدہ کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے تو اُسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے وہ سب واپس کر دو۔ چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا گیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آ گئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بنا پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیش نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا اس لیے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا اس لیے

واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفا، کہ جب زبان سے بات نکل گئی تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔

ایک نوجوان کا ایفائے عہد

ایک دن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سادہ دربارِ خلافت سرگرم انصاف و عدل تھا، اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے اور مختلف درپیش معاملات طے ہو رہے تھے کہ اچانک ایک خوش رُو نوجوان کو دو نوجوان پکڑے ہوئے لائے، اور فریاد کی "یا امیر المؤمنین! اس ظالم سے ہمارا حق دلوایئے، اس لیے کہ اس نے ہمارے بوڑھے باپ کو مار ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر فرمایا: "ہاں! دونوں کا دعویٰ تو سُن چکا، اب بتا تیرا کیا جواب ہے؟ اس نے نہایت ہی فصاحت و بلاغت سے پورا واقعہ بیان کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہاں! مجھ سے یہ جرم ضرور ہوا ہے اور میں نے طیش میں آکر پتھر کھینچ مارا جس کی ضرب سے وہ پیر ضعیف مر گیا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "تجھے اعتراف ہے تو اب قصاص کا عمل لازمی ہو گیا اور اُس کے عوض تجھے اپنی جان دینی ہو گی۔"

نوجوان نے سر جھکا کر عرض کیا "مجھے امام کے حکم اور شریعت کے فتویٰ کو ماننے میں کوئی عذر نہیں، لیکن ایک درخواست ہے۔" ارشاد ہوا: وہ کیا؟ عرض کیا "میرا ایک چھوٹا نابالغ بھائی ہے، جس کے لیے والد مرحوم نے کچھ سونا میرے سپرد کیا تھا کہ وہ بالغ ہو تو اُس کے سپرد کر دوں، میں نے اُس سونے کو ایک جگہ زمین میں دفن کر دیا، اور اُس کا حال سوائے میرے کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اگر وہ سونا اُس کو نہ پہنچا تو قیامت کے دن میں ذمہ دار ہوں گا، اس لیے اتنا چاہتا ہوں کہ تین دن کے لیے ضمانت پر چھوڑ دیا جاؤں۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں سر جھکا کر ذرا غور فرمایا اور پھر سر اٹھا کر ارشاد فرمایا: "اچھا! کون ضمانت دیتا ہے کہ تو تین دن کے بعد تکمیل قصاص کے لیے چلا آئے گا؟" فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد پر اُس نوجوان نے چاروں طرف دیکھا اور حاضرین کے چہروں پر نظر ڈال کر حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا: "یہ میری ضمانت دیں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا "ابو ذر! تم ضمانت دیتے ہو۔" انہوں نے فرمایا: "بے شک میں ضمانت دیتا ہوں کہ یہ نوجوان تین دن بعد حاضر ہو جائے گا۔" یہ ایسے جلیل القدر صحابی کی ضمانت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو گئے، اُن دونوں مدعی نوجوانوں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی اور وہ شخص چھوڑ دیا گیا۔

اب تیسرا دن تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دربار بدستور قائم ہوا، تمام جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تشریف لائے، اور وقتِ مقررہ پر مجرم کا انتظار ہونے لگا۔ وقت گزرتا جارہا تھا اور اُس مجرم کا کچھ پتا نہیں تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نسبت تشویش پیدا ہوگئی، دونوں نوجوانوں نے بڑھ کر کہا: ”اے ابو ذر! ہمارا مجرم کہاں ہے؟“ انہوں نے کمالِ استقلال اور ثابت قدمی سے جواب دیا: ”اگر تیسرے دن کا وقت مقررہ گزر گیا اور وہ نوجوان نہ آیا تو اللہ کی قسم! میں اپنی ضمانت پوری کروں گا۔“ عدالت فاروقی بھی جوش میں آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنبھل کر بیٹھے اور فرمایا: ”اگر وہ نوجوان نہ آیا تو ابو ذر کی نسبت وہی کاروائی کی جائے گی جو شریعتِ اسلامی کا تقاضہ ہے۔“

یہ سنتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تشویش بڑھ گئی، بعض آبدیدہ اور بعض کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ لوگوں نے مدعیوں سے کہنا شروع کر دیا: ”تم خون بہا قبول کرلو۔“ انہوں نے قطعی انکار کیا کہ ”ہم خون کے بدلے خون ہی چاہتے ہیں۔“

لوگ اسی پریشانی میں تھے کہ اچانک مجرم نمودار ہوا، پسینے میں ڈوبا ہوا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا۔ خندہ پیشانی سے سلام کیا اور عرض کیا: ”میں اُس بچے کو اُس کے ماموں کے سپرد کر آیا ہوں، اور اُس کی جائیداد اُنہیں بتادی، اب آپ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالائیں۔“

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! میں جانتا بھی نہ تھا کہ یہ شخص کون اور کہاں کا رہنے والا ہے، نہ اس سے پہلے کبھی اس کی صورت دیکھی تھی، مگر سب کو چھوڑ کر مجھے اُس نے اپنا ضامن بنایا، مجھے انکار مروّت کے خلاف معلوم ہوا، اور یہ یقین ہوا کہ یہ شخص عہد میں سچا ہوگا، اس لیے ضمانت دی۔“

اُس کے آپہنچنے سے حاضرین میں ایسا غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا تھا کہ دونوں مدعی نوجوانوں نے خوشی میں آکر عرض کیا: ”امیر المؤمنین! ہم نے اپنے باپ کا خون بہا معاف کر دیا۔“ سب نے ایک نعرۂ مسرت بلند کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا اور فرمایا: ”مدعی نوجوانو! تمہارے باپ کا خون بہا میں بیت المال سے ادا کردوں گا، تم اسی نیک نیتی کے ساتھ فائدہ بھی اُٹھاؤ گے۔“ انہوں نے عرض کیا:

"امیر المؤمنین! ہم اس حق کو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے معاف کر چکے ہیں، لہٰذا اب ہمیں کچھ لینے کا حق نہیں اور نہ لیں گے۔" (حکایات وواقعات: ۸۵ تا ۸۷)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایفائے عہد

حضرت ہارون بن رِیَاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا: فلاں آدمی کو تلاش کرو، کیونکہ میں نے اس سے اپنی بیٹی (کی شادی کرنے) کا ایک قسم کا وعدہ کیا تھا، میں نہیں چاہتا کہ اللہ سے میری ملاقات اس حال میں ہو کہ نفاق کی تین نشانیوں میں سے ایک نشانی یعنی وعدہ خلافی مجھ میں ہو، اس لیے میں آپ لوگوں کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ایفائے عہد

بخاری شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک ہزار دینار اُدھار مانگے۔ اس نے کہا: گواہ لاؤ۔ جواب دیا کہ خدا کی گواہی کافی ہے۔ کہا: ضمانت لاؤ۔ جواب دیا کہ خدا کی ضمانت کافی ہے۔ کہا: تونے سچ کہا۔ ادائیگی کی میعاد مقرر ہوگئی اور اس نے اسے ایک ہزار دینار گن کر دیے۔ اس نے بحری سفر کیا اور اپنے کام سے فارغ ہوا۔ جب میعاد پوری ہونے کو آئی تو یہ سمندر کے قریب آیا کہ کوئی جہاز کشتی ملے تو اس میں بیٹھ کر جاؤں اور رقم ادا کر آؤں لیکن کوئی جہاز نہ ملا۔ جب دیکھا کہ وقت پر نہیں پہنچ سکتا تو اس نے ایک لکڑی لے لی اور بیچ میں سے کھوکھلی کر کے اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیے اور ایک پرچہ بھی رکھ دیا۔ پھر اس کا منہ بند کر دیا اور خدا تعالیٰ سے دعا کی:

"اے پروردگار! تجھے خوب علم ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لیے۔ اس نے مجھ سے ضمانت طلب کی، میں نے تجھے ضامن بنایا اور اس پر وہ خوش ہوگیا۔ گواہ مانگا، میں نے گواہ بھی تجھی کو رکھا، وہ اس پر بھی خوش ہوگیا۔ اب جب کہ وقتِ مقررہ ختم ہونے کو آیا تو میں نے ہر چند کشتی تلاش کی کہ جاؤں اور اپنا قرض ادا کر آؤں لیکن کوئی کشتی نہیں ملی۔ اب میں یہ رقم تجھے سونپتا ہوں اور سمندر میں ڈال دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ رقم اسے پہنچادے"۔

پھر اس لکڑی کو سمندر میں ڈال دیا اور خود چلا گیا، لیکن پھر بھی کشتی کی تلاش میں رہا کہ مل جائے تو جاؤں۔ جس شخص نے اسے قرض دیا، جب اس نے دیکھا کہ وقت پورا ہوا اور آج اسے آجانا چاہیے تھا تو وہ بھی دریا کے کنارے آکھڑا ہوا کہ وہ آئے گا اور میری رقم مجھے دے گا یا کسی کے ہاتھ بھجوائے گا، مگر جب شام ہونے کو آئی اور کوئی کشتی اس طرف سے نہ آئی تو یہ واپس لوٹا۔ کنارے پر ایک لکڑی دیکھی تو اس نے یہ سمجھ کر وہ لکڑی اٹھائی کہ خالی تو جا ہی رہا ہوں کیوں نہ اس لکڑی کو ساتھ لے جاؤں، پھاڑ کر سکھالوں گا، جلانے کے کام آئے گی۔

گھر پہنچ کر جب اُسے چیرتا ہے تو اس سے اشرفیاں نکلتی ہیں، گنتا ہے تو پوری ایک ہزار ہوتی ہیں۔ وہیں پرچہ پر نظر پڑتی ہے، اسے بھی اٹھا کر پڑھتا ہے۔ پھر ایک دن وہی شخص آتا ہے اور ایک ہزار اشرفیاں پیش کر کے کہتا ہے کہ یہ لیجیے اپنی رقم! معاف کیجیے گا، میں نے ہر چند کوشش کی کہ وعدہ خلافی نہ ہو، لیکن کشتی نہ ملنے کی وجہ سے مجبور ہو گیا اور دیر لگ گئی۔ آج کشتی ملی تو آپ کی رقم لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا میری رقم آپ نے بھجوائی بھی ہے؟ اس نے کہا: میں تو کہہ چکا کہ مجھے کشتی نہ ملی۔ اس نے کہا: اپنی رقم واپس لے کر خوش ہو کر چلے جاؤ۔ آپ نے جو رقم لکڑی میں ڈال کر اسے توکلاً علی اللہ دریا میں ڈال دیا تھا اُسے خدا تعالیٰ نے مجھ تک پہنچا دیا اور میں نے اپنی پوری رقم وصول کر لی۔

(صحیح اسلامی واقعات: ۱۷۰ تا ۱۷۲)

خیانت کا بیان

امانت کی ضد خیانت ہے، خیانت بھی جھوٹ کی ایک عملی قسم ہے کیونکہ جس شخص کے پاس کوئی امانت رکھی جاتی ہے یا اسے کوئی ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے تو اس پر اعتماد اور بھروسہ کی بنا پر سپرد کی جاتی ہے۔ ذمہ داری اٹھانے والا شخص اپنے آپ کو قابلِ اعتماد باور کراتا ہے تو دوسرا اس پر اعتماد اور بھروسہ کر کے اس کو کوئی ذمہ داری سپرد کر دیتا ہے۔ جب یہ شخص اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا یا پورا کرنے میں کمی اور کوتاہی کرتا ہے تو یہ اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو جس قدر قابل اعتماد ظاہر کیا تھا وہ اس میں پورا جھوٹا یا ایک گونہ جھوٹا نکلا۔

امانت کیا ہے اور خیانت کیا ہے؟

جو شخص اعتماد دِلا کر کسی چیز کی ذمہ داری اُٹھالے وہ اس کے پاس امانت ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو کماحقہ پورا کرتا ہے تو ایسا شخص "امین" یعنی "امانتدار" کہلاتا ہے۔ اگر وہ اس کو پورا نہیں کرتا یا کسی قدر نقصان کے ساتھ پورا کرتا ہے تو پہلی صورت میں پوری خیانت کا اور دوسری صورت میں قدرِ خیانت کا مرتکب ہو کر "خائن" یعنی "خیانت کرنے والا" کہلاتا ہے۔

"امانت" اور اس کی ضد "خیانت" کا مفہوم اس معنی کے لحاظ سے بہت وسیع ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر واجب ہوتے ہیں، یا جو بھی ذمہ داری انسان اپنے ذمہ لے لیتا ہے خواہ وہ مالی ہو، قانونی ہو یا اخلاقی؛ سب کی سب اس میں شامل ہے۔ امانت کے اس معنی کے لحاظ سے شریعتِ مطہرہ کی تمام تفصیلات سمٹ کر اسی کے اندر آجاتی ہیں، لہٰذا عبادات میں امانت داری یہ ہے کہ ان کو صحیح وقت میں شرائط وآداب کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں امانت داری یہ ہے کہ ان کی پوری پوری ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔ اگر کسی کا کوئی حق (قرض) آپ پر باقی ہے یا آپ کے پاس کوئی چیز امانت رکھی ہے تو اس کو جوں کا توں دے دینا بھی امانت ہے۔ کسی کا کوئی بھید اور راز آپ کو معلوم ہے تو اس کو (بغیر شرعی ضرورت کے) فاش نہ کرنا اور اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ آپ نے اگر کسی مجلس میں کوئی بات راز کی سن لی یا کسی کے متعلق کوئی

بات سن لی تو اس کو اسی مجلس تک محدود رکھنا بھی امانت ہے۔ کسی نے آپ سے کوئی مشورہ مانگا تو اس کو صحیح مشورہ دینا اور اس کو اپنے تک ہی محدود رکھنا بھی امانت ہے۔ جس شخص پر منصب اور عہدہ کی تقسیم کی ذمہ داری ہو تو اس کو وہ منصب اور عہدہ اہل لوگوں کے حوالے کرنا بھی امانت ہے۔ اگر کسی کے پاس نوکری کرنی ہے تو اس کو نوکری کی شرائط کے مطابق انجام دینا بھی امانت ہے۔ نوکری اور مزدوری میں بلاوجہ سستی کرنا، یا دیر سے کام پر آنا، یا وقت پورا ہونے سے پہلے چلا جانا؛ اس طرح کی کوتاہیاں کرنا بھی امانت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح کسی بھی ذمہ داری میں کوئی کوتاہی یا کمی کرنا امانت کے خلاف ہے۔

مثلاً: دو آدمیوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرنا ہے تو عدل کے ترازو کو تمام تر مخالف رجحانات کے باوجود برابر رکھنا امانت داری ہے اور اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔ اسی طرح حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے رشتہ داری، کنبہ پروری اور دوست نوازی کے بجائے صرف اہلیت اور قابلیت کو معیار قرار دینا امانت داری ہے اور اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔ مثلاً: کسی حاکم کو یہ خوب معلوم ہے کہ زید کو جو یہ فلاں عہدہ دے رہا ہے اس سے زیادہ اس عہدے کا حق دار بکر ہے، ایسی صورت میں یہ حاکم اگر زید کو عہدہ دے گا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگا جیسا کہ قرآن مجید اور احادیث میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ یہاں بھی اس کے متعلق قرآن مجید اور حدیث شریف سے کچھ نقل کیا جاتا ہے۔

ادائے امانت کا حکم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ”بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کیا کرو۔“ (سورۃ النساء: آیت: ۵۸)

امانت کا لفظ یہاں محدود مفہوم میں نہیں، بلکہ ہر ذمہ داری امانت ہے اور اس کو ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے۔ تمام حقوق و فرائض خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے متعلق ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات کی شکل میں ہوں یا حکومتی اور سیاسی معاہدات کی شکل میں، غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ حضرت

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، وزن اور پیمانہ امانت ہے۔ (دیکھیے ترغیب وترہیب: ج۴، ص۵)

خلاصہ یہ کہ جو شخص جس چیز کا حق دار ہو اس کے حق کا اعتراف کریں، اور جو چیز جس کو ملنی چاہیے وہ اس کے سپرد کریں۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کریں، آنکھ، کان اور زبان وغیرہ تمام چیزیں امانت ہیں، ان کا غلط استعمال نہ کریں۔ ماں باپ کے حقوق ہوں یا رشتہ داروں کے، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ہوں یا قرض داروں کے، امانت کی کوئی ذمہ داری سر پر آئی ہو یا قابلیت اور اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ کی تقرری کا حق؛ غرض جو جس کا حق ہو اور جو جس چیز کا اہل ہو وہ اس کے حوالے کریں یہی امانت داری ہے اور اس کے خلاف خیانت ہے۔

پوری شریعت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس میں کوتاہی خیانت ہے

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پوری شریعت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے اور اس میں کوتاہی کرنا خیانت ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے خیانت (یعنی نافرمانی اور بے وفائی) نہ کرو اور اپنی آپس کی امانتوں (یعنی ایک دوسرے کے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں) میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو، اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (جن کی وجہ سے انسان کو پرکھا جاتا ہے) اور یہ (بھی جان رکھو) کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (اس آزمائش اور امتحان میں پاس ہونے والوں کے لیے) اجرِ عظیم ہے۔“ (سورۃ الانفال: آیت ۲۷۔۲۸)

وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِكُمْ یہ جملہ لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ کے تحت ہی ہے، لیکن صرف نہی کا اعادہ نہیں فرمایا جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت اور بے وفائی ایک ایسی چیز ہے جو امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کی راہ کھول دیتی ہے۔ اس کے بعد

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ میں خیانت کی اصل وجہ بتادی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت واطاعت میں کمزور ہوتے ہیں اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور امانتوں میں اپنی ذمہ داریوں میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اصل میں ان پر دنیاوی مال و اولاد کی محبت غالب ہوتی ہے، لہٰذا اس بات کو خوب جان لو کہ یہ مال اور اولاد بھی ایک امتحان اور آزمائش ہے جن کی وجہ سے انسان کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شخص اس امتحان اور کشمکش میں پاس ہو جائے وہ اس بات کو اچھی طرح جان لے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں اپنے اور اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار اور امانتدار بنائے۔ آمین

اعضاوجوارح میں خیانت

ہمارے تمام اعضاو جوارح اللہ تعالیٰ کی سونپی ہوئی امانت ہیں اور ہم اس کے پابند ہیں کہ انہیں مالکِ حقیقی کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ جو کوئی ان کو غلط اور بے جا استعمال میں لاتا ہے اور جس قدر لاتا ہے، وہ اُسی قدر امانت میں خیانت کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ”اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری اور (اس خیانت کو) جو سینوں میں چھپی ہے۔“ (سورہ مؤمن:۱۹)

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتیں اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ امانت اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے صرف یہ نہیں کہ کوئی شخص آپ کے پاس کوئی چیز رکھے اور آپ اس کو وہ چیز جوں کی توں واپس کردیں، بلکہ اس ضمن میں دین وشریعت کی تمام تفصیلات، حقوق اللہ اور حقوق العباد سمٹ کر آجاتے ہیں۔

قابلیت واہلیت کے بغیر عہدہ اور منصب سپرد کر دینا بھی خیانت ہے

عہدے اور مناصب سب امانتیں ہیں۔ ان کے امین وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں یہ اختیارات ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان اختیارات کو صحیح استعمال نہیں کرتے اور اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو وہ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے، یہاں اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات میں سے بھی کچھ پڑھ لیجیے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنِ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنْ عِصَابَةٍ وَفِيهِمْ مَنْ هُوَ اَرْضٰى لِلّٰهِ منه فقدخان اللّٰه وَرَسُولَهٗ وَالْمُؤْمِنِينَ یعنی "جس (حاکم اور ذمہ دار) نے کوئی عہدہ ایک شخص کے سپرد کیا حالانکہ (اس کے علم میں تھا کہ) اس جماعت میں ایسا آدمی تھا جو اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا (اور اس عہدہ و منصب کا زیادہ لائق اور مستحق) تھا تو اس (حاکم اور) ذمہ دار شخص نے اللہ تعالیٰ کے حق میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اور سب مسلمانوں کے حق میں خیانت کی۔"

(دیکھیے ترغیب وترہیب: ج۳، ص۱۷۹)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب حضرت یزید بن ابی سفیان کو شام کی طرف بھیج رہے تھے تو ان کو نصیحت کی اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ وَلِيَ مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ شَيْأً فَاَمَّرَ عَلَيْهِمْ اَحَدًا مُحَابَاةً فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا حَتّٰى يُدْخِلَهٗ جَهَنَّمَ یعنی "جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی، پھر اُس نے کوئی عہدہ اور منصب کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی بنا پر (بغیر اہلیت اور قابلیت معلوم کیے ہوئے) دے دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ اس سے نہ کوئی فرض (روزہ، زکوٰۃ وغیرہ) قبول کرے گا اور نہ کوئی نفل (اور دوسرا معاوضہ یا دینی محنت، کوشش) قبول کرے گا یہاں تک کہ اس کو جہنم میں داخل کر دے گا۔" (حاکم واحمد ج۱ اص ۲۰۲، دیکھیے ترغیب وترہیب: ج۳، ص۱۷۹)

خیانت کی بعض باریک قسمیں

خیانت کی بعض قسمیں تو ایسی ہیں جن کو ہر کوئی جانتا ہے، لیکن اس کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن کو لوگ خیانت ہی نہیں سمجھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خیانت کے متعلق ہمیں خبردار کیا ہے۔

اپنی عقل و فکر سے صحیح اور خیر خواہانہ مشورہ دینا بھی امانت ہے

ان میں سے ایک مشورہ ہے۔ جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی عقل، فکر اور تجربہ کے مطابق وہ مشورہ دے جو مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو۔ اگر جان بوجھ کر غلط مشورہ دے دیا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے ایک موقع پر ابوالہیثم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ "جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ اس میں امین ہے (یعنی اپنی عقل و فکر سے کام لے کر اس کی خیر خواہی کرنا، اس کے راز کو خفیہ رکھنا اور نیک مشورہ دے دینا ضروری ہے"۔) (ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جس سے کسی معاملہ میں مشورہ لیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس بات کو جان لے کہ مشورہ طلب کرنے والے نے اس کو قابلِ اعتماد سمجھ کر اس سے مشورہ طلب کیا ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ ایک امانت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے، بلکہ اچھی طرح غور و فکر کرکے ایسا مشورہ دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اور پھر اُس کی بات راز میں بھی رکھے ورنہ اگر جانتے ہوئے غلط مشورہ دے دیا یا اس کے راز کو فاش کر دیا تو خیانت کا مرتکب ہو گا۔

مؤذن ایک امین شخص ہیں اور امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ "یعنی امام ضامن ہے اور مؤذن امین ہے (اور امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے۔")

(احمد، داؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

یعنی لوگ نماز کے اوقات اور روزے کی سحری و افطاری کے سلسلے میں مؤذن پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اب اگر مؤذن بلا تحقیقِ وقت کے اذان دے دیتا ہے تو وہ امانت میں خیانت کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دو چیزیں مؤذنوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی ہیں: ایک تو مسلمانوں کے روزے اور دوسری ان کی نمازیں۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ: باب بعض احکام الاذان)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دو اہم بنیادی اعمال ایسے ہیں جو مؤذنوں پر موقوف ہیں اور مؤذن ان اعمال کی صحت اور تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔

پہلی چیز تو روزہ ہے کہ مسلمان مؤذن کی اذان پر اعتماد کرکے روزے کو بند کرتے ہیں اور ان ہی پر اعتماد کرتے ہوئے افطار کرتے ہیں۔

دوسری چیز نماز ہے جس کی ادائیگی مؤذنوں کی اذان کے تحت ہوتی ہے، لہٰذا مؤذن کو چاہیے کہ

وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اور اوقات کی پوری رعایت کرتے ہوئے اذان کہے تاکہ مسلمانوں کے ان دونوں اعمال میں خلل واقع نہ ہو۔

ان روایات سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ ہر ذمہ داری امانت ہے اور ہر ذمہ دار اس وقت بریٔ الذمہ قرار پاتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو کمال احتیاط کے ساتھ پورا کرتا رہے۔

جب کوئی ایسی بات آپ سے کہہ دے جس کو وہ دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے وہ بھی امانت ہے

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِیْثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَھِیَ اَمَانَۃٌ "جب کوئی شخص اپنی کوئی بات کہے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھے تو وہ امانت ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے اپنی بات کرے اور پھر ایسا کچھ نہ کہے کہ یہ بات امانت ہے یا اسے راز میں رکھنا، لیکن اس کے انداز سے یہ محسوس ہو رہا ہو کہ وہ اس بات کو عام لوگوں سے چھپا رہا ہے تو ایسی صورت میں اس کی یہ بات امانت ہے، اس کو راز میں رکھنا چاہیے۔ اگر یہ بات دوسروں تک پہنچائی تو یہ خیانت ہوگی۔

مجلس کی باتیں بھی امانت ہوتی ہیں

مجلس میں جو بات ہوتی ہے وہ مجلس میں بیٹھنے والوں کے پاس امانت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ "مجلسوں میں امانت داری ضروری ہے۔" (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

یعنی مجلس میں راز کی باتیں اہلِ مجلس کے علاوہ کسی اور سے بیان نہ کی جائیں۔ یہ مجلس کی امانت ہیں اور ان کو دوسروں سے بیان کرنا خیانت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجلس میں جو بات ہو جائے وہ مجلس کی امانت ہے، مجلس والے کی اجازت کے بغیر اس بات کو دوسروں سے کہہ دینا اور پھیلانا ناجائز اور خیانت ہے۔

ظلم کی سازش والی بات متعلقہ لوگوں تک پہنچانا ہی امانت ہے

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اگر کسی مجلس میں کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے یا کوئی شخص آپ سے ایسی بات کہہ دے جس میں ظلم کی سازش ہو، مثلاً: کسی شخص کے ناحق قتل کرنے، یا کسی کی آبرو ریزی، یا اس کو مالی نقصان پہنچانے کی کوئی سازش ہو، یا اسلام کے خلاف کوئی سازش ہو تو ایسی صورت میں شریعتِ مطہرہ کی تعلیم یہی ہے کہ ایسی بات کو ہرگز راز میں نہ رکھیں، بلکہ ایسی صورت میں دیانت داری اور امانت داری کا تقاضہ یہی ہے کہ اس گناہ اور ظلم کے منصوبے کو ناکام بنایا جائے، اور جن لوگوں کو اس سے خبردار کرنا ضروری سمجھیں اُن کو ضرور خبردار کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حق میں خیانت ہوگی۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ إِلَّا ثَلٰثَةَ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ أَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ أَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی "مجلسوں میں امانت داری ضروری ہے (یعنی کسی مجلس میں رازداری کے ساتھ جو بات ہو اہلِ مجلس امانت سمجھ کر اس کو راز میں رکھیں)، لیکن تین مجالس اس سے مستثنیٰ ہیں: ایک وہ جس میں کسی کے ناحق خون کی سازش اور مشورہ ہو، دوسری وہ جس میں کسی کی عصمت وعفت لوٹنے کا فیصلہ کیا گیا ہو، اور تیسری وہ جس میں بغیر کسی حق کے (ناجائز طور پر) کسی کا مال لوٹنے اور چھیننے کا فیصلہ ہو"۔

(ابوداؤد)

یہ تین چیزیں بطورِ مثال بیان کی گئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مجلس میں اگر کسی گناہ اور ظلم کی کوئی سازش ہو اور اس کا فیصلہ کیا گیا ہو تو پھر امانت اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ظالمانہ اور مجرمانہ منصوبے کو ناکام بنایا جائے اور جہاں خبر دینا ضروری ہو وہاں تک اس بات کو پہنچایا جائے۔

اجتماعی اموال اور حقوق میں خیانت کی سزا

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

یعنی "کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی کی ہوئی خیانت کے ساتھ قیامت کے دن حاضر ہوگا، پھر ہر شخص کو اپنی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر

کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۱۶۱)

لفظ "غلول" مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خاص کر مالِ غنیمت کی خیانت کے لیے بھی۔ مالِ غنیمت اور اجتماعی اموال میں چوری اور خیانت کا گناہ عام چوریوں اور خیانتوں سے بھی زیادہ سخت ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مالِ غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہت بڑا گناہ بتلایا اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا۔ پھر اس کے بعد فرمایا کہ خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنے گردن پر بلبلاتے ہوئے اونٹ کو لاد کر (میدانِ حشر میں) لائے (یعنی جو شخص مالِ غنیمت سے اونٹ کی خیانت کرے گا وہ شخص میدانِ حشر میں ایسی حالت میں پیش ہوگا کہ اس کی گردن پر وہی اونٹ سوار ہوگا اور بلبلا رہا ہوگا) اور پھر مجھ سے کہے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری شفاعت کیجیے، اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں اب تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ (یعنی میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات نہیں دلا سکتا) کیونکہ میں نے تمہیں دنیا میں شریعت کے احکام پہنچا دیے تھے (یعنی تمہیں پہلے بتلا دیا تھا کہ مالِ غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں تصرف بہت بڑا گناہ ہے)۔

اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو لاکر حاضر کردے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری مدد (اور فریاد رسی) کیجیے اور (میں اس کے جواب) میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے احکامِ شریعت پہنچا دیے تھے، اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ممیاتی ہوئی بکری لاد کر (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے کہہ دے کہ یارسول اللہ! میری (شفاعت) کیجیے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیے تھے، اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر کسی چلاتے ہوئے آدمی کو

(یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لیا ہو) لاد کر (میدانِ حشر میں) آئے اور کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد اور فریاد رسی کیجیے، اور میں اس کے جواب میں یوں کہہ دوں کہ میں اب تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے تمہیں احکامِ شریعت پہنچا دیئے تھے۔ اور خبر دار! میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے حاضر ہو اور پھر مجھے کہے کہ یا رسول اللہ! میری مدد اور فریاد رسی کیجیے اور میں اس کے جواب میں کہہ دوں کہ میں تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے تمہیں احکامِ شریعت پہنچا دیئے ،اور خبر دار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لاد کر حاضر ہو اور پھر مجھ سے کہے کہ یا رسول اللہ! میری مدد اور شفاعت کیجیے، اور میں اس کے جواب میں کہہ دوں کہ میں تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

ایک عبرتناک واقعہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک غلام بطورِ ہدیہ پیش کیا جس کا نام مدعم تھا۔ ایک دن (غالباً میدانِ جنگ میں) وہ رسول اللہ ﷺ کا کجاوا اُتار رہا تھا کہ اچانک کسی نامعلوم شخص کا تیر آ کر اس کو لگا جس سے وہ جاں بحق ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ مدعم کو جنت مبارک ہو۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''نہیں، ایسا نہیں؛ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ چادر جس کو مدعم نے خیبر کے مالِ غنیمت میں سے اُس کی تقسیم سے قبل لے لیا تھا (وہ چادر) آگ بن کر مدعم پر شعلے برسا رہی ہے۔ جب لوگوں نے یہ سخت وعید اور تنبیہ سنی تو (جن لوگوں نے مالِ غنیمت کے بارے میں یہ گمان کر رکھا تھا کہ اس میں سے چھوٹی موٹی اور حقیر چیز کو لے لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہو گا تو وہ کانپ گئے، اور انہوں نے جو چھوٹی موٹی چیزیں لے لی تھیں وہ لا لا کر واپس کرنے لگے یہاں تک کہ) ایک شخص نے ایک یا دو تسمے (نبی کریم ﷺ کی خدمت میں) واپس کیے۔ آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ: باب القائم)

اس سے اندازہ لگائیں! کہ اوقاف، بیت المال ،جماعت اور مدرسہ کے اموال جن کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق متعلق ہوں اُن میں ذرہ برابر خیانت کس قدر عظیم جرم ہے۔

ایک شخص نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا غلام ہے اور خود نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ جنگوں میں شریک رہااور جب وہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا کجاوا اتار رہاتھا تو اسی وقت تیر لگنے سے جاں بحق ہو گیا،اور جس کے بارے میں مسلمانوں نے یہی گمان کیا کہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہو گیااور جنت کے باغوں میں داخل ہو گیا، لیکن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی گواہی اس کے برعکس تھی اور اس کی وجہ صرف یہ بتائی گئی کہ انہوں نے اجتماعی مال یعنی مالِ غنیمت میں سے اس کی تقسیم سے پہلے ایک چادر لے لی تھی جو اس پر آگ بن کر لپٹ رہی تھی۔اس کا مطلب یہی ہے کہ خیانت کی چیز ہر حالت میں دوزخ کی آگ ہے خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔

اجتماعی مال میں خیانت کرنے والے آگ کے سزاوار ہوں گے

حضرت خولہ انصاریہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا کہتی ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

اِنَّ رِجَالًا يَتَخَوَّضُوْنَ فِيْ مَالِ اللّٰهِ بِغَيْرِ حَقٍّ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ "بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے مال (یعنی غنیمت، بیت المال اور زکوۃ وغیرہ اجتماعی مال) میں ناحق (یعنی بغیر کسی استحقاق کے) تصرف کرتے ہیں، پس ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن جہنم کی آگ ہو گی۔" (بخاری، مشکوۃ: باب القائم)

نیز حضرت عبد اللہ بن عمرو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام "کرکرہ" تھا۔جب اس کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ وہ (کرکرہ) جہنم کی آگ میں ڈالا گیا ہے۔(صحابہ کرام نے جب یہ سنا تو وہ سمجھ گئے کہ اس کا سبب مالِ غنیمت میں ناحق تصرف ہے) چنانچہ انہوں نے اس کے سامان کو دیکھنا شروع کیا تو اس میں ایک کملی پائی گئی جس کو اس نے مال غنیمت میں سے خیانت کر کے لیا تھا۔

(بخاری، مشکوۃ)

حضرت خولہ بنت قیس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَصَابَهُ بِحَقِّهٖ بُوْرِكَ لَهُ فِيْهِ وَرُبَّ مُتَخَوِّضٍ فِيْمَا شَاءَتْ بِهٖ نَفْسُهُ مِنْ مَالِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَلَيْسَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا النَّارُ "بلاشبہ یہ مال ایک سرسبز اور میٹھی چیز

ہے (یعنی وہ انسان کی نظر کو بھاتا ہے اور دل کو لُبھاتا ہے)، جو شخص اس مال کو حق کے ساتھ (یعنی حلال ذریعہ سے) حاصل کرتا ہے اس کے لیے اس میں برکت ہوتی ہے، اور (یادرکھو!) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے مال (یعنی مالِ غنیمت اور اجتماعی اموال) میں سے جس چیز کو ان کا نفس چاہتا ہے اپنے تصرف میں لے آتے ہیں، قیامت کے دن اُن کے لیے سوائے آگ کے کوئی چیز نہیں ہوگی۔" (ترمذی، مشکوٰۃ)

خائن قیامت میں رسوا ہوگا

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: اَدُّوا الْخِيَاطَ وَالْمَخِيْطَ وَاِيَّاكُمْ وَالْغُلُوْلَ فَاِنَّهٗ عَارٌ عَلٰى اَهْلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ "دھاگے اور سوئی کی بھی ادائیگی کرو (یعنی مال غنیمت میں سے اس قدر معمولی) چیزیں بھی چھپا کر نہ رکھو) اور تم خیانت سے اجتناب کرو کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیانت کرنا قیامت کے روز خیانت کرنے والے پر ذلت اور رسوائی لانے والی ہوگی۔" (دارمی، نسائی، مشکوٰۃ: باب قسمۃ الغنائم)

جس کے اندر صفت امانت نہیں اس میں ایمان نہیں

جس شخص میں امانت داری کی صفت نہیں اُس میں ایمان نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ نہ فرمایا ہو: لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ "جس میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی کچھ نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اُس کا دین بھی کچھ نہیں۔" (مشکوٰۃ: کتاب الایمان)

اس روایت کو علامہ منذری رحمہ اللہ نے مسند احمد، مسند بزار و طبرانی سے بھی نقل کیا ہے اور اس میں ہے کہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے کوئی خطبہ ایسا نہیں دیا جس میں آپ ﷺ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا کوئی دین نہیں"۔ (ترغیب وترہیب: ج۴، ص۱۱)

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: لَا اِيْمَانَ

لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَا طُھُوْرَ لَہٗ "جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں۔" (ترغیب: ج۴، ص۵)

اس روایت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جس طرح بغیر وضو اور طہارت کے نماز صحیح نہیں ہو سکتی، اسی طرح جس شخص کے اندر امانت داری نہیں اس کا ایمان بھی صحیح نہیں، اور جس شخص کا ایمان صحیح نہیں تو اس کی نماز وزکوٰۃ بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں بھی موجود ہے کہ: اِنَّہٗ لَادِیْنَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَاصَلٰوۃَ لَہٗ وَلَازَکٰوۃَ لَہٗ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس شخص کا کوئی دین نہیں جس میں امانت نہیں، نہ اس کی نماز صحیح ہے اور نہ زکوٰۃ۔" (ترغیب: ج۴، ص۵)

ایمان کے منافی کون سی خیانت ہے؟

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی غلطی اور خیانت کی بات سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ سے ایمان سلب نہیں ہوتا، بلکہ ایمان کے منافی وہ خیانت ہے جو اس کی عادت بن جائے اور اس کے اندر سے امانت داری کا جوہر ختم ہو جائے، البتہ یہ صحیح ہے کہ خیانت کے بار بار ارتکاب سے بالآخر امانت داری کا جوہر ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب تک آپ سے جس قدر خیانت کا ارتکاب ہوا ہے اس سے توبہ کریں اور حتی الوسع اس کا تدارک کریں (یعنی جن کا حق مارا ہو اُن کو اُن کا حق لوٹانے کا اہتمام کریں، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو صاحبِ حق سے معافی مانگیں، جیسا کہ اس کا بیان توبہ کے باب میں موجود ہے) اور آئندہ کے لیے پورے عزم کے ساتھ امانت داری کی راہ اختیار کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، وہ سابقہ گناہوں اور خیانتوں کو معاف کرے گا اور ہم کو ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے گا۔

جس کام میں امانت داری اور ذمہ داری ہو گی اس میں برکت ہو گی

امانت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے اندر دنیا و آخرت کی کامیابیاں موجود ہیں۔ جس کام میں امانت داری، سچائی اور ذمہ داری ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت نازل فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث بطورِ نمونہ پیش کرتا ہوں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اِنَّ اللہَ یَقُوْلُ

اَنَاثَالِثُ الشَّرِیکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُھُمَاصَاحِبَہٗ فَاِذَاخَانَہٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِھِمَا" بلاشبہ اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتا ہے کہ میں دوشریکوں کا ایک تیسرا (نگہبان) ہوتا ہوں جب تک ان دونوں میں سے کوئی اپنے شریک کے ساتھ خیانت نہیں کرتا، اور جب وہ خیانت اور بددیانتی پر اُتر آتے ہیں تو میں ان کے درمیان میں سے ہٹ جاتا ہوں۔" (ابوداؤد، رزین، مشکوٰۃ: باب الشرکۃ)

اس روایت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ معاملات اور خاص طور پر تجارت میں شراکت پسندیدہ ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جس معاملہ اور کام کے شرکا جب تک دیانت، امانت اور ایمانداری کے ساتھ باہم شریک رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی محافظت اور خیر وبرکت کا سایہ اُن پر رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو نقصان اور تباہی سے محفوظ رکھتا ہے، اُن کے رزق، کاروبار میں وسعت بخشتا ہے، اُن کے معاملات کو خیر وبھلائی کے ساتھ برقرار رکھتا ہے اور اُن کی مدد ونصرت فرماتا ہے۔ جب شرکا میں بددیانتی کے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خیانت کرنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی محافظت وبرکت کا سایہ ان پر سے ہٹ جاتا ہے اور ان پر شیطان اپنا تسلط جمالیتا ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرکاء کو مکمل نقصان اور تباہی کے کنارے لاکھڑا کر دیتا ہے اور ان کا جو کاروبار یا کام ہوتا ہے درہم برہم ہوکر ختم ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا مختصر بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ امانت داری کی صفت سے خالی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص دین وایمان کی اصل حقیقت اور اس کے اصل نور سے محروم ہے اور خیانت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پلٹ کر کے رکھ دیتا ہے اور خائن کی دنیا وآخرت کو تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس امانت داری کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دنیا میں ترقی، عروج اور عزت پالیتے ہیں اور آخرت میں بھی دائمی کامیابیوں کو حاصل کرلیتے ہیں۔ جس شخص پر امانت داری کا راز کھل گیا اور جس نے خیانت کے زہر کو محسوس کیا وہ ہر قسم کی خیانت سے اس قدر متنفر ہوجاتا ہے اور اس سے اس قدر دور بھاگتا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی زہریلی اور بدبودار چیز سے متنفر ہوتی ہے اور اس سے دور بھاگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بے دینی، بددیانتی، خیانت اور بے ایمانی سے بچائے، پکا مؤمن اور مسلمان رکھ کر ایمان اور اسلام پر موت نصیب فرمائے۔ آمین

امانت داری بقدرِ ذمہ داری

اب تک جس قدر بیان ہوا اُس سے دو باتیں اچھی طرح ثابت ہو گئیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص پر اسی قدر بارِ امانت ہے جس قدر وہ ذمہ دار ہے، اور جس کے پاس اسباب، وسائل اور اختیارات واقتدار کی جتنی مقدار موجود ہے اُسی تناسب سے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے اعمال وافعال اور ذمہ داری کا جواب دہ ہو گا، اور جس قدر وہ اپنی ذمہ داری اور شرعی امور میں غفلت کرے گا اُسی قدر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت کی رو سے خائن اور جھوٹا ہو گا اور اپنی خیانت اور جھوٹ کے بقدر سزا پائے گا۔

بدعہدی، بددیانتی وغیرہ سب جھوٹ کی مختلف صورتیں ہیں

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جھوٹ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ریا، بدعہدی اور بددیانتی جنم لیتی ہیں اور پھر انسان سے خیانت، بہتان اور تکبر جیسے سنگین جرائم سرزد ہوتے ہیں، اور یہی وہ بُری خصلت ہے کہ جس میں یہ جس قدر زیادہ ہو گی اُسی قدر وہ منافق ہو گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ "منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے، اور جب اس کو کوئی چیز (ذمہ داری یا مال وغیرہ) سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔" (بخاری ومسلم)

بظاہر یہ تین چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں ہیں، کوئی زبانی جھوٹ ہے اور کوئی عملی جھوٹ۔ اگر یہی جھوٹ عقیدہ میں آجائے تو انسان پکا کافرو منافق بن جاتا ہے اور اگر صرف عمل میں پایا جائے تو اگرچہ ایسی صورت میں وہ عقیدہ کا منافق نہیں، لیکن عمل اور سیرت میں منافق ہی ہے، جیسا کہ اس کا مفصل بیان اپنی جگہ پر گزر چکا ہے۔

بہرحال جھوٹ بہت ہی بڑی خباثت ہے۔ یہ انسان کے ضمیر کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ یہی جھوٹ وخیانت کی صفت ایسی مذموم صفت ہے جو انسان کی پوری زندگی کو مسموم بنا دیتی ہے اور اس کو بالآخر جہنم میں پھینک دیتی ہے، اس لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے جھوٹ اور خیانت کے (کہ یہ ایمان کے منافی ہیں)"۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب القسمۃ الغنائم)

اتفاقی طور پر اگر کسی سے غلطی سرزد ہو جائے تو اس کو اس غلطی کا عادی نہیں کہا جا سکتا

پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اور اب پھر یہ بات یاد کرائی جاتی ہے کہ اتفاقی طور پر کبھی خیانت اور جھوٹ ایک مؤمن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، لیکن وہ اس کا عادی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی میں یہ بری عادت بڑھ رہی ہے تو اب اس کو پورا علاج کرنا چاہیے، کیونکہ اب اس کا ایمان زخمی ہو چکا ہے اور اس میں نفاق کے جراثیم داخل ہونے لگے ہیں۔ اگر اس سے غفلت برتی جائے تو بالآخر یہی نفاق کے جراثیم اس کے پورے ایمان کو ایسے تباہ و برباد کر دیں گے جس کے بعد اس کا علاج بھی ناممکن ہو جائے گا۔

صداقت اور سچائی کا بیان

جھوٹ اور خیانت کی مذکورہ بالا تفصیل سے صداقت اور سچائی کی حقیقت اور اس کی فضیلت خود بخود سامنے آجاتی ہے، لیکن صداقت اور سچائی کی چونکہ غیر معمولی اہمیت اور فضیلت ہے اس وجہ سے اس کی ضروری تفصیل الگ بھی بیان کرتا ہوں۔

آسانی اور سہولت کے ساتھ سمجھنے کے لیے سچائی کی چند صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) زبان کی سچائی:-

"زبان کی سچائی" یعنی اندرونی علم ویقین کے مطابق بولنا، مثلاً: آپ دینِ اسلام کو حق جان کر مانتے ہیں اور اس کا اقرار زبان سے کرتے ہیں، یا مثلاً: آپ نے کسی معاملہ یا کسی جگہ میں جو کچھ دیکھا، سُنا یا کیا ہے یا نہیں کیا ہے یا اپنی اندرونی کیفیت اور جذبے (مثلاً غم یا خوشی) کو زبان سے ظاہر کرتے ہیں یا مثلاً: آپ کے دل میں زید کا احترام ہے اور زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ ، ان سب چیزوں کو اسی طرح بیان کرنا جیسا کہ دیکھا، سُنا یا کیا ہے، یا جو جذبہ ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کو انسان اپنے اندرونی علم ویقین کے مطابق حق جانتا اور مانتا ہے، یا جس چیز کو ناحق اور باطل سمجھتا ہے، یا جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے یا کرتا ہے یا نہیں کرتا اس کو اُسی طرح بیان کرنا جیسا کہ وہ اس کو مانتا یا سمجھتا ہے ، یہ تمام چیزیں سچائی کی اس صورت میں داخل ہیں جسے "زبان کی سچائی" کا نام دیا گیا ہے۔ اگر کوئی اپنے اندرونی علم ویقین یا اندرونی جذبات یا اپنے دیکھنے، سننے اور کرنے یا نہ کرنے کو اپنے علم ویقین اور سمجھ کے مطابق ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے بیان میں جان بوجھ کر زیادتی یا کمی کرتا ہے تو جس قدر کوتاہی اور زیادتی کرے گا اسی قدر اس کی سچائی میں نقصان اور کمزوری ہوگی۔

(۲) عمل کی سچائی:-

"عمل کی سچائی" کا مطلب ہے اپنے اندرونی علم ویقین کے مطابق عمل کرنا یا اپنی زبان کے مطابق عمل کرنا، مثلاً: آپ نماز اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے پڑھتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ کی زبان نہیں بلکہ آپ کا عمل آپ کے اندرونی علم ویقین اور جذبہ کے مطابق ہے، یا

مثلاً: آپ کے دل میں کسی عالمِ دین اور متقی شخص کا احترام ہے تو آپ اس شخص کے ساتھ بلا مبالغہ اسی قدر تواضع سے پیش آتے ہیں جس قدر آپ کے دل میں اُس کا احترام ہے، یا مثلاً اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اس کی نافرمانی کے خوف سے رونا، یا مثلاً غم کی بات سن کر عملاً اداس ہو جانا، سر جھکانا یا چہرہ پر ناراضگی ظاہر کرنا وغیرہ اندرونی جذبات وصفات کے مطابق ہے، یا اپنی زبان کے مطابق عمل کرنا جیسا کہ وعدہ پورا کرنا یا کوئی ذمہ داری اٹھا کر اس کو کماحقہ' پورا کرنا جیسا کہ امانت کی صورت میں کوئی خیانت نہ کرنا؛ سب اس میں داخل ہیں۔ وعدہ اور عہد کی پابندی کو عمل کی سچائی میں داخل کیا جاتا ہے کیونکہ یہ عمل سے اپنی زبان کو سچا کر کے دکھانا ہے، غرض یہ کہ اندرونی علم و عمل، زبان و عمل اور ظاہر و باطن کی یکسانیت سب عمل کی سچائی میں داخل ہیں۔ بعض خوش بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا باطن اُن کے ظاہر سے زیادہ اچھا اور بہتر ہوتا ہے۔ ظاہر و باطن کی یکسانیت بلکہ باطن کو ظاہر سے بھی بہتر بنانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے دُعا بتلا کر گویا اس کی ایک قسم کی ترغیب بھی دی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا منقول ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَرِیْرَتِیْ خَیْراً مِّنْ عَلَا نِیَتِیْ وَاجْعَلْ عَلَا نِیَتِیْ صَالِحَۃً "اے اللہ! میرے باطن (اندرون) کو ظاہر سے بہتر بنا اور میرا ظاہر بھی بہتر بنا۔" (ترمذی)

غرض آپ کا ہر وہ عمل جو آپ کے اندرونی علم و یقین کے مطابق ہو، یا آپ کا ہر وہ عمل جو آپ کی باطنی کیفیت اور صفت کے مطابق ہو، یا آپ کا ہر وہ عمل جو آپ کی دی ہوئی زبان یا قبول کی ہوئی ذمہ داری کے مطابق ہو تو یہ سب کچھ سچائی کی اس صورت میں داخل ہیں جسے عمل کی سچائی کا نام دیا گیا ہے۔ جو عمل اندرونی علم و یقین یا باطنی اوصاف اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا مخالف ہو تو یہ عملی جھوٹ ہے جسے ریاکاری، نفاق، بدعہدی اور خیانت کہا جاتا ہے، اور اگر مخالف نہیں مگر اس میں کمی یا زیادتی ہے تو جس قدر نقصان اور کوتاہی ہوگی اُسی قدر عملی جھوٹ اور سچائی میں نقصان اور کمزوری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے لیے تکلف سے عمل کرنا کارِ ثواب ہے لیکن یہ سچائی نہیں

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر ایک شخص لوگوں کو دکھلانے اور نمائش کے لیے ایسا عمل کرتا ہے جو اس کی باطنی کیفیت کے خلاف ہو، مثلاً: اندر کوئی خشوع و خضوع نہیں لیکن بظاہر لوگوں کے سامنے خشوع و خضوع والی صورت بنا کر نماز پڑھتا ہے تو یہ کھلا جھوٹ اور ریاکاری ہے، لیکن

اگر یہ شخص لوگوں کے دکھلانے کے لیے ایسانہیں کرتا بلکہ صرف اس لیے خشوع و خضوع کو تکلف کے ساتھ اختیار کرتا ہے کہ اس کے دل میں خشوع کی صفت جڑ پکڑ لے تو ایسی صورت میں اگرچہ اس کو ثواب ملے گا بلکہ زیادہ محنت و مشقت کی وجہ سے شاید زیادہ اور دُگنا ثواب مل جائے نیز وہ سچائی کا طالب بھی ہے، لیکن پھر بھی جب تک اس کے اندر خشوع کی صفت راسخ نہیں ہو جاتی (بلکہ تکلف کے ساتھ وہ خشوع کی صورت بناتا ہے) اس وقت تک وہ مقامِ صداقت تک پہنچا ہوا نہیں کیونکہ ایسی صورت میں اس کے اعمال، باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

صدق اور سچائی کی ان تمام صورتوں میں مذکورہ بالا دو قسمیں (یعنی ''زبان کی سچائی'' اور ''عمل کی سچائی'') بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ زندگی کے تمام تر دنیوی اور دینی معاملات کی درستگی ان دو صداقتوں پر منحصر ہے۔ وعدہ، معاہدہ، امانت اور لین دین میں صفائی سب کچھ انہی دو صداقتوں کے گرد گھومتا اور یہی دو قسمیں (صداقت اور سچائی) باقی تمام صورتوں کے لیے کسوٹی ہیں۔ جو ان میں سچا ہو گا ان شاء اللہ تعالیٰ وہ باقی انواعِ صداقت پر پورا اُتر سکے گا۔

(۳) نیت وارادہ کی سچائی:-

نیت اور ارادہ میں سچائی کا مطلب ہے کہ جس قول و عمل کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کا قُرب اور رضا تلاش کرتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا کوئی بھی مقصد پیشِ نظر نہ ہو، اسی کو اخلاص بھی کہا جاتا ہے۔

لوگوں کے درمیان صلح اور ظلم کے دفاع کی کوشش اخلاص اور صدق میں داخل ہے

صدق اور اخلاص کی اس قسم میں وہ اقوال و اعمال بھی داخل ہیں جو مصالحِ دین، یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے، یا ظلم ختم کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کرتا ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان کو مصیبت میں بلاوجہ گرفتار ہو جائے، یا وہ دشمن کے ہاتھ لگ کر ہلاک ہو جائے، یا اس کو تکلیف پہنچائی جائے تو یہ سچائی کی راہ نہیں بلکہ بدنیتی یا حماقت کی راہ ہے جو سچائی کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں ایسی بات کہنی چاہیے جس سے مسلمان مصیبت اور تکلیف سے بچ جائے اور وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگے۔

غیبت، چغلی اور کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنا سچائی کے منافی ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کسی کے عیوب بیان کرنا سچائی میں داخل نہیں، بلکہ اس کا منشا یا تو تکبر ہوتا ہے یا کسی کے ساتھ بغض، حسد اور بدنیتی۔ یہ صداقت واخلاص کے منافی چیزیں ہیں۔ انسان کے معاملہ میں خیر خواہی اور اخلاص یہ ہے کہ اس کی پردہ پوشی کی جائے اور جو کام اس نے چھپ کر کیا ہے اور کام بھی ایسا کہ اس میں اس نے اپنا نقصان کیا ہے اس کو چھپایا جائے۔ مسلمان کی آبرو کی حفاظت ہی سچائی اور اخلاص کی راہ ہے۔ یہی حال چغلی کھانے کا ہے کہ اس میں کسی کی وہ باتیں دوسروں تک پہنچائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اُن کے درمیان افتراق اور دشمنی پیدا ہو جائے، یہ بھی بدنیتی، مسلمانوں کے ساتھ بے وفائی اور ان کے حقوق میں خیانت ہے۔ ایسے امور میں سچائی اور اخلاص کی راہ یہی ہے کہ مصلحت آمیز بات کی جائے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان محبت واُلفت کی فضا قائم ہو جائے اور دشمنی و عداوت ختم ہو جائیں۔ چغلی اور غیبت کے متعلق ان شاء اللہ اپنی جگہ مفصل بیان آجائے گا۔

(ا) کس مجبوری کے تحت توریہ کیا جاسکتا ہے؟

اگر کسی نیک مقصد کا حصول توریہ کے بغیر ناممکن ہو، جیسے دو مسلمانوں کے درمیان تعلقات بہتر بنانا، مظلوم کا دفاع کرنا؛ تو ایسی صورت میں اس کو بوقتِ ضرورت اختیار کرنا جائز بلکہ مستحب ہے، بلکہ اگر مقصود کا حصول واجب ہو جیسے کسی ظالم سے مظلوم کو بچانا تو وہاں بوقت ضرورت اس کا اختیار کرنا واجب ہے (یعنی اگر آپ اس ظالم کے ظلم کے دفاع پر قادر نہیں تو تب واجب یہ ہے کہ کوئی تدبیر اختیار کریں تاکہ مظلوم اس کے شر سے بچ جائے)۔ اگر ایسے مواقع پر صاف جھوٹ بھی بولا جائے تو بھی جائز ہے، لیکن ایسی ضرورت کے وقت (جبکہ نیک مقصد کے حصول کی کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو یا اس کے بغیر ضرر کا دفعیہ ناممکن ہو تو ایسی صورت میں جو تدبیر وحیلہ کرنا ہو وہاں) بھی اس بات کی رعایت کی جائے کہ کھول کر صاف جھوٹ اور غلط بیانی نہ ہو بلکہ ایسی بات یا عمل کرنا چاہیے جس سے مقصود بھی حاصل ہو جائے اور جھوٹ بھی نہ ہو، مثلاً: اگر کوئی ظالم کسی مظلوم شخص کو مارنے کے لیے اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس کے بارے میں پوچھے کہ آپ نے فلاں کو دیکھا ہے تو آپ کہہ دیجیے کہ یہاں تو نہیں، یا یوں کہہ

دیں کہ اب تو نہیں دیکھا، یا کسی غلط جانب پر نظر دوڑائے اور اس کی تلاش شروع کریں کہ وہ اس سے یہ سمجھیں کہ شاید اس طرف مظلوم فرار ہو گیا ہے، اس لیے وہ اُسی طرف اپنی نظریں دوڑا رہا ہے۔ ملحوظ رہے کہ جہاں جہاں توریہ سے بچنے کی گنجائش ہو وہاں ایسی تدابیر اور حیلوں سے بچنا چاہیے تاکہ جھوٹ کا دروازہ کھل نہ جائے۔

کئی دفعہ دیکھا گیا کہ جتنی اور جس طرح بات کہنے کی ضرورت ہوتی ہے، لوگ اُن حدود کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ بظاہر دیندار لوگ بھی صاف جھوٹ بولنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کو کارِ ثواب سمجھنے لگتے ہیں، جبکہ یہ جھوٹ کو حلال کرنا ہے اور قطعی حرام کو حلال جاننا کفر ہے۔

(۲) توریہ کی ایک اور مثال

حضرت سوید بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے نکلے۔ ہمارے ساتھ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ راستے میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو ان کے کسی دشمن نے پکڑ لیا۔ ہمارے ساتھ اور لوگوں نے تو قسم کھانے میں جھجک (اور گناہ) محسوس کی مگر میں نے قسم کھا کر یوں کہہ دیا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اُس نے میری وجہ سے اُن کو چھوڑ دیا۔ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے سارا واقعہ عرض کیا کہ ان لوگوں نے تو قسم کھانے میں گناہ محسوس کیا مگر میں نے قسم کھالی کہ یہ میرا بھائی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صَدَقْتَ اَلْمُسلِمُ اَخُ الْمُسلِمِ ”تم نے سچ کہا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہی ہوتا ہے۔“

(ابو داود: کتاب الایمان والنذر)

(۳) شرعی مجبوری کے وقت اگر مصلحت کے لیے کچھ کہنا پڑے تو بھی سچ بولنے کی کوشش کریں

اگر کبھی کسی مصلحت کے تحت کچھ کہنا پڑے تو بھی صاف جھوٹ بولنے کے بجائے ایسی بات کہنی چاہیے جو اصل مراد کے لحاظ سے تو سچ ہو مگر بظاہر مخاطب اس سے دوسرا مطلب لے لے۔ اسی کا نام ”توریہ“ ہے۔ یہ دراصل صدق ہی کی ایک کذب نما صورت ہے، لیکن یہ بھی مجبوری کی صورت میں جائز ہے، مثلاً: فتنہ وفساد کو ختم کرنے کی نیت سے، لیکن بلاضرورت اور بغیر کسی حاجت کے ایسا کہنا بھی

صدق کے منافی ہے، بلکہ اگر اس سے مقصد کسی کی حق تلفی ہو تو پھر ایسی دو معنی والی بات بھی حرام ہے۔ ضرورت کے وقت ایسی دو معنی رکھنے والی بات کہنے کے بارے میں دو روایات پیش کرتے ہیں:

۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بچہ بیمار ہوا اور اس کا انتقال ہوا۔ اس وقت یہ (یعنی ابو طلحہ) کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رات کے وقت گھر آئے تو انہوں نے پوچھا کہ بچے کی طبیعت کیسی ہے؟ تو اُن کی بیوی یعنی حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ وہ خاموش ہو گیا ہے اور اب اس کو بالکل آرام آگیا ہے۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے یہ گمان کیا کہ بچہ صحت یاب ہو چکا ہے (حالانکہ وہ مکمل خاموش تھے اور بیماری سے مکمل آرام پاکر وفات پا گئے تھے)۔ بیوی نے اُن کے سامنے کھانا پیش کیا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور مطمئن ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ ہمبستری بھی کی۔ جب صبح ہوئی اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ باہر جانے لگے تو اُن کی بیوی (حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا) نے صاف بات بتلا دی کہ بچہ تو وفات پا گیا ہے۔ انہوں نے صبح کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی، پھر اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس رات میں ان دونوں (یعنی ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اور ام سُلیم رضی اللہ عنہا) کے لیے برکت فرمائے۔ سفیان راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے بیان کیا ہے کہ میں نے ان کے نو ۹۔ بچوں کو دیکھا ہے کہ وہ سب کے سب قرآن مجید کے قاری (یعنی عالم و حافظ) تھے۔

(بخاری: جلد ۱، ص ۱۷۴)

اور بعض روایتوں میں اس واقعہ کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جب صبح ہوئی تو حضرت اُم سُلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بتاؤ! اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی کوئی چیز بطورِ امانت رکھی ہو پھر وہ اس سے واپس مانگ لے تو کیا اس شخص کو اس کے روکنے کا کوئی حق ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر اپنے بچے پر صبر کرو۔ (مسلم)

اس مہذب دینِ اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی صحابیہ نے رات کے وقت اپنے شوہر کو اچانک ایسے غم کی خبر دینا بھی مناسب نہ سمجھا اور صاف جھوٹ بولنے سے بھی پرہیز کیا، اور ایسے الفاظ کہے جو اپنی جگہ درست بھی تھے اور شوہر نے ان کے دوسرے معنی سمجھ کر رات اطمینان سے گزاری۔

۲۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي

یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ فَیَقُوْلُ خَیْراً اَوْیَنْمِی خیراً ''وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کراتا ہے، خیر وبھلائی کی بات کرتا ہے اور (ایک دوسرے کو اُن کے) خیر کی اور اچھی باتیں پہنچاتا ہے۔'' (بیہقی)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاع اور فتنہ وفساد کو ختم کرانے کے لیے اور ان کے درمیان صلح وصفائی کرانے کے لیے اگر کوئی شخص ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خیر اندیشی کی بات پہنچائے جس سے فتنہ وفساد کی آگ بجھ جائے اور فریقین کے درمیان صلح ہو جائے۔ اگر یہ مخلص بندہ کسی ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خیر وبھلائی کی باتیں بھی پہنچائے جو واقعہ میں اس فریق نے نہ کہی ہوں پھر بھی ایسا شخص جھوٹا نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کا خیر خواہ اور مخلص ہے کہ لوگوں کو فتنہ وفساد اور باہمی نزاع سے بچاتا ہے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ بات خیر وبھلائی کی ہو، نہ یہ کہ وہ کسی بُرائی جیسے شرک وفسق پر مشتمل ہو۔

(۴) ارادہ اور عزم کی سچائی اور تکمیلِ عزم کی سچائی:۔

ارادہ اور عزم میں سچائی کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ اور عزم میں کوئی تردد اور ضعف نہ ہو، مثلاً: کوئی غریب اس بات کا ارادہ اور عزم کرلیتا ہے کہ میرے ہاتھ اتنا مال آجائے تو اس کو فلاں کارِ خیر میں لگا دوں گا، یا یوں عزم کرلے کہ جب دشمنانِ اسلام کے ساتھ لڑنے کا موقع آجائے تو اس میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا، اور جس وقت وہ یہ ارادہ کر رہا ہو اس وقت اس کا یہی ارادہ اور عزم ہو اور اس میں کوئی اضطراب اور تردد نہ ہو، اس کو عزم کی سچائی کہتے ہیں۔ اس عزم کے سچا ہونے کا علم اُس وقت ہو گا جب اس کو پورا بھی کرلے، کیونکہ کسی بات کا عزم کرنا کوئی زیادہ کمال کی بات نہیں، بلکہ انسان کا کمال یہ ہے کہ جو بات کرے یا جس نیک کام کا عزم وارادہ کرلے اس میں وہ سچا بھی ہو اور پکا بھی (یعنی اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کی حتی الوسع کوشش کرے) اور جوں ہی اس کے عزم کی تکمیل کے اسباب مہیا ہو جائیں اس کو پورا کرے۔

کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک نیک کام کا عزم کرلیتا ہے، لیکن پھر اُس کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے انسان کا ارادہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اس کے ارادے کو مرض اور بیماری لگ گئی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ صرف تمنا اور خواہش ہوتی ہے، اور ایسے شخص کو اگر تمام

اسباب بھی مہیا ہو جائیں پھر بھی وہ اس عزم کو پورا نہیں کرتا، مثلاً: اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا عزم کیا ہے تو مال ملنے کے بعد وہ اس کو خرچ نہیں کر سکے گا، اور اگر جہاد کا عزم کیا ہے تو وقت آنے پر وہ جہاد سے جی چرائے گا، ایسے شخص کا یہ ارادہ اور عزم سچا نہ تھا بلکہ یہ اس کی ایک خواہش تھی جس کو کسی دوسری خواہش نے ختم کر دیا۔ عزم کا سچا اور پکا شخص وہی ہو سکتا ہے جو کامل مؤمن ہو۔ منافق اور کمزور قسم کا مسلمان اس امتحان میں پورا نہیں اتر سکتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دو قسم کے لوگوں (یعنی جو عزم کے پکے اور سچے ہیں اور جو اس میں پکے اور سچے نہیں) کو مندرجہ ذیل آیتوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۞

”اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی، تو جس وقت کوئی محکم (اور واضح) سورت نازل ہوتی ہے اور اس میں قتال کا (بھی) ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے (اس اعلان کے وقت) تم ان کو دیکھو گے کہ تمہاری طرف (خوف اور بزدلی کی وجہ سے) ایسے دیکھتے ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو، پس ان لوگوں کی ہلاکت اور بربادی قریب ہے۔“

(سورۃ محمد: آیت: ۲۰)

ایک دوسری جگہ عزم کے پکے اور سچے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے اور دوسری قسم کے لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۞ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۞

”مسلمانوں میں سے ایسے (جوان مرد) لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے وعدے کو سچ کر دکھایا، پھر ان میں سے بعض تو اپنی نذر اور کام پورا کر چکے (یعنی شہید ہو گئے) اور بعض ان میں (جام شہادت نوش کرنے کے) منتظر ہیں، اور انہوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی ہے (بلکہ بے تابی سے وہ شہادت کے منتظر ہیں) تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کے سچ کا صلہ (بدلہ، اجر و ثواب) دے اور منافقوں کو

اگر چاہے عذاب دے یا چاہے تو اُن کی توبہ قبول فرمائے، بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

(احزاب: ۲۳ تا ۲۴)

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا اور انہیں افسوس تھا کہ میں کفر اور اسلام کی پہلی جنگ میں شرکت سے محروم رہا، تو انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ پھر وہ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ تلوار، نیزے اور تیر کے (اسی ۸۰) زخم کھا کر شہادت پائی۔ یہ اپنے عزم کو پورا کرنے اور سچا کر دکھانے کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں اور ان جیسے لوگوں کے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ (بخاری: تفسیر سورۂ احزاب)

(۵) طلب کی سچائی:-

"طلب کی سچائی" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کچھ اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اس طلب میں وہ سچا بھی ہو، مثلاً: اولاد مانگتا ہے تو اس کے لیے شادی کی بھی کوشش کرے، یا دینِ اسلام کے غلبہ کی دعا مانگتا ہے تو اس کے لیے حتی الوسع کوشش بھی کرے۔ اسی طرح اگر بہترین اخلاق اور اعلیٰ مقامات کا طالب ہو، مثلاً زہد، توکل، صبر واستقامت، سخاوت وشجاعت اور امانت وغیرہ کے اعلیٰ مقامات کا طالب ہے جیسا کہ ہر مسلمان ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگتا بھی ہے، لیکن ان چیزوں کے حصول اور طلب میں سچا وہی شخص ہے جو ان کو حاصل کرنے کے لیے حتی الوسع کوشش بھی کرے، ورنہ اگر وہ ان کے حصول کے لیے کوشش نہیں کرتا تو اُس کی یہ طلب جھوٹی ہے۔

صداقت کا خلاصہ

صداقت کا خلاصہ یہ ہوا:

۱۔ زبان کی سچائی۔

۲۔ عمل اور کردار کی سچائی۔

۳۔ نیت کی سچائی۔

۴۔ عزم کی سچائی اور ایفائے عزم کی سچائی۔ (یعنی عزم کو پورا کر کے دکھانا)

۵۔ طلب کی سچائی۔

قرآن مجید اور صداقت

جب صداقت اور سچائی کا خلاصہ معلوم ہوا تو اب اس کے متعلق قرآن مجید کی چند آیتوں کو پیش کرتے ہیں:

۱۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ "(وہ اموال) ان فقرا ومہاجرین کے لیے بھی ہیں جو اپنے گھر اور جائیدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حمایت میں لگے رہتے ہیں، اور یہی لوگ سچے ہیں۔" (سورہ حشر: آیت ۸)

پورے دین اسلام پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے والا سچا ہے

۲۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ یعنی "مؤمن لوگ تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انہوں نے (کسی طرح کا) شک نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی جان ومال سے جہاد کیا تو یہی صادق (سچے) لوگ ہیں۔" (سورہ حجرات: آیت ۱۵)

یہاں ان لوگوں کو اس لیے سچا فرمایا گیا کہ جس ایمان کا انہوں نے اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی، اور ان کی یہی جد وجہد ان کی اندرونی کیفیت کی صحیح اور سچی ترجمان ہوئی۔

۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞

یعنی ”پوری نیکی، وفاداری اور سچائی کی راہ صرف یہی نہیں کہ تم نے اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا بلکہ وفاداری اور نیکی تو اُن لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی) کتابوں پر اور (اللہ تعالیٰ کے تمام) نبیوں پر ایمان لائے ہیں، اور اس کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے دیتے ہیں، اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں، نیز نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں) جب بھی وہ عہد، قول واقرار کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، تنگی اور جنگ کے وقت (یعنی ہر حال) میں صبر کرنے والے (اور ہر حال میں دین پر ثابت قدم رہتے) ہیں، تو یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں۔“ (البقرہ: آیت: ۱۷۷)

صادق کون ہوتا ہے؟

مذکورہ بالا بحث کے بعد ”صادق“ کا جاننا بہت آسان ہے کہ صادق وہی ہوتا ہے جو سچ بولتا ہو، وعدہ پورا کرتا ہو، امانت دار ہو، ذمہ دار ہو، جو کہتا ہو اور جو عزم کرتا ہو اس کو کرکے دکھاتا ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے والا ہو، منعمِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی نعمتوں پر شکر کرنے والا ہو، صحیح نیت والا ہو یعنی اس کے ہر قول و عمل کا محرک اور باعث اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا حاصل کرنا ہو، ہر وقت حق وسچ کا طالب اور اس کا متلاشی رہتا ہو، اس کے باطن اور ظاہر میں یکسانیت ہو، قول و عمل میں مطابقت ہو اور طلب میں سچائی ہو۔ غرض پوری شریعتِ مطہرہ پر اخلاص اور سچائی کے ساتھ عمل کرنے والا ہو۔

صدیق کون ہوتا ہے؟

صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں نہایت سچا اور راست باز۔ جو شخص ان پانچ چیزوں (یعنی زبان کی سچائی، عمل و کردار کی سچائی، نیت کی سچائی، عزم اور وفائے عزم کی سچائی اور طلب کی سچائی) میں کمال حاصل کرے اُس کا شمار صدیقوں میں ہوا کرتا ہے۔ صدیق کی فطرت اور اس کا ظاہر و باطن ہر گرد وغبار سے ایسا پاک وصاف ہوتا ہے کہ جب اور جہاں سچ اور حق کو پالیتا ہے تو بے ساختہ قبول کرلیتا ہے۔ اس کے سامنے حق و باطل کو ملا کر پیش کریں تو وہ حق کو باطل سے اس طرح جدا کرتا ہے جیسے

مقناطیس راکھ میں ملے ہوئے لوہے کے ذروں کو کھینچ کر جدا کرلیتا ہے، اس لیے ایسے لوگوں کو خیر وشر کے درمیان التباس نہیں ہوتا۔ انسان کی ظاہری نگاہ جس طرح سفید وسیاہ کے درمیان بے تکلف امتیاز کرلیتی ہے، اس طرح اس کے دل کی آنکھیں حق وباطل میں امتیاز کرلیتی ہیں۔ پھر صدیقوں کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بہت سے درجات ہوسکتے ہیں ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جو "صدیق" کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مقامِ صدیقیت کو نہیں پہنچے، بلکہ حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی اور اسی طرح دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مقام صدیقیت پر فائز تھے، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے اعلیٰ مقامِ صدیقیت پر فائز تھے۔ اور چونکہ یہی وصف اُن میں بہت ہی غالب تھا اس لیے اُن کو صدیق کا لقب ملا، ورنہ جس شخص میں بھی مذکورہ بالا صفات درجہ کمال میں پائی جائیں اس کا شمار صدیقین میں ہوگا۔

صداقت اور سچائی کے فضائل

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞

یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی کام آئے گی، ان (سچوں) کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان (جنتوں) میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان (سچوں) سے راضی ہوگئے اور وہ (یعنی سچے لوگ) اس (یعنی اللہ تعالیٰ) سے راضی ہوگئے، اور یہی عظیم کامیابی ہے۔"

(مائدہ: آیت ۱۱۹)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو اُن راست بازوں کی فتح مندیوں اور کامیابیوں کے ظہور کا دن ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے وعدے اخلاص اور سچائی کے ساتھ پورے کیے ہیں۔ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے (یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا انہوں نے اس کی رضا کے مطابق اس کو پورا کرکے دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں رکھیں وہ ان کی توقعات اور تصورات سے اربوں درجہ اوپر پوری ہوگئیں) بلاشبہ یہی عظیم کامیابی ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

صدق وسچائی کی عظمت کے لیے یہ بہت کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی مدح میں سب سے پہلے اس فضیلت کا تذکرہ فرمایا ہے، مثلاً: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۝ یعنی ”اور کتاب (یعنی قرآن مجید) میں ابراہیم کا ذکر کیجیے، بے شک وہ سچا نبی تھا۔“ (مریم: آیت ۴۱)

بلاشبہ عملی فضائل میں صداقت کو ایک طرح کی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دنیاوآخرت کی فلاح وبہبود کے تمام اُمور کا انحصار صداقت اور سچائی پر ہی ہے۔

سچائی پر جنت کی ضمانت

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِضْمَنُوْا لِي سِتًّا مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُمْ وَاَدُّوْا اِذَا ائْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ

یعنی ”تم چھ باتوں کے ضامن ہو جاؤ اور ان کی ذمہ داری لے لو تو میں تمہارے لیے جنت کی ذمہ داری لے لیتا ہوں۔ (۱)۔ جب بات کرو تو ہمیشہ سچ بولو (۲)۔ اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو (۳)۔ اور جب تمہیں کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرو (۴)۔ اور (حرام کاری سے) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو (۵)۔ اور (نامناسب وممنوعہ چیزوں سے) اپنی آنکھوں کو بند رکھو (یعنی کوشش کرو کہ کسی ممنوعہ چیز پر نظر نہ پڑے) (۶)۔ اور اپنے ہاتھوں کو (ظلم اور ناجائز چیزوں کو لگانے سے) روکو۔“

(احمد، بیہقی، مشکوۃ: باب حفظ اللسان)

سچ بولنا، ایفائے عہد، ادائے امانت، آنکھیں، ہاتھ اور تمام اعضا وجوارح جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتیں ہیں ان کو بغیر خیانت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنا یہ سب کچھ صداقت اور سچائی کی مختلف صورتیں ہیں جیسا کہ اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ: مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْيُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا ائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَارَهٗ ”جس شخص کی یہ خوشی ہو اور وہ یہ چاہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سچی محبت ہو یا کہ اللہ تعالیٰ

اور اس کے رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے، اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو (اس میں ذرابرابر خیانت کیے بغیر) اس کو (ٹھیک ٹھیک) ادا کرے، اور جس کے پڑوس میں رہتا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔" (بیہقی، مشکوٰۃ: باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)

سچا بہترین شخص ہوتا ہے

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ مَخْمُوْمِ الْقَلْبِ صَدُوْقِ اللِّسَانِ "ہر وہ شخص جو "مخموم القلب" اور زبان کا سچا ہو۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ "زبان کا سچا" تو ہم سمجھ گئے لیکن "مخموم القلب" کیا ہوتا ہے؟ (یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: هُوَ التَّقِيُّ النَّقِيُّ لَا اِثْمَ فِيْهِ وَلَا بَغْيَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ یعنی "وہ دل کا صاف اور خدا ترس انسان ہے جس پر نہ گناہ کا بوجھ ہو نہ ظلم و سرکشی کا، نہ اس کے دل میں کینہ ہو اور نہ حسد"۔ (ابن ماجہ، بیہقی، مشکوٰۃ: کتاب الرقاق)

ظلم، حسد اور کینہ؛ یہ سب صداقت اور اخلاق کے منافی چیزیں ہیں۔

جھوٹ ایک بدترین اور مبغوض ترین چیز

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹ سے زیادہ کوئی چیز مبغوض نہ تھی اور جس شخص کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ اُس نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو اُس وقت تک آپ کے مبارک دل میں یہ بات کھٹکتی تھی، جب تک وہ اس سے توبہ نہ کر لیتا۔

(مجمع الزوائد: ج: اول ص: ۱۴۲ و ترغیب و ترہیب: ج: ۳ ص: ۵۹۷)

اور بعض روایتوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ بات منقول ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیز مبغوض ترین چیز جھوٹ تھی۔

(مسند بزار، رواہ البیہقی باسناد حسن و رواہ ابو داؤد و ترمذی وحسنہ، دیکھیے ترغیب و ترہیب)

خوش طبعی میں بھی جھوٹ سے پرہیز کرو

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ وَسَطِ

الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحًا "میں اس شخص کے لیے جنت کے درمیان گھر کا کفیل اور ضامن ہوں جس نے جھوٹ سے (بالکل اور قطعاً) پرہیز کیا اگرچہ خوش طبعی کرنے والا کیوں نہ ہو (کبھی مزاح اور خوشی طبعی کے طور پر بھی خلافِ واقعہ بات نہ کہے)۔"

(رواہ البیہقی باسناد حسن ورواہ ابوداؤد والترمذی وحسّنہ دیکھیے ترغیب وترہیب)

صداقت جنت میں پہنچانی والی چیز ہے

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: یارسول اللہ! جنت (حاصل کرنے) کا عمل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصِّدْقُ وَإِذَا صَدَقَ الْعَبْدُ بَرَّ وَإِذَا بَرَّ آمَنَ وَإِذَا آمَنَ دَخَلَ الْجَنَّةَ "سچ، اور جب بندہ سچائی کو اختیار کرلیتا ہے تو نیک بن جاتا ہے، اور جب نیکوکار ہوتا ہے تو ایماندار بن جاتا ہے، اور جب ایماندار بن جاتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔" (مسند احمد ج۲ ص۲۱۶)

اس کے بعد پھر اُس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبارہ پوچھا کہ یارسول اللہ! جہنم کا عمل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْكَذِبُ إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ فَجَرَ وَإِذَا فَجَرَ كَفَرَ وَإِذَا كَفَرَ دَخَلَ يَعْنِي النَّارَ "جھوٹ، جب بندہ جھوٹ کو اختیار کرلیتا ہے تو فاسق اور شریعت کی حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے، اور جب تجاوز کرنے لگتا ہے تو کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور جب کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو دوزخ کی آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔" (مسند احمد ج۲ ص۲۱۶)

صداقت اور سچائی بلند درجات پر پہنچانے والی چیز ہے

صداقت اور راستی ایسی چیز ہے جو انسان کو بلند ترین درجات پر پہنچاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ یہ بلند مرتبہ آپ کو کیسے نصیب ہوا (یعنی اس کے ظاہری اسباب کیا تھے؟) تو انھوں نے ارشاد فرمایا: صِدْقُ الْحَدِيثِ وَأَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِي "راست گوئی، ادائے امانت اور بے کار اور فضول باتوں سے کنارہ کشی کی بنا پر۔"

(مؤطا امام مالک، مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان)

بلاشبہ اصلی حکمت، عقلمندی اور دانائی یہی ہے کہ انسان راست گفتار اور نیک کردار رہے۔ یہی دو

چیزیں ہیں (جو کہ صداقت کی دو مختلف صورتیں ہیں) جو انسانی زندگی کے اعلیٰ جوہر ہیں۔ جس نے ان کو اختیار کیا اور اپنی پوری زندگی کو ان دو چیزوں کے مطابق پورا پورا ڈھال لیا تو انسانیت کے عظیم مراتب پر پہنچ جائے گا۔

سچوں کے ساتھ رہنے کی تاکید

سچائی کی فضیلت اور اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث میں نہ صرف یہ کہ ہر حال میں سچائی اختیار کرنے کا حکم ہے، بلکہ اس بات کی بھی تاکید ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دیتے رہو اور سچوں کی صحبت اور ہم نشینی اختیار کرو، تاکہ اُن کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے اور متقی بن جاؤ یا سچائی اور پرہیز گاری میں ترقی کر جاؤ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی (نافرمانی) سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔"

(سورۃ توبہ: آیت ۱۱۹)

مقامِ صدیقیت کی فضیلت

جب مقامِ صداقت کی فضیلت اور اہمیت سامنے آچکی ہے تو اس سے مقامِ صدیقیت کا اندازہ خود بخود لگ جاتا ہے کہ "صدیق" مبالغہ کا لفظ ہے (یعنی انتہائی سچا اور راست باز)۔ اس مقام کی فضیلت کو اس سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نبوت کے بعد صدیقیت اور نبی کے بعد صدیق کا مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں نبیوں کے بعد صدیقین کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے (یعنی) انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین (کے ساتھ ہوگا)، اور کیسی اچھی ہے ان پاکیزہ لوگوں کی رفاقت۔"

نیکی اور سچائی میں ہی دنیا و آخرت کی بڑائی اور بھلائی ہے

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا

”تم سچائی کو اپنے اوپر لازم کرو کیونکہ سچائی نیکی کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور نیکی جنت (کے اعلیٰ درجات) تک پہنچاتی ہے، اور جو آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور (ہر قول و فعل میں حق اور) سچائی کو تلاش کرتا ہے تو وہ (مقامِ صدیقیت کو پہنچ کر) اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اور تم جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو، کیونکہ جھوٹ، فسق اور بدکاری کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور آدمی جب جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے (اور اتنا لعنتی بن جاتا ہے کہ اس سے ہدایت کی صلاحیت اور استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے)۔

(مسلم بخاری دیکھیے مشکوٰۃ)

سچائی نیکی کا میلان اور جھوٹ برائی کا میلان پیدا کرتی ہے

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سچائی اختیار کرنا صرف ایک نیکی ہی نہیں، بلکہ جب انسان اس کو اختیار کر لیتا ہے تو اِس کی یہ خاصیت بھی ہے کہ یہ آدمی کو زندگی کے تمام شعبوں میں صالح اور نیک کردار بنا کر جنت کے اعلیٰ درجات کا مستحق بنا دیتی ہے۔ ہمیشہ سچ بولنے والا اور سچائی کو اختیار کرنے والا مقامِ صدیقیت (یعنی انتہائی راست بازی اور سچائی کے مقام) کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا اور جھوٹ کو اختیار کرنا صرف ایک برائی نہیں، بلکہ اس خبیث خصلت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ آدمی کے اندر فسق و فجور کا میلان پیدا کر کے اس کی پوری زندگی کو مجرمانہ بنا کر جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔ بالآخر یہی خبیث عادت انسان کو کذابیت کے مقام پر لا کر پورا لعنتی بنا دیتی ہے اور اس میں ہدایت کی روشنی پہنچنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے جس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

اس حدیث میں صادق بلکہ صدیق بن جانے کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے کہ سچ بولنے اور ہر قول وفعل میں سچائی کی طلب اور سچائی کو اختیار کرنے کی وجہ سے بالآخر انسان صادق بلکہ صدیق بن جاتا ہے، لہٰذا سچائی کی جو صورتیں آسانی کے لیے اوپر بیان کی گئی ہیں ان کو اپنایا جائے اور ان میں خوب کوشش کی جائے تو ان شاء اللہ انسان سچا بلکہ انتہائی سچا بن سکتا ہے۔

سچائی کو اختیار کرنا ہی شرافتِ انسانی اور راہِ نجات ہے

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں اور حدیثوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے (اور یہی مشاہدہ اور تجربہ ہے) کہ سچائی کی عادت انسان کو بلند سے بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے اور اس کے مقابلہ میں جھوٹ کی عادت انسان کو انتہائی پستی اور ذلت کے بدبودار گڑھوں میں پھینک دیتی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حالت میں سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دے، ہمیشہ سچ بولے، حق وسچ کا طالب رہے اور ہر قول و فعل اور اپنی پوری زندگی کے تمام شعبوں اور معاملات میں سچائی کو اختیار کرے، ظاہر و باطن میں یکسانیت اور یک رنگی اختیار کرے، اپنی آخری سانس تک اپنے باطن کو صاف ستھرا اور پاکیزہ تر بنانے کی کوشش میں لگا رہے، جھوٹ اور جھوٹی راہ سے قطعاً پرہیز کرے اگرچہ سچ بولنے اور سچائی اختیار کرنے میں بظاہر ہلاکت اور بربادی نظر آئے اور جھوٹ میں نجات، لیکن یقین کریں کہ نجات سچ اور سچائی ہی میں ہے اس کے متعلق ایک روایت بھی موجود ہے۔ منصور بن معتمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تَحَرَّوا الصِّدقَ وَإنْ رَأَيْتُمْ أَنَّ الْهَلَكَةَ فِيهِ فَإنَّ فِيهِ النِّجَاةُ ”صدق اور سچائی کو اختیار کرو اگرچہ تم اس میں (بظاہر) ہلاکت اور بربادی دیکھو، پس اسی (سچائی) میں نجات ہے۔“

(ترغیب وترہیب: ج۳، ص ۵۹۰)

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے سچے بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین!

مؤمن کی سچائی کے واقعات

ایمان، ایمانی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے چند اہم جزئیات اور چند اہم پہلو آپ کے سامنے آئے۔ اب اس دوسرے حصہ میں ایمان والوں کے کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوجائے گا کہ جسے ایمان وتوحید کی سچی دولت نصیب ہوجاتی ہے تو اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ اس سے خودبخود یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ کامیابی کا راز صرف توحید وایمان کے فلسفے سیکھنے میں نہیں، بلکہ یہ اُس ایمان وتوحید کی معرفت میں ہے جو دلوں کو گرمائے اور ضمیر کو بیدار کرکے انسان کو اللہ تعالیٰ کی پوری بندگی کی راہ پر ڈال دے۔ اسی سچی بندگی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اب صرف انبیا علیہم السلام نہیں بلکہ ان کے اتباع کرنے والوں اور اللہ تعالیٰ کی سچی بندگی کرنے والے سچے مؤحدین، عباد الرحمٰن اور اسلاف کے واقعات بھی پڑھ لیجیے:

مؤمن نہ بات کا خائن ہوتا ہے نہ کردار کا، اس کے متعلق چند واقعات پیش خدمت ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی سچائی

۱۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ "اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے"۔ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴)

تو سیدنا رسول اللہ ﷺ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور قریش کے تمام خاندانوں کو نام بنام آواز دے کر قوم کے تمام لوگوں کو بلایا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو لوگوں نے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، اگر میں یہ خبر دوں کہ ایک دشمن صبح یا شام تم پر چھاپہ مارنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کروگے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! ہم نے سوائے سچ کے آپ کو اور کچھ کہتے ہوئے نہیں پایا، کبھی جھوٹ کا ہمیں تجربہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی اور تقریر کی اور ابولہب نے اس کی سخت تردید کی۔

(تفصیل کے دیکھیے صحیح بخاری ومسلم: کتاب التفسیر)

۲۔ وعن عبداللہ بن عمر وعن النبی ﷺ انه ذكر الصلوٰة يوما.......ويوم القيٰمة مع فرعون وهامان وابي بن خلف. "ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے نماز کا ذکر

فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز کا اہتمام کرے تو نماز اس کے لیے قیامت کے دن نور ہو گی، اور حساب پیش ہونے کے وقت حجت ہو گی، اور نجات کا سبب ہو گی، اور جو شخص نماز کا اہتمام نہ کرے اس کے لیے قیامت کے دن نہ نور ہو گا، اور نہ اس کے پاس کوئی حجت ہو گی، اور نہ نجات کا کوئی ذریعہ۔ اس کا حشر فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا"۔

ف: فرعون کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ کس درجہ کا کافر تھا، حتیٰ کہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اور ہامان اس کے وزیر کا نام ہے، اور اُبی بن خلف مکہ کے مشرکین میں سے بڑا سخت دشمنِ اسلام تھا۔ ہجرت سے پہلے نبی ﷺ سے کہا کرتا تھا کہ میں نے ایک گھوڑا پالا ہے، اس کو بہت کچھ کھلاتا ہوں، اس پر سوار ہو کر (نعوذ باللہ) تم کو قتل کروں گا۔ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اس سے فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ میں ہی تجھ کو قتل کروں گا۔ اُحد کی لڑائی میں وہ حضور اقدس ﷺ کو تلاش کرتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر وہ آج بچ گئے تو میری خیر نہیں، چنانچہ حملہ کے ارادے سے وہ حضور ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ارادہ بھی فرمایا کہ دور ہی سے اس کو نمٹا دیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آنے دو۔ جب وہ قریب ہوا تو حضور ﷺ نے ایک صحابی کے ہاتھ میں سے برچھا لے کر اس کے مارا جو اس کی گردن پر لگا اور ہلکی سی خراش آگئی۔ مگر اس کی وجہ سے گھوڑے سے لڑھکتا ہوا گرا، اور کئی مرتبہ گرا، اور بھاگتا ہوا اپنے لشکر میں پہنچ گیا، اور چلاتا تھا: خدا کی قسم! مجھے محمد (ﷺ) نے قتل کر دیا۔ کفار نے اُس کو اطمینان دلایا کہ معمولی خراش ہے، کوئی فکر کی بات نہیں۔ مگر وہ کہتا تھا کہ محمد (ﷺ) نے مکہ میں کہا تھا کہ میں تجھ کو قتل کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر وہ مجھ پر تھوک بھی دیتے تو میں مر جاتا۔

لکھتے ہیں کہ اس کے چلانے کی آواز ایسی ہو گئی تھی جیسے کہ بیل کی ہوتی ہے۔ ابو سفیان نے، جو اس لڑائی میں بڑے زوروں پر تھا، اس کو شرم دلائی کہ اس ذرا سی خراش سے اتنا چلاتا ہے۔ اس نے کہا: تجھے خبر بھی ہے کہ یہ کس نے لگائی ہے، محمد (ﷺ) کی ضرب ہے، مجھے اس سے جس قدر تکلیف ہو رہی ہے لات اور عزّیٰ کی قسم! اگر یہ تکلیف سارے حجاز والوں کو تقسیم کر دی جائے تو سب ہلاک ہو جائیں۔ محمد (ﷺ) نے مجھ سے مکہ میں کہا تھا کہ میں تجھ کو قتل کروں گا۔ میں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ میں ان کے ہاتھ سے ضرور مارا جاؤں گا۔ میں ان سے چھوٹ نہیں سکتا۔ اگر وہ اس کہنے کے بعد مجھ

پر تھوک بھی دیتے تو میں اس سے بھی مر جاتا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ پہنچنے سے ایک دن پہلے وہ راستہ ہی میں مر گیا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ نبی کریم ﷺ کے قول و عمل اور کردار اور دعوے کی سچائی کی یہ حالت کہ دشمن، منکرِ حق کو بھی آپ ﷺ کے قول پر اس قدر بھروسہ اور اعتماد تھا جس کی وضاحت خود اس کافر کے بیان میں موجود ہے۔ خلاصہ یہ کہ سچے کا کوئی قول و فعل سچائی کے خلاف نہیں ہو سکتا، اور ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ آپ ﷺ کی بات اور کردار میں صرف سچائی نہیں ہوتی بلکہ آپ ﷺ کی بات اور کردار سچائی سے بنا ہوا اور سچائی کا پیکر ہوتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت اور راست بازی کا یہ حال تھا کہ ان کو خود نبی کریم ﷺ نے اس نام سے ملقب اور موصوف کیا تھا اور ان کے علاوہ سچائی اور عدل و انصاف کی ایمانی روح تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دوڑ رہی تھی اور ان کی زبانیں اور کردار کبھی بھی جھوٹ سے آلودہ نہیں ہوتا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو عزتِ نفس کا بہت خیال رہتا تھا۔ اپنے متعلق بدگمانی کا موقع نہیں آنے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے کہنے سے سواریاں مانگنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے کہہ دیا: ”میرے پاس سواریاں نہیں ہیں۔ اللہ کی قسم! میں انہیں کوئی سواری نہیں دے سکتا“۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ واپس آ گئے اور دوستوں سے یہ بات بیان کر دی۔ تھوڑی دیر میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا کر چند اونٹ مرحمت فرمائے۔ انہوں نے وہ اونٹ اپنے دوستوں کو پہنچا دیے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ لوگ انہیں جھوٹا سمجھیں گے (اس لیے کہ پہلے انہوں نے یہ خبر دی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اونٹنیاں نہیں ہیں) لہٰذا انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”اللہ کی قسم! میں تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک میں تمہیں ان لوگوں کے پاس نہ لے چلوں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو انکار کرتے ہوئے سنا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری بات کو جھوٹ سمجھو۔“ دوستوں نے

کہا: ”تم سچے ہو اور اگر تم تصدیق کرانا بہتر سمجھتے ہو تو ہم ایسا بھی کرلیں گے۔“ الغرض حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ایک آدمی کو لے کر آئے اور اپنی بات کی تصدیق کرائی۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ ایک دن اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ ان ساتھیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں کسی جگہ کا عامل بنادیا جائے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ (کو خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھیں گے کہ میں ان کو اسی مقصد کے لیے لے کر آیا ہوں تو صفائی پیش کرتے ہوئے انہوں) نے عرض کیا: اللہ کی قسم! جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، انہوں نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں کیا ہے اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ عامل بننا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اس کو عامل نہیں بناتے جو عامل بننے کی درخواست کرے، ہاں اے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ! تم یمن جاؤ۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے بخاری: کتاب المغازی و مسلم)

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جھوٹ، غلط بیانی بلکہ جھوٹ کی تہمت سے کس قدر ڈرتے تھے۔

سچائی کے واقعات اس لیے زیادہ نہیں لکھے گئے کہ سچائی مؤمن کی وہ صفت ہے جس کا تعلق صرف گفتار سے نہیں، بلکہ اس کے اعتقاد و کردار اور ظاہر و باطن سے ہے۔ اس لیے اگر دل میں سچائی نہ ہو تو انسان ایمان میں سچا نہیں ہو سکتا اور نہ وہ مؤمن بن سکتا ہے۔ جب انسان کے اندر سچائی کا جوہر ختم ہو جاتا ہے تو انسان کی زبان و کردار سب جھوٹ اور باطل ہو جاتی ہیں، لہٰذا اگر کبھی وہ سچ بولتا بھی ہے یا ایفائے عہد کرتا بھی ہے تو دنیوی مفاد کے لیے کرتا ہے نہ کہ اس لیے کہ اس کے اندر سچائی ہوتی ہے۔ بہر حال دینِ اسلام سراسر حق اور سچائی اور اس کے خلاف جھوٹ اور باطل ہے۔ امانتداری سچائی ہے اور خیانت جھوٹ ہے۔ وعدہ پورا کرنا سچائی ہے اور اس کے خلاف کرنا جھوٹ ہے۔ ظاہر باطن کے مطابق ہو تو سچائی ہے ورنہ جھوٹ۔ بس مؤمن کی سچائی اس کی زبان اور اس کے کردار سے ٹپکتی ہے، اس لیے یہاں دوسری قسم کے واقعات کو ذکر کیا جاتا ہے جس سے ایمان کی سچائی معلوم ہو اور ایمان سچا ہو تو زبان اور کردار سے خود بخود سچائی ٹپکتی ہے۔

رُبعی بن حراش کا صدق اور اس کی برکات

حضرت رُبعی بن حراش بچپن سے صدق وصفائی میں مشہور تھے۔ تمام عمر کوئی جھوٹ آپ کی زبان پر نہیں آیا۔

ایک مرتبہ ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ ان کے دو صاحبزادے حجاج بن یوسف کے (جو اس امت کا سب سے زیادہ ظالم مشہور ہے) معتوب تھے اور اس کی ظالمانہ سختیوں سے واقف تھے، اس لیے روپوش ہو کر دن گزار رہے تھے۔ حجاج کو کسی نے بتلایا کہ ان کے والد کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہی سے ان لڑکوں کا پتا دریافت کرو۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں فوراً آدمی بھیج کر دریافت کیا۔ آپ نے بے تامل فرمادیا کہ دونوں گھر کے اندر ہیں۔ اولاد کی جان جاتی ہے اور والد شفیق ایک کلمہ خلافِ واقع فرمادینا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے مواقع پر سچ پر قائم رہنا کوئی معمولی کام نہ تھا لیکن سچائی کو بھی حق تعالیٰ نے وہ برکات عطا فرمائی ہیں کہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اس کے آثار وبرکات کا ظہور ہو جاتا ہے۔

حضرت ربعی بن حراش کی اس حیرت انگیز راست گوئی سے حجاج بن یوسف جیسا سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور کہا کہ ہم نے آپ کی سچائی کی وجہ سے ان دونوں کا جرم معاف کر دیا۔

(کشکول:۱۷۴)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے والد ماجد کا تقویٰ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ اپنے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق فرماتے ہیں:

میرے والد صاحب کے زمانہ میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا، نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کا مکان تھا۔ گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانہ میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس کا نام اسمٰعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانہ میں وہاں سے کھانا آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں، بلکہ باہر رکھواتے تھے۔ اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ تنخواہ تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے سات

سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔ (اکابر کا تقویٰ:۳۷)

جھوٹی خوشامد کی سزا

امیر المؤمنین ولید بن عبد الملک کے عہدِ حکومت میں ایک شخص نے ان کی خوشامد کے لیے ایک موضوع حدیث گھڑی اور موضوع سند کے ساتھ ان کے سامنے پیش کی جس کا مضمون یہ تھا کہ: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو خلیفہ اور امیر المؤمنین بناتے ہیں تو اس کی حسنات لکھی جاتی ہیں اور سیئات نہیں لکھی جاتیں۔''

ولید بن عبد الملک نہ کوئی ولی ہیں نہ متقی، نہ صلحا واتقیا کے طبقہ میں ان کا شمار ہے مگر عہدِ نبوت کے قُرب کی برکت کا اثر سب میں تھا۔ یہ حدیث سنی تو فوراً کہا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، یہ حدیث نہیں ہوسکتی کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

''اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین کا خلیفہ بنایا ہے، سو آپ لوگوں میں حق کا فیصلہ کریں اور خواہشات کا اتباع نہ کریں کہ ''اتباعِ ہوا'' آپ کو اللہ کے راستہ سے گمراہ کردے گا۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ سے گمراہ ہوتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ بھول گئے حساب کے دن کو''۔

اس آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی کو خلیفہ بنانے کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ اگر (بالفرض) خلافِ حق فیصلہ کریں گے تو عذابِ شدید کے مستوجب ہوں گے، پھر کسی دوسرے انسان کا کیا پوچھنا۔ (فتح الباری بتوضیح:۱۳/۹۷)

الغرض ولید بن عبد الملک سمجھ گیا کہ روایت اس نے محض میری خوشامد کے لیے گھڑی ہے تو بجائے خوش ہونے کے اس کے خلاف کیا اور یہ شخص جو دین کو دنیا کے بدلے بیچنا چاہتا تھا دنیا میں بھی خائب وخاسر رہ گیا۔ نعوذ باللہ منہ

تنبیہ: اس واقعہ سے اس ارشاد کی تصدیق ہوئی جو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے

ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ جو شخص کسی مخلوق کو راضی کرنے کے لیے خالق کو ناراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کی ایذا و تکلیف کے لیے اُسی مخلوق کو اُس پر مسلط فرما دیتے ہیں۔

(اخرجہ الترمذی، کشکول: ۱۷۰ تا ۱۷۱)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی امانتداری

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی امانتداری اور احتیاط کا حال یہ تھا کہ وہ عام باورچی خانہ کا (جو بیت المال کی طرف سے ہوتا تھا اور جس پر عام مسلمانوں کا حق تھا) گرم کیا ہوا پانی استعمال نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی اس پر پکے ہوئے کھانے کو کھاتے تھے، اور اگر مجبوراً کبھی اس کی نوبت آجاتی تو اس کی اُجرت ادا کر دیتے۔ سرکاری کام کے لیے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی میں ذاتی کام نہ کرتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً سرکاری چراغ کو بجھا دیتے تھے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے تھے۔

(دیکھیے سیرۃ عمر بن عبد العزیز "ابن حکم": ۴۴)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی امانت داری

حضرت سہارنپوری قدس سرہ کی حیاتِ مبارکہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ مظاہر العلوم میں بحیثیت جانشین اور سرپرست نہیں تھے، اس لیے جب ان کو مہمان خانہ میں جانا ہوتا تو کبھی مہمان خانہ کی چارپائی پر تشریف نہ رکھتے تھے، مہمان سے بات کھڑے رہتے ہوئے کرتے یا بیٹھنے کی ضرورت ہو تو فرش پر بیٹھ جاتے، اور مہمان حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کے ساتھ چارپائی پر ہوتے مگر حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد چونکہ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ جانشین کے طور پر ہوگئے تو یہ مشکل پیش آئی کہ اگر حضرت زمین پر تشریف رکھیں تو مدرسہ کے مہمان کیسے چارپائی پر بیٹھے رہیں۔ اس وجہ سے تو مہمانوں کو بھی نیچے اترنا پڑتا، اس لیے حضرت نے اس وقت سے ہمیشہ کے لیے مدرسہ کی تمام چارپائیاں اور بستر اپنے ذاتی بنوانا شروع کر دیے تاکہ ان کو مدرسہ کے مہمان بھی استعمال کر سکیں اور حضرت اور ان کے ذاتی مہمان بھی۔ (دیکھیے اکابر کا تقویٰ: فصل پنجم)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ مہمان خانہ کی چارپائی پر پہلے کیوں نہیں بیٹھے، صرف اس لیے کہ یہ مدرسہ میں رہنے والوں کے لیے نہیں بلکہ مہمانوں کے لیے بنائے گئے ہیں جن میں مدرسہ کے مہمانوں

کے علاوہ کسی اور کا حق نہیں۔ یہ حضرت کا ایک طرف مدرسہ اور اوقاف کی چیزوں کے بارے میں سخت امانتداری کی دلیل ہے تو دوسری طرف امانتداری اور حقوق کے معاملہ میں سخت قسم کے تقویٰ یعنی احتیاط کی دلیل ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی امانتداری اور اس میں احتیاط کے ایک اور پہلو کو دیکھیے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

بلامعاوضہ تدریس

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا ابتدائی تقرر با تنخواہ مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا۔ ۴۴ھ تک آپ کبھی تنخواہ لے لیتے اور کبھی نہ لیتے۔ شعبان ۴۴ھ میں بسلسلہ بذل طویل قیام کے لیے آپ کا حضرت سہارن پوری قدس سرہ کے ساتھ حجاز جانا طے ہوا (جس کی تفصیل ان شاء اللہ کسی دوسرے موقع پر آئے گی) تو حضرت قدس سرہ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے خرچ کا کیا ہو گا؟ حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں نے عرض کیا: حضرت رحمہ اللہ! اس کا تو بالکل فکر نہیں۔ میں ۳۸ھ میں بھی قرض لے کر گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت قرض ملنا بہت دشوار تھا اور اس وقت آسان ہے۔ اب بھی لے لوں گا۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: تمہاری مدرسہ میں تنخواہ بھی کچھ جمع ہے۔

اس کی شرح یہ ہے ۳۵ھ میں جب میں ملازم ہوا تھا اور میری تنخواہ پندرہ روپے ہوتی تھی۔ (حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کے ابتدائی تقرر کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ حضرات سرپرستان مدرسہ نے آپ کی تنخواہ بیس روپے تجویز کی تھی۔ آگے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا جو گرامی نامہ ناظم مدرسہ کے نام آرہا ہے اس میں بھی بیس روپے کا ذکر ہے، لیکن آپ بیتی میں پندرہ روپے کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم) اس وقت بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہ نے مدرسہ میں تو سفارش کی تھی کہ پندرہ روپے تنخواہ بہت کم ہے، کم از کم پچیس روپے ہونی چاہیے، اور مجھ سے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ جب اللہ توفیق دے مدرسہ کی تنخواہ چھوڑ دیجیو۔ جس کا اثر یہ تھا کہ میرا حضرت رائے پوری قدس سرہ کے ارشاد کی وجہ سے تو تنخواہ لینے کو بالکل جی نہیں چاہے، مگر میرے حضرت قدس سرہ لیتے تھے۔ اگرچہ میرے والد صاحب نے کبھی نہیں لی، پھر بھی چونکہ میرے حضرت لیتے تھے اس لیے میں نہ لینا بے ادبی سمجھتا تھا، اس لیے کسی ماہ

میں اس کا غلبہ ہوتا، کسی ماہ میں اس کا۔ البتہ نہ لینے سے میری ترقیاں رکتی رہیں۔ جب مدرسین کی ترقی کا وقت آتا اور دوسرے مدرسین کی ترقی ہوتی تو اگر میں اس سے پہلے مہینوں میں تنخواہ لینے والا ہوتا تو میری بھی چار پانچ روپے ترقی ہو جاتی۔ اور جس زمانے میں میں تنخواہ نہ لیتا مہتمم صاحب فرمادیتے وہ تو پہلے ہی سے نہیں لیتا، اس کی کیا ترقی؟۔

بہر حال محرم ۵۸ھ سے شعبان ۶۴ھ تک نو سو پینتالیس (۹۴۵) روپے میری تنخواہ کے جمع تھے، جو اس زمانے میں حج کے اخراجات سے بہت زائد تھے۔ حج کا خرچ اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ چھ سو روپے تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کے ذہن میں یہ تھا کہ بقدرِ اخراجات لے کر بقیہ اہل وعیال کے خرچ کے لیے دے دیے جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کا فکر نہ فرمائیں، خرچ کا انتظام ہو جائے گا۔ اس تنخواہ کا لینا تو جائز نہیں۔ اکابر کی خدمت میں گستاخ تو ہمیشہ ہی رہا.... حضرت قدس سرہ نے فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: حضرت رحمہ اللہ جن مہینوں کی تنخواہ نہیں لی، ان میں اس نیت سے پڑھایا کہ تنخواہ نہیں لوں گا، اب اس کے لینے کا کیا حق ہے۔ حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ تم نے کوئی درخواست مدرسہ کو دی؟ تم اجیر تھے مدرسہ مستاجر، تمہیں یکطرفہ فسخ اجارہ کا کیا حق تھا، جب تک کہ ہم قبول نہ کریں۔

میں نے عرض کیا: حضرت اس میں اجارے کی تو کوئی بات نہیں۔ ایک شخص کام کرتے ہوئے یہ نیت کر لے کہ بوجہ اللہ کر رہا ہوں، اس کے بعد اس کو معاوضہ لینے کا کیا حق ہے؟

حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ بھی تشریف فرما تھے، انہوں نے حضرت رحمہ اللہ سے عرض کیا: حضرت رحمہ اللہ میں انہیں سمجھادوں گا۔

حضرت قدس سرہ بہت خوش ہوئے اور میں بھی بہت خوش ہوا۔ حضرت رحمہ اللہ کے سامنے تو میں بہت ادب سے ڈرتے ڈرتے کوئی لفظ کہوں اور ناظم صاحب سے خوب کھل کر مناظرہ ہوا۔ انہوں نے حضرت رحمہ اللہ سے عرض کر دیا کہ حضرت رحمہ اللہ! یہ نہیں مانتا۔ حضرت تھانوی قدس سرہ بھی مدرسہ کے سرپرستوں میں تھے اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھانہ بھون کے مفتی اعظم اور مجھ سے بے حد بے تکلفی..... میں نے ان سے کہا کہ مدرسہ کے کاغذات میری تنخواہ کے سلسلہ میں حضرت قدس سرہ کے پاس آویں گے، حضرت سے میری تنخواہ نامنظور کرادیجیے۔

انہوں نے حضرت تھانوی قدس سرہ سے نہ معلوم کیا۔ کہا: جب میری درخواست ڈیڑھ سال کی چھٹی کی اور مہتمم صاحب کی طرف سے اس پر یہ تحریر کہ اس کی تنخواہ بھی کچھ رُکی ہوئی ہے اس کے دینے کی بھی اجازت دی جائے تو حضرت تھانوی نے چھٹی بخوشی منظور فرمائی اور تنخواہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ اگر قبض الوصول میں تنخواہ درج ہے اور انہوں نے وصول نہیں کی تو اس میں سرپرستان سے اجازت کا کیا مطلب؟ دی جائے، اور اگر اس میں کوئی اور اشتباہ ہے تو اس کو ظاہر کیا جائے تاکہ اس پر غور کیا جائے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی اسی وقت سرپرست بنائے گئے تھے، یہاں آئے۔ میں نے ان سے بھی عرض کیا کہ تم سرپرست ہو، اس تنخواہ کا لینا میرے لیے جائز نہیں، اسے نامنظور کر دیجیو، لیکن حضرت قدس سرہ کی منظوری کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ تو رد فرما سکتے تھے، خدام میں سے کسی کو ہمت پڑتی۔ یہ گستاخیاں تو اللہ نے اس ناکارہ کے حق میں رکھی تھیں، جو ہمیشہ کرتا رہا۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اول تو مجھ سے مناظرہ کیا اور جب ناظم صاحب کی طرح وہ بھی مناظرے میں غالب نہ آئے تو انہوں نے بحیثیت سرپرست میرے کاغذ پر لکھا، ڈیڑھ سال رخصت منظور ہے اور تنخواہ کے سلسلہ میں جیسا کہ اس کی طرف سے رخصت کی درخواست ہے، اسی کی طرف سے یہ درخواست بھی ہونی چاہیے کہ میری تنخواہ مدرسہ سے دلوادی جائے۔

حضرت قدس سرہ نے جب حضرت میرٹھی کی تحریر دیکھی تو سمجھ گئے کہ میرا اُن سے بھی مناظرہ ہوا.... تو میرے حضرت قدس سرہ نے بہت ہی شفقت سے مجھ سے یوں فرمایا کہ بذل میرا ذاتی کام تو نہیں، مدرسہ ہی کا کام ہے، اگر میں سرپرستان کی منظوری کے بعد تمہیں بکارِ مدرسہ اپنے ساتھ لے جاؤں اور آمد و رفت کے خرچ کے علاوہ وہاں کے قیام کی تنخواہ مدرسہ سے دلواؤں تو تم کیا کہو گے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ عرض کروں گا، بالکل جائز ہے، ذرا تردد نہیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: تمہاری جمع شدہ تنخواہ تو بہت کم ہو گی، جتنا کہ اس صورت میں مدرسہ تم کو دے گا۔ میں نے کہا: بالکل صحیح ہے۔ حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ پھر تم یہی سمجھ لو۔ اس پر میں نے تنخواہ تو لے لی لیکن حضرت رائے پوری رحمہ اللہ کی نسبت کا اثر کچھ ایسا غالب تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر میں نے سب سے پہلے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اس تنخواہ کا تو کوئی ذکر نہیں کیا البتہ یہ لکھا:

بحضرت مہتمم صاحب مدفیوضکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، الحمد للہ کہ ہم سب یہاں بخیریت ہیں۔ حضرت اقدس بھی بعافیت ہیں۔ میرا ارادہ ایک عرصہ سے مدرسہ کے ان حقوق کے معاوضہ میں، جو مجھ پر ہیں، ایک بڑی رقم مدرسہ میں پیش کرنے کا ہو رہا ہے، مگر آپ کو معلوم ہے کہ مجھ سے جمع ہونا ناممکن ہے، اس لیے بالفعل میری طرف سے صرف ایک ہزار روپے کا وعدہ اس طرح تحریر فرمالیں کہ اسی ماہ جمادی الاول سے پانچ روپے ماہانہ میری واپسی تک میرے کارکن مولوی نصیر الدین سے اور بعد واپسی کے خود مجھ سے وصول فرماتے رہیں۔ اگر اس کے پورا ہونے تک میرا انتقال ہو جائے تو اس وقت جس قدر رقم باقی ہو وہ میری وصیت ہے جو کہ متروکہ سے وصول کی جائے۔ اگر ممکن ہوا تو اس ماہانہ کے علاوہ یکمشت بھی اس رقم میں ان شاء اللہ واپسی پر کچھ جمع کروں گا۔ یہ مجھے اعتراف ہے کہ مدرسہ کے حقوق اس سے کہیں زیادہ ہیں مگر مالا یدرك كله لا يترك كله اور خدا کرے کہ اس کے پورا ہو جانے کے بعد کچھ اور بھی پیش کر سکوں۔"

فقط والسلام

زکریا عفی عنہ، مدینہ طیبہ / ۵ جمادی الاول ۸۵ھ

اللہ کے فضل سے جب یہ رقم ادا ہو گئی تو مجھے رائے پوری جذبہ سے یہ خیال ہوا کہ اس سے پہلے زمانہ میں جو تنخواہیں لی ہیں وہ بھی واپس کر دی جائیں۔ اللہ نے وہ بھی واپس کرا دیں۔ للہ الحمد والمنۃ.

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهٗ اَللّٰهُمَّ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ

اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ

اس سلسلہ میں بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے حضرت نور اللہ مرقدہ نے ناظم مدرسہ کے نام دوسرا خط حسب ذیل تحریر فرمایا:

بگرامی خدمت حضرت ناظم صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور زاد مجدکم۔ بعد سلام مسنون!

یہ ناکارہ محرم ۳۵ھ میں مدرسہ میں بیس روپے (۲۰) ماہانہ پر مدرس مقرر ہوا تھا، جبکہ میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ جو کئی سال پہلے سے مدرس تھے، ترقیات کے بعد اکیس (۲۱) روپے تک پہنچے تھے، اور مولانا عبد الرحمن صاحب دام مجدہم جو پہلے سے مدرس تھے، ترقی کے بعد سترہ (۱۷)

روپے تک، اور مولانا منظور احمد صاحب جو مجھ سے پہلے مدرس تھے، پندرہ (۱۵) روپے تک پہنچے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میری تنخواہ محض اکابر کے حسنِ ظن اور شفقت کی وجہ سے اتنی مقرر ہو گئی تھی جو میری حیثیت اور استعداد سے زائد تھی۔ ان حضرات کے حسنِ ظن کا مبنی میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کا طرزِ تعلیم تھا کہ وہ خصوصی طلبہ سے تعلیم کے زمانے میں بھی اسباق پڑھوایا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے انتقال ۳۴ھ کے سال میں بھی اپنے مخصوص شاگردوں کے اسباق مقامات وغیرہ اس ناکارہ کے حوالہ فرمار کھے تھے۔ اس کے بعد شوال ۴۴ھ تک جب کہ یہ ناکارہ دوسری مرتبہ حجاز گیا اور اس کے بعد مستقل طور سے تنخواہ چھوڑ دی تھی متفرق ترقیات کے بعد تنخواہ پینتیس (۳۵) روپے تک پہنچی تھی، ان تمام ایام کی تنخواہ جو اس ناکارہ نے مدرسہ سے وصول کی تھی، دو ہزار سات سو سترہ (۲۷۱۷) روپے تھی۔ اس ناکارہ کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہ تنخواہ جو ملتی رہی وہ میری حیثیت، استعداد سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ گو اس ناکارہ نے مدرسہ کے اوقات کا ہمیشہ بہت اہتمام کیا اور شدید بخار وغیرہ اور دوسرے امراض میں بھی رخصت بیماری بہت کم لی، لیکن اکابر کے جو واقعات مدرسہ کی تنخواہ اور تحفظ اوقات کے سنتا اور دیکھتا رہا ہوں، وہ بہت شدید ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہ کا معمول تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں اگر کوئی ذاتی مہمان آجاتا اور اس سے مزاج پرسی وغیرہ میں چند منٹ خرچ ہو جاتے تو ان کو اسی وقت یادداشت میں لکھ لیتے اور مہینہ کے ختم ہونے پر ان سب منٹوں کو جمع فرما کر اتنے وقت کو رخصتِ اتفاقیہ میں لکھوا لیتے اور حسبِ ضابطہ تنخواہ وضع کرایا کرتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ حضرت اقدس سہارن پوری قدس سرہ آخر ۱۳۳۴ھ میں جب حجاز سے واپس تشریف لائے تو یہ فرما کر تنخواہ چھوڑ دی تھی کہ میں اپنے ضعف وغیرہ کی وجہ سے مدرسہ کے اوقات کا پورا تحفظ نہیں کر سکتا، اب تک میں تنخواہ اس لیے لیتا رہا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب میری نیابت میں بلا تنخواہ کام کیا کرتے تھے اور میرا اور ان کا کام مل کر ایک مدرس سے بہت زیادہ ہو جاتا تھا، مگر اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اس لیے میں اب تنخواہ لینے سے معذور ہوں۔ تقریباً ایک سال تک حضرت قدس سرہ اس زمانے کے سرپرستان حضرت اقدس رائے پوری، حضرت تھانوی وغیرہ نور اللہ مرقدہم سے اس پر اصرار فرماتے رہے۔

میں نے اپنے والد صاحب کو دیکھا کہ سردی میں مدرسہ کے حمام کے سامنے اپنا سالن وغیرہ رکھ دیتے، جو اس کی دور کی شعاع (آنچ) سے گرم ہو جاتا، لیکن اس پر بھی سردی کے ختم پر دو چار روپے اس کے معاوضہ میں چندے کے نام سے داخل فرما دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے متعدد واقعات کی بنا پر مجھے ہمیشہ سے اپنی تنخواہ کے واپس کرنے کا داعیہ رہا مگر بعض دوسرے خیالات اس کی تکمیل میں مانع رہے۔

مندرجہ بالا مقدار میں سے تقریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) روپے کی رقم میں تو مجھے خصوصی اشکال تھا، اس لیے اس کی پیش کش تو بندہ ۱۳۴۵ھ میں کر چکا تھا، جو اسی سال روئداد میں مفصل طبع ہو چکا تھا اور وہ رقم پوری ہو گئی تھی۔ بقیہ سترہ سو سترہ (۱۷۱۷) روپیہ کی پیش کش اس وقت کرتا ہوں۔ اس طرح پر کہ پانچ سو سترہ (۵۱۷) روپے تو نقد پیش ہیں، بقیہ بارہ سو (۱۲۰۰) روپے میں سے اس ناکارہ کی حیات تک مبلغ بیس (۲۰) روپے ماہانہ بندہ سے وصول فرماتے رہیں اور تکمیل رقم سے قبل اگر اس ناکارہ کا انتقال ہو جائے تو جتنا اس وقت باقی ہو اس کی وصیت کرتا ہوں کہ بندہ کے کتب خانہ سے وصول کر لی جائے۔

محمد زکریا، ۱۱ شوال ۱۳۸۰ (حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ: ۱۴۳ تا ۱۵۱)

اوقات کی پابندی

حضرت نور اللہ مرقدہ کے درس کا ایک خصوصی امتیاز وقت کی پابندی تھی۔ شادی غمی، سردی گرمی، بارش آندھی کوئی چیز اس میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ کبھی مہینوں میں بھی ایسا اتفاق نہیں ہوتا تھا کہ حضرت نور اللہ مرقدہ ٹھیک مقررہ وقت پر درس گاہ میں نہ پہنچے ہوں اور چند منٹ کی تاخیر ہو گئی ہو۔ اس شدید پابندی کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو گا، جو مولانا تقی الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

ایک بار موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، تمام سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر رہا تھا۔ ناکارہ راقم سطور مدرسہ قدیم میں کتاب لیے ہوئے منتظر تھا کہ بارش کا زور کم ہو تو سبق میں حاضر ہو۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب مرحوم ناظم مدرسہ مظاہر علوم اس وقت دفتر نظامت (جو مدرسہ قدیم میں واقع ہے) میں تشریف رکھتے تھے۔ اس ناچیز نے ان سے دریافت کیا کہ کیا حضرت شیخ الحدیث آج بھی درس میں تشریف لے گئے ہوں گے؟

انہوں نے فرمایا کہ اس طوفانی بارش میں تو بظاہر مشکل ہی معلوم ہوتا ہے، باہر جا کر معلوم کر لو۔

چنانچہ میں نے مدرسہ کے دروازے پر آکر سائبان میں بیٹھے ہوئے پھل فروشوں سے معلوم کیا۔ بارش کا زور برابر قائم تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرتؒ تو دیر ہوئی تشریف لے گئے ہیں، جبکہ حضرت کے مکان سے دار الحدیث کا خاصہ فاصلہ ہے۔ سڑک پر پانی بہہ رہا تھا۔ یہ کم ہمت بھی بہ عجلت تمام دار الحدیث میں حاضر ہوا۔ وہاں بجلی غائب تھی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا، مگر درس شروع ہو چکا تھا۔ ناچیز راقم سطور چپکے سے بیٹھ گیا کہ مبادا حضرت شیخ رحمہ اللہ کی نظر پڑ جائے، مگر آپ نے دیکھ لیا اور فرمایا: جانتے ہو کیسے آیا ہوں؟ اپنے مکان سے روانہ ہوا تو ایک ہاتھ میں بخاری شریف کا پارہ تھا اور دوسرے میں چھتری تھی۔ جوتے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا، نصف راستہ تک آیا تو ایک رکشہ والا مل گیا۔ اس نے بہ اصرار مجھے رکشہ پر سوار کر لیا اور یہاں پہنچانے کے بعد میرے پاؤں اور پائجامہ کے نچلے حصہ کو دھویا ..... یہ ناکارہ یہ سن کر پانی پانی ہو گیا۔ (حضرت شیخ الحدیثؒ:۱۵۱تا۱۵۲)

مؤمن ایسا ہوتا ہے، اس کا شعور بیدار اور ضمیر صاف ہوتا ہے۔ ایک طرف اپنی حیثیت سے زیادہ تنخواہ لینے کا خطرہ کہ خائن نہ بنوں، دوسری طرف اس امانتداری کے ہوتے ہوئے یہ خدشہ کہ شاید کام میں کوتاہی ہو اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے دین کی تعلیم و تعلم سے ہے اس لیے وہ ملی ہوئی تنخواہ بھی واپس کی تاکہ یہ سلسلہ ہی نہ رہے۔ پھر دیکھیے اس پاک اور روشن ضمیر کو یہ معلوم تھا کہ اگر میں آکر مدرسہ میں مفت بھی پڑھاؤں پھر بھی غیر حاضری کی صورت میں تو طلبا کے حقوق مارے جائیں گے، کیونکہ ان کا وقت تو ضائع ہو جائے گا اور یہ بھی ایک قسم کی خیانت ہے، اس لیے انہوں نے سخت بیماری اور سخت بارش کی حالت میں بھی طلبا کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنی تمام تر زندگی پوری امانتداری کے ساتھ گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صفاتِ ایمانیہ سے ہی رعب دوسروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے

کفار کے قلب میں جب رعب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ان کی کثرت کارآمد نہیں ہوتی اور رعب دشمن پر اس وقت پڑتا ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ اگر خدا کا خوف دل میں نہیں تو دشمن سے مرعوب ہو گا۔

سجستان کا علاقہ نصرانی بادشاہ کے قبضہ میں تھا، مسلمانوں کو جزیہ دیا کرتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس

نے محصول دینا بند کر دیا۔ یہاں سے جماعت کی جماعت گھڑ سواروں کی گئی، مطالبہ کرنے کے لیے کہ محصول تو نے کیوں بند کر دیا۔ اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ جو پہلے لوگ وصول کرنے آئے تھے وہ کہاں ہیں؟ پوچھا: پہلے کون سے، ان میں کیا بات تھی، ان کی کوئی علامت ہے؟ کہا کہ ان کی آنکھیں اندر کو اتری ہوئی تھیں، گال پچکے ہوئے تھے، لب خشک تھے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، وہ ایسے تھے۔ ان کا اثر یہ تھا کہ جب وہ میری حکومت کی حدود میں داخل ہوتے تھے تو میرا دل کانپنے لگتا تھا اور آج وہ بات نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: وہ دنیا سے رخصت ہو لیے، اب ہمارا نمبر ہے۔ نصرانی نے کہا: میں انہیں کو دیا کرتا تھا تمہیں نہیں دوں گا، تم میں حوصلہ ہو تو لڑ کر لے لو اور یہ بتاؤں کہ وہ کرتے کیا تھے۔ دن میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر اکھٹی کرکے لاتے تھے اور جن کے گھروں میں آگ جلانے کے لیے لکڑیاں نہیں تھیں ان کے گھروں میں پہنچاتے، جن کے گھروں میں پانی نہیں ہوتا تھا، ان کے گھروں میں پانی پہنچا دیتے تھے، یہ مشغلہ تھا، اور رات کو خدا کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

(ملفوظات فقیہ الامت: ۶۵/ ۶,۸۰/ ۹تا۸۱)

امانت کے معنی

عربی زبان میں ''امانت'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کیا جائے۔ لٰہذا ہر وہ چیز جو دوسرے کو اس طرح سپرد کی گئی ہو کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، یہ امانت ہے۔ لٰہذا کوئی شخص کوئی کام یا کوئی چیز یا کوئی مال جو دوسرے کے سپرد کرے اور سپرد کرنے والا اس بھروسے پر سپرد کرے کہ یہ شخص اس سلسلے میں اپنے فریضے کو صحیح طور پر بجالائے گا اور اس میں کوتاہی نہیں کرے گا، یہ امانت ہے۔ لٰہذا امانت کی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بے شمار چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔

یوم الَست میں اقرار

اللہ تعالیٰ نے ''یومِ اَلَست'' میں انسانوں سے جو عہد لیا تھا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں یا نہیں؟ اور تم میری اطاعت کروگے یا نہیں؟ تمام انسانوں نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ اس عہد کو قرآن کریم نے سورۂ احزاب کے آخری رکوع میں امانت سے تعبیر فرمایا ہے، فرمایا کہ: اِنَّا عَرَضۡنَا

الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۝ ”ہم نے زمین پر امانت پیش کی اور اس سے پوچھا کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گی؟ تو اس نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا، پھر آسمانوں پر پیش کی کہ تم یہ امانت اٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی انکار کر دیا اور پھر پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ سب اس امانت کو اٹھانے سے ڈر گئے۔ لیکن جب یہ امانت اس حضرت انسان پر پیش کی گئی تو اس نے بہت بہادر بن کر آگے بڑھ کر اقرار کر لیا کہ میں اس امانت کو اٹھاؤں گا۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا (کہ اتنے بڑے بوجھ کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھ گیا اور یہ نہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے عاجز رہ جاؤں جس کی وجہ سے میرا انجام خراب ہو جائے)۔“ (سورۂ احزاب: آیت ۷۲)

یہ زندگی امانت ہے

بہرحال اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے ”امانت“ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ امانت کیا چیز تھی جو انسان پر پیش کی جارہی تھی؟ چنانچہ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں امانت کے معنی یہ ہیں کہ اس انسان سے یہ کہا جارہا تھا کہ تمہیں ایک زندگی دی جائے گی اور اس میں تمہیں اچھے کام کرنے کا بھی اختیار دیا جائے گا اور بُرے کام کرنے کا بھی، اور جب اچھے کام کرو گے تو ہماری خوشنودی حاصل ہو گی، جنت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تمہیں حاصل ہوں گی، اور اگر برے کام کرو گے تو اس کے نتیجے میں تم پر ہمارا غضب ہو گا اور جہنم کا ابدی عذاب تم پر ہو گا، اب بتاؤ! تمہیں ایسی زندگی منظور ہے یا نہیں؟ چنانچہ اور سب نے انکار کر دیا، لیکن انسان اس کے لیے تیار ہو گیا۔ حافظ شیرازی رحمہ اللہ اسی کو بیان فرماتے ہیں کہ

آسمان بار امانت نتوانست کشید — قرعہ فال بنام من دیوانہ زد

یعنی آسمان سے تو یہ بوجھ نہیں اٹھا، اس نے تو انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ حضرت انسان، مشت استخوان نے یہ بوجھ اٹھا لیا اور قرعۂ فال میرے نام پر پڑ گیا۔ بہرحال قرآن کریم نے اس کو ”امانت“ سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ جسم ایک امانت ہے

یہ پوری زندگی ہمارے پاس امانت ہے اور اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے احکام کے مطابق گزاردیں، لہٰذا سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ امانت خود اس کا "وجود" اور اس کی "زندگی"، اس کے اعضاء وجوارح، اس کے اوقات اور اس کی توانائیاں ہیں۔ یہ سب کی سب امانت ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کا مالک ہوں، یہ آنکھ جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کا مالک ہوں۔ ایسا نہیں، بلکہ یہ سارے اعضاء ہمارے پاس امانت ہیں۔ ہم اس کے مالک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں بلکہ اعضاء کی یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لیے عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان اعضاء کو، اپنے اس وجود کو، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنی توانائیوں کو اسی کام میں صرف کریں جس کام کے لیے یہ دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ ایک نعمت ہے

مثلاً: آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ ساری دنیا کا مال و دولت خرچ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہیں تو حاصل نہیں ہوسکتی، لیکن اس کی قدر اس لیے نہیں ہے کہ پیدائش کے وقت سے یہ سرکاری مشین لگی ہوئی ہے اور کام کر رہی ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں نہ تو کوئی پیسہ لگا ہے اور نہ محنت کرنی پڑی ہے، لیکن جس دن (خدانہ کرے) اس آنکھ کی بینائی پر ادنیٰ سا نقص آجائے اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں میری یہ بینائی چلی نہ جائے، اس وقت اس کی قدر وقیمت معلوم ہوتی ہے اور اس وقت آدمی ساری دولت ایک آنکھ کی بینائی کے لیے خرچ کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ یہ ایسی سرکاری مشین ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے نہ اوورہالنگ کی، نہ اس کا ماہانہ خرچہ ہے، نہ ٹیکس اور نہ کرایہ، بلکہ مفت ملی ہوئی ہے۔

آنکھ ایک امانت ہے

لیکن یہ مشین اللہ تعالیٰ نے بطورِ امانت کے دے رکھی ہے اور یہ فرمادیا ہے کہ اس مشین کو استعمال کرو۔ اس کے ذریعہ دنیا کو دیکھو، دنیا کا نظارہ کرو، دنیا کے مناظر سے لطف اٹھاؤ، سب کچھ کرو لیکن

صرف چند چیزوں کو دیکھنے سے منع کر دیا کہ اس سرکاری مشین کو ان کاموں میں استعمال نہ کرو، مثلاً: حکم دے دیا کہ اس کے ذریعہ نامحرم پر نگاہ نہ ڈالی جائے، اب اگر اس کے ذریعہ ہم نے نامحرم کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔ اسی لیے قرآن کریم نے نامحرم کی طرف نگاہ کرنے کو خیانت سے تعبیر فرمایا، چنانچہ فرمایا کہ: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ یعنی "آنکھوں کی خیانت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں" کہ تم نے اس کو ایسی جگہ استعمال کیا جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا تھا۔ (سورۂ غافر: آیت ۱۹)

یہ ایسا ہے جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے پاس اپنا مال بطورِ امانت رکھوایا اور اب وہ چوری چھپے آنکھ بچا کر اس کا مال استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ویسا ہی معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ بھی کرتا ہے اور بے وقوف کو یہ پتا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عمل چھپ نہیں سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی خیانت کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا اور نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس پر وعیدیں بیان فرمائیں۔

اگر آنکھ کی اس امانت کو صحیح جگہ استعمال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک شخص باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اُس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لیے کہ اس نے اس امانت کو صحیح جگہ پر استعمال کیا، اگرچہ اپنی ذاتی لذت کے لیے، اپنے فائدے کے لیے کیا، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا اس لیے ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔

کان ایک امانت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کان سننے کے لیے عطا فرمائے اور پھر ہر چیز سننے کی اجازت دے دی، صرف چند چیزوں پر پابندی لگا دی کہ تم گانا بجانا مت سننا، غیبت مت سننا، غلط اور جھوٹی باتیں مت سننا، لہٰذا اگر کان ان چیزوں کے سننے میں استعمال ہو رہے ہیں تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

زبان ایک امانت ہے

زبان اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو پیدائش کے وقت سے چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہتی ہے۔ زبان کی ذراسی حرکت سے نہ جانے کیا کیا کام انسان لے رہا ہے۔ یہ زبان اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان کو حرکت دے کر یہ کہہ دو سبحان اللہ الحمد للہ حدیث شریف میں ہے

کہ اس سے میزان عمل کا آدھا پلڑا ابھر جاتا ہے اس لیے اس کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہیے، لیکن اگر اس زبان کو جھوٹ بولنے میں استعمال کیا، غیبت کرنے میں استعمال کیا، مسلمان کی دل آزاری کرنے میں استعمال کیا یا دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں استعمال کیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

خودکشی کیوں حرام ہے؟

یہ تو صرف اعضاء کی بات تھی، ہمارا یہ پورا وجود، پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اسی لیے شریعت میں خودکشی کرنا حرام ہے۔ اگر یہ جسم ہمارا اپنا ہوتا تو خودکشی کیوں حرام ہوتی؟ وہ اس لیے حرام ہے کہ یہ جان، یہ جسم، یہ وجود، یہ اعضاء در حقیقت ہماری ملکیت نہیں ہیں، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

مثلاً: یہ کتاب میری ملکیت ہے۔ اب اگر میں کسی شخص سے کہوں کہ یہ کتاب تم لے جاؤ، میرے لیے ایسا کرنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کہے کہ مجھے قتل کر دو، میری جان لے لو، اب اس نے قتل کرنے کی اجازت دے دی، اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیا، دستخط کر دیے اور مہر بھی لگا دی، سب کچھ کر لیا لیکن اس شخص کی اجازت دینے سے اس کی جان لینا دوسرے کے لیے جائز نہیں ہو جاتا، اس لیے کہ یہ جان اُس کی ملکیت ہی نہیں ہے۔ اگر اُس کی ملکیت ہوتی تب وہ دوسرے کو اس کے لینے کی اجازت دے سکتا تھا لہٰذا جب ملکیت نہیں تو پھر دوسرے کو اجازت دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

گناہ کرنا خیانت ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ پورا وجود، یہ زندگی، یہ صلاحیتیں اور توانائیاں سب ہمیں امانت کے طور پر عطا فرمائی ہیں، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ پوری زندگی امانت ہے، اس لیے زندگی کا کوئی کام اور ان اعضاء سے کیا جانے والا کوئی عمل اور کوئی قول ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس امانت میں خیانت کا سبب بنے، لہٰذا امانت کا جو محدود تصور ہمارے ذہنوں میں ہے کہ کوئی شخص آ کر پیسے رکھوائے گا اور ہم صندوقچی کھول کر اس میں وہ پیسے رکھیں گے اور تالہ لگا دیں گے، اب اگر ان پیسوں کو نکال کر خرچ کر لیا تو یہ خیانت

ہو گی۔ امانت کا اتنا محدود تصور غلط ہے، بلکہ یہ پوری زندگی ایک امانت ہے اور زندگی کا ایک ایک قول و فعل امانت ہے۔

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ امانت میں خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو یا کان کا، زبان کا گناہ ہو یا کسی دوسرے عضو کا؛ وہ سارے امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اور وہ مؤمن کے کام نہیں ہیں بلکہ منافق کے کام ہیں۔

عاریت کی چیز امانت ہے

یہ تو امانت کے بارے میں عام باتیں تھیں لیکن امانت کے کچھ خاص خاص شعبے بھی ہیں۔ بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے، مثلاً: "عاریت" کی چیز۔ عاریت اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک چیز کی ضرورت تھی اور وہ چیز اس کے پاس نہیں تھی اس لیے اس نے وہ چیز استعمال کرنے کے لیے دوسرے سے مانگ لی کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، تھوڑی دیر کے لیے دے دو۔ اب یہ عاریت کی چیز امانت ہے، مثلاً: میرا ایک کتاب پڑھنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن وہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، اس لیے میں نے دوسرے شخص سے پڑھنے کے لیے وہ کتاب مانگ لی کہ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، اب یہ کتاب میرے پاس عاریت ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو عاریت کہا جاتا ہے اور یہ عاریت کی چیز امانت ہوتی ہے، لہٰذا اس لینے والے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ اس عاریت کی چیز کو اس طرح استعمال نہ کرے جس سے مالک کو تکلیف ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو بروقت مالک کے پاس لوٹانے کی فکر کرے۔

یہ برتن امانت ہیں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے بے شمار مواعظ میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ لوگ بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کے گھر کسی نے کھانا بھیج دیا، اس بچارے بھیجنے والے سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے آپ کے گھر کھانا بھیج دیا، اب صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کھانا تم دوسرے برتن میں نکال لو اور وہ برتن اس کو فوراً واپس کر دو، مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ بے چارہ کھانا بھیجنے والا برتن سے بھی محروم ہو گیا، چنانچہ وہ برتن گھر میں پڑے ہوئے ہیں واپس پہنچانے کی فکر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا

ہے کہ وہ برتن خود اپنے استعمال میں لانے شروع کر دیے، یہ امانت میں خیانت ہے، اس لیے کہ وہ برتن آپ کے پاس بطورِ عاریت کے آئے تھے، آپ کو ان کا مالک نہیں بنایا گیا تھا لہٰذا ان برتنوں کو استعمال کرنا اور ان کو واپس پہنچانے کی فکر نہ کرنا امانت میں خیانت ہے۔

یہ کتاب امانت ہے

یا مثلاً آپ نے کسی سے کتاب پڑھنے کے لیے لے لی اور کتاب پڑھ کر اس کو مالک کے پاس نہیں پہنچائی، یہ امانت میں خیانت ہے حتیٰ کہ اب تو لوگوں میں یہ مقولہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ "کتاب کی چوری جائز ہے" اور جب کتاب کی چوری جائز ہو گئی تو امانت میں خیانت بطریقِ اولیٰ جائز ہو گی۔ اگر کسی نے کوئی کتاب پڑھنے کے لیے دے دی تو اب لوٹانے کا کوئی سوال نہیں، حالانکہ یہ سب باتیں امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں۔ اسی طرح جتنی عاریت کی چیزیں ہیں، جو آپ کے پاس کسی بھی طریقے سے آئی ہوں اُن کو حفاظت سے رکھنا اور ان کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا واجب اور فرض ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ایک شخص نے کہیں ملازمت کر لی اور ملازمت میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا معاہدہ ہو گیا، یہ آٹھ گھنٹے آپ نے اس کے ہاتھ فروخت کر دیے، لہٰذا یہ آٹھ گھنٹے کے اوقات آپ کے پاس اس شخص کی امانت ہے جس کے یہاں آپ نے ملازمت کی ہے۔ لہٰذا اگر ان آٹھ گھنٹوں میں سے ایک منٹ بھی آپ نے کسی ایسے کام میں صرف کر دیا جس میں صرف کرنے کی مالک کی طرف سے اجازت نہیں تھی تو یہ امانت میں خیانت ہے، مثلاً ڈیوٹی کے اوقات میں دوست احباب ملنے کے لیے آ گئے، اب ان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہو رہی ہیں یہ وقت اس میں صرف ہو رہا ہے، حالانکہ یہ وقت تمہارا بکا ہوا تھا، تمہارے پاس امانت تھا، تم نے اس وقت کو باتوں اور ہنسی مذاق میں گزار دیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

اب بتائیے ہم لوگ کتنے غافل ہیں کہ جو اوقات ہمارے بکے ہوئے ہیں ہم اُن کو دوسرے کاموں میں صرف کر رہے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہو رہی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں

جو تنخواہ مل رہی ہے وہ پوری طرح حلال نہیں ہوتی اس لیے کہ وقت پورا نہیں دیا۔

دار العلوم دیو بند کے اساتذہ کا معمول

دار العلوم دیوبند کے حضرات اساتذہ کرام کو دیکھیے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کی یادیں تازہ کرائیں۔ ان حضرات اساتذۂ کرام کی تنخواہ دس ۱۰۔ روپے یا پندرہ (۱۵) روپے ماہانہ ہوتی تھی، لیکن چونکہ جب تنخواہ مقرر ہوگئی اور اپنے اوقات مدرسے کے ہاتھ فروخت کر دیے، اس لیے ان حضرات اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات کے دوران مہمان یا دوست احباب ملنے کے لیے آتے تو جس وقت وہ مہمان آتے فوراً گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے اور پھر ان کو جلد از جلد نمٹانے کی فکر کرتے، اور جس وقت وہ مہمان چلے جاتے اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ پورا مہینہ اس طرح وقت نوٹ کرتے رہتے۔ پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا تو وہ اساتذہ باقاعدہ درخواست دیتے کہ اس ماہ کے دوران ہم نے اتنا وقت مدرسے کے کام کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کیا ہے لہٰذا براہِ کرم ہماری تنخواہ میں سے اتنے وقت کے پیسے کاٹ لیے جائیں۔ وہ حضرات اساتذہ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ اگر ہم نے اس وقت کی تنخواہ لے لی تو وہ ہمارے لیے حرام ہو گی۔ آج تنخواہ لینے کے لیے تو درخواستیں دی جاتی ہیں، تنخواہ کٹوانے کے لیے درخواست دینے کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تنخواہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ جو دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں، جن کے ذریعہ دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم، تقویٰ اور معرفت میں بہت اونچا مقام بخشا تھا۔ جس زمانے میں آپ دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث تھے اس وقت آپ کی تنخواہ ماہانہ دس روپے تھی۔ پھر جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور تجربہ بھی زیادہ ہو گیا تو اس وقت دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ حضرت والا کی تنخواہ بہت کم ہے جبکہ آپ کی عمر زیادہ ہو گئی ہے، ضروریات بھی زیادہ ہیں، مشاغل بھی زیادہ ہیں اس لیے تنخواہ بڑھانی چاہیے، چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اب آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ جب تنخواہ تقسیم ہوئی تو حضرت والا نے دیکھا کہ اب دس کے بجائے پندرہ روپے ملے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ یہ پندرہ روپے مجھے کیوں دیے

گئے؟لوگوں نے بتایا کہ مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی جائے۔ آپ نے وہ تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضرت! آپ نے میری تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی ہے حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، پہلے تو میں نشاط کے ساتھ دو تین گھنٹے سبق پڑھالیتا تھا اور اب تو میں کم پڑھاتا ہوں، وقت کم دیتا ہوں لہٰذا میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا جو اضافہ آپ حضرات نے کیا ہے یہ واپس لے لیا جائے اور میری تنخواہ اسی طرح دس روپے کر دی جائے۔

لوگوں نے آکر حضرت والا سے منت سماجت شروع کر دی کہ حضرت! آپ تو اپنے تقویٰ اور ورع کی وجہ سے اضافہ واپس کر رہے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کے لیے یہ مشکل ہو جائے گی کہ آپ کی وجہ سے اُن کی ترقیاں رُک جائیں گی لہٰذا آپ اس کو منظور کر لیں، مگر انہوں نے اپنے لیے اس کو گوارا نہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ یہ دنیا تو چند روز کی ہے خدا جانے آج ختم ہو جائے یا کل، لیکن یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے کہیں یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کے وقت شرمندگی کا سبب نہ بن جائے۔

آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے

آج سارا زور حقوق حاصل کرنے پر ہے۔ حقوق حاصل کرنے کے لیے جلسے ہو رہے ہیں، جلوس نکالے جا رہے ہیں، نعرے لگائے جا رہے ہیں اور اس بات پر احتجاج ہو رہا ہے کہ ہمیں ہمارا حق دو۔ ہر شخص یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق دو لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسروں کے حقوق جو مجھ پر عائد ہو رہے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ آج یہ مطالبہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، مجھے ترقی ملنی چاہیے، یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی چھٹیاں ملنی چاہئیں، مجھے اتنا الاؤنس ملنا چاہیے لیکن جو فرائض مجھے سونپے گئے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اس کی کوئی فکر نہیں۔

ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے

سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری یہ ذہنیت برقرار رہے گی کہ میں دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں اور مجھ سے کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے، میں اپنے فرائض سے غافل رہوں اور دوسروں سے

حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں۔ یاد رکھیں! اس وقت تک دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں ہوگا، حق ادا ہونے کا صرف ایک راستہ ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے، میرے ذمہ جو فریضہ ہے میں اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب اس بات کا احساس دل میں ہوگا تو پھر سب کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ اگر شوہر کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمہ بیوی کے جو حقوق ہیں، میں ان کو ادا کر دوں بس بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ بیوی کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے شوہر کے جو فرائض ہیں میں ان کو ادا کر دوں بس شوہر کا حق ادا ہو گیا، مزدور کے دل میں یہ احساس ہو کہ مالک کے میرے ذمے جو حقوق ہیں میں ان کو ادا کر دوں مالک کا حق ادا ہو گیا اور مالک کے دل میں یہ احساس ہو کہ مزدور کے میرے ذمے جو حقوق ہیں وہ میں ادا کر دوں، مزدور کا حق ادا ہو گیا۔

جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک حقوق کے مطالبے کے صرف نعرے ہی لگتے رہیں گے اور تحفظِ حقوق کی انجمنیں ہی قائم ہوتی رہیں گی اور جلسے جلوس نکلتے رہیں گے، لیکن اُس وقت تک کسی کا حق ادا نہ ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس کے حقوق کا جواب دینا ہے۔ بس دنیا میں امن وسکون کا یہی راستہ ہے، اور کوئی راستہ نہیں۔

یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے

لہٰذا یہ اوقات ہمارے پاس امانت ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۞ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۞ "ان لوگوں کے لیے درناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ جب دوسروں سے وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورا پورا وصول کرتے ہیں تاکہ ذرا بھی کمی نہ ہو جائے، لیکن جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو اس میں کم دیتے ہیں اور ڈنڈی مارتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی کوئی سودا بیچے اور اس میں ڈنڈی مار جائے حالانکہ علماء نے فرمایا: التطفیف فی کل شئ یعنی ناپ تول میں کمی ہر چیز میں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے اور وہ پورے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں دے رہا ہے وہ بھی ناپ تول میں کمی کر رہا ہے اور اس عذاب کا مستحق

ہو رہا ہے۔ اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

"منصب" اور "عہدہ" کی ذمہ داری کا پھندا

آج ہم پر یہ بلا جو مسلط ہے کہ اگر کسی کو سرکاری دفتر میں کوئی کام پڑ جائے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا کام آسانی سے نہیں ہوتا، بار بار دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ کبھی افسر صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کام نہیں ہو سکتا کل آنا، جب دوسرے دن پہنچتے ہیں تو اگلے روز آنے کا کہا جاتا ہے، چکر پر چکر لگوائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے فرض اور امانت کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی منصب ہے تو وہ کوئی منفعت نہیں ہے، وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ وہ ذمہ داری کا ایک پھندا ہے۔ حکومت، اقتدار، منصب، عہدہ؛ یہ سب ذمہ داری کے پھندے ہیں۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مر جائے تو مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال نہ ہو جائے کہ اے عمر! تیرے عہدِ خلافت میں فلاں کتا بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔ (اصلاحی خطبات: ۱۷۷/۳ تا ۱۸۹)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانتداری کے واقعات

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور عادلانہ صفات کی وجہ سے خلیفہ منتخب ہو گئے تو آپ نے ہر جگہ عادل اور امانت دار حکام کی تقرری کی۔ چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شعبۂ مالیات کا منتظم مقرر فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو محکمۂ قضا کا منصب سپرد کیا، لیکن نظم و نسق میں ہر جگہ عمال نے وہ عدل اختیار کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سال بھر میں دو اشخاص کا بھی جھگڑا نہ پہنچتا۔ امام بیہقیؒ کے الفاظ ہیں: فمكث عمر سنة لا ياتيه اثنان ولا يقضى بين اثنين "یعنی پورے سال میں حضرت عمر کے پاس دو اشخاص کا بھی دعویٰ نہ پہنچا اور دو اشخاص بھی کوئی شکایت لے کر نہ آئے"۔

فتوحاتِ عراق میں ایک قیمتی چادر حاصل ہوئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہلِ لشکر کے مشورہ سے اس چادر کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بطورِ تحفہ بھیجا اور لکھا کہ اسے آپ لے لیجیے، آپ کے لیے

روانہ کیا جارہا ہے۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے لینا گوارا نہیں فرمایا اور نہ اپنے رشتہ داروں کو دیا، بلکہ اہلِ شوریٰ سے مشورہ کرکے اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمادیا۔ اللہ اللہ قومی چیزوں کے کیسے امانت دار تھے اور خود کو ایسی چیزوں سے کس قدر دور رکھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امانتداری

۱۔ حضرت حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ کہیں سے مال آیا تو ان کی صاحبزادی اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس کی اطلاع پہنچی۔ انہوں نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اس لیے اس مال میں آپ کے رشتہ داروں کا بھی حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: اے میری بیٹی! میرے رشتہ داروں کا حق میرے مال میں ہے اور یہ تو مسلمانوں کا مالِ غنیمت ہے، تم اپنے باپ کو دھوکہ دینا چاہتی ہو، جاؤ! تشریف لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کھڑی ہوئیں اور چادر کا دامن گھسیٹتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ (حیاۃ الصحابہ:۳۱۳)

۲۔ اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ:

حضرت حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑا کر چل رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ لڑکی کون ہے؟ تو (ان کے بیٹے) حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آپ کی بیٹی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ میری کونسی بیٹی ہے؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: یہ میری بیٹی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ اتنی کمزور کیوں ہے؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: آپ کی وجہ سے، کیونکہ آپ اسے کچھ نہیں دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے آدمی! اللہ کی قسم! میں تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں دھوکہ میں نہیں رکھنا چاہتا۔ (خود کما کر) تم اپنی اولاد پر خوب خرچ کرو (میں بیت المال میں سے نہیں دوں گا)۔

۳۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے گزارے کے قابل خوراک لیا کرتے تھے۔ گرمیوں میں ایک جوڑا پہنتے۔ بعض دفعہ ان کی لنگی پھٹ جاتی تو اسے پیوند لگالیتے، لیکن (نیا جوڑا لینے کا) وقت آنے سے پہلے اس کی جگہ بیت المال سے اور لنگی نہ لیتے، اسی سے کام

چلاتے رہتے، اور جس سال مال زیادہ آتا اس سال ان کا جوڑا پچھلے سال سے اور گھٹیا ہو جاتا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے ان سے اس بارے میں بات کی تو فرمایا: میں مسلمانوں کے مال میں سے پہننے کے جوڑے لیتا ہوں اور یہ میری ضرورت کے لیے کافی ہیں۔ حضرت محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے اہل وعیال کے لیے دو درہم خرچہ لیا کرتے تھے۔

۴۔ حضرت مالک بن اوس بن حدثان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس روم کے بادشاہ کا قاصد آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ایک دینار ادھار لے کر عطر خریدا اور شیشیوں میں ڈال کر وہ عطر اس قاصد کے ہاتھ روم کے بادشاہ کی بیوی کو ہدیہ میں بھیج دیا۔ جب یہ قاصد بادشاہ کی بیوی کے پاس پہنچا اور اسے وہ عطر دیا تو اس نے وہ شیشیاں خالی کر کے جواہرات سے بھر دیں اور قاصد سے کہا: جاؤ! یہ حضرت عمر بن خطاب کی بیوی کو دے آؤ۔ جب یہ شیشیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کے پاس پہنچیں تو انہوں نے شیشیوں سے وہ جواہرات نکال کر ایک بچھونے پر رکھ دیے۔ اتنے میں حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ گھر آگئے اور انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ ان کی بیوی نے ان کو سارا قصہ سنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ تمام جواہرات لے کر بیچ دیے اور ان کی قیمت میں سے صرف ایک دینار اپنی بیوی کو دیا اور باقی ساری رقم مسلمانوں کے لیے بیت المال میں جمع کرا دی۔

یہ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ یہ ان کے امیر المؤمنین ہونے کی حیثیت سے مل گئی ہے اور امیر المؤمنین ہونے کی حیثیت سے اب اس میں تمام مسلمانوں کا حصہ ہے۔

۵۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے کچھ اونٹ خریدے اور ان کو بیت المال کی چراگاہ میں چھوڑ آیا۔ جب وہ خوب موٹے ہو گئے تو میں انہیں (بیچنے کے لیے بازار) لے آیا۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بازار تشریف لے آئے اور انہیں موٹے موٹے اونٹ نظر آئے تو انہوں پوچھا: یہ اونٹ کس کے ہیں؟ لوگوں نے انہیں بتایا کہ یہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہیں۔ تو فرمانے لگے: اے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما! واہ واہ! امیر المؤمنین کے بیٹے کے کیا کہنے۔ میں دوڑتا ہوا آیا اور میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ اونٹ کیسے ہیں؟ میں نے عرض کیا: میں نے یہ اونٹ خریدے تھے اور بیت المال کی چراگاہ میں چرنے کے لیے بھیجے تھے۔ (اب میں ان کو بازار لے آیا ہوں)

تاکہ میں دوسرے مسلمانوں کی طرح انہیں بیچ کر نفع حاصل کروں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت المال کی چراگاہ میں لوگ ایک دوسرے کو کہتے ہوں گے، امیر المؤمنین کے بیٹے کے اونٹوں کو چراؤ اور امیر المؤمنین کے بیٹے کے اونٹوں کو پانی پلاؤ (میرے بیٹے ہونے کی وجہ سے تمہارے اونٹوں کی زیادہ رعایت کی ہوگی، اس لیے) اے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ! ان اونٹوں کو بیچو اور تم نے جتنی رقم میں خریدے تھے وہ تو تم لے لو اور باقی زائد رقم مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرادو۔

ان واقعات سے ایک مؤمن یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امانتداری بھی، عدل بھی اور عظیم تقویٰ واحتیاط بھی ثابت ہوئی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معاملات اور حقوق کے بارے میں ایک مؤمن کس قدر چوکنا ہوتا ہے۔ آخری دونوں واقعات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھانپ لیا کہ ان کی اہلیہ اور بیٹے کو یہ فائدے اس لیے نہیں ملے کہ ان کا تعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات سے ہے، بلکہ صرف اس لیے ملے ہیں کہ ان کا تعلق امیر المؤمنین سے ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس منصب جس میں تمام مسلمان شریک ہیں، لہٰذا اس منصب کی وجہ سے حاصل ہونے والے فائدوں میں سب مسلمان شریک ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تحصیل دار کی آمد پر بیت المال کے غلہ سے ان کے کھانے کے لیے کچھ کھجوریں پیش فرمائیں۔ انہوں نے کھانا شروع کیا اور کہا: امیر المؤمنین! آپ بھی کھائیے، آپ نے انکار فرمادیا تو انہوں نے کہا: ہم تو بیت المال کے جانوروں کا دودھ پیتے ہیں، کسی پر سوار ہوتے ہیں، کسی کا گوشت کھاتے ہیں۔ فرمایا: میں تمہارے مانند نہیں ہوں، تم لوگ وصولی صدقات میں محنت کرتے ہو، ان جانوروں کی دم کے ساتھ رہتے ہو، تم ان کے دودھ اور سواری وغیرہ سے فائدہ اٹھاؤ تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن میں بیٹھے بٹھائے کیا حق رکھتا ہوں۔

سبحان اللہ! خلافتِ راشدہ کے حاملین کیسے امانتدار اور کیسے قدسی الصفات لوگ تھے۔

ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے۔ طبیب نے شہد کے استعمال کا مشورہ دیا۔ خلیفہ کے گھر اس قدر رقم نہیں تھی کہ شہد خرید کر وقتِ ضرورت کے لیے محفوظ رکھتے۔ بیت المال میں شہد کا کپا بھرا پڑا تھا مگر بلا اجازت استعمال کی جرأت کہاں تھی۔ خدا کا خوف تھا۔ چنانچہ باہر تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ بات پیش آئی ہے، اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں بیت

المال کے شہد سے تھوڑا سا لے کر استعمال کروں ورنہ بلا اجازت وہ مجھ پر حرام ہے۔لوگوں نے ایک زبان ہو کر اجازت دے دی۔

اب غور کیجیے کیسے عادل وخدا ترس ہمارے یہ خلفاء تھے کہ پورے بیت المال پر اقتدار اعلیٰ رکھتے ہوئے ذرا سا شہد برائے دوا استعمال کرنے کا حق بھی اپنے لیے نہیں سمجھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دیانت وامانت پر اس پہلو سے بھی غور کیجیے کہ وہ معمولی کپڑے کے دو جوڑے عام مسلمانوں کی طرح بیت المال سے لیتے تھے۔ جب پھٹ جاتے تو اس پر پیوند لگاتے چلے جاتے۔ خطبۂ جمعہ ہو یا فتح شام کا سفر، ہمیشہ ایسے ہی بارہ چودہ پیوند والے کپڑوں میں دیکھے گئے۔ حضرت انس وحضرت ابو عثمان نہدی رضی اللہ عنہما وغیرہ کی روایت ہے کہ وہ بحالتِ خلافت جمعہ کے دن بھی منبر پر جن کپڑوں میں دیکھے گئے ان میں کبھی بارہ کبھی چودہ پیوند شمار کیے گئے۔

اس تذکرہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ امانت ودیانت کے کتنے بلند مقام پر تھے ورنہ وہ بھی بیت المال کی رقم سے کم سے کم اتنا تو ضرور لیتے جو انہیں ایک متوسط درجہ کی آسودہ حال زندگی سے بہرہ ور کر سکتا مگر وہ تو آنے والوں کے لیے نظیر بننا چاہتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (جس زمانہ میں خلیفۃ المسلمین تھے) اپنا کچھ سرمایہ تجارتی قافلہ میں شام کی طرف بھیجنا چاہا تو چار ہزار درہم بطورِ قرض حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے طلب فرمائے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے قاصد کو جواب دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ دو کہ بیت المال سے قرض لے لیں۔ جب یہ پیغام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچا تو انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ ایک دن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ بیت المال سے میں نے قرض اس لیے نہیں لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرض ادا کرنے سے پہلے میں مر جاؤں اور میرے امیر المؤمنین ہونے کی رعایت میں لوگ مجھ سے مطالبہ نہ کریں، تو یہ امانت میرے ذمہ باقی رہ جائے اور قیامت میں میری گرفت ہو، اس لیے تم سے طلب کیا تھا کہ اگر میں مر گیا تو تم میرے ورثا سے مطالبہ کر کے وصول کرو گے اور میرا معاملہ صاف ہو جائے گا۔

ایک بار سخت گرمیوں کے زمانے میں بیت المال کے دو اونٹ بھاگ نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہ

نفس نفیس ان کی تلاش میں نکلے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مقامِ عالیہ میں اپنے مکان میں تھے۔ دور سے دیکھا کہ ایک آدمی سخت گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ دل میں کہنے لگے: کیا حرج ہوتا اگر یہ شخص مدینہ سے ٹھنڈے وقت میں نکلتا۔ قریب آنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہچانا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آواز دے کر بلایا کہ ایسی گرمی اور لُو میں، جب کہ دروازے سے قدم نکالنا مشکل ہے، آپ کیوں نکل کھڑے ہوئے؟۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صدقات کے اونٹ بھاگ نکلے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کو چراگاہ میں پہنچا آؤں، ایسا نہ ہو کہ وہ ضائع ہو جائیں تو خدا مجھ سے اس کی بابت سوال کرے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: آیئے ٹھنڈا پانی پیجیے اور سایہ میں آرام کیجیے۔ میں سب انتظام اپنے غلاموں کے ذریعہ کرائے دیتا ہوں۔ فرمایا: آپ کو یہ سایہ مبارک ہو۔ بیت المال کے املاک کی نگہداشت میرے ذمہ ہے، یہ کام میں خود کروں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا: من احب ان ینظر الی القوی الامین فلینظر الی ھذا "یعنی جو شخص کسی قوی امین کو دیکھنا چاہے وہ عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے"۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے بعد والے خلفاء کا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر بیت المال سے ایک بکری کا بچہ بھی گم ہو جائے گا تو عمر رضی اللہ عنہ سے روزِ محشر میں مواخذہ ہو گا۔

عدی بن حاتم لکھتے ہیں کہ میں ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا دیکھا کہ بنی طے کے لوگوں کو دو دو ہزار تقسیم کر رہے ہیں اور میں قبیلہ طے کا نامور و معزز فرد تھا، مگر میری طرف انہوں نے کوئی التفات نہ کیا۔ میں آپ کے سامنے آیا تو آپ نے چہرہ پھیر لیا۔ میں پھر دوسرے رُخ پر قریب آکر بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے چہرہ پھیر لیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے کہا: "امیر المؤمنین! کیا آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں؟" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی زور سے ہنسنے لگے حتیٰ کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو بولے: "میں تم کو خوب پہچانتا ہوں، تمہارا ایمان، تمہاری وفاداری اور تمہاری اسلامی خدمات کو بھی خوب جانتا ہوں۔ انما فرضت لقوم اجحفت بھم الفاقۃ وھم سادۃ عشائرھم: "لیکن یہ وظیفہ صرف ان شرفاء وسادات قوم کے لیے مخصوص ہے جن کا چہرہ فاقہ سے پژمردہ ہو گیا ہے۔"

(ایام خلافت راشدہ: ۱۹۴ تا ۱۹۵)

حضرت سالم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ اگر اونٹ کی دُبر میں بھی کوئی زخم ہو جاتا تو اپنا ہاتھ ڈال کر اُس کا زخم خود صاف کرتے اور اس کی دوا کرتے اور فرماتے: انی لخائف ان اسئال عمابك "یعنی مجھے خطرہ ہے کہ تیری تکلیف کے بارے میں مجھ سے مواخذہ ہو گا"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرینِ اولین کا چار چار ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا اور اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کا ساڑھے تین ہزار۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ جب ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی مہاجرینِ اولین میں سے ہیں تو پھر ان کا وظیفہ چار ہزار سے کیوں کم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہوں نے تو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دیانت وامانت کی انتہا دیکھیے کہ انہوں نے اپنے صاحبزادہ کو مہاجرین اولین کے برابر اس لیے نہیں دیا کہ ان کو ان لوگوں کی طرح نہیں سمجھا جنہوں نے خود ہجرت کی بلکہ ان کی ہجرت کو اپنی ہجرت کے تابع سمجھا۔ اگر دیانتداری وامانت پسندی کا اس قدر عظیم جذبہ نہ ہوتا تو ایسی دقت نظری وباریک بینی کی نوبت نہ آتی اور اپنے اہل وعیال کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچاتے۔ سخت افسوس ہے کہ خود کو مسلمان کہلانے والے ہی کچھ بدنصیب وبدنیت لوگ ہیں جو اس سراپا دیانت و امانت ہستئ معظم کو برا بھلا کہتے ہیں۔ (ایام خلافت راشدہ:۵۹ تا ۶۳)

ایک بار مدینہ منورہ میں ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نمازِ فجر کے بعد لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے منع کر دیا تو اس نے کہا کہ آپ مجھ کو وعظ ونصیحت جیسے سرتا پا خیر کام سے منع کرتے ہیں۔ فرمایا: میں تجھے اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ تیرے متعلق مجھے شبہ ہے کہ تو وعظ کہنے کے بعد پھول کر کُپا ہو جائے گا اور ثریا کو چھو لینے کی کوشش کرے گا۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو وعظ سے اس لیے روک دیا کہ اس میں وعظ کے ذریعے جاہ طلبی اور شہرت طلبی کا مادہ فاسد آپ نے محسوس کیا، اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص دین کے معاملہ میں اخلاص وتقویٰ کے لحاظ سے نااہل تھا۔ (ایام خلافت راشدہ:۲۸۳ تا ۲۸۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عادل ومنصف اور رعایا کا محافظ وامین شخص پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے۔ حدیث شریف کے بموجب آپ نے عہدوں کو قومی امانت سمجھ کر صرف ان لوگوں کے سپرد کیا جن

کی دیانت، امانت اور صلاحیتِ کار پر آپ کو کامل وثوق ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حکومت کے عمال وعہدہ داران میں چار طرح کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ قوت کے ہوتے ہوئے نرم دلی۔

۲۔ سخت مزاجی کے بغیر اصولی سخت گیری۔۔

۳۔ خرچ میں احتیاط واعتدال لیکن بخل نہ ہو۔

۴۔ سخاوت لیکن اسراف نہ ہو۔

مطلب یہ کہ قوت اور کامل اقتدار ہوتے ہوئے نرم دلی کا مظاہرہ کریں اور اصول و قواعد کی اگرچہ سخت پابندی ہو لیکن سخت مزاجی کا ظہور نہ ہو، خرچ میں ممکن کفایت واحتیاط مد نظر رکھیں لیکن ایسا نہ ہو کہ بخیلی کے قریب ہو جائے۔ اسی طرح لوگوں کی معاونت ومساعدت میں طبیعت کو سخا پیشہ رکھیں مگر اس طرح نہیں کہ مسرف وفضول خرچ بن جائیں۔ (ایام خلافت راشدہ:۲۸۶)

ایک اور واقعہ سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امانت ودیانت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ اس واقعہ کی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں جلولاء کی جنگ (جلولاء کی جنگ ۱۶ھ میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ہوئی ۱۲ ہزار فوج حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے جلولاء کے محاذ پر بھیجی گئی جس کے سالار لشکر قعقاع بن عمرو تھے۔ ایرانی فوج مہران کی سرکردگی میں تقریباً ۵۰ ہزار تھی، کئی مقابلے ہوئے مسلمانوں نے نقصان بھی اٹھایا مگر بالاخر کامیاب وہی ہوئے۔ ایران کے بقیہ سپاہی حلوان کی طرف بھاگ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حسب الحکم قعقاع نے فارسیوں کی سرحد سواد تک ان کا پیچھا کیا اور حلوان پر معمولی جنگ کے بعد قبضہ جمایا۔ تاریخ طبری :۱۷۹/۴) میں شریک تھا۔ وہاں میں نے چالیس ہزار میں مال غنیمت کی بکریاں خرید لیں۔ جب میں واپس آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو طلب فرمایا اور پوچھا کہ اگر میں آگ میں ڈال دیا جاؤں اور تم سے کہا جائے کہ اپنے باپ کو فدیہ دے کر چھڑا لو تو کیا تم مجھے اس سزا سے چھڑاؤ گے؟ سعادت مند بیٹے نے جواب دیا: واللہ ما من شئ یوذیك الا كنت منقذك منه یعنی "خدا کی قسم! میں آپ کو ہر ایذا دینے والی

چیز سے چھڑانے کے لیے اپنے جان ومال کا فدیہ دوں گا"۔

یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جلولاء سے جو بکریاں خرید کر لائے ہو وہ تمہیں خاص طور پر رعایت سے دی گئی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے دیکھا کہ تم معزز صحابی اور امیر المؤمنین کے صاحبزادے ہو اس لیے تم کو سستی دے دی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ میری حیثیت ایک امیر مسؤل اور ذمہ دار کی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان بکریوں کو از سرِ نو نیلام کراؤں اور تم کو اس سلسلہ میں وہ نفع دے دوں جو قریش کے دوسرے تاجروں نے جلولاء کے مالِ غنیمت میں اٹھایا ہو۔ اس کے بعد چار لاکھ درہم نیلام سے حاصل ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو اصل لاگت کے واپس کر دیے اور چالیس ہزار منافع دیا کیونکہ قریشی تاجروں کو دوگنا منافع حاصل ہوا تھا۔ باقی تین لاکھ بیس ہزار کی رقم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حوالے کی اور حکم دیا کہ اس رقم کو جنگ جلولاء میں شرکت کرنے والے تمام مجاہدین میں تقسیم کر دیں۔

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سلوک اپنے اس محبوب ترین صاحبزادے کے ساتھ تھا جس کے متعلق وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر اولاد اور مال میرے پاس ہے سب پر میں اِنّا للہ پڑھنے کے لیے تیار ہوں البتہ صرف عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے لیے چاہتا ہوں کہ وہ میرے بعد بھی زندہ رہیں "سیرت عمر:۱۲۸")۔

اس واقعہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امانت پسندی اور دیانت داری کا ایک اعلیٰ معیار سامنے آتا ہے جو آج کی جدید دنیا کے لیے ایک آئیڈیل اور نمونہ بننے کے لائق ہے۔

ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیت المال میں جھاڑو دے رہے تھے۔ اتفاقاً ایک درہم پڑا مل گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک چھوٹے سے بچے کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچے کے ہاتھ میں درہم دیکھ کر پوچھا: من این لك هذا "یہ تم کو کہاں سے ملا؟" بچے نے جواب دیا: "مجھے ابو موسیٰ نے دیا ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درہم بچے کے ہاتھ سے لے لیا اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس بیت المال میں آئے اور غضبناک ہو کر فرمایا: اردت ان لا یبقی احد من امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم الا طالبا بمظلمة فی هذا الدرهم یعنی "تم نے چاہا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کا ایک ایک فرد اس درہم کے معاملہ میں مجھ سے اپنا حق طلب کرے"۔ یہ کہہ کر اس درہم کو

بیت المال میں ڈال دیا۔

ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی عاتکہ کے لیے قیمتی کپڑے کا ایک ٹکڑا ایک گز بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو پوچھا: یہ کپڑا تمہیں کہاں سے ملا؟ جواب دیا: میرے لیے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ہدیہ بھیجا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو لے کر ان کے سر پر اس زور سے مارا کہ ان کا سر دُکھنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے سوال کیا: ''تمہیں میری عورت کے پاس ہدیہ بھیجنے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟'' یہ کہہ کر ان کے کپڑے کو ان کے سر پر دے مارا اور فرمایا خذھا فلا حاجۃ لنا فیھا یعنی ''اس کو لے لو، ہمیں ایسی چیزوں کی حاجت نہیں''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حکام کے فرائض و اعمال کا احتساب فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک راستہ سے گزر رہے تھے۔ کسی نے پکار کر کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کا کام دفعات کے مرتب کر دینے اور اصول دے دینے پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ بھی آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ دیکھیں کہ آپ کے شرائط و ضوابط پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں، عیاض بن غنم حاکمِ مصر نے دروازہ پر دربان مقرر کیا اور پہرہ بٹھا دیا ہے، اہلِ حاجت ان کے پاس بے تکلف نہیں پہنچ پاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ کو تحقیقات کے لیے مصر بھیجا اور شکایت کا ازالہ فرما دیا۔ (ایام خلافت راشدہ:۲۸۷)

خلفائے راشدین کی امانت پسندی کا یہ عالم تھا کہ کسی عامل کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے کہ اس کے اثر سے عامل کہیں غلط فائدہ نہ اٹھائے جبکہ آج تو ایسے ہی عمال و حکام مقرر کیے جاتے ہیں جو افسرانِ اعلیٰ کو خوب تحائف اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نذرانے وہ رعایا پر ظلم کر کے ہی حاصل کریں گے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

(ایام خلافت راشدہ:۶۴تا۶۶)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امانت داری

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر فرمایا: لا استحل اموال المسلمين لنفسي ولا لاحد من الناس ولقد كنت اعطي العطية الكبيرة من صلب مالي. یعنی ''مسلمانوں کے بیت المال سے

کسی مال کو نہ تو اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں نہ کسی عزیز و اقارب کے لیے جس کسی کو بھی میں نے کوئی بڑا عطیہ دیا ہے وہ اپنی ذاتی رقم ہی سے دیا ہے"۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت عالی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (امیر شام) نے لکھا کہ مجھے حالات خراب معلوم ہوتے ہیں، میں شام سے چار ہزار سواروں کا ایک دستہ آپ کی حفاظت کے لیے آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: میں ان کا خرچ کہاں سے پورا کروں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیت المال سے ان کو خرچ دے دیجیے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: کیا میں اپنی ذات کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے بیت المال سے چار ہزار لشکریوں کا خرچ گوارہ کرلوں؟ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے خلفاء کے مدِ نظر نازک ترین حالات میں بھی صرف عوام کا فائدہ ہوتا تھا اور بیت المال میں بچت اور وسعت کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس سے ملک کے عوام اور رعایا زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔ (ایام خلافت راشدہ:۲۵۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امانت داری

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بیت المال کے مالک اور امیر مطلق تھے اس وقت اُن کا حال یہ تھا کہ ایک بار برسر منبر مجمع عام میں فرمانے لگے: من یشتری منی سیفی ھذا فلو کان عندی ثمن ازار ما بعتہ یعنی "یہ تلوار مجھ سے کون خریدے گا، اگر میرے پاس ایک تہبند خریدنے کی بھی قیمت ہوتی تو میں اسے فروخت نہ کرتا"۔ ایک شخص نے کہا: آپ تلوار فروخت نہ کریں، ہم آپ کو قرض دے دیں گے، اس سے آپ تہبند خریدلیں۔ امام عبدالرزاق فرماتے ہیں کانت بیدہ الدنیا الا ما کان من الشام یعنی "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ملک شام کے علاوہ" (جس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قابض تھے) باقی ایک بڑی دنیا ان کے ہاتھ میں تھی مگر قصرِ خلافت میں بیٹھ کر بیت المال سے ایسی ضرورتوں کو نہیں نکالا کرتے تھے۔

ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دربارِ خلافت میں ان کے پاس کسی ضرورت سے آیا۔ دیکھا کہ آپ ایک چھوٹے سے مکان میں فروکش ہیں اور ایک پرانی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ جاڑے کا موسم تھا،

راوی کا بیان ہے ویرعد فیھا "یعنی جاڑے کی شدت سے کانپ رہے تھے"۔ اس نے کہا: آپ بیت المال سے بقدرِ ضرورت کیوں نہیں لے لیتے، اس قدر سختی کیوں برداشت کرتے ہیں؟۔ فرمایا: یہ سادی اور پرانی چادر گھر سے لایا ہوں۔ مجھے اپنی ضرورت کے لیے بیت المال میں اس کے بقدر بھی نقصان پہنچانا گوارا نہیں ہے۔

اس واقعہ سے ان کی دیانت داری اور امانت پسندی کا حال صاف ظاہر ہے۔

(کتاب الاموال:۲۷۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ایک روز بیت المال میں بہت سا شہد آیا جو مٹکوں میں بھرا ہوا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت آپ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے یہاں چند مہمان آئے اور روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے شہد کی ضرورت پڑی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے غلام قنبر سے کہا کہ ایک مشک کھول کر تھوڑا سا شہد لاؤ۔ جب شہد تقسیم ہونے لگے تو میرے حصہ سے اتنا وزن کر کے لے لینا۔ قنبر نے اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا اور تھوڑا سا شہد وزن کر کے دے دیا۔

تھوڑی دیر میں امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہد تقسیم کرنے کے لیے مشکیں منگوائیں۔ ایک مشک میں کچھ شہد کم معلوم ہوا۔ آپ نے قنبر سے وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا: صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے، انہوں نے تھوڑا سا شہد اس شرط پر منگوالیا تھا کہ جب تقسیم ہونے لگے تو ان کے حصہ سے اتنا شہد لے لیا جائے۔ یہ سن کر امیر المؤمنین نہایت خفا ہوئے۔ آپ نے حکم دیا کہ حسن رضی اللہ عنہ فوراً حاضر کیے جائیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اظہار خفگی کرتے ہوئے پوچھا: تمہیں بیت المال کی چیز لینے کی جرأت کیسے ہوئی؟ حضرت حسن نے عرض کیا کہ جرأت تو نہ ہوتی مگر صرف اس خیال سے کہ شہد میں میرا بھی حصہ ہے، تھوڑا سا اس شرط پر منگوالیا تھا کہ تقسیم کے وقت اتنا واپس کر دوں گا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا کہ ہاں! یہ صحیح ہے کہ شہد میں تمہارا بھی حق ہے مگر تقسیم ہونے سے قبل تمہیں اپنا حصہ لینے کا کیا حق تھا؟ اس سوال پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ امیر المؤمنین نے فوراً شہد لانے کا حکم دیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فوراً شہد لا کر بیت المال میں داخل کر دیا اور مہمانوں کو شہد کھانا نصیب نہ ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جب کسی عامل کے متعلق شکایت ملتی یا بیت المال میں خیانت کی اطلاع پہنچتی تو اس کی برطرفی کا رقعہ لکھتے اور دوسرا عامل وہاں بحال کر دیتے اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر فرماتے: اللّٰھم انك تعلم انی لم امرھم بظلم خلقك...... یعنی ”خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے ان کو رعایا پر ظلم کرنے اور بیت المال کے حق میں نقصان کا حکم نہیں دیا تھا....“۔ اسی طرح بعض عمال کے پاس عبرت آموز خط لکھ کر ان کو معزول کرتے۔ ایک تحریر ملاحظہ ہو: رویداقد بلغت المدی بالمحل الذی یتمنی لامضیع التوبة والظالم المرجعة.: ٹھہرو! اب تم اس حد تک پہنچ گئے ہو اور اس مقام پر آ گئے ہو جہاں زیاں کار توبہ کی آرزو کرتا ہے اور جہاں ظالم رجوع کی خواہش کرتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اصفہان سے کچھ مالِ غنیمت آیا۔ مستحقین میں اس کے حصے تقسیم کیے گئے تو اس میں ایک عمدہ روغنی روٹی بھی نکلی، اس کے بھی ٹکڑے کیے اور برابر برابر سب کے حصوں پر رکھ دیا۔ نہ خود لیا، نہ اپنے اقربا کو دیا، نہ کسی کے حصہ میں کم و بیش کیا۔

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں موتیوں کا ایک ہار آیا اور بیت المال میں داخل کر لیا گیا۔ اس کی خبر آپ کی صاحبزادی کو ہوئی۔ صاحبزادی نے عید سے ایک روز قبل بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ کل عید ہے تمام عورتیں اچھے اچھے لباس اور زیور سے آراستہ ہوں گی، میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے، بیت المال میں جو موتیوں کا ہار آیا ہے تم یہ مجھے دو تاکہ میں عید کے موقع پر اسے پہن لوں۔ اس کے بعد نہایت احتیاط سے واپس کر دوں گی۔ بیت المال کے افسر نے جواب دیا کہ میں صرف تین دن کے لیے یہ ہار دے سکتا ہوں۔ صاحبزادی راضی ہو گئیں اور تین دن کے وعدہ پر افسر نے بھیج دیا۔ عید کے دن اس ہار کو پہنا۔ اتفاقاً اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ گئی۔ آپ نے اسے فوراً پہچان لیا اور دریافت کیا کہ ہار تمہیں کہاں سے ملا ہے؟ صاحبزادی نے عرض کیا کہ یہ ہار بیت المال کا ہے، بیت المال کے افسر سے تین دن کے لیے لیا ہے، کل واپس کر دوں گی۔ یہ سنتے ہی امیر المؤمنین نے بیت المال کے افسر کو طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تم مسلمانوں کی امانت میں خیانت کرتے ہو؟ افسر نے کہا: خدا کی پناہ! میں اور مسلمانوں کی امانت میں خیانت کروں، یہ کیونکر ممکن ہے؟ میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔

امیر المؤمنین نے کہا: تم نے بغیر میری اجازت کے موتیوں کا ہار میری بیٹی کو کیوں دیا؟ افسر نے کہا کہ چونکہ صاحبزادی نے طلب فرمایا تھا اور وہ بھی صرف تین دن کے لیے، اس لیے دے دیا ورنہ ہرگز نہ دیتا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: تم نے غلطی کی، تمہیں مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ایسا کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ فوراً ہار لے کر بیت المال میں داخل کرو۔ میں اپنی لڑکی سے سخت ناراض ہوں، اگر اس نے تین دن کے وعدے پر نہ لیا ہوتا تو میں چوری کے جرم میں ماخوذ کر کے اس کو سخت سزا دیتا۔ بیت المال کے افسر نے اسی وقت صاحبزادی سے ہار طلب کیا۔ صاحبزادی امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئیں، عاریت کے طور پر دن بھر کی اجازت چاہی۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: بیٹی! کیا تم اپنے نفس کی خاطر انصاف کا خون کرنا چاہتی ہو؟ کیا تمام مسلمانوں کی لڑکیاں آج زیور سے آراستہ ہوں گی؟ صاحبزادی خاموش ہو گئیں اور ہار بیت المال کے افسر کو واپس کر دیا۔ عید کے دن بھی بطورِ عاریت ان کے پاس نہ رہنے دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیت المال کا مال سب لوگوں میں برابر تقسیم کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کچھ زیادہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا: انما المال مال اللہ وانما اعطاء المال فی غیر حقه تبذیر واسراف یعنی "یہ مال اللہ کا مال ہے، کسی کو بلا حق کے زیادہ دے دینا اسراف و تبذیر ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں"۔ (نہج البلاغۃ: ۲/۱۰)

خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی امانت داری

اسی طرح خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی دیانتداری کی بابت صاحب طبقات نے لکھا ہے کہ رات میں حکومت کا کام کرتے تو حکومت کی شمع استعمال کرتے اور اگر اس وقت کسی ذاتی ضرورت کے لیے لکھنا ہوتا تو اپنا ذاتی شمع دان جلا کر اس کی روشنی میں لکھتے۔ بیت المال کے چراغ سے کبھی ایک حرف بھی اپنے ذاتی کام کے لیے نہیں لکھا۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز: ۱۴۴)

شاہی خزانہ میں معائنہ کے وقت مشک کا ڈبہ کھولا گیا۔ آپ نے معائنہ تو فرمالیا لیکن ناک کو فوراً بند کر لیا۔ کسی نے کہا: حضرت یہ کیا ہے؟ فرمایا: معائنہ آنکھوں سے ہوتا ہے لیکن میں نے ناک اس لیے بند کر لیا ہے کہ مجھے عام مسلمانوں سے زیادہ خوشبو سونگھنے کا حق ہی کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت! یہ تصرف کہاں ہوا؟ اس کی خوشبو ناک میں خود بخود آجاتی ہے۔ فرمایا: مشک میں بجز خوشبو کے اور ہوتا ہی کیا

ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ مشک کے خواص و منافع اور اس کے استعمال کے اثرات و فوائد ہی مشک کو ایک بڑی قیمت کی چیز بناتے ہیں لیکن اس کا استعمال تو کجا معائنہ کے وقت اس کی خوشبو کا ناک میں آجانا بیت المال میں تصرف نظر آیا اور انہوں نے اس سے بچنے کے لیے اپنی ناک بند کرلی۔ ان کی امانت و دیانت ہر توصیف سے بے نیاز ہے۔

ایک دفعہ آپ کے سامنے عنبر معائنہ کے لیے لایا گیا۔ اسے ہاتھ سے چھو کر ٹٹولا، پھر اس کو فروخت کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اپنے ہاتھ کو ناک پر رکھا تو خوشبو آرہی تھی۔ فوراً پانی منگوا کر اچھی طرح ہاتھ کو اتنا دھویا کہ خوشبو نکل گئی۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز:۴۴)

امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ بیت المال میں بہت سے سیب آئے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فوراً مسلمانوں میں تقسیم کرنے بیٹھ گئے۔ آپ کا چھوٹا بچہ پاس کھڑا تھا۔ اٹھا کر کھانے لگا۔ آپ نے دیکھا تو اس کے منہ سے چھین لیا اور ڈانٹ کر ہٹا دیا۔ وہ روتا ہوا ماں کے پاس پہنچا۔ بیٹے نے اپنی خواہش اور باپ کی سختی بیان کی۔ یہ ماں (فاطمہ) جو خلیفہ کی پوتی، خلیفہ کی بیٹی، خلیفہ کی بہن، خلیفۂ وقت کی بیوی تھیں، سخت بے چین ہوگئی۔ بے چینی کسی اور بات کے لیے نہیں صرف اس لیے تھی کہ سیب خریدنے کے لیے گرہ میں دام نہیں تھے۔ بیٹے کے آنسو پونچھے۔ کسی نہ کسی طرح اسے دلاسا دے کر چپ کیا۔ بھاگی دوڑی، کہیں سے کچھ درہم لے کر بازار سے سیب منگوایا۔ اپنے ہاتھوں سے بیٹے کو کھلایا۔ اتنے میں امیر المؤمنین تشریف لے آئے۔ سیب کی خوشبو محسوس کی تو پوچھا: فاطمہ! کوئی سیب بیت المال کا تو یہاں نہیں آگیا؟ بیوی نے سارا واقعہ سنایا، ایک ایک لفظ میں مامتا کا دکھ بھرا تھا۔ یہ سن کر آپ نے بیوی سے کہا: خدا کی قسم! سیب میں نے بچہ کے منہ سے نہیں بلکہ اپنے دل سے چھینا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ تم اور ہم مسلمانوں کے آگے شرمندہ نہیں ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے پاس بہترین پھل تازہ کھجوروں کی تھیلیاں بطورِ تحفہ امیر اُردن کی طرف سے آئیں۔ پوچھا: یہ تحفہ کس ذریعہ سے یہاں تک پہنچا؟ بتایا گیا کہ سرکاری ڈاک کے گھوڑے یہاں آرہے تھے، بس اُن پر یہ بھی لایا گیا۔ فرمایا: سرکاری ڈاک کے گھوڑے تو بیت المال کے

ہیں، ان سے سب لوگوں کا تعلق ہے لہٰذا اِن پھلوں کو بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کرو اور اس رقم سے ڈاک کے گھوڑوں کو دانہ چارہ دو۔

اس واقعہ سے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی غایت درجہ کی دیانت داری اور امانت پسندی کا معاملہ اظہر من الشمس ہے۔ (ایام خلافتِ راشدہ:۷۱ تا ۷۷)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے ایک دوست بلکہ یار غار عنبہ بن سعید تھے۔ ان کو سلیمان بن عبد الملک نے اپنے عہدِ خلافت میں بیس ہزار دینار کے عطیہ کا فرمان دیا تھا۔ خزانہ شاہی سے قبضہ نہیں کر سکے تھے کہ خلیفہ کا انتقال ہوا اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے۔ اب بغیر نئے فرمان کے خزانچی روپیہ نہیں دے سکتا تھا اس لیے عنبہ بن سعید نے یہ سمجھ کر کہ وہ تو میرے دوست ہیں ابھی ان سے دستخط لے لیتا ہوں، جب ان کے پاس پہنچے اور عرض حال کیا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: بیس ہزار اشرفی تو چار ہزار مسلمانوں کے لیے کافی ہو سکتا ہے، میں ایسی زیادتی نہیں کر سکتا۔ آخر میں معذرت کر دی واللہ مالی الی ذلک من سبیل یعنی ''خدا کی قسم! میرے لیے اس میں کچھ گنجائش نہیں ہے''۔ اس کے بعد آپ کے دوست نے کہا کہ امیر المؤمنین! تو پھر آپ بڑی بڑی جاگیروں پر کیوں قابض ہیں؟ فرمایا: عزیزِ من! تم نے بطورِ طعنہ کہا ہے، لیکن یہ تمہارا احسان ہے کہ میں اُمورِ خلافت میں مشغول ہو کر جس چیز سے غافل تھا تم نے اسے یاد دلا دیا۔ فوراً غلام کو پکارا اور کہا: میرا بکس لے آؤ۔ اس میں خاندان عبد العزیز یا عمر بن عبد العزیز کے نام سے سابق خلیفہ کی طرف سے جتنے جاگیروں کے فرمان تھے، سب کو باہر نکالا اور ایک ایک کر کے دوست کے سامنے چاک کر دیا اور فرمایا: یہ سب جاگیریں اب بیت المال کی ہیں۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اپنے بچوں کو نہ کچھ جاگیر دی نہ کچھ رقم عنایت فرمائی بلکہ بیت المال کو جوڑ جوڑ کر صرف اس لیے منظم کیا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ عوام مستفید ہوں۔ آپ کے انتقال کے وقت جب آپ کے اعزہ نے کہا: انك لتترك ولدك عالة على الناس فاوص بهم لم تمولهم شيئا ولم تعطهم یعنی ''آپ کے بچوں کی عیال داری کون کرے گا کیوں کہ ان کو آپ نے کچھ مال دیا اور نہ کوئی عطیہ جاگیر وغیرہ دیا ہے، تو ان کے بارے میں کچھ وصیت فرماتے

جائیے "۔ فرمایا: ان ولدی لهم اللّٰہ الذی نزّل الکتاب وھو یتولی الصالحین یعنی "میرے بچوں کا والی اور محافظ اللہ ہے جو صلحائے اُمت کا ہمیشہ سے والی و محافظ ہے"۔ (ایام خلافت راشدہ: ۱۱۰ تا ۱۱۱)

مدینہ کے گورنر ابو بکر بن حزم نے لکھا کہ مجھ سے پہلے جو امراء مدینہ کے حاکم ہوتے تھے ان کو شمع دان کا خرچہ ملتا تھا، جسے وہ اپنے آنے جانے میں استعمال کرتے، لہٰذا مجھے بھی یہ خرچ ملنا چاہیے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب دیا کہ اس مسرفانہ رویہ سے بچ کر چلو، بہت ضروری ہو تو اپنے گھر کی بتی روشن کر لو۔ (ایام خلافت راشدہ: ۲۶۰)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے پہلے خلفائے بنی اُمیّہ سرکاری کاموں کے لیے کاغذ کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ ذرا سی بات کے لیے موٹے قلم کا استعمال ہوتا تھا اور سطروں میں زیادہ فاصلہ ڈال کر خوب پھیلا کر کاغذ پر لکھا جاتا تھا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو عمال کو حکم بھیجا کہ آئندہ باریک قلم سے لکھا جائے اور سطروں کو باریک رکھا جائے، صرف چند جملوں میں اصل ضرورت واضح کی جائے اور تمام مطالب کو ایک ہی تحریر میں لکھا جائے۔ ہر ضرورت کے لیے الگ الگ مراسلات نہ لکھے جائیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کاغذات و رجسٹر اور دفاتر میں مسلمانوں کے بیت المال کی رقم ضائع ہو۔

ظاہر ہے کہ نستعلیق اور موٹے قلم کے استعمال میں اور ہر ضرورت کے لیے الگ الگ مراسلات کی روانگی میں کس طرح کا اسراف ہو رہا تھا، اس لیے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے حکم دیا کہ کئی ضرورتوں کو ایک ہی مراسلہ میں لکھا جائے اور باریک قلم اور باریک حروف سے کام لیں تاکہ کاغذ کے اسراف پر خزانہ کی جو رقم اٹھنے والی ہے وہ بچ جائے اور یہ بچت مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ کام آئے۔

(ایام خلافت راشدہ: ۲۶۰)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں عادل و منصف اور متدین حکام جابجا متعین تھے۔ اس کے باوجود آپ کی طرف سے یہ اعلان عام رہتا تھا من ظلمه عامل فلیس علیه منی اذن فلیاتنی یعنی "جس کسی شخص پر ہمارے کسی عامل نے ظلم کیا تو اس کو چاہیے کہ میرے پاس دادرسی کے لیے آئے کیونکہ میں نے کسی عامل کو ظلم کی اجازت نہیں دی ہے"۔ (ایام خلافت راشدہ: ۲۹۱)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آپ نے عہدہ خلافت سنبھالتے ہی اپنی بیوی سے فرمایا کہ تمہارے جو زریں کپڑے مرصع بہ جواہر ہیں ان کو تمہارے والد عبد الملک نے بیت المال کی رقم سے بنوایا ہے، اسی طرح تمہارا عروسی کپڑا جو ایک لاکھ اشرفی میں تیار ہوا ہے وہ بیت المال کا ہے، یہ اس لیے اگر تم مجھے پسند کرتی ہو تو یہ کپڑا بیت المال میں جائے گا، الفاظ یہ ہیں: ان اخترتنی فانی اخذالثوب واجعله فی بیت المال۔ ان کی مؤمنہ بیوی نے جواب دیا: لاحاجة لی بالثوب یعنی "مجھے ایسے کپڑے کی پرواہ نہیں"۔ اس طرح ان کا کپڑا بھی بیت المال میں داخل ہو گیا۔

اسی طرح علامہ شعرانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وکانت زوجته فاطمة بنت عبدالملك كذالك وضعت جميع مالها فی بيت المال فصارت كاحاد الناس. موتی، یاقوت اور مرصع زیورات وزریں کپڑے لاکھوں کی مالیت کے تھے، لیکن اس مؤمنہ، صالحہ خاتون نے ان سب کو بیت المال کے حوالے کر دیا اور عوام الناس کی طرح زندگی گزار دی۔

بیت المال کی طرف سے مسلمانوں کے لیے گرم غسل خانوں کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ ایک دن آپ کے لیے اسی غسل خانہ سے پانی گرم کر کے لایا گیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ بیت المال کے حمام سے پانی گرم کیا گیا ہے تو اس کے بدلے میں بیت المال میں درہم داخل کیے، تب اس پانی کو استعمال فرمایا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بیت المال کی چیزوں کو اپنی ذاتی ضروریات میں استعمال کرنا کس قدر ناگوار خاطر تھا۔

ایک بار قرآن کریم کی تلاوت کے لیے آپ نے ایک رحل کی فرمائش کی۔ کسی نے عمدہ لکڑی کی ایک رحل بنوا کر آپ کے سامنے پیش کر دی۔ آپ نے پتا لگوایا تو معلوم ہوا کہ لکڑی بیت المال کی تھی۔ فوراً بازار میں اس کی قیمت لگوائی۔ نصف دینار اس کا دام ٹھہرا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر نصف دینار کے بجائے ہم ایک دینار دے دیں تو کیا بیت المال کی لکڑی کا معاوضہ ہو جائے گا؟ اس نے کہا: حضرت نصف دینار ہی کم نہیں ہے۔ فرمایا: میرا نفس مطمئن نہیں ہے، کچھ لکڑی چھیلی گئی ہو گی تب رحل تیار ہوئی ہو گی، تو اس کا بھی تو دام دینا ہے، اچھا لو یہ دو دینار میری طرف سے بیت المال میں داخل کر دو۔

(ایام خلافت راشدہ: ۲۷۲ تا ۲۷۳)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی امانتداری

امام صاحب کی تجارت بہت وسیع تھی، لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے۔ بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا۔ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبّہ بھی ان کے خزانے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ حفص بن عبدالرحمن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے خریدار کو بتادینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا۔ تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو اس عیب کی اطلاع نہ دی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو انہیں نہایت افسوس ہوا اور تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔

ایک دن ایک عورت خز کا تھان لے کر آئی کہ فروخت کرا دیجیے۔ امام صاحب نے دام پوچھے۔ اس نے سو(۱۰۰) روپیہ بتائے۔ فرمایا: کم ہیں۔ اس نے کہا: تو دوسو(۲۰۰) روپے۔ فرمایا: یہ تھان پانچ سو(۵۰۰) روپے سے کم قیمت کا نہیں۔ اس نے متعجب ہو کر کہا کہ آپ شاید مذاق کرتے ہیں۔ امام صاحب نے پانچ سو روپے اپنے پاس سے دے دیے اور وہ تھان رکھ لیے۔

اس احتیاط اور دیانت نے ان کے کارخانے کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی چمکا دیا۔

(سیرۃ النعمان:۸۸)

قصہ دو ایمان داروں کا

رسول پاک ﷺ نے دو ایمانداروں کا قصہ بیان فرمایا۔ایک نے دوسرے سے زمین خریدی۔ خریدار کو بعد میں زمین سے ایک مٹکا ملا جس میں سونا تھا۔ اس نے زمین فروخت کرنے والے کے سامنے سونے سے بھرا ہوا مٹکا رکھتے ہوئے کہا کہ اپنا سونا لے لیجیے، میں نے آپ سے زمین خریدی تھی یہ سونا نہیں۔ دوسرا آدمی جو دولت ایمان سے مالا مال تھا گویا ہوا: میں نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: بعد ازاں وہ دونوں ایک تیسرے آدمی کے پاس بغرض فیصلہ گئے۔ اس نے ان سے پوچھا: تم صاحب اولاد ہو؟ ایک نے جواب دیا: میرا ایک لڑکا ہے۔ دوسرا بولا: میری ایک لڑکی ہے۔ فیصلہ کرنے والے نے کہا: دونوں کا آپس میں نکاح کر دو اور اس

سونے کو مصرف میں لاؤ، پھر جو بچ رہے اسے صدقہ کر دینا۔ اس طرح دنیا کے سامنے یہ عجیب منظر آیا کہ سونے کا ڈھیر سامنے تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کا طلب گار نہ تھا۔ ہر ایک اس سے بچنا چاہتا تھا اور ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ یہ تیرا ہے، حالانکہ ایسے مواقع پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ میرا ہے صرف میرا۔

......☆......☆......☆......

انفاق کا بیان

انفاق کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت، توانائی اور کمائی میں سے اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کیا جائے۔ دعوتِ حق، نفاذِ حق اور جماعتی زندگی کے لیے بھی انفاق فی سبیل اللہ کا ہونا ناگزیر ہے۔ جس جماعت (یا شخص) کے اندر انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ نہ ہو وہ جماعت نہ تو دعوتِ حق اور نفاذِ حق کے فرائض سر انجام دے سکتی ہے، نہ حقیقی معنوں میں جماعتِ حقہ بن سکتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کر سکتی ہے۔ اس لیے ضروری سمجھا کہ اس کتاب میں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت اور بخل کی مذمت کو بھی سامنے لایا جائے۔

مختلف انداز میں بار بار ذکر ہو چکا کہ دینِ اسلام کی عملی بنیادیں صرف دو ہیں: ایک نماز و ذکر۔ دوسری اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال و دولت صلاحیتوں اور قوتوں میں سے مخلوقِ الٰہی کی نفع رسانی کے لیے خرچ کرنا۔

جذبۂ رحم کا تعلق اگرچہ انسان کے دل سے ہے، لیکن اس کا پھل اور لازمی نتیجہ مخلوق کی عملی طور پر خدمت اور انفاق یعنی اپنے مال و جان کو مخلوق کی نفع رسانی کے لیے استعمال کرنا ہے۔

تزکیۂ نفس میں انفاق کا کردار

تزکیۂ نفس اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگنا نبوت کا اصل مقصد ہے جس کا پورا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس تزکیہ کے بنیادی ارکان دو ہیں:

نماز و ذکر: ان سے اللہ تعالیٰ کے خوف، محبت اور تعلق میں اضافہ اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔

دوسرا انفاق: یعنی اپنے مال و دولت، اپنی طاقت و قوت میں سے اللہ تعالیٰ کی خاطر خرچ کرنا یا یوں کہیے کہ انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مالی و جانی خدمت کرنا: اس کے ذریعے دنیا پرستی اور دنیوی اسباب کی محبت کھرچتی رہتی ہے ۔ اور انسان میں بیماریاں بھی دو ہی قسم کی پائی جاتی ہیں۔ ایک نفسانی خواہشات اور نفسانی بیماریاں، دوسری دنیوی مال و اسباب کی حرص و لالچ۔ پہلی قسم کی بیماریوں کا علاج نماز و ذکر اور عبادات سے ہوتا ہے اور دوسری قسم کی بیماریوں کا علاج انفاق یعنی مخلوق کی مالی و جانی خدمت

کرنے میں ہے۔جب ان دونوں بنیادوں پر سچائی کے ساتھ عمل ہوتا ہے تو انسان کا دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و عدل وغیرہ جیسی صفات میں رنگ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت میں فلاح پا جاتا ہے اور کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔

اسلام عام رحم دلی کی تعلیم دیتا ہے

اسلام نے عام رحم دلی کی تعلیم دی ہے۔ قرآن و حدیث نے اس بات کی پوری وضاحت کی ہے کہ اسلام سلامتی اور رحم و مہربانی کا دین ہے۔ دینِ اسلام کی تمام تعلیمات و احکامات پر نظر ڈالیں تو یہی معلوم ہو گا کہ اس کا ہر حکم، ہر تعلیم رحم و عدل پر مبنی ہے اور رحم و مہربانی کے یہ احکامات نہ صرف تمام انسانوں بلکہ بے زبان جانوروں کے لیے بھی ہیں۔ اگر کوئی ایمان کے ساتھ کتے سے بھی مہربانی کا سلوک کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور جو کوئی کسی جانور پر بھی ظلم کرے گا تو وہ اس کی پاداش میں سزا پائے گا۔ یہاں قرآن و حدیث کے مجموعے میں سے صرف چند آیات و احادیث کو پیش کیا جاتا ہے۔

انفاق اور قرآنی آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین اور فلاح پانے والوں کے اوصاف میں ان کی بڑی نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ "اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱)

۲۔ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو حکم فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ "اے ایمان والو! خرچ کرو ان چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہے، نہ دوستی ہے اور نہ سفارش۔ اور جو آخرت کے منکر ہیں، وہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں"۔

(سورۃ البقرہ: آیت ۲۵۴)

انفاق اور خرچ کرنے سے مراد اپنے آپ کو اور اپنے مال و دولت کو دین کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے وہ تم پر گراں نہ

گزرے۔ وہ تم سے وہی چیز مانگ رہا ہے جو اس نے تم کو بخشی ہے۔ پھر یہ بات نہیں کہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے سب کا مطالبہ کر رہا ہے بلکہ وہ اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ پھر یہ مطالبہ خود تمہارے لیے ہی نفع بخش ہے کہ تمہیں اس دن کام آئے گا جس دن نہ خرید و فروخت کام آئے گی، نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی بے جا سفارش۔ وہاں اگر کوئی چیز کام آسکتی ہے تو وہ صرف نیکی ہے جو دنیا میں کی گئی ہو۔ اس کے سوا آخرت میں کوئی اور چیز کام آنے والی نہیں ہے۔ اور جو لوگ آخرت کے معاملہ کو آسان سمجھتے ہیں اور باطل سفارشوں کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں، ایسے لوگ کل کے ادھار کے لیے آج کے نقد کو قربان نہیں کرسکتے، اور یہ منکرینِ آخرت اپنے گمان میں اپنے آپ کو نفع پہنچا رہے ہیں، لیکن در حقیقت یہ اپنی جانوں پر سب سے زیادہ بڑھ کر ظلم کرنے والے ہیں۔

سچی وفاداری اور سچی نیکوکاری

۳۔ اللہ تعالیٰ ایک جگہ انفاق کے بارے میں ذکر فرماتے ہیں کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۞ "تم ہرگز نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو، اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے (وہ تم کو اس چیز کا پورا پورا اجر و ثواب دے گا)"۔

(سورۃ آلِ عمران: آیت ۹۲)

اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ وفاداری کی ایک کسوٹی ہے، اس کے ذریعے لوگوں کی وفاداریاں پرکھی جاسکتی ہیں۔ جو لوگ اپنی محبوب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی خاطر قربان کرسکتے ہیں انہی پر نیکیوں کے راستے کھولے جاتے ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور وفادار بنتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی محبوب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لیے تیار نہیں وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ یاد رکھیں! جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کی راہ پر قربان نہ کرسکے در اصل وہی چیز اس کا بُت ہے، جب تک وہ اس کو نہ توڑے، اُس وقت تک نیکی کے دروازے اس پر بند رہتے ہیں۔

سچی بندگی کرنے والا لوگوں کے حقوق حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے

سچی بندگی کرنے والا لوگوں کے حقوق کو حسن وخوبی سے ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا‌ ؕ وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَـارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۙ ۝ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ وَيَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَيَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ۝

”اور اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو، اور کسی چیز کو (کسی طرح بھی) اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، اور اچھا سلوک کرو والدین کے ساتھ، اور رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ، اور اپنے غلاموں (خادموں اور ماتحتوں) کے ساتھ۔ (اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کرتے ہیں، حقوق العباد کا پورا لحاظ رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں، اور جو لوگ حسن سلوک نہیں کرتے اور ادائے حقوق سے غافل ہیں، دراصل یہی لوگ مغرور و متکبر ہیں اور) بے شک اللہ تعالیٰ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں (اور بخل سکھاتے ہیں)۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں (دراصل یہی لوگ سخت ناشکرے اور منکر ہیں) اور ہم نے ایسے کافروں (اور ناشکروں) کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے“۔ (سورۃ النساء: آیت ۳۶ تا ۳۷)

ان آیات میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کے بعد بندوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور ان کو اس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے:

۱۔ والدین کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔

۲۔ قرابت داروں، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔

۳۔ یتیموں، بے کسوں، بے سہارا لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔

۴۔ اس پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک، جو قرابت دار بھی ہے۔

۵۔ اس پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک، جو قرابت دار اور رشتہ دار نہیں ہے۔

۶۔ ہر اس شخص کے ساتھ حسنِ سلوک، جس سے وقتی طور پر سفر یا حضر میں واسطہ پڑتا ہے اور وہ ساتھی و ہم نشین بن جاتا ہے، یا ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا ہوتا ہے۔

۷۔ اس مسافر کے ساتھ حسنِ سلوک، جس کے پاس زادِ راہ کی کمی ہو، یا اس کو کوئی ضرورت پیش آئی ہو، یا کسی طرح وہ مدد کا محتاج ہو۔

۸۔ غلاموں، خادموں اور ماتحت لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک۔

حسنِ سلوک صرف اچھی اور میٹھی میٹھی باتوں کا نام نہیں، بلکہ اس سے مراد بندوں کی جانی و مالی امداد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت اور اپنے بازوؤں کی قوت کو اُن کی خدمت میں لگا دے اور اُن پر خرچ کر دے۔ بندوں کے درجہ بدرجہ حقوق کے بعد فرمایا کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرًا یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ ادائے حقوق اور حسنِ سلوک میں کوتاہی کرتے ہیں، دراصل وہ انانیت، بڑائی اور تکبر کے مرض میں مبتلا ہیں ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے بچ نہیں سکیں گے۔ اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ جو لوگ حقوق کو ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے سچائی کے ساتھ جھکنے والے ہیں، اور یہی لوگ حقیقی معنوں میں تواضع، انکساری اور سچائی کے ساتھ بندگی کرنے والے ہیں اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔

ادائے حقوق میں کوتاہی کا سبب

یاد رکھیں! جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال و دولت، اس کی دی ہوئی عقل، علم و ہنر اور قوت سے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کی مخلوق پر خرچ نہیں کرتا تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال

وجان، عقل، علم و قوت اور کمائی اپنی عقل کا کرشمہ سمجھتا ہے، اگرچہ وہ بظاہر لاکھ بار اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے مال و جان کو منسوب کرتا ہے۔ لیکن اس کا جو رویہ ہے، وہ یہی بتاتا ہے کہ وہ اس کو اپنا کمال سمجھتا ہے، اور یہی انانیت کا بت بہت بڑا شرک ہے، ورنہ اگر اپنے مال و جان اور اپنی کمائی و قوت کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے تکبر و بخل میں مبتلا ہو، لیکن چونکہ وہ ان چیزوں کو اپنی عقل و قوت کا کرشمہ سمجھتا ہے، اس لیے وہ ان چیزوں کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ لہٰذا وہ تواضع، انکساری اور انفاق فی سبیل اللہ کے بجائے فخر و بخل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اترانے والوں کے اوصاف

دوسری آیت میں اترانے اور فخر کرنے والوں کی مزید چند خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

ا۔ وہ خود بخیل ہوتے ہیں (بخیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ بخل کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ بخیل شخص اپنے مال و اسباب اور کمائی عطیۂ خُداوندی سمجھنے کے بجائے خود اپنی تدبیر اور قوت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع اور شکر گزاری کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے)۔

۲۔ وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں، دوسروں کو بخل کا مشورہ دینا اور دوسروں کو بخل سکھانا یہ ہے کہ دوسرے لوگ ان کو دیکھ کر خود بھی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں اور دوسروں کے اندر بھی ادائے حقوق کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی دینے والے یا خدمت کرنے والے سے یہ کہا جائے کہ اسے اتنے زیادہ دینے کی کیا ضرورت ہے یا اتنی خدمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یا اس کو دوسروں کے حقوق مارنے کا طریقہ یا حیلہ سکھایا جائے۔ تیسرا یہ کہ ایسے بخل والے قوانین بنائے جائیں جن کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے راستے بند ہو جائیں۔ یہ سب بخل کے مشورے ہیں اور بخل سکھانے میں شامل ہیں۔ بخیل دوسروں کو اس لیے بخل کا مشورہ دیتا ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے اس کے بخل کا پردہ نہ اٹھ جائے۔

۳۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ یہ آیت بخیل مالداروں کے اندرون کو سامنے لاتی ہے کہ ایک طرف تو ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کمزور اور غریب

لوگوں پر ان کی ریاست اور امارت قائم رہے۔ دوسری طرف یہ کوشش کرتے ہیں کہ ادائے حقوق کے معاملہ میں سستی کرتے رہیں۔ اس کے لیے وہ یہ طریقہ نکالتے ہیں کہ ہر طالب اور محتاج کے سامنے اپنے وسیع اخراجات اور کاروبار میں نقصانات وغیرہ کا رونا روتے ہیں تاکہ لوگ سمجھ جائیں کہ اس قدر اخراجات اور ضروریات کے باوجود کس قدر سخی اور جود و کرم والا ہے کہ پھر بھی کچھ نہ کچھ دیتا ہے، حالانکہ یہ اس کا بخل، کتمانِ فضل اور تکبر ہوتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ذلیل کن عذاب دے گا۔

اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے والے پر نہ خوف ہوگا اور نہ غم

۵۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے والے پر نہ خوف ہوگا اور نہ غم چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۞ ”جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات دن، پوشیدہ اور کھلم کھلا، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر و ثواب ہے اور ان کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے“۔

(سورۃ البقرہ: آیت ۲۷۴)

دن رات، پوشیدہ اور کھلم کھلا میں جو مناسبت اور تقابل ہے اس سے سارے اوقات بھی احاطے میں آگئے اور حالتیں بھی اس میں جمع ہوگئیں۔ اور اس میں ایمان والوں کو جوش و خروش سے خرچ کرنے کی ترغیب ہے کہ دن رات، ہر وقت کھلے بندوں اور خاموشی سے ہر حالت میں اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کریں اور ایسے لوگ آخرت کی ہولناکیوں اور اس کے خوف و خطر اور غمگینیوں سے بھی محفوظ رہیں گے اور دنیا میں بھی انہیں اس کی ٹھنڈک اور سکون ملے گا۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کرنا چاہیے؟

۶۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کرنا چاہیے؟ اس سوال و جواب کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: وَیَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ”اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ تعالیٰ کی راہ اور اس کی خوشنودی کے لیے) کتنا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجیے جو ضرورت سے زیادہ ہو“۔

(سورۃ البقرہ: آیت ۲۱۹)

عفو المال کے معنی ہیں ضرورت سے زائد، وہ مال جو فاضل بچے۔ مطلب یہ کہ مال تو خرچ کرنے کے واسطے ہے، جتنی ضرورت اور حاجت ہو اس کے مطابق اپنے پاس رکھ کر باقی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خرچ کریں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر لازمی ہے، بلکہ یہ وہ خرچ ہے جس کا تعلق دینی جدوجہد، جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ اور ملت و دینِ اسلام کے تحفظ سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتائی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت پڑ جائے تو بیوی بچوں اور اہل و عیال کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب کچھ اس راہِ حق میں قربان کردو۔

اشتراکیت سے متاثرہ لوگوں کا جذبہ

جو لوگ اشتراکی نظریات سے بری طرح متاثر ہو چکے ہیں، وہ زکوٰۃ، مقدار و نصابِ زکوٰۃ اور میراث کے کھلے اور واضح احکامات و ہدایات کو نظر انداز کر کے اس لفظ "عفو" سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ناگزیر ضروریات سے بچی ہوئی آمدنی کو اسلامی حکومت کی تحویل میں لازماً دیا جائے گا اور ایک اسلامی حکومت فاضل آمدنی کو جبراً وصول کر سکتی ہے۔ حالانکہ آیتِ کریمہ میں غور و فکر کریں اور سوال و جواب کو دیکھیں تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں، بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادی رائے اور اخلاص سے اس حد تک قربانی کے لیے تیار رہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا تعلق عام حالات سے نہیں بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے کہ جب دین و ملت کے تحفظ کا سوال سامنے کھڑا ہو، ایسے حالات میں تو غیرت مند لوگ خود بخود ہی طرح طرح کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر ایسے حالات میں کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، مگر اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر خود انفاق کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی نیکی قبول ہوتی ہے جو خلوصِ نیت اور اختیار کی آزادی کے ساتھ ہو۔

کامل ایمان اور اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اخلاص اور اختیار کی آزادی کے ساتھ بقدرِ کفایت مال کو اپنے پاس روکے رکھیں اور باقی فاضل مال اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ اسی طرح کی ترغیب خود نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی موجود ہے جس کا بیان ان شاء اللہ آگے آرہا ہے۔

بخل آخرت میں طوق عذاب بنے گا

انسان کا بخل آخرت میں اس کے گلے کا طوقِ عذاب بنے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞ "اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل میں سے دی ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کے حق میں اچھا اور بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کرتے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے"۔ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۸۰)

لوگ اپنے مال کو اس لیے بچاتے ہیں اور گن گن کر رکھتے ہیں کہ اس طرح ان کا مال مستقبل میں ان کے کام آئے گا اور یہ لوگ ایسا کرنے کو بہت بڑا مفید کام جانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی مستقبل تو وہ ہے جو آخرت میں سامنے آنے والا ہے اور آخرت میں ایسا بچایا ہوا مال، جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق نظر انداز کیے گئے ہوں گے، ان کے لیے صرف وبال ثابت ہو گا۔ یہی سامان واسباب جو آج زینت اور فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں کل سانپوں اور اژدھوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آگ کے سخت زہریلے، گنجے سانپ ان کے گلے کا طوق بن جائیں گے اور وہ ان کو ان کے دونوں جبڑوں سے پکڑ کر اُن سے کہیں گے کہ میں تیرا مال ہوں اور میں تیرا خزانہ ہوں، اسی طرح وہ ان کو ابدی طور پر ڈستے رہیں گے۔ (دیکھیے بخاری: کتاب الزکوٰۃ)

آیت کے آخر میں اس صفت کو واضح فرمایا کہ آسمان وزمین کی ساری میراث اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور بالآخر سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے رہ جانے والا ہے اور یہ سب کچھ اس کی طرف پلٹ جانے والا

ہے۔ جس کو جو کچھ ملا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے اور مقصود اس سے امتحان ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت اور مال و دولت اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرتا ہے اس کو عظیم اجر و ثواب ملتا ہے اور جو اس میں دھاندلی کرتا ہے اور ان چیزوں کو بے جا خرچ کرتا ہے اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کسی کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی یا بدی، بخل یا سخاوت چھپ نہیں سکتی۔ ہر ایک کو اس کے ارادے اور عمل کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔

اس باب میں قرآن مجید کی مذکورہ چند آیات پر اکتفا کیا گیا ہے، ورنہ قرآن مجید میں انفاق اور باہمی ہمدردی کی اس قدر آیات ہیں کہ اگر ان تمام کو ان کے ترجمے کے ساتھ جمع کیا جائے تو ان سے ایک مستقل ضخیم کتاب بن جائے گی۔

انفاق اور احادیث الرسول ﷺ

قرآن مجید کی آیات کے بعد اب چند احادیث بھی پڑھ لیجیے۔

انفاق اور صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَازَادَاللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍاِلَّا عِزًّا وَمَاتَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّارَفَعَهُ اللّٰهُ "صدقہ دینا مال میں نقصان اور کمی نہیں کرتا، اور جو شخص کسی کی خطا کو قادر ہونے کے باوجود معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس (معاف کرنے والے) کی عزت بڑھاتا ہے، اور جو شخص محض اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اور انکساری اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے"۔ (مسلم)

حلال مال کا صدقہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَايَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّاالطَّيِّبَ وَاِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَابِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يُرَبِّيْهَالِصَاحِبِهٖ كَمَايُرَبِّيْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ "جو شخص کھجور برابر حلال کی کمائی میں سے خرچ کرے اور (یہ بات اچھی طرح جان لو کہ) اللہ تعالیٰ صرف حلال مال کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو

اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اس (کھجور برابر صدقہ) کو صدقہ دینے والے کے لیے اس طرح پالتا (اور بڑھاتا) ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچھڑا پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے"۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

کسبِ طیب سے مراد وہ مال ہے جو حلال ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ "فلو" کے معنی گھوڑی کا بچہ، بچھڑا یا اونٹنی کا وہ بچہ جو دودھ چھڑانے کے قابل ہو۔ عرب کے نزدیک گھوڑے اور اونٹ محبوب مال مویشی تھے، وہ ان کو بہت شوق و محبت سے پالتے تھے۔ اس حدیث میں ایک طرف صدقہ کی ترغیب ہے اور یہ کہ مقبول صدقہ کی مسلسل پرورش ہوتی ہے اور وہ بڑھتا رہتا ہے، دوسری طرف حلال کمائی کی ترغیب اور یہ کہ صدقہ وہی قبول ہوتا ہے جو حلال و پاک مال میں سے دیا جائے۔

مسکینوں کی ضروریات پورا کرنے کا حکم

۳۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ وَاَطْعِمُوا الطعام وَاَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجُنَّةَ بِسَلَامٍ "رحمن کی بندگی کرو (محتاجوں کو)، کھانا کھلاؤ اور سلام کو ظاہر کرو (اور اس کو پھیلاؤ)، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو گے"۔

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

رحمن کی بندگی کرو: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ رحمن کا بندہ مہربان ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم کی بندگی کرنے والا سخت بخیل ہو۔ اس کے بعد طعام کا ذکر ہے اور طعام اپنے وسیع معنی میں "مایحتاج الیہ" یعنی فقیر کی ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے۔ سلام کے اظہار اور تشہیر سے باہمی محبت اور الفت بڑھتی ہے اور یہ سلامتی کی دعا ہے۔ جس معاشرہ میں سلام ایک دوسرے کے لیے دعا ہو وہ معاشرہ بلاؤں، دشمنیوں اور باہمی عداوتوں سے محفوظ رہتا ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کریں، مخلوقِ الٰہی پر رحم کریں اور دعا و سلام کو ظاہر کریں اور پھیلائیں ان کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

صدقہ میں مصائب کا علاج اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيتَةَ السُّوءِ "صدقہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت

سے بچاتا ہے‘‘۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خرچ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں عافیت و سکون کے ساتھ رکھتا ہے اوراس سے بلاؤں کو دور فرماتا ہے، اور بُری موت سے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے والا موت کی بُری حالت سے محفوظ رہتاہے اوراس کا خاتمہ خیر اور ابدی سعادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے میں جلدی کرو کیونکہ بلا صدقے کو نہیں پھاند سکتی۔ (مشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ موت اور بیماری سے پہلے پہلے صدقہ کیا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے بلائیں و مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔

صدقہ کی برکت

حضرت قیس بن سلَع انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی کہ یہ بہت اسراف کرتا ہے اور اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں باغ میں سے اپنا حصہ لے لیتا ہوں اور اللہ کے راستہ میں بھی خرچ کرتا ہوں اور جو مجھ سے ملنے آتے ہیں ان کو بھی کھلاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر تین بار فرمایا کہ خرچ کیا کر، اللہ جل شانہ تجھ پر خرچ فرمائیں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں ایک سفر جہاد میں چلا تو میرے پاس سواری بھی اپنی تھی اور اپنے سب گھر والوں سے زیادہ ثروت مجھے حاصل تھی۔ (ترغیب)

یعنی جو لوگ بڑی احتیاط کے ساتھ خرچ کرتے تھے ان کے پاس اتنا نہ تھا جتنا مجھ بے دریغ خرچ کرنے والے کے پاس تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو قبل اس کے کہ تمہیں موت آجائے، اور نیک کاموں میں جلدی کرو اس سے پہلے کہ تم ادھر ادھر مشغول ہو جاؤ، اور اپنے اور اللہ جل شانہ کے درمیان تعلقات کو جوڑ لو اس کا ذکر کثرت سے کرکے، اور مخفی اور اعلانیہ صدقہ بہت کثرت سے دیا کرو کہ اس کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جائے گا، تمہاری مدد کی جائے گی، تمہارے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔ (ترغیب)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ صدقہ کے ذریعہ رزق پر مدد چاہو۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ صدقہ کے ذریعہ سے رزق اتارو۔ (کنز)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ صدقہ سے مال میں زیادتی ہوتی ہے۔ (کنز)

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ہیں، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ میں ان چیزوں پر قسم کھاتا ہوں۔ اول یہ کہ صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا، اس لیے خوب صدقہ کیا کرو۔ دوسرے یہ کہ جس بندہ پر کوئی ظلم کیا جائے اور وہ اس کو معاف کر دے تو حق تعالیٰ شانہ قیامت میں اس کی عزت بڑھاتے ہیں۔ تیسری چیز یہ کہ نہیں کھولتا کوئی بندہ سوال کے دروازہ کو مگر حق تعالیٰ شانہ اس پر فقر کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

(ترغیب)

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا، پس صدقہ کیا کرو۔ (دراول)

کم نہ ہونے کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس کا نعم البدل بہت جلد عطا فرماتے ہیں۔

حضرت حبیب عجمی رحمہ اللہ مشہور بزرگ ہیں۔ ان کی بیوی ایک مرتبہ آٹا گوندھ کر برابر کے گھر سے آگ لینے گئیں۔ پیچھے کوئی سائل آگیا۔ حضرت حبیب رحمہ اللہ نے وہ آٹا اس سائل کو دے دیا۔ یہ جب آگ لے کر آئیں تو آٹا ندارد۔ خاوند سے پوچھا: آٹا کیا ہوا۔ وہ کہنے لگے: وہ روٹی پکنے گیا ہے۔ ان کو یقین نہ آیا، اصرار کرنے لگیں۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تو میں نے صدقہ کر دیا۔ کہنے لگیں: سبحان اللہ! تم نے اتنا بھی خیال نہ کیا کہ اتنا ہی آٹا تھا، اب سب کیا کھائیں گے، آخر ہمارے لیے بھی تو کچھ چاہیے تھا۔ وہ یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ ایک آدمی بڑے پیالہ میں گوشت اور روٹیاں لے کر حاضر ہوا کہنے لگیں: کیسے جلدی پکا لائے اور سالن اضافہ میں ساتھ لائے۔ (روض)

اس قسم کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں مگر ہم چونکہ حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اس لیے غور بھی نہیں کرتے کہ یہ نعمت کس چیز کے بدلے میں ملی۔ ایسی چیزوں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ اتفاقاً فلاں چیز مل گئی ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا، حالانکہ وہ چیز خرچ کرنے کی وجہ سے ہی آئی ہوتی

ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عنه عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ بَیْنَمَا رَجُلٌ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ فَسَمِعَ صَوْتًا فِیْ سَحَابَةٍ اِسْقِ حَدِیْقَةَ فُلَانٍ فَتَنَحّٰی ذٰلِکَ السَّحَابُ فَاَفْرَغَ مَاءَہٗ فِیْ حَرَّةٍ فَاِذَا شَرْجَةٌ مِّنْ تِلْکَ الشِّرَاجِ قَدِ اسْتَوْعَبَتْ ذٰلِکَ الْمَاءَ کُلَّہٗ فَتَتَبَّعَ الْمَاءَ فَاِذَا رَجُلٌ قَائِمٌ فِیْ حَدِیْقَتِہٖ یُحَوِّلُ الْمَاءَ بِمِسْحَاتِہٖ فَقَالَ لَہٗ یَا عَبْدَ اللّٰہِ مَا اسْمُکَ قَالَ فُلَانٌ اَلْاِسْمَ الَّذِیْ سَمِعَ فِی السَّحَابَةِ فَقَالَ لَہٗ یَا عَبْدَ اللّٰہِ لِمَ تَسْاَلُنِیْ عَنْ اِسْمِیْ فَقَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ صَوْتًا فِی السَّحَابِ الَّذِیْ ھٰذَا مَاءُہٗ یَقُوْلُ اِسْقِ حَدِیْقَةَ فُلَانٍ لِاِسْمِکَ فَمَا تَصْنَعُ فِیْھَا قَالَ اَمَّا اِذَا قُلْتَ ھٰذَا فَاِنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مَا یَخْرُجُ مِنْھَا فَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثِہٖ وَاٰکُلُ اَنَا وَعِیَالِیْ ثُلُثًا وَاَرُدُّ فِیْھَا ثُلُثَہٗ

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص ایک جنگل میں تھا۔ اس نے ایک بادل میں سے یہ آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے۔ اس آواز کے بعد فوراً وہ بادل ایک طرف چلا اور ایک پتھریلی زمین میں خوب پانی برسا۔ وہ سارا پانی ایک نالے میں جمع ہو کر چلنے لگا۔ یہ شخص جس نے آواز سنی تھی اس پانی کے پیچھے چل دیا۔ وہ پانی ایک جگہ پہنچا جہاں ایک شخص کھڑا ہوا بیلچہ سے اپنے باغ میں پانی پھیر رہا تھا۔ اس نے باغ والے سے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل میں سے سنا تھا۔ پھر باغ والے نے اس سے پوچھا کہ تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا؟۔ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں، جس کا پانی یہ آرہا ہے، یہ آواز سنی تھی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے اور تمہارا نام بادل میں سنا تھا، تم اس باغ میں کیا کام ایسا کرتے ہو (جس کی وجہ سے بادل کو یہ حکم ہوا کہ اس کے باغ کو پانی دو)؟۔ باغ والے نے کہا کہ جب تم نے یہ سب کہا تو مجھے بھی کہنا پڑا“۔

میں، اس کے اندر جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کو دیکھتا ہوں (اور اس کے تین حصے کرتا ہوں) ایک حصہ یعنی تہائی تو فوراً اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی میں اور میرے اہل وعیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اسی باغ کی ضروریات میں لگا دیتا ہوں۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ)

ف: کس قدر برکت ہے اللہ کے نام پر صرف ایک تہائی آمدنی کے خرچ کرنے کی کہ پردۂ غیب سے

ان کے باغ کی پرورش کے سامان ہوتے ہیں اور کھلی مثال ہے اس مضمون کی جو پہلی حدیث میں گزرا کہ صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا کہ باغ کی ایک تہائی پیداوار صدقہ کی تھی اور تمام باغ کے دوبارہ پھل لانے کے انتظامات ہورہے ہیں۔

اس حدیث شریف سے ایک بہترین سبق اور بھی حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ آدمی کو اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لیے متعین کرلینا زیادہ مفید ہے۔ تجربہ بھی یہی ہے کہ اگر آدمی یہ طے کرلے کہ اتنی مقدار اللہ کے راستہ میں خرچ کرنی ہے تو پھر خیر کے مصارف اور خرچ کرنے کے مواقع بہت ملتے رہتے ہیں، اور اگر یہ خیال کرے کہ جب کوئی کارِ خیر ہوگا اس وقت دیکھا جائے گا تو اول تو کارِ خیر ایسی حالت میں بہت کم سمجھ میں آتے ہیں اور ہر موقع پر نفس اور شیطان یہی خیال دل میں ڈالتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری خرچ تو ہے نہیں، اور اگر کوئی بہت ہی اہم کام ایسا بھی ہو جس میں خرچ کرنا کھلی خیر ہے تو اکثر موجود نہیں ہوتا اور موجودگی میں بھی اپنی ضروریات سامنے آجاتی ہیں اور کم سے کم خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اگر مہینہ کے شروع ہی میں تنخواہ ملنے پر ایک حصہ علیحدہ کرکے رکھ دیا جائے یا روزانہ تجارت کی آمدنی میں سے صندوقچی کا ایک حصہ علیحدہ کرکے اس میں متعینہ مقدار ڈال دی جایا کرے کہ یہ صرف اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے تو پھر خرچ کے وقت تنگ دلی نہیں ہوتی کہ اس کو تو بہر حال وہ مقدار خرچ کرنا ہی ہے۔ بڑا مجرب نسخہ ہے، جس کا دل چاہے کچھ روز تجربہ کرکے دیکھ لے۔

ابو وائل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قریظہ کی طرف بھیجا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں وہاں جاکر وہی عمل اختیار کروں جو بنی اسرائیل کا ایک نیک مرد کرتا تھا کہ ایک تہائی صدقہ کردوں، ایک تہائی اس میں چھوڑدوں اور ایک تہائی ان کے پاس لے آؤں۔ (کنز)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس نسخہ پر عمل فرماتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِاِمْرَاَةٍ مُؤْمِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰی رَاْسِ رَكِیٍّ یَلْهَثُ كَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهٗ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ.

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک فاحشہ عورت (رنڈی) کی اتنی بات پر بخشش کردی گئی کہ وہ چلی

جارہی تھی، اس نے ایک کنویں پر دیکھا کہ ایک کتا کھڑا ہوا ہے جس کی زبان پیاس کی شدت کی وجہ سے باہر نکلی پڑی ہے اور وہ مرنے کو ہے۔ اس عورت نے اپنے پاؤں کا (چمڑہ کا) موزہ اتارا اور اس کو اپنی اوڑھنی میں باندھ کر کنویں میں سے پانی نکالا اور اس کتے کو پلایا۔ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا: کیا ہم لوگوں کو جانوروں کے صلہ میں بھی ثواب ملتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ہر جگر رکھنے والے (یعنی جاندار) پر احسان کرنے میں ثواب ہے (مسلمان ہو یا کافر، آدمی ہو یا جانور)۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ)

ف: یہ قصہ بنی اسرائیل کی ایک رنڈی کا ہے جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح ہے۔ (کنز)

بخاری شریف وغیرہ میں ایک اور قصہ اسی قسم کا ایک مرد کا بھی آیا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص جنگل میں چلا جارہا تھا۔ اس کو پیاس کی شدت نے بہت پریشان کیا۔ وہ ایک کنویں میں اترا اور جب پانی پی کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے بے تاب ہے اور پیاس کی شدت سے گارے میں منہ مار رہا ہے۔ اس شخص کو خیال ہوا کہ اس کو بھی پیاس کی وہی تکلیف ہو رہی ہے جو مجھے تھی۔ کوئی چیز پانی نکالنے کی تھی نہیں، اس لیے اپنے پاؤں کا موزہ نکالا اور دوبارہ کنویں میں اتر کر اس کو بھرا اور موزہ کو منہ سے پکڑ کر دونوں ہاتھوں کی مدد سے چڑھا اور وہ پانی اس کتے کو پلایا۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس کے اس کارنامہ کی قدر فرمائی اور اس شخص کی مغفرت فرمادی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جانوروں میں بھی اجر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر جگر رکھنے والے (یعنی جاندار) میں اجر ہے۔ (بخاری)

موزہ میں پانی بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ عرب میں چمڑے کے موزوں کا عام رواج ہے اور ان میں پانی بھرنے سے کم گرتا ہے اور منہ سے پکڑنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جنگل کے کنویں میں عام طور سے کچھ اینٹیں وغیرہ اس طرح باہر کو نکال دیتے ہیں کہ جن کی مدد سے آدمی اگر اس کے پاس ڈول رسی نہ ہو تو نیچے اتر سکتا ہے لیکن اترنے چڑھنے کے لیے ہاتھوں سے مدد لینے کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے، اس لیے موزہ کو منہ سے سنبھالنا پڑا۔

ان دونوں حدیثوں میں کتے جیسے ذلیل جانور پر احسان کرنے کا جب یہ بدلہ ہے تو آدمی جو اشرف المخلوقات ہے اس پر احسان کرنے کا کیا کچھ بدلہ ہوگا۔

بعض علما نے لکھا ہے کہ ایسے جانور جن کو مارنا مستحب ہے جیسے کہ سانپ، بچھو وغیرہ اس سے

مستثنیٰ ہیں، لیکن دوسرے اہلِ علم حضرات فرماتے ہیں کہ ان کے مارنے کے حکم کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ان کا پیاسا ہونا معلوم ہو جائے تو ان کو پانی نہ پلایا جائے، اس لیے کہ ہم مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ جس کو کسی وجہ سے قتل کیا جائے اس میں بہتری کی رعایت رکھی جائے۔ اسی وجہ سے جس کو قتل کرنا ضروری ہے اس کے بھی ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹنے کی ممانعت ہے۔ (فتح)

ان دونوں حدیثوں سے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث سے ایک لطیف چیز یہ بھی معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ شانہ کو کسی شخص کا کوئی ایک عمل بھی اگر پسند آجائے تو اس کی برکت سے عمر بھر کے گناہ بخش دیتے ہیں، اس کے لطف وکرم کے مقابلہ میں یہ کوئی بھی چیز نہیں ہے، البتہ قبول ہو جانے اور پسند آجانے کی بات ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر گناہ گار کے سارے گناہ پانی پلانے سے یا کسی ایک نیکی سے بخش دیے جائیں، ہاں کوئی چیز کسی کی قبول ہو جائے تو کوئی مانع نہیں۔ اس لیے آدمی کو نہایت اخلاص سے کوشش کرتے رہنا چاہیے اللہ جانے کون سا عمل وہاں پسند آجائے، پھر بیڑا پار ہے۔

بڑی چیز اخلاص ہے۔ یعنی خالص اللہ کے لیے کوئی کام کرنا، جس میں دنیا کی کوئی غرض شامل نہ ہو، نہ اس سے دنیا کمانا مقصود ہو، نہ شہرت ووجاہت مطلوب ہو۔ ان میں سے کوئی چیز شامل ہو جاتی ہے تو سارا کیا کرایا برباد کر دیتی ہے اور محض اُس (اللہ) کے لیے کوئی کام ہو تو معمولی سے معمولی کام بھی پہاڑوں سے وزن میں بڑھ جاتا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت کی کہ جب تجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو صدقہ کیا کر (احیاء) اس لیے کہ یہ گناہ کو دھوتا ہے اور اللہ جل شانہ کے غصہ کو دور کرتا ہے۔

صدقہ سے علاج کا واقعہ

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ بڑے درجے کے علماء میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میرے گھٹنے میں سات سال سے ایک پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ ہر طرح کا علاج کرا چکا ہوں، بہت سے اطباء سے بھی رجوع کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا: جاؤ! کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں پانی کی قلت ہو اور لوگ پانی کے ضرورت مند ہوں، وہاں جا کر ایک کنواں کھودو۔ مجھے امید ہے کہ وہاں کوئی پانی کا چشمہ جاری ہو گا تو تمہارا خون رک جائے گا۔ اس شخص نے ان کے کہنے پر

عمل کیا تو تندرست ہو گیا۔

یہ واقعہ علامہ منذری رحمہ اللہ نے امام بیہقی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اسے نقل کرنے کے بعد علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی جیسا ایک واقعہ ہمارے شیخ ابو عبد اللہ حاکم رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ان کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئی تھیں، بہت سے علاج کیے مگر پھنسیاں ختم نہیں ہوئیں۔ تقریباً سال بھر اس تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد وہ جمعہ کے دن امام ابو عثمان صابونی رحمہ اللہ کی مجلس میں پہنچے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ امام صابونی رحمہ اللہ نے ان کے لیے دعا کی، حاضرین نے آمین کہی۔

اگلے جمعہ کو ایک عورت نے امام صابونی رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک پرچہ بھجوایا۔ اس میں لکھا تھا کہ پچھلے جمعہ کو شیخ ابو عبد اللہ حاکم رحمہ اللہ کی دعائے صحت کے بعد میں گھر گئی۔ وہاں جا کر میں نے بھی ان کی صحت کے لیے بہت دعا کی۔ اسی رات مجھے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ابو عبد اللہ سے کہو کہ وہ مسلمانوں کے لیے وسعت کے ساتھ پانی پہنچانے کا انتظام کریں۔

شیخ حاکم کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک سبیل بنادی جس سے لوگ خوب پانی پیتے تھے۔ اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ شیخ پر شفا کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پھنسیاں ختم ہو گئیں اور چہرہ پہلے کی طرح صاف اور خوبصورت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال زندہ رہے۔

(الترغیب والترہیب للمنذریؒ: ۵۳ / ۲ تا ۵۴ فصل فی الصدقۃ والحث علیہا)

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات اور حقوق بھی ہیں

۵۔ آدمی اور اس کے مال و دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، چنانچہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ ثُمَّ تَلَا: ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ "مال و دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ اور حق بھی ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے ارشاد کی تائید میں) یہ پوری آیت تلاوت فرمائی کہ: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ.... اس حدیث شریف میں یہ بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے اور حق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا ذکر مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ

”نیکی (اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری) محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی اور وفاداری اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر (صدقِ دل سے) ایمان لائے، اپنے مال کو اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنوں (کے چھڑانے) پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے“۔

(البقرۃ: آیت ۱۷۷)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں وغیرہ پر مال خرچ کرنے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرنے کے بعد زکوٰۃ کو مستقل ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جس خرچ اور حسنِ سلوک کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ سچی وفاداری اور تقویٰ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ دن رات، پوشیدہ اور کھلم کھلا فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

خرچ کرنے والوں کے لیے فرشتوں کی دعائیں

۶۔ خرچ کرنے والوں کے لیے فرشتے دعائیں کرتے ہیں اور جو خرچ نہیں کرتے ان کے لیے فرشتے بددعائیں کرتے ہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَامِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا ”روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرشتہ تو یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ یہ بد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! روک کر رکھنے والے کا مال برباد فرما“۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے والوں کے لیے خاص انعام

۷۔ اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والوں پر دنیا میں بھی خاص انعام فرماتا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَنْفِقْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ

عَلَیْكَ ”اے اولادِ آدم! (میری راہ میں) اپنا مال خرچ کر میں تیرے اوپر خرچ کروں گا“۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

اس حدیث میں انفاق پر خاص انعام کا وعدہ ہے؛ وہ یہ کہ اس پر اللہ تعالیٰ خرچ کریں گے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس پر کس قدر انعامات کی بارش کرے گا یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مگر جو لوگ خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو خرچ کرتے ہیں وہ دنیا میں راحتِ قلبی، سکون اور ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں۔ صدقہ پر اس کے سوا دنیا و آخرت میں اور کوئی چیز نہ بھی ملے تب بھی یہ سکون اور لذت اس قدر عظیم نعمت ہے کہ اس کو پانے کی خاطر دنیا کی تمام چیزوں کو آسانی سے قربان کیا جاسکتا ہے۔

ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم

۸۔ حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ اَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَهٗ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰی كَفَافٍ وَابْدَءْ بِمَنْ تَعُوْلُ ”اے آدم کی اولاد! جو مال تمہاری ضرورت سے زائد ہو اسے (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے) خرچ کرنا تمہارے لیے (دنیاو آخرت کے لحاظ سے) بہتر ہے اور روکے رکھنا تمہارے لیے شر اور برا ہے۔ بقدرِ کفایت مال روکنے پر کوئی ملامت نہیں ہے اور (خرچ کے سلسلہ میں) اس سے ابتدا کرو جو تمہاری عیال میں ہے“۔

(مسلم، مشکوٰۃ)

حقیقت یہ ہے کہ ضرورت اور احتیاج سے جو مال زائد ہو وہ جمع کرنے کے واسطے نہیں۔ اس لیے بہترین بات یہی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں خرچ کیا جائے اور اس کو ابدُالآباد زندگی کے لیے محفوظ کیا جائے تاکہ وہ آخرت کی ضرورتوں اور حوائج کے لیے سرمایہ بنے۔ اس حدیث شریف میں دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ بقدرِ کفایت پر کوئی ملامت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر واقعی ضرورت اور احتیاج ہو کہ اس کے بغیر گزر بسر مشکل ہو، اس قدر روکنے پر کوئی الزام نہیں ہے۔ حدیث شریف میں تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ خرچ کرنے میں ان سے ابتدا کرو جن کی روزی تمہارے ذمے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی روزی تمہارے ذمہ ہے جیسے اہل وعیال ہوں یا دوسرے

لوگ حتیٰ کہ جانور بھی جن کے چارہ کھلانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے اُن پر خرچ کرنا دوسروں سے مقدم ہے۔

صدقہ ہر مسلمان پر لازم ہے

۹۔ سعید بن ابو بردہ اپنے باپ سے اور وہ سعید کے دادا یعنی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ فَقَالُوا يَانَبِيَّ اللّٰهِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَقَالَ يَعْمَلُ بِيَدِهٖ فَيَنْفَعُ نَفْسَهٗ وَيَتَصَدَّقُ قَالُوا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ قَالَ يُعِيْنُ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفِ قَالُوا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ قَالَ فَلْيَعْمَلْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلْيُمْسِكْ عَنِ الشَّرِّ فَاِنَّهَا لَهٗ صَدَقَةٌ

”ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے، تو (یہ حکم سن کر نادار) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جس کے پاس کوئی مال نہ ہو وہ کیا کرے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ہاتھ سے کام (اور محنت مزدوری) کر کے کمائے، اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں پر صدقہ بھی کرے۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ: جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو (کہ وہ محنت مزدوری کر سکے تو پھر کیا کرے؟) فرمایا: فریادی کی (کسی طرح بھی) مدد کرے۔ پھر عرض کیا: اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ تو فرمایا: وہ نیکی اور بھلائی کا کام کرے اور اپنے آپ کو برائی سے بچائے رکھے، یہی اس کا صدقہ ہے“۔ (بخاری: کتاب الزکوۃ)

(..... فَلْيَعْمَلْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلْيُمْسِكْ عَنِ الشَّرِّ....) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ خود بھلے کام کرے اور اپنے آپ کو بُری باتوں سے بچائے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ نیکیوں اور اچھے کاموں کی تلقین کرے اور بُرے کاموں سے لوگوں کو بچائے۔ بعض روایات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تصریح بھی آئی ہے، لیکن ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں اور یہ دونوں روایات قریب قریب ہیں، کیونکہ جو شخص نیکی کے وقت ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا ارادے و نیت کی حد تک ہو، تلقین نہ کرے اور برائی کے ارتکاب کو نہ روکے خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا دل سے تو ایسے شخص نے نیکی کا کام نہیں کیا اور نہ اس نے اپنے آپ کو شر سے بچایا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کا تزکیہ روحانی ترقی اور نجات کے لیے سخت ضروری ہے اور ہر انسان کو چاہیے کہ محنت مزدوری کر کے مال کمائے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ جو شخص محنت مزدوری کی طاقت نہ رکھے وہ کسی فریادی، حاجت مند کی کسی نہ کسی طرح مدد کرے۔ اگر اس سے بھی بالکل عاجز ہو چکا ہو تو کم از کم اتنا کرے کہ وہ ایسے نیک اور بھلے کام کرے (مثلاً نماز، ذکر) جو اس کی قدرت میں ہوں اور برائیوں مثلاً جھوٹ، غیبت اور گالی سے بچے، اور جس قدر اس سے ہو سکے لوگوں کو نیک کاموں کی تلقین کرے اور بُرے کاموں سے روکے رکھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی پر قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات نے ایسا اثر کیا تھا کہ وہ صدقہ دینے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر ڈالتے تھے۔ (دیکھیے بخاری: کتاب الزکوٰۃ: باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ...)

بخل، معاشرہ کے فساد، خونریزی اور تباہی کا سبب ہے

۱۰۔ جس طرح بخل کا مرض فرد کے اخلاق اور اس کے دل کے فساد اور بگاڑ کا سبب ہے اسی طرح جس قوم کے اندر بخل کا مرض پھیل جاتا ہے اس قوم کے اندر فساد اور خونریزی کی وبا بھی پھیل جاتی ہے۔ بخیل قوم کا آخری انجام دنیا میں بھی تباہی و بربادی ہے اور آخرت میں بھی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰى اَنْ سَفَكُوْا دِمَاءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ "ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن (ہولناک، دہشت ناک اور دردناک) اندھیروں کی شکل میں ہوگا (جن میں ظالم بھٹکتا پھرے گا) اور بخل سے بچو (کیونکہ) بخل نے ان لوگوں کو ہلاک (تباہ و برباد) کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ بخل ہی کی وجہ سے انہوں نے خونریزی کی اور حرام و ناجائز کاموں کو حلال اور جائز کرنا چاہا"۔ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

ظلم کا اصل مفہوم کسی چیز کو اس کی غیر مناسب جگہ استعمال کرنا ہے۔ اس میں تمام چھوٹے بڑے گناہ، بے انصافیاں، اور شرک و کفر داخل ہیں، اور "شُحّ" بخل کا اعلیٰ درجہ ہے۔ بخل بھی ظلم ہی کی

ایک قسم ہے، یہاں ظلم سے بچنے کا عام حکم فرماتے ہوئے ظلم کی ایک بہت بڑی قسم بخل کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہی چیز اخلاق و معاشرے کے بگاڑ کا بہت بڑا سبب بنتی ہے۔ اس بخل کی وجہ سے ایک دوسرے کا حق مارا جاتا ہے جس کی وجہ سے گھر اور قوم خونریزی اور فساد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی بخل خونریزی کا ایک بہت بڑا سبب بنتی ہے، اس کی وجہ سے لوگ ناجائز اور حرام چیزوں کو حلال اور جائز کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاح اور بگاڑ کی ابتدا

۱۱۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین ہو وہ دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بے ایمانی سے انسان لمبی امیدوں اور بخل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور ان کے والد یعنی شعیب عمرو بن شعیب کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَلْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَاَوَّلُ فَسَادِهَا اَلْبُخْلُ وَالْاَمَلُ "اس امت کی اصلاح کی ابتدا (اللہ تعالیٰ اور آخرت پر) یقین اور دنیا سے بے رغبتی ہوئی اور اس کے فساد کی ابتدا بخل اور لمبی لمبی امیدوں سے ہو گی"۔ (بیہقی، مشکوۃ: باب الامل والحرص)

حقیقت یہ ہے کہ سچے ایمان و یقین سے زہد (یعنی دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے) اور بے یقینی، بے ایمانی سے دنیا کی محبت، لمبی لمبی امیدیں اور دنیوی راحت و آرام اور لذت کے دور دور کے منصوبے بننا شروع ہو جاتے ہیں اور اسی سے انسان کے اندر بخل پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

بخل ایمان کی ضد ہے

۱۲۔ بخل ایمان کی ضد ہے، کیونکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ ہی کی نعمت سمجھتے ہیں وہ کبھی بخل کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے اور یہی شکر و ایمان کا تقاضا ہے۔ انسان کے بخل کی ایک بڑی وجہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت، توانائی اور مال و دولت کو اپنا اور اپنی تدبیر و محنت کا ثمرہ جاننا ہے، اس لیے وہ بخل و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ورنہ جو شخص ذرا عقل سے کام لے، اپنی پیدائش، دنیا کی چیزوں اور

ان کی پیدائش میں غور وفکر کرے تو وہ ان کو صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے گا، ایسے شخص کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت کی وجہ سے بخل اور تکبر میں مبتلا ہو جائے، بلکہ ایسے شخص پر جس قدر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہوں گے اسی قدر وہ متواضع، منکسر المزاج، بندوں کے حقوق کو ادا کرنے والا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور لرزنے والا ہو گا جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَصْلَتَانِ لَاتَجْتَمِعَانِ فِيْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ ”دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ مؤمن میں جمع نہیں ہو سکتیں؛ ایک بخل اور دوسری بد خلقی“۔ (ترمذی، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

اس حدیث کو نقل کرکے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یعنی کوئی شخص مؤمن ہو کر بخیل بھی ہو اور بد خلق بھی، یہ مؤمن کی شان ہرگز نہیں۔ ایسے شخص کو اپنے ایمان کی بڑی فکر چاہیے، خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ اسی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جیسے ہر خوبی دوسری خوبی کو کھینچتی ہے ایسے ہی ہر عیب دوسرے عیب کو کھینچتا ہے۔ دوسری حدیث میں اس سے بھی بڑھ کر حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ شُحّ (یعنی بخل کی اعلیٰ قسم) ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ (مشکوٰۃ) ان دونوں چیزوں کا اجتماع گویا ضدین کا اجتماع ہے جیسا کہ آگ اور پانی کا جمع ہونا کہ جونسی چیز غالب ہو گی وہ دوسرے کو فنا کر دے گی۔ اگر پانی غالب ہے تو آگ کو بجھا دے گا، آگ غالب ہے تو پانی کو جلا دے گی۔ ایسے ہی یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے منافی ہیں، جو چیز غالب ہو گی رفتہ رفتہ دوسری کو فنا کر دے گی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی ولی ایسا نہیں ہوا جس میں اللہ جل شانہ نے دو عادتیں پیدا نہ کر دی ہوں: ایک سخاوت، دوسری خوش خلقی۔ (کنز)

دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ کا کوئی ولی ایسا نہیں ہے جو سخاوت کا عادی نہ بنایا گیا ہو۔ (کنز)

بہت ظاہر بات ہے کہ اگر اللہ جلّ شانہ سے تعلق اور محبت ہے تو اس کی مخلوق پر خرچ کرنے کو بے اختیار دل چاہے گا کہ محبوب کے عزیز واقارب کی خاطر محبت کے لوازمات سے ہے اور جب مخلوق اللہ کی عیال ہے تو ان پر خرچ کرنے کو ولی کا دل ضرور چاہے گا، اور اس کے عیال میں بھی جس کا تعلق اس کے ساتھ جتنا زیادہ ہو گا اتنا ہی اس پر خرچ کرنے کو زیادہ چاہے گا، اور اگر نہ چاہے تو معلوم ہوا کہ مال کی محبت

اللہ کی محبت سے زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ جھوٹ ہے"۔

(دیکھیے فضائل صدقات: حصہ اول، ص ۱۶۱)

بخیل جنت میں داخل نہیں ہو گا

(۱۴) بخل بہت ہی بری خصلت ہے۔ جو شخص حقوق کی ادائیگی اور بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملہ میں بخل کی روش کو اختیار کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ خَبٌّ وَّلَا بَخِیْلٌ وَلَا مَنَّانٌ "جنت میں نہ جعل ساز مکار (اور دھوکے باز) داخل ہو گا، نہ بخیل اور (نہ صدقہ و خیرات دے کر) احسان جتانے والا"۔

(ترمذی، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

سخی اور بخیل کی دنیا و آخرت

جو شخص بھی عقل سے کام لے گا یا لوگوں اور قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالے گا یا قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرنا لازمی ہے اور سخاوت کی روش ایسا صحت بخش رویہ اور کام ہے جو انسان کے دل کو جنت بناتا ہے۔ اس کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج بنتا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں جنتی معاشرہ بنتا ہے۔ یہ دنیا و آخرت میں عروج اور ترقی کا سبب ہے۔ سخی قوم لوگوں پر نہ صرف سیاسی غلبہ حاصل کرتی ہے بلکہ وہ لوگوں کے دلوں پر اپنی عزت و بلندی کا اقتدار بھی جما لیتی ہے۔ یہ اس کے دنیوی فائدے ہیں۔ اور جو کچھ آخرت میں رحم و سخاوت پر ملنے والا ہے اس کا تصور بھی اس دنیا میں ناممکن ہے۔ اس کے برعکس بخیل شخص کا دل جہنم کا گڑھا ہوتا ہے اور یہ مرض اس کے روحانی و جسمانی امراض کا سبب بن جاتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ اور ملک میں خونریزی اور فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد اور اقوام دنیا کی نظروں سے گر جاتے ہیں اور بالآخر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

مخلوقِ الٰہی پر رحم اور حسنِ سلوک کی فضیلت

انفاق اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت، توانائی، اپنی کمائی اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی دولت کو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے بندوں کی مدد اور ان

کی خدمت میں خرچ کیا جائے۔ انفاق کی فضیلت، اس کے دنیاوی واخروی فائدے اور بخل کے نقصانات اور اس کی تباہیاں آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم وشفقت، مسکینوں، یتیموں، بے کسوں اور مظلوموں کی مدد کے بارے میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو پڑھ لیجیے۔

بہترین انسان

۱۔ بہترین انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ "مخلوق (خواہ انسان ہو یا جانور سب) اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سے بہترین وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبہ کے ساتھ زیادہ حسنِ سلوک کرے"۔

(مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

جو لوگ مخلوقِ الٰہی کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والے ہوں ظاہر ہے کہ وہی انسانیت کے لیے سب سے زیادہ مفید ہوں گے۔ یہی لوگ اور جماعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین لوگ اور جماعت ہوتے ہیں۔ جو لوگ مخلوقِ الٰہی کے لیے مفید ترین ثابت ہوتے ہیں، وہی دنیا میں عروج پاتے ہیں، جیسا کہ "بقائے انفع" کا قانون اللہ تعالیٰ کی دنیا میں جاری وساری ہے، جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اور جو جماعت اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین لوگ اور جماعت ہیں، وہ دنیا، آخرت میں کامیاب وکامران ہوں گے۔

رحم وشفقت کے جذبہ سے خالی دل بدبخت کا ہی ہوتا ہے

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم جو صادق اور مصدوق ہیں، سے یہ فرماتے ہوئے سنا: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ "رحمت (یعنی اللہ کی مخلوق پر رحم اور مہربانی کے جذبے) کو کسی دل سے نکالا نہیں جاتا ہے مگر بدبخت کے دل سے"۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بہت بڑا بدبخت ہوتا ہے جو اپنے کرتوت اور بے رحمیوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آجاتا ہے اور اس کے دل سے رحم وشفقت کا جذبہ نکل جاتا ہے۔

تم زمین والوں پر رحم کرو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَّنْ فِی السَّمَاءِ "اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، لہٰذا تم زمین والوں پر رحم کرو تاکہ تم پر وہ رحم کرے جو آسمان میں ہے"۔ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے

۴۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا یَرْحَمُ النَّاسَ "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا"۔

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

خلاصہ یہ کہ قرآن وحدیث میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ لوگوں کی غمخواری، ان کی مالی وجانی امداد، مظلوموں کی حمایت اور انفاق یعنی مخلوق کی نفع رسانی میں مال وجان خرچ کرنے اور اس کی خدمت کرنے ہی سے مہربانی کے جذبے کا ظہور ہوتا ہے ورنہ جو نفع رسانی کے کام نہ کرے اور مخلوق کی خدمت اور مدد نہ کرے، پھر رحم کا دعویٰ کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

مؤمنوں اور مسلمانوں کی باہمی خیر خواہی وہمدردی اور معاونت

جب یہ بات معلوم ہے کہ مؤمن اور مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام مخلوق حتیٰ کہ جانوروں اور حیوانات پر بھی رحم کرے، مخلوق کی خدمت کرے، تمام انسانیت کو نفع اور خیر پہنچائے، لوگوں سے شر اور ضرر دور کرنے کی کوشش کرے اور اُن کی دنیا وآخرت کی ترقی اور فلاح کا خیال رکھے، تو ظاہر ہے کہ وہ تو ان لوگوں کا بہت ہی زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ ہو گا جو اس کے ساتھ اس کام میں معاون ہوں، اور یہیں سے وہ باہمی تعاون اور خیر خواہی کی داغ بیل ڈالے گا اور اس کو نمونہ بنا کر پوری انسانیت کو اس خیر کی طرف دعوت دے گا۔ قرآن وحدیث نے مسلمانوں اور مؤمنوں کے مابین باہمی تعاون اور الفت ومحبت پر بہت ہی زیادہ زور دیا ہے۔ یہاں قرآن وحدیث میں سے بطورِ نمونہ کچھ پیش خدمت ہے:

ہر مؤمن دوسرے مؤمن کا بھائی ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ "بے شک مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔ (سورۃ الحجرات: آیت ۱۰)

بھائی کا مطلب یہ نہیں کہ بس اس کو رواجی اور زبانی جمع خرچ کے طور پر کہا جائے کہ تم میرے بھائی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گویا ایک مشترک گھرانہ ہوتا ہے، جن کا نفع و نقصان اور مفادات مشترک ہوں۔ ایک کے نفع میں دوسرے کا نفع اور ایک کے نقصان میں دوسرے کا نقصان ہو۔ اسی طرح ان کے غم اور خوشیاں مشترک ہوں۔ وہ گویا ایک بدن کی مانند ہوں۔

اخوت کی جان باہمی تعاون ہے، یعنی مشکل وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ بلا کسی معاوضہ کے مالی وجانی تعاون اور خدمت کرنا۔ اگر ایک دوسرے کے ساتھ مالی وجانی تعاون نہیں تو یہ نہ اخوت ہے اور نہ بھائی بندی، بلکہ صرف زبانی جمع خرچ ہے۔

مؤمن ایک دوسرے کا معاون اور دوست ہوتا ہے

۲۔ ایک دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اَلْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ "مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں (یہ سب آپس میں) ایک دوسرے کے دوست (اور معاون) ہوتے ہیں"۔

ولی دوست اور مددگار کو کہتے ہیں، مطلب یہ کہ مؤمن ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے دست وبازو، ہمدرد اور مددگار ہوتے ہیں۔

سارے مؤمن ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے ناقابلِ تسخیر طاقت بن سکتے ہیں

نبی کریم ﷺ نے مؤمنوں کی اس اخوت، دوستی اور غمگساری کو اپنے ارشادات میں یوں واضح فرمایا ہے:

۱۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِه "ایک مؤمن دوسرے

مؤمن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط رکھتا ہے۔ (یہ کہہ کر) پھر آپ ﷺ نے سمجھانے کے لیے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیں (کہ مؤمنین اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں)۔ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ: باب الشفقہ والرحمہ)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمارت کی ساری اینٹیں، اجزا اور تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں اور اس طرح انہی اینٹوں وغیرہ سے مضبوط قلعہ بن جاتا ہے، اسی طرح سارے مؤمنین ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور متحد ہوتے ہیں اور باہمی محبت اور امداد و تعاون کے ذریعے ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتے ہیں۔

مؤمنین ایک بدن کی طرح ہوتے ہیں

۲۔ مؤمنین کے باہمی تعاون، ہمدردی اور محبت و اخوت کی مثال ایک ہی بدن سے دی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى " (اے مخاطب) تم مؤمنوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمدلی میں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور تعلق رکھنے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی و معانت کا سلوک کرنے میں ایسا پاؤ گے جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضا اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور اس طرح بیداری (بے خوابی) اور بیماری کے درد میں سارا جسم شریک رہتا ہے"۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقہ)

ایک بدن کے اعضا پر نظر ڈالیے، ہر ایک اپنا اپنا کام کرتا ہے، آنکھ اپنا کام اور کان اپنا کام، پاؤں اپنا کام؛ اسی طرح ہر عضو اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے لیے کام کر رہے ہیں اور خوشی و غم میں سارے اعضا شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح مؤمنین بظاہر تو اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے لیکن وہ آپس میں ایک بدن کی طرح مربوط ہوں گے۔ ایک مؤمن کی خوشی تمام مؤمنین کے لیے خوشی ہے اور ایک مؤمن کو درد و مصیبت پہنچے تو اس کی مدد، غمگساری اور اس کے ساتھ تعاون کے لیے سب ایک دوسرے کو بلاتے ہیں اور اس کے درد و غم اور تکلیف و مصیبت میں اس کے

ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنے پورے مال و جان سے اس کی مدد کرتا ہے اور اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس حدیث میں مؤمنین اور مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت ہے کہ وہ ایک جسم کی طرح رہیں۔ اگر کسی ایک مسلمان پر مصیبت آئے، بھوک و افلاس میں مبتلا ہو جائے یا اس کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو سارے مسلمان مل کر اس کے دکھ درد اور تکلیف دور کرنے کی تدبیر کریں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی بھوک کو اپنی بھوک سمجھیں اور اس کے لیے ایسی دوڑ دھوپ کریں جس طرح اپنے درد و تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔

مسلمان دوسرے مسلمان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا

۳۔ حضرت سالم اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر زیادتی کرتا ہے اور نہ وہ اسے (ظلم، فقر وغیرہ) مخالف کے حوالے کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لیے کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان بھائی سے کوئی غم، پریشانی اور بے چینی وغیرہ دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پریشانیوں میں سے ایک بڑی پریشانی اور غم سے اسے نجات دے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا“۔

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقہ)

اس حدیث میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ نہ خود کسی مسلمان پر زیادتی کریں اور نہ اس کو ظلم و فقر کے حوالے کر کے اس کو بے یار و مددگار چھوڑیں، بلکہ ظالم اور بھوک کے مقابلے میں اس کی مدد کریں اور اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کریں اور اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کریں۔

مسلمان بھائی کی تذلیل و تحقیر نہ کرو

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَحْقِرُهٗ اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا وہ نہ اس پر زیادتی کرتا ہے اور نہ (اس کی اعانت اور مدد ترک کرکے) اس کو بے یارومددگار چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔ (یہ فرماکر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ تو یہاں (دل میں) ہے۔ (نیز فرمایا) کسی آدمی کے شر اور برائی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ (یاد رکھو!) مسلمان پر مسلمان کی ہر چیز حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت"۔ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

اس حدیث میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ خود بھی مسلمان پر کوئی زیادتی و ظلم نہ کریں اور جو اس پر ظلم کرے یا وہ بھوک و افلاس میں مبتلا ہو جائے یا مقروض ہو جائے تو اس کی مدد کرے، غرض کسی صورت میں اس کو بے یارومددگار نہ چھوڑیں بلکہ اس کی مدد اور اعانت کریں اور کبھی اس کی تذلیل نہ کریں اور نہ اپنے دل میں اس کو حقیر سمجھیں۔ کون اچھا ہے اور کون افضل اس کا تعلق تقویٰ سے ہے اور تقویٰ کا مرکز دل ہے، اور جو متقی دل ہوگا وہ کبھی کسی کی تحقیر نہیں کرے گا اور نہ اس دل میں مسلمان کی حقارت ہوگی۔

ہمسایہ اور پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو

۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَازَالَ جِبْرَئِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ "حضرت جبرئیل علیہ السلام (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) برابر مجھ کو پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید پڑوسی کو وراثت میں حصہ دار بنائیں گے"۔ (مسلم و بخاری، مشکوٰۃ)

۲۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یَا اَبَاذَرٍ اِذَا طَبَخْتَ مَرَقَۃً فَاَکْثِرْ مَائَھَا وَتَعَاھَدْ جِیْرَانَکَ ''اے ابو ذر! جب تو (گھر میں) شوربا پکائے تو پانی زیادہ کر لے اور (اس میں) اپنے ہمسایہ کا خیال رکھ''۔ (مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے خلیل نے وصیت فرمائی کہ جب تو شوربا پکائے تو پانی زیادہ ڈال، پھر ہمسایہ کے گھر والوں کو دیکھ اور ان کو اس شوربہ میں سے ایک معقول حصہ پہنچا دے۔

پڑوسی کو ایذا اور تکلیف پہنچانے والا یا اس کی خبر گیری نہ کرنے والا مؤمن نہیں

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ وَمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ ''اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو''۔

(بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ ''وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو گا جس کا پڑوسی اس کے شر اور ایذا رسانیوں سے محفوظ اور امن میں نہ ہو''۔ (مسلم و مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ ''وہ شخص مؤمن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اُس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو''۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

پڑوسی اور ہمسایہ کے حقوق اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے قرآن مجید اور احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن افسوس آج کل ایمان اور اسلام کے دعویدار سب سے زیادہ اپنے پڑوسیوں اور اپنے پاس والوں کے ساتھ بد سلوکی کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے پڑوسی کی آبروریزی کرتے ہیں اور

ان کے گھر کھانا، سالن پہنچا کر ان کی مدد کرنا تو درکنار اپنے قول و فعل سے اس کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ دن رات ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹیلی ویژن اونچی آواز میں لگا کر پڑوسی تو کیا پورے محلے کے بیماروں، سوئے ہوؤں اور دین دار لوگوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کی سنت سے کھل کر بغاوت کرتے ہیں جس کا نتیجہ اور عذاب دنیا میں بے چینی، بے اطمینانی اور افتراق و انتشار کی صورت میں دیکھا جا رہا ہے اور اس کا سخت دردناک انجام آخرت میں عذاب جہنم کی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

کسی کو اپنے مؤمن بھائی کی غیبت نہ کرنے دو

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنِ اغْتِيبَ عِنْدَهُ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى نَصْرِهٖ فَنَصَرَهٗ، نَصَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَّمْ يَنْصُرْهُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى نَصْرِهٖ اَدْرَكَهُ اللّٰهُ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ "جس شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد پر قادر ہو۔ پھر وہ اس مسلمان بھائی کی مدد کرے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی مدد کرے گا اور اگر وہ اس کی مدد نہ کرے حالانکہ اس کی مدد پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی گرفت کرے گا"۔ (مشکوٰۃ ج۲ص۲۶۸ باب الشفقۃ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کر رہا ہے اور اس کی حیثیت و عزت کو نقصان پہنچا رہا ہے، اگر وہ اس پر قادر ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی مدد کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی مدد کرے اور اس کی عزت و حیثیت کو خراب نہ ہونے دے۔ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی نصرت فرمائے گا، اور اگر وہ باوجود قدرت کے ایسا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کی گرفت فرمائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی مسلمان بھائی کی آبروریزی سے روکے اور اس کی غیبت سے روکے اور اس کی عزت و آبرو کا دفاع کرے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد نہ کرے اور غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہ روکے جہاں اُس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جارہا ہو تو اللہ بھی (دنیا و آخرت میں) اس موقع پر اس شخص کی مدد نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا ہو، اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر اس کی مدد کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا ہو۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

مؤمن بھائی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ رَأَى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ أَحْيَى مَوْؤُدَةً "جو شخص کسی مسلمان میں کوئی عیب (یا اس کی کوئی برائی) دیکھے اور پھر وہ اس کو چھپائے تو اس کا درجہ اس شخص جیسا ہے جس نے زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچالیا ہو"۔

(ابوداود، مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

مظلوم کی فریاد رسی اور اس کی مدد کرو

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُولَ اللّٰهِ أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا أَفَرَأَيْتَ إِذَا كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ قَالَ تَحْجُزُهُ أَوْ تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ

"اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ تو ایک آدمی نے عرض کیا (یعنی صحابی رضی اللہ عنہ نے): یارسول اللہ ﷺ! جب وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا مگر میں اس مسلمان کی کس طرح مدد کروں جب وہ ظلم کر رہا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کو ظلم سے روکو، بس یہی ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے"۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ أَغَاثَ مَلْهُوفًا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ ثَلٰثًا وَسَبْعِينَ مَغْفِرَةً وَاحِدَةً فِيهَا صَلَاحُ أَمْرِهِ كُلِّهِ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ لَهُ دَرَجَاتٌ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ "جو شخص مظلوم کی فریاد رسی (اور امداد) کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تہتر (۷۳) بخششیں (اور حفاظتیں) لکھ دیتا ہے اور ان میں سے ایک بخشش (اور حفاظت) وہ ہے جس میں اُس کے تمام (دنیوی اور اخروی) امور کی اصلاح ہے اور باقی بہتر (۷۲) بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوں گی"۔ (مشکوٰۃ ج۲ص ۴۲۷ باب الشفقہ)

اور ایک طویل حدیث میں ہے کہ: وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَاكَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ "اور اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے"۔

(مسلم، ریاض الصالحین: باب ۲۹)

ظالم کی مدد ایمان کے منافی ہے

حضرت اوس بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ "جو شخص کسی ظالم کی تقویت و تائید کے لیے اس کے ساتھ چلے اور وہ یہ جانتا ہو کہ (جس شخص کی وہ حمایت کر رہا ہے) وہ ظالم (ناحق پر) ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے"۔ (مشکوٰۃ ج۲ص ۴۳۸ باب الظلم)

یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کی فضیلت

حضرت سعد بن سہیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ وَلِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا "میں اور یتیم کی کفالت اور پرورش کرنے والا خواہ وہ یتیم اس کا اپنا قریبی (رشتہ دار جیسے پوتا، بھتیجا وغیرہ) ہو یا غیر (رشتہ دار اور اجنبی یتیم) ہو، جنت میں ایسے قریب قریب ہوں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے ساتھ اشارہ فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان کچھ کشادگی رکھی"۔

(بخاری و مشکوٰۃ ج۲ص ۴۲۳ باب الشفقہ)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے ساتھ ہمدردی کرنے والے اور اس کی پرورش کرنے والے اور اس کی ضروریات پوری کرنے والے کا درجہ بتلایا کہ جنت میں میرے اور یتیم کی کفالت کرنے والے کے درمیان اتنی قربت ہو گی جتنی ان دونوں انگلیوں کے درمیان ہے۔ شاید یہ تھوڑا سا فرق

درجۂ نبوت ہے کیونکہ امتی کبھی نبی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی اور غرض اور جذبہ کے تحت نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی یتیم بچے کے سر پر (پیار و محبت اور شفقت کے ساتھ) ہاتھ پھیرے تو اس کے لیے یتیم کے سر پر ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ لگا ہے، نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

(الحدیث: احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

بیوہ عورت اور مسکین کی خدمت کا ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَالسَّاعِي عَلَى الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ يَشُكُّ الْقَعْنَبِيُّ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ "بیوہ عورت اور مسکین کا خیال رکھنے اور خبر گیری کرنے والا (اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے والا اجر و ثواب میں) اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے، اور (راوی کہتا ہے کہ) میرا گمان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس عبادت گزار، شب بیدار کی مانند ہے جو عبادت اور نماز میں سست نہ پڑے، اور اُس روزہ دار کی طرح ہے جو ناغہ نہ کرے (بلکہ مسلسل روزے رکھے)"۔

(بخاری و مسلم)

جب یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی ضروریات میں دوڑ دھوپ کرنے والے کا اجر و ثواب اس قدر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کا ثواب، اور ایسے شب بیدار اور راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے والے کا ثواب جو کبھی شب بیداری میں سستی نہ کرے اور نہ اس میں کوئی نقصان اور کمزوری دکھائے اور بلاناغہ مسلسل روزے رکھتا ہو؛ تو جو شخص خود بھی ان بے کسوں اور محتاجوں کی مدد کرے اور ان کے لیے یہ بھاگ دوڑ بھی کرے کہ منظم طور پر یتیموں، مسکینوں، محتاجوں اور مظلوموں کی مدد ہو تو آپ اندازہ لگائیں کہ اس کا اجر و ثواب کس قدر عظیم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ ہم خود بھی بے کسوں، یتیموں، محتاجوں اور مظلوموں کی مدد کریں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں اور اس کام کے لیے دوسروں کو بھی دعوت دیں، اور ظالم کے روکنے اور مظلوموں اور بے کسوں کی مدد کرنے کے لیے ایسا معاشرہ اور ایسی تنظیم تشکیل دیں جس میں ہر کسی کو عزت کی روزی مل سکے، جس

میں ہر کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہو اور جس میں پورا معاشرہ ظالم کے خلاف لڑے اور مظلوم کی پشت پناہی پورا معاشرہ اور پوری تنظیم کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں سب سے زیادہ کمزور وہ شخص ہو گا جو کسی کا حق دبائے اور سب سے زیادہ طاقتور وہ شخص ہو گا جو مظلوم ہو، جس کا حق چھینا گیا ہو۔

یتیموں، مسکینوں اور بے کسوں کی امداد اور اخلاص

آخر میں یہ گزارش کروں گا کہ یتیموں، بے کسوں، بیواؤں، محتاجوں اور مظلوموں کے لیے بھاگ دوڑ کرنا اور دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھ کر اس کو حل کرنا، دوسرے مسلمان بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور اسی طرح کے تمام اچھے اور نیک کام اس وقت مفید ہوتے ہیں اور ان سے اس وقت آخرت کی دائمی جنت اور دنیا کا جنتی معاشرہ بنتا ہے جب یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے لیے ہوں۔ اگر یہ خوش اخلاقی صرف ان لوگوں کے لیے ہو جن سے کوئی فائدہ وابستہ ہو اور یہ امید ہو کہ وہ کسی وقت کام آسکتے ہیں، یا لوگوں سے کٹ کر علیحدہ رہ جانے کے خوف سے لوگوں کے کام کیے جائیں، یا دنیوی عزت، شان و شوکت اور نیک نامی وغیرہ کے حصول کے لیے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جائے؛ تو اس طرح کے یہ تمام کام مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لیے مذکورہ بالا محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ اس قسم کے نمائشی اخلاق سے نہ دنیا میں جنتی معاشرہ بن سکتا ہے اور نہ اس سے آخرت میں جنت کی دائمی اور ابدی خوشیاں مل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے واقعات

☆جہاد فی سبیل اللہ میں مال خرچ کرنا☆

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مال خرچ کرنا

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم (مکہ سے ہجرت کے لیے) روانہ ہوئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ روانہ ہوئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھ اپنا سارا مال پانچ ہزار یا چھ ہزار درہم جتنا بھی تھا سارا لے لیا اور لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے۔ پھر ہمارے دادا حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ ہمارے گھر آئے، ان کی بینائی جا چکی تھی۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میرے خیال میں تو ابو بکر رضی اللہ عنہ تم لوگوں کو جانے کے صدمہ کے ساتھ مال کا صدمہ بھی پہنچا گئے ہیں یعنی خود تو وہ گئے ہی ہیں میرا خیال یہ ہے کہ وہ مال بھی سارا لے گئے ہیں اور تمہارے لیے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ میں نے کہا: دادا جان! ہر گز نہیں، وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں، اور میں نے (چھوٹی چھوٹی) پتھریاں لے کر گھر کے اس طاق میں رکھ دیں جس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا مال رکھا کرتے تھے (اس زمانے میں درہم و دینار چھوٹی پتھریوں کی طرح کے ہوتے تھے لہٰذا درہم و دینار کے سائز کی پتھریاں رکھی ہوں گی)۔ پھر میں نے ان پتھریوں پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر میں نے اپنے دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر ان سے کہا: اے دادا جان! اپنا ہاتھ اس مال پر رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا (وہ یہ سمجھے کہ یہ درہم و دینار ہی ہیں) تو انہوں نے کہا: کوئی بات نہیں، اگر وہ تمہارے لیے اتنا مال چھوڑ گئے ہیں تو انہوں نے اچھا کیا، اس سے تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔ حضرت اسماء کہتی ہیں: اللہ کی قسم! انہوں نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا لیکن میں نے یہ کام بڑے میاں (دادا جان) کی تسلی کے لیے کیا تھا، اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں اپنا سارا مال جو کہ چار ہزار درہم تھا خرچ کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے لیے جانے کا ارادہ فرمایا تو جد بن قیس سے کہا کہ بنو اصفر رومیوں سے لڑنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں تو بہت سی عورتوں والا ہوں (ان کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں)، میں تو رومیوں کی عورتوں کو

دیکھ کر فتنہ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا آپ مجھے یہاں رہ جانے کی اجازت دے دیں گے؟ مجھے (ساتھ لے جا کر) فتنہ میں نہ ڈالیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا

ابن عساکر نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے مختلف قبیلوں اور اہلِ مکہ کی طرف آدمی بھیجے جو ان سے دشمن کے مقابلے میں جانے کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ کو قبیلہ اسلم کی طرف بھیجا اور ان سے فرمایا: فُرع بستی تک پہنچ جانا اور حضرت ابورُہم غِفاری رضی اللہ عنہ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور ان سے فرمایا کہ اپنی قوم کو ان کے علاقہ میں جمع کرلیں، اور حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی طرف گئے، اور حضرت ابو جعد ضمری رضی اللہ عنہ ساحل سمندر پر اپنی قوم کی طرف گئے، اور حضور ﷺ نے حضرت رافع بن مکیث اور حضرت جندب بن مکیث رضی اللہ عنہما کو قبیلہ جہینہ کی طرف بھیجا، اور حضرت نُعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کو قبیلہ اشجع کی طرف بھیجا اور حضور ﷺ نے قبیلہ بنو کعب بن عمیر میں حضرت بدیل بن ورقاء اور حضرت عمرو بن سالم اور حضرت بِشر بن سفیان رضی اللہ عنہم کی جماعت کو بھیجا اور قبیلہ سُلیم کی طرف چند صحابہ کو بھیجا جن میں حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

حضور ﷺ نے مسلمانوں کو جہاد میں جانے کی خوب ترغیب دی اور انہیں (اللہ کے راستے میں) مال خرچ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی بہت دل کھول کر خوب خرچ کیا اور سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لائے اور وہ اپنا سارا مال لائے تھے جو کہ چار ہزار درہم تھا تو ان سے حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں! اللہ اور اس کے رسول کو (گھر چھوڑ کر آیا ہوں)، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا آدھا مال لے کر آئے۔ ان سے حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ جتنا لایا ہوں اس کا آدھا (چھوڑ کر آیا ہوں لیکن دوسری روایت میں یہ ہے کہ جتنا لایا ہوں اتنا ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو مال لے کر آئے جب اس کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب بھی کسی نیکی میں ہمارا آپس میں مقابلہ ہوا تو ہمیشہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس نیکی میں مجھ سے آگے نکلے ہیں۔ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی

بہت سامال حضور ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں دو سو (۲۰۰) اوقیہ چاندی یعنی آٹھ ہزار (۸۰۰۰) درہم لائے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی بہت سارا مال لائے اور اسی طرح حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی اور حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے نوے (۹۰) وسق (تقریباً پونے پانچ سو من) کھجور دی۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے تہائی لشکر کا پورا سامان دیا اور صحابہ میں سے سب سے زیادہ انہوں نے خرچ کیا یہاں تک کہ تہائی لشکر کے لیے تمام ضروری سامان دیا۔ حتیٰ کہ یہ کہا گیا کہ اب ان کو مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے یہاں تک کہ مشکیزوں کی سلائی کے لیے موٹی سوئی کا بھی انتظام کیا چنانچہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس دن حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کے بعد عثمان کچھ بھی کر لیں ان کا کوئی نقصان نہ ہو گا۔ مالداروں نے مال خرچ کرنے کی نیکی میں خوب ذوق شوق سے حصہ لیا اور انہوں نے یہ سب کچھ محض اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے شوق میں کیا اور جو حضرات ان مالداروں سے مال میں کم تھے انہوں نے بھی اپنے سے کمتر مال والوں کی خوب مدد کی اور ان کی قوت کا ذریعہ بنے۔ یہاں تک بعض اپنا اونٹ لا کر ایک دو آدمیوں کو دے دیتے کہ تم دونوں اس پر باری باری سوار ہو جانا اور دوسرا آدمی کچھ خرچ لاتا اور اس غزوہ میں جانے والے کو دے دیتا یہاں تک کہ عورتیں بھی اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق ان نکلنے والوں کی مدد کر رہی تھیں۔ چنانچہ حضرت ام سِنان اسلمیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حضور ﷺ کے سامنے ایک کپڑا بچھا ہوا ہے جس پر کنگن، بازوبند، پازیب، بالیاں، انگوٹھیاں اور بہت سے زیورات رکھے ہوئے ہیں اور اس غزوہ کی تیاری کے لیے عورتوں نے جانے والوں کی مدد کے لیے جو زیورات بھیجے تھے، ان سے وہ کپڑا ابھرا ہوا تھا۔ لوگ ان دنوں سخت تنگی میں تھے اور اس وقت پھل بالکل پک چکے تھے اور سایہ دار جگہیں بڑی مرغوب ہو گئی تھیں۔ لوگ گھروں میں رہنا چاہتے تھے اور ان حالات کی بنا پر گھروں سے جانے پر بالکل راضی نہیں تھے اور حضور ﷺ نے اور زیادہ زور شور سے تیاری شروع فرما دی اور ثنیۃ الوداع میں جا کر آپ نے اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈال دیا۔ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، کسی ایک رجسٹر میں سب کے نام آ نہیں سکتے تھے اور جو بھی اس غزوہ سے غائب ہونا چاہتا تھا اسے معلوم تھا کہ اس کے غائب ہونے کا اس وقت تک کسی کو پتا نہیں چلے گا جب تک کہ اس کے بارے میں اللہ

کی طرف سے وحی نازل نہ ہو۔ چنانچہ جب حضور ﷺ نے سفر شروع کرنے کا پختہ عزم فرمالیا تو آپ نے مدینہ میں حضرت سباع بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جوتے زیادہ مقدار میں ساتھ لے کر چلو کیونکہ جب تک آدمی جوتی پہنے رہتا ہے وہ گویا کہ سوار ہی رہتا ہے۔ جب حضور ﷺ نے سفر شروع فرمادیا تو ابن ابیّ (منافق) اور منافقین کو لے کر پیچھے رہ گیا اور یوں کہنے لگا کہ محمد (ﷺ) بنو اصفر رومیوں سے لڑنا چاہتے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کی بری حالت ہو رہی ہے اور گرمی سخت پڑ رہی ہے اور یہ سفر بہت دور کا ہے اور مقابلہ بھی ایسے لشکر سے ہے جن سے لڑنے کی حضور ﷺ میں طاقت نہیں ہے، کیا محمد یہ سمجھتے ہیں کہ بنو اصفر رومیوں سے لڑنا کھیل ہے؟ اور اس کے منافق ساتھیوں نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں پریشان کن خبریں پھیلانے کے لیے اس نے یہ کہا کہ اللہ کی قسم! میں تو دیکھ رہا ہوں کہ حضور ﷺ کے تمام صحابہ کل کو رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔

جب حضور ﷺ نے ثنیّۃ الوداع سے سفر شروع فرمایا اور چھوٹے اور بڑے جھنڈوں کو لہرایا تو چھوٹے جھنڈوں میں سے سب سے بڑا جھنڈا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور بڑے جھنڈوں میں سے سب سے بڑا جھنڈا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو دیا اور قبیلہ اوس کا جھنڈا حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو دیا۔ حضور ﷺ کے ساتھ تیس ہزار کا لشکر تھا اور دس ہزار گھوڑے تھے۔ حضور ﷺ نے انصار کے ہر خاندان کو حکم دیا کہ اپنے چھوٹے اور بڑے جھنڈے لے لیں اور عرب کے دوسرے قبائل کے بھی اپنے اپنے چھوٹے اور بڑے جھنڈے تھے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۵۳۹ تا ۵۴۲)

حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کا مال خرچ کرنا

حضرت عبد الرحمن بن خباب سلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا اور جیش عسرہ (غزوہ تبوک میں جانے والے لشکر) پر خرچ کرنے کی ترغیب دی تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: کجاوے اور پالان سمیت سو اونٹ میرے ذمہ ہیں یعنی میں دوں گا۔ پھر حضور ﷺ منبر سے ایک سیڑھی نیچے تشریف لائے اور پھر (خرچ کرنے کی) ترغیب دی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر کہا: کجاوے

اور پالان سمیت اور سو اونٹ میرے ذمہ ہیں۔ حضرت عبد الرحمن کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اتنا زیادہ خرچ کرنے پر بہت خوش ہیں اور خوشی کی وجہ سے) ہاتھ کو ایسے ہلا رہے ہیں جیسے تعجب و حیرانی میں انسان ہلایا کرتا ہے۔ اس موقع پر عبد الصمد راوی نے سمجھانے کے لیے اپنا ہاتھ باہر نکال کر ہلا کر دکھایا، اور حضور ﷺ فرما رہے ہیں: اگر اتنا زیادہ خرچ کرنے کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کوئی بھی (نفل) عمل نہ کرے تو ان کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ بیہقی کی روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے تین مرتبہ ترغیب دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کجاوے اور پالان سمیت تین سو اونٹ اپنے ذمہ لیے۔ حضرت عبد الرحمن کہتے ہیں میں اس وقت موجود تھا جب حضور ﷺ منبر پر یہ فرما رہے تھے کہ اتنا خرچ کرنے کے بعد یا فرمایا: آج کے بعد عثمان کا کسی گناہ سے نقصان نہیں ہو گا۔

حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ جیش عسرہ (یعنی غزوۂ تبوک کے لشکر) کو تیار کر رہے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس ایک ہزار دینار لے کر آئے اور لا کر حضور ﷺ کی جھولی میں ڈال دیے۔ حضور ﷺ ان دیناروں کو الٹتے پلٹتے جا رہے تھے اور یہ کہتے جا رہے تھے کہ آج کے بعد عثمان جو بھی گناہ صغیرہ یا خلاف اولیٰ کام کریں گے تو اس سے ان کا نقصان نہیں ہو گا۔ یہ بات آپ نے کئی مرتبہ فرمائی۔ ابو نُعیم نے یہی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے، اس میں یہ مضمون ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اے اللہ! عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو نہ بھولنا اور اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کوئی نیکی کا کام نہ کریں تو اس سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جیش عسرہ کی مدد کرنے کے لیے پیغام بھیجا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار حضور ﷺ کے پاس بھیجے۔ لانے والے نے وہ دینار حضور ﷺ کے سامنے ڈال دیے۔ حضور ﷺ اپنے سامنے ان دیناروں کو اوپر نیچے الٹنے پلٹنے لگے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کرنے لگے: اے عثمان! اللہ تیری مغفرت فرمائے اور جو گناہ تم نے چھپ کر کیے اور علی الاعلان کیے اور جو تم نے مخفی رکھے اور جو گناہ تم سے قیامت تک ہوں گے اللہ ان سب کو معاف فرمائے۔ اس عمل کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کوئی بھی نیک عمل نہ کریں تو کوئی پرواہ نہیں ۔ (انسان جب مرتا ہے تو اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے ،اس لیے مطلب یہ ہے کہ

عثمان رضی اللہ عنہ سے مرتے دم تک جتنے گناہ ہوں اللہ انہیں معاف کر دے)۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جیشِ عُسرہ کی تیاری کے لیے سامان دیا اور سات سو اوقیہ سونا لا کر دیا اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں ہزار (۱۰۰۰) سواریاں دیں جن میں پچاس (۵۰) گھوڑے تھے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساڑھے نو سو (۹۵۰) اونٹنیاں اور پچاس (۵۰) گھوڑے دیے تھے یا یہ کہا کہ نو سو ستر (۹۷۰) اونٹنیاں اور تیس (۳۰) گھوڑے دیے تھے اور یہ پہلے گزر چکا کہ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تہائی لشکر کو ان کی ضرورت کا سامان دیا تھا یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک تہائی لشکر کی ضرورت کی ہر چیز انہوں نے مہیا کی تھی۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا مال خرچ کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں تھیں کہ انہوں نے مدینہ میں ایک شور سنا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ ملک شام سے ضرورت کی ہر چیز لے کر آ رہا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس قافلے میں سات سو (۷۰۰) اونٹ تھے اور سارا مدینہ اس شور کی آواز سے گونج اُٹھا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ بات حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے کہا: میں پوری کوشش کروں گا کہ میں جنت میں (قدموں پر) چل کر داخل ہوں اور یہ کہہ کر اپنا سارا قافلہ مع سارے سامانِ تجارت اور کجاووں کو اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیا۔

حضرت زہری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنا آدھا مال چار ہزار (۴۰۰۰) درہم اللہ کے راستے میں صدقہ کیے، پھر چالیس ہزار (۴۰،۰۰۰) صدقہ کیے۔ پھر چالیس ہزار (۴۰،۰۰۰) دینار صدقہ کیے۔ پھر پانچ سو (۵۰۰) گھوڑے اللہ کے راستے میں دیے۔ پھر ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) اونٹ اللہ کے راستے میں دیے۔ ان کا اکثر مال تجارت کے ذریعے کمایا

ہوا تھا۔

انہوں نے غزوۂ تبوک میں دوسو (۲۰۰) اوقیہ (یعنی آٹھ ہزار، ۸۰۰۰ درہم چاندی) صدقہ کیے۔

مانگنے والوں پر خرچ کرنا

حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم قبیلہ مُزینہ کے چار سو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنے دین کے احکام بتائے۔ (جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے تو) ایک آدمی نے کہا یارسول اللہ! راستے کے لیے ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا انہیں راستہ کے لیے توشہ دے دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میرے پاس تو بس تھوڑی سی بچی ہوئی کھجوریں ہیں، میرے خیال میں تو وہ کھجوریں ان کی ضرورت کچھ بھی پوری نہ کر سکیں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اور انہیں راستہ کے لیے توشہ دے دو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیں ایک بالا خانے میں لے گئے۔ وہاں ایک خاکستری جوان اونٹ جتنی کھجوریں رکھی ہوئی تھیں (یعنی بیٹھے ہوئے ایک اونٹ جتنا اونچا کھجوروں کا ایک ڈھیر تھا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ لوگ یہ کھجوریں لے لیں۔ ہمارے تمام قافلے والوں نے اپنی ضرورت کے مطابق کھجوریں لے لیں اور میں سب سے آخر میں لینے گیا، میں نے دیکھا تو نظر آیا کہ (کھجوریں شروع میں جتنی تھیں اب بھی اتنی ہی ہیں) ان میں سے ایک کھجور بھی کم نہ ہوئی تھی، حالانکہ اس ڈھیر میں سے چار سو آدمی کھجوریں لے چکے تھے (یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی برکت تھی)۔

حضرت دکین بن سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چار سو چالیس آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (سفر کے لیے) کھانے کی کوئی چیز مانگنے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: جاؤ اور انہیں سفر کے لیے کچھ دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے پاس تو صرف اتنا ہے جس سے میرے اور میرے بچوں کے گرمی کے چار مہینے گزر سکیں (اس سے ان کا کام نہیں چلے گا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! جاؤ اور جو ہے وہ انہیں دے دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! بہت اچھا جیسے آپ فرمائیں، میں تو آپ کی ہر بات سنوں گا اور مانوں گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے کھڑے ہوئے اور ہم بھی ان کے ساتھ کھڑے

ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیں اوپر اپنے ایک بالا خانے میں لے گئے اور اپنے نیفے میں سے چابی نکال کر بالا خانے کا دروازہ کھولا تو بالا خانے میں بیٹھے ہوئے اونٹ کے بچے کے برابر کھجوروں کا ایک ڈھیر تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ لوگ اس میں سے جتنا چاہیں لے لیں۔ چنانچہ ہم میں سے ہر ایک آدمی نے اپنی ضرورت کے لیے کھجوریں اپنی مرضی کے مطابق لیں۔ میں سب سے آخر میں لینے گیا۔ میں نے دیکھا تو ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم نے اس ڈھیر میں سے ایک بھی کھجور نہ لی ہو۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲۱۵ تا ۲۱۷)

مجاہدین کو کھانا کھلانا

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ فرمایا جس کے امیر حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما تھے۔ سفر میں ان حضرات پر فاقہ آیا تو حضرت قیس نے اپنے ساتھیوں کے لیے نو اُونٹ ذبح کر دیے۔ جب یہ حضرات مدینہ منورہ واپس آئے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ سنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سخاوت تو اس گھرانے کی خاص صفت ہے۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (جب حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نو اونٹ ذبح کرنے لگے تو) حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر حضرت قیس کے پاس آئے اور ان سے کہا: میں آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ اونٹ ذبح نہ کریں (اس سے اونٹ کم ہو جائیں گے اور سفر میں دقت ہو گی،) لیکن پھر بھی انہوں نے ذبح کر دیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا قصہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ارے یہ تو سخی گھر کا آدمی ہے، اور یہ غزوۂ خبط کا واقعہ ہے جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے خبط یعنی درختوں کے پتے کھائے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما گزرے۔ اس وقت ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی، انہوں نے ہمارے لیے سات اونٹ ذبح کیے (پھر ہم نے سفر کیا) اور سمندر کے کنارے ہم نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں ہمیں ایک بہت بڑی مچھلی ملی۔ ہم تین دن تک اس کا گوشت کھاتے رہے۔ ہم نے اس میں سے اپنی مرضی کے مطابق بہت ساری چربی نکالی اور اپنے مشکیزوں اور بوریوں میں بھر لی اور ہم وہاں سے چل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے اور آپ کو قصہ سنایا اور یہ بھی ساتھیوں نے کہا: اگر ہمیں یہ یقین ہوتا کہ مچھلی کا گوشت حضور کی خدمت میں پہنچنے تک خراب نہیں ہو گا تو ہم اپنے ساتھ ضرور لاتے۔

...... ☆ ...... ☆ ...... ☆ ......

زبان کی حفاظت کا بیان

زبان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے ، اس کو جھوٹ، غیبت، چغلی، فحش گوئی، سخت کلامی اور بے فائدہ باتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ زبان کی شیرینی یا تلخی، نرمی یا سختی، اس کی درستی اور کجی کے دنیوی اور اخروی نتائج بہت دور رَس ہوتے ہیں۔ دنیا میں جھگڑے اور فسادات، باہمی عداوتیں، دشمنیاں اور رنجشیں زیادہ تر زبان کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہ لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں ان کا تعلق بھی اکثر زبان ہی سے ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے زبان کی حفاظت اور اس کی درستگی کی سخت تاکید فرمائی ہے اور مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت فرمائی ہے کہ زبان کو قابو میں رکھیں اور ہر قسم کی بری باتوں، بلکہ بے ضرورت باتوں سے اپنے آپ کو روکیں، اور جب بات کرنے کی ضرورت نہ ہو اور بات سے خیر اور نفع کی امید نہ ہو تو خاموش رہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد زبان سے متعلق نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات پڑھ لیجیے۔

زبان کی استقامت

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا فَاِنَّمَا نَحْنُ بِكَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا ”جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضا (یعنی آنکھ، کان وغیرہ) زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اللہ کے لیے ہم پر رحم کر اور) ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر، کیونکہ ہم تیرے ہی ساتھ بندھے ہوئے ہیں، اگر تو سیدھی اور درست رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہو گی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ)

زبان سے بقیہ اعضا کی درخواست کا مطلب یہ ہے کہ ہماری صلاح و فلاح اور ہمارے انجام کی اچھائی اور برائی تجھ ہی سے بندھی ہوئی ہے، اس لیے ہم پر رحم کر اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر بے احتیاطی اور بے باکی سے نہ چل ورنہ تیرے ساتھ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

زبان کی بے باکی آدمی کو جہنم میں ڈال دیتی ہے

نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ کونسی چیز ہے جس کے سبب آدمی جہنم میں جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اَلْاَجْوَفَانِ اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ "دو کھوکھلی چیزیں: ایک منہ (یعنی زبان)، دوسری شرمگاہ۔" (سنن ابن ماجہ)

ان دونوں کے گناہوں کے سبب اکثر لوگ جہنم میں جائیں گے۔

زبان اور شرمگاہ کے فتنے اور شر سے بچنے والا جنتی ہے

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ دو چیزوں کے شر سے بچائے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کونسی چیزیں ہیں؟ فرمایا: مَا بَیْنَ لِحْیَیْہِ وَمَا بَیْنَ رِجْلَیْہِ یعنی "ایک وہ چیز جو دونوں داڑھوں کے درمیان (یعنی زبان) ہے اور دوسری چیز وہ جو دونوں پاؤں کے درمیان (یعنی شرمگاہ) ہے۔" (مؤطا امام مالک)

زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے کو جنت کی بشارت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ یَّضْمَنْ لِیْ مَا بَیْنَ لَحْیَیْہِ وَمَا بَیْنَ رِجْلَیْہِ اَضْمَنْ لَہُ الْجَنَّۃَ "جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی اس چیز کی حفاظت کرے گا جو اس کے دونوں داڑھوں کے درمیان ہے اور جو اس کے دونوں پاؤں کے درمیان ہے تو میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔" (بخاری، مشکوٰۃ)

خاموشی میں نجات ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا "جو چپ رہا وہ نجات پا گیا۔" (مسند احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بری، فضول اور لایعنی باتوں سے زبان کو روکا وہ ہلاکت اور عذاب سے بچ گیا۔"

زبان کے فتنے سے بچو

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کو میرے بارے میں جن چیزوں کا خطرہ ہو سکتا ہے ان سب سے زیادہ خطرناک اور خوفناک چیز کیا ہے؟

حضرت سفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جواب میں) اپنی زبان مبارک پکڑ کے فرمایا کہ یہ چیز، یعنی سب سے زیادہ خطرہ اس سے ہے۔" (ترمذی، مشکوۃ)

خاموشی اور خوش خلقی کی فضیلت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت) ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا میں تمہیں وہ دو خصلتیں نہ بتادوں جو پیٹھ پر بہت ہلکی ہیں (کہ ان کے اختیار کرنے میں آدمی پر کچھ زیادہ بوجھ نہیں پڑتا) اور اللہ تعالیٰ کی میزان میں وہ بہت بھاری ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ہاں ضرور بتلائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا "زیادہ خاموش رہنے کی عادت اور حسن اخلاق۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! مخلوقات کے اعمال میں یہ دونوں چیزیں بے مثل ہیں۔" (بیہقی، مشکوۃ)

زیادہ خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتوں سے زبان کو روکا جائے۔ جو شخص اپنے آپ کو نامناسب اور لایعنی باتوں سے بچائے گا وہ لازماً کم بولنے والا اور زیادہ خاموش رہنے والا ہوگا۔

خاموشی کی عادت اختیار کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَقَامُ الرَّجُلِ لِلصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً "خاموشی کی عادت سے آدمی کو جو رتبہ اور مقام حاصل ہوتا ہے وہ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" (بیہقی، مشکوۃ)

مطلب یہ ہے کہ آدمی کا بری، نامناسب اور بے ضرورت باتوں سے خاموشی اختیار کرنا اور اس پر مداومت اور ہمیشگی کے ساتھ ثابت قدم رہنا اس شخص کی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے جو کثرتِ کلام

اورزبان کی بے احتیاطی میں مبتلا ہو۔

نرم مزاجی اور نرم خوئی کا بیان

اسلام کا مزاج نرم ہے، اور اسلام اس کے دل میں اچھی طرح پیوست ہوتا ہے جو نرم خو ہوتا ہے۔ نرم مزاجی اور نرم خوئی کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ معاملات میں سخت گیری کے بجائے نرمی اور آسانی اختیار کی جائے۔

۲۔ اپنے ساتھیوں اور عام لوگوں کے حق میں مہربانی اور نرم خوئی اختیار کی جائے اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا جائے۔

۳۔ جو بات کی جائے نرمی سے سمجھائی جائے۔

۴۔ جو مطالبہ کیا جائے، شیریں انداز میں کیا جائے کہ پتھر کو بھی موم کردے۔

۵۔ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ ادب واحترام اور لطف وشفقت کا پہلو ملحوظ رہے۔

۶۔ ہر کام اطمینان، خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ کیا جائے۔

نرم خوئی کی فضیلت

نرم خوئی اور لطف وکرم اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ آدمی محبوب ہوتا ہے جو اس کے بندوں کے معاملہ اور برتاؤ میں نرمی کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں اس لطف اور نرمی کا سب سے زیادہ اور وافر حصہ خاتم الانبیاوالرسل رحمۃ للعالمین نبی کریم ﷺ کو عنایت فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ خود نبی کریم ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد فرماتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ''پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپ اُن کے لیے نرم دل ہوگئے اور اگر آپ درشت خو اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) آپ سے تتر بتر ہوجاتے۔'' (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۹)

بلاشبہ یہی نرم خوئی ہے جو کہ حِلم وبردباری، عفوودرگزر، چشم پوشی اور خوش کلامی؛ غرض ان تمام اخلاقِ حسنہ کا عطر اور نچوڑ ہے جن میں شانِ جمال پائی جاتی ہے۔

نرمی پر جو کچھ ملتا ہے وہ سختی پر نہیں ملتا

نرمی خیر اور برکتوں کو کھینچتی ہے اور اس پر جو کچھ ملتا ہے وہ سختی پر نہیں ملتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ وَیُعْطِیْ عَلَی الرِّفْقِ مَالَا یُعْطِیْ عَلَی الْعُنْفِ وَمَالَا یُعْطِیْ عَلٰی مَاسِوَاہُ "اللہ تعالیٰ خود مہربان ہے اور نرمی و مہربانی اس کو محبوب ہے، اور نرمی پر وہ اتنا دیتا ہے جتنا کہ درشتی اور سختی پر نہیں دیتا، اور نرمی و مہربانی پر وہ جتنا عطا فرماتا ہے وہ نرمی و مہربانی کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر عطا نہیں فرماتا۔" (مسلم، مشکوۃ)

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ سخت گیری سے آدمی وہ کچھ حاصل کرتا ہے جو نرمی سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حدیث میں اس غلط خیال کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے:

۱۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نفع و نقصان کا مالک اور لینے اور دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چونکہ نرمی و مہربانی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، تو ظاہر ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو محبوب ہو اُسی میں بندوں کے لیے خیر و برکت، خوشی و اطمینان اور سکون ہو گا۔ بلاشبہ جس معاشرے میں نرمی و مہربانی اور شفقت و مروت کے جذبات پھیل جاتے ہیں اس معاشرے پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور جس معاشرے میں اس خصلت کا فقدان ہوتا ہے وہ ٹوٹ پھوٹ، افتراق و انتشار، مختلف قسم کی پریشانیوں اور سختیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ نرمی پر اس قدر دیتا ہے جس قدر سختی پر نہیں دیتا، بلکہ نرمی کے علاوہ کسی چیز پر بھی اللہ تعالیٰ اتنا نہیں دیتا جتنا کہ نرمی پر دیتا ہے، لہٰذا اپنے فائدہ اور دنیوی و اخروی خیر و برکات کے حصول کے لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنے تعلقات و معاملات اور کلام وغیرہ میں نرمی اختیار کریں اور نرمی کو اپنا شعار اور قانون بنائیں۔

نرمی ہر چیز میں حسن اور زینت پیدا کر دیتی ہے

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ نرمی اختیار کرو اور سختی سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الرِّفْقَ لَا یَکُوْنُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ

وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ "بلاشبہ نرمی جس چیز میں ہو اس کو حسن وزینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کرلی جائے اس کو بدنما بنادیتی ہے۔" (مسلم، مشکوۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام بنادیتی ہے اور اس میں حسن وزینت پیدا کردیتی ہے۔ اس کے برعکس سختی اور درشتی ہر کام کو بگاڑتی اور عیب دار وبدنما کردیتی ہے، البتہ جہاں قانونِ شریعت یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہے وہاں سختی کے بجائے نرمی کرنا حق وعدل سے ہٹی ہوئی بات اور مخلوقِ الٰہی پر ظلم ہے۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کوئی حد توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کی جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں، ایسے لوگوں کے شر کو روکنے، ان کی سازشوں کو ختم کرنے اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے اُن پر پوری سختی کی جاسکتی ہے۔

سنگ دل اور درشت خو، نیکی سے محروم رہتا ہے

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ يُّحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ "جو آدمی نرمی ومہربانی سے محروم کیا گیا وہ نیکی اور خیر سے محروم کیا گیا۔"
(صحیح مسلم، مشکوۃ)

جامع صغیر کی روایت میں خیر کے ساتھ كُلَّهٗ کا لفظ بھی ہے، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص نرمی ومہربانی کی خوبیوں سے خالی ہوتا ہے وہ تمام بھلائیوں اور ساری کی ساری خیر سے محروم رہتا ہے۔

دنیا وآخرت کی خیر حاصل کیجیے اور محرومی سے بچیے

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ فَقَدْ اُعْطِیَ حَظَّهٗ مِنَ الْخَيْرِ وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الْخَيْرِ "جس شخص کو نرمی ومہربانی میں سے اس کا اپنا حصہ دیا گیا اس کو (دنیا وآخرت کے) خیر میں سے حصہ مل گیا اور جو شخص

نرمی ومہربانی میں سے اپنے حصے سے محروم کیا گیا وہ (دنیاوآخرت میں) خیر کے حصہ سے محروم کیا گیا۔"

(ترمذی ص ۴۸۷)

خوش کلامی اور اس کا حکم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا "اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔"

(سورۂ بقرہ: آیت ۸۳)

اچھی بات کہنے میں اچھی باتوں کی تعلیم کرنا، لوگوں کو نصیحت کرنا اور لوگوں سے ان کے فائدے اور کام کی باتیں کہنا، باتوں میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کے پہلو کو ملحوظ رکھنا، سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، لوگوں کا حال احوال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، مصیبت کے وقت تسلی کی بات کرنا، اچھی باتیں سمجھانا داخل ہیں یہ سب اسی ایک صفت "قولِ حسن" یعنی خوش کلامی کی مختلف جزئیات ہیں۔ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور اس سے خوشگوار تعلقات اور باہم مروت اور محبت وغیرہ جیسی بہت سی بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس بدگوئی اور بدکلامی سے لوگوں میں افتراق وانتشار، دلوں میں غصہ، نفرت اور حسد وغیرہ جیسی برائیاں اور قلبی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو چاہیے کہ اچھی بات کہیں، نیک بول بولیں، نیک بات اچھے لہجے میں کہیں، بدگوئی سے پرہیز کریں، ایک دوسرے کو برے ناموں، برے لفظوں، نفرت انگیز اور تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ پکارنے اور بلانے سے اور غلط خطابات سے اپنی زبان کی حفاظت کریں۔ لوگوں کا مذاق اُڑانے، ان کو طعنہ دینے، ان کے درمیان چغلی کھانے، ان کی غیبت کرنے سے بچیں، اور درشتی، سخت گوئی اور فحش گوئی وغیرہ سے بھی اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مسلمانوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کا مذاق نہ اُڑائیں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دیں اور نہ ایک دوسرے کو برے لفظوں اور برے ناموں سے پکاریں۔

(دیکھیے تفصیل کے لیے سورۂ حجرات: آیت ۱۲)

بدکلامی شیطان کا کام ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ

بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا۝ ”اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان آپس میں لڑا دیتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔“ (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۵۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بدگوئی شیطانی کام ہے۔ شیطان اس کے ذریعے لوگوں میں نفرت، حسد اور بغض وغیرہ کے بیج بوتا ہے۔

قیامت کے روز بدترین آدمی فحش گو اور بدگو ہو گا

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: اِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَاللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ وَدَعَهُ اَوْ تَرَكَهُ النَّاسُ اِتِّقَاءَ فُحْشِهٖ ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ کے لحاظ سے بدترین آدمی قیامت کے دن وہ شخص ہو گا جس کی بدزبانی اور سخت کلامی کے ڈر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔“ (بخاری، مسلم، مشکوۃ)

بدزبانی اور سخت کلامی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے ملنے جلنے اور بات کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں، اور جس شخص کا یہ حال ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین آدمی ہے اور قیامت کے دن اس کا حال بھی بدترین ہو گا۔

نرم اور میٹھی بات صدقہ ہے

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: اَلْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ ”اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ (یعنی نیکی) ہے۔“ (بخاری)

کسی کے ساتھ اچھی بات میٹھے اور شیریں انداز میں کرنا اس کا دل خوش کرنے کا سبب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کا دل خوش کرنا اُس پر صدقہ کرنا ہے اور بہت بڑی نیکی ہے۔

مؤمن لعن طعن کرنے والا اور بدگو نہیں ہوتا

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ ”مؤمن بندہ نہ طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا، اور نہ فحش گوئی کرنے والا اور نہ گالی بکنے والا ہوتا ہے۔“ (ترمذی)

آپس کی گالی گلوچ کا سارا گناہ گالی کی ابتدا کرنے والے پر ہوتا ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْمُسْتَبَّانِ مَاقَالَا فَعَلَى الْبَادِیْٔ مَالَمْ یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ "دو شخص ایک دوسرے کو گالیاں دیں تو ان ساری گالیوں کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے (گالیوں میں) پہل کی، جب تک مظلوم (یعنی جس کو گالیاں دے دی گئی ہیں) تجاوز نہ کرے۔" (مسلم، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے گالی دینے میں پہل کی ہے اس کو اپنی گالی گلوچ کا گناہ تو ہو گا ہی، دوسرے شخص کی ان گالیوں کا گناہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ دوسرا شخص جواب میں زیادتی نہ کرے۔ اگر اس دوسرے شخص نے جوابی گالیوں میں زیادتی کی کہ اس نے پہل کرنے والے کو زیادہ گالیاں دیں، یا زیادہ سخت گالیاں دیں، یا ابتدا کرنے والے نے جو ایذا اور تکلیف پہنچائی تھی، اس نے پہل کرنے والے کو اس سے زیادہ تکلیف پہنچائی، تو اس صورت میں یہ دوسرا شخص بھی اپنے جرم کی مقدار کا گناہ اور عذاب پائے گا۔

جو شخص قابلِ لعنت نہ ہو اس پر لعنت کرنا خود اپنے آپ کو مبتلائے لعنت کرنا ہے

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مَنْ لَعَنَ شَیْئًا لَیْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَیْهِ "جو شخص کسی چیز پر لعنت کرے جو اس لعنت کے قابل نہ ہو تو وہ لعنت اسی پر لوٹ کر آتی ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

جو چیز قابلِ لعنت نہ ہو یا جو شخص کافر یا فاسق نہ ہو اس پر لعنت کرنا یا اس کو کافر یا فاسق وغیرہ کے الفاظ سے گالی دینا ایسا بدترین گناہ ہے کہ یہی لعنت اور کفر وفسق وغیرہ اس کہنے والے پر لوٹ آتے ہیں، جیسا کہ مسلم وبخاری وغیرہ کی صحیح حدیثوں سے یہ ثابت ہے۔

فحش گوئی کی مذمت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا شَیْءٌ اَثْقَلَ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ فَاِنَّ اللّٰهَ لَیُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ "قیامت کے دن

مؤمن کے میزانِ اعمال میں رکھی جانے والی چیزوں میں بہت وزنی چیز اچھے اخلاق ہیں، اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بدزبان سے سخت نفرت کرتا اور بغض رکھتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

نرم مزاج اور نرم خو شخص کی فضیلت

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَنْ یَحْرُمُ عَلَی النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَیْهِ عَلٰی کُلِّ هَیِّنٍ لَیِّنٍ قَرِیْبٍ سَهْلٍ "کیا میں تمہیں وہ شخص نہ بتاؤں جو دوزخ کی آگ پر حرام ہوگا اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہوگی، (تو سنو!) دوزخ کی آگ ہر اُس شخص پر حرام ہوگی جو مزاج کا سخت نہ ہو، نرم ہو، لوگوں سے قریب ہونے والا نرم خو ہو۔"

(احمد و ترمذی عن عبد اللہ بن مسعود، مشکوٰۃ)

عار دلانے والے کے بارے میں وعید

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: مَنْ عَیَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ یَمُتْ حَتّٰی یَعْمَلَهٗ قَالَ اَحْمَدُ قَالُوْا مِنْ ذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی گناہ پر عار دلاتا ہے تو وہ عار دلانے والا مرنے سے قبل خود بھی اس گناہ میں (کسی نہ کسی طرح ضرور) مبتلا ہوتا ہے۔ (راوی کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی) مراد اس گناہ سے متعلق تھی جس سے اس نے توبہ کرلی ہو۔"

(ترمذی عن خالد بن معدان، مشکوٰۃ)

کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے، پھر وہ اس پر نادم ہو کر تائب ہوجائے، یہ اس کی سلامتِ طبع اور حسنِ اسلام کی علامت ہے۔ اس صورت میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کو سابقہ گناہ پر ٹوکے اور اس کو عار اور شرم دلائے اور ملامت کرے، البتہ جو شخص توبہ کیے بغیر کسی گناہ میں مبتلا رہتا ہے، مثلاً: داڑھی منڈاتا ہے، یا کوئی نشہ کرتا ہے، یا کسی غلط عقیدے میں مبتلا ہے تو اس کو تنبیہ کرنا اور اس کو ملامت کرنا درست ہے بشرطیکہ یہ ملامت وغیرہ درست طریقہ پر ہو اور بطریقِ تکبر اور بقصدِ تحقیر و تذلیل نہ ہو بلکہ مقصد صرف نصیحت، خیر خواہی اور اس کو اس گناہ سے روکنا ہو۔

زبان کی لغزش نہایت خطرناک ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الْعَبْدَ لَیَقُوْلُ الْکَلِمَةَ لَا یَقُوْلُهَا اِلَّا لِیُضْحِكَ بِهِ النَّاسَ

یَھْوِیْ بِھَا اَبْعَدَ مِمَّا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَاِنَّہٗ لَیَزِلُّ عَنْ لِسَانِہٖ اَشَدَّ مِمَّا یَزِلُّ عَنْ قَدَمِہٖ ''بے شک بندہ ایک بات کہتا ہے اور صرف اس لیے کہتا ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کو ہنسائے (حالاں کہ) وہ اس کی وجہ سے (دوزخ میں جا) گرتا ہے اور اتنی دوری سے گرتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بندہ اپنے قدموں کے ذریعے پھسلنے سے زیادہ سخت اپنی زبان کی وجہ سے پھسلتا ہے۔'' (بیہقی، مشکوٰۃ)

ہر آدمی کو چاہیے کہ اپنی زبان قابو میں رکھے اور اس کو نامناسب اور بے فائدہ باتوں سے محفوظ رکھے۔

زبان کو قابو کرنے کا طریقہ

نفس کو زیادہ بولنے میں مزہ آتا ہے اور اس سے سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کو طعنہ دینا، اپنی بڑائی جتانا، خواہ مخواہ کسی سے بحث کرنا، گالی گلوچ، امیروں اور منصب داروں کی خوشامد کرنا، کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا، سنی سنائی باتوں کو پھیلانا وغیرہ؛ ان تمام نامناسب اور بے فائدہ باتوں کی آفتوں سے بچنا اُس وقت ممکن ہے جب زبان کو قابو میں رکھا جائے۔ زبان کو قابو میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو بات منہ سے نکالنی ہو اس بات کو دل میں آتے ہی نہ کہیں، بلکہ پہلے خوب سوچ لیں کہ اس بات میں گناہ ہے یا ثواب یا کہ نہ گناہ ہے نہ ثواب۔ اگر وہ بات ایسی ہے جس میں ذرہ برابر بھی گناہ کی آمیزش ہو تو اپنی زبان بالکل بند کر لیں۔ اگر نفس اس بات کے کرنے کا تقاضا کرے تو اس کو یوں سمجھائیں کہ اس وقت تھوڑا سا اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا اور صبر کرنا آسان ہے اور دوزخ کا عذاب بہت سخت ہے۔ نیز ہر اچھی بات کے بارے میں بھی یہ سوچیں کہ اس بات کو کرنے کا سب سے میٹھا اور شیریں انداز کیا ہے، پھر اپنی اچھی اور خیر کی بات کو بھی شیریں اور بہترین انداز میں ادا کرنے کی کوشش کریں۔

چغلی کی مذمت

چغل خوری یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکایا جائے۔

مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان الفت و محبت کی فضا بنائیں، اگر ان میں ناچاقی ہو تو ان کے درمیان صلح کرا دیں۔ چغلی کھانا اس کے بالکل خلاف اور ضد ہے۔ جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ناپسندیدہ باتوں کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور پھر ایک کی بات دوسرے تک ایسے انداز میں پہنچاتے ہیں جس سے مسلمانوں کے درمیان بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے اور قوموں، قبیلوں اور عزیز و اقارب وغیرہ میں فساد کی آگ بھڑکتی ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی بداخلاقی ہے اس کی وجہ سے دو اشخاص کے درمیان اور عزیز و اقارب اور دوست احباب وغیرہ میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے۔ چغل خور لوگ معاشرہ میں بدترین کردار ادا کر کے معاشرہ میں اخوت، باہمی محبت و الفت اور رحمت کی زندگی کو جلا کر درہم برہم کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے شریر اور برے لوگ کون ہیں، پھر خود ہی آپ ﷺ نے فرمایا: الْمَشَّاءُوْنَ بِالنَّمِيمَةِ الْمُفْسِدُوْنَ بين الاَحِبَّةِ یعنی "جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں (عزیزوں وغیرہ) کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔" (مسند احمد، دیکھیے مجمع الزوائد: جلد نمبر ۸، ص نمبر ۹۳)

اور ایک حدیث شریف میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے۔ وہاں دو قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو عذاب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ وہ پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرے کو اس لیے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

نیز حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ "چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

چغلی کھانا اور لوگوں کے درمیان نفاق اور دشمنی پیدا کرنا دین کو ختم کرتا ہے

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلٰوةِ، وَالصَّدَقَةِ قَالُوا بَلٰى قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ "کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتلاؤں جس کے ثواب کا درجہ روزے، نماز اور صدقہ کے ثواب سے زیادہ

ہے ؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: "ہاں" (ضرور بتلا دیجیے) ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (آپس میں دشمنی رکھنے والے) لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانا، (اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) اور لوگوں کے درمیان فساد (یعنی جدائی اور دشمنی) پیدا کرنا ایک ایسی خصلت ہے جو مونڈنے والی ہے (یعنی دین کو تباہ و برباد کر دیتی ہے)۔ (شرح السنۃ ترمذی)

چغل خوروں کی باتوں کو ناقابل اعتبار قرار دیا جائے

یہ بداخلاقی چونکہ زیادہ تر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو نہایت خبیث ہوتے ہیں یا ایسے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو کم ہمت اور پست حوصلہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بغض وانتقام کی وجہ سے، یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں مقام حاصل کرنے، یا معاشرہ میں اپنے لیے کوئی خاص جگہ بنانے کے لیے جب کوئی اور ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں، اس لیے ان کے شر وفساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے، یہی قرآن مجید کی تعلیم ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۞ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ ۞ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۞ "اور آپ ہر ایسے شخص کی بات نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، ذلیل ہو، طعنہ دینے والا اور چغلی کھانے والا ہو بھلائی سے روکنے والا، زیادتی کرنے والا، بد عمل ہو۔" (سورۂ قلم: آیت ۱۰ تا ۱۱)

سلیمان بن عبد الملک کی مجلس میں حضرت زہری رحمہ اللہ بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور سلیمان نے اس شخص سے کہا: "میں نے سنا ہے کہ تو نے میری شکایت کی ہے"۔ اس شخص نے انکار کیا۔ سلیمان نے کہا: "میں نے معتمد شخص سے سنا ہے"۔ اس پر حضرت زہری بول اٹھے: "اے سلیمان! وہ شخص جس نے تمہارے سامنے کہا کہ فلاں شخص نے تمہاری شکایت کی ہے چغل خور ہے اور چغل خور کبھی سچا نہیں ہوتا"۔ (احیاء العلوم: باب النمیمۃ)

غیبت کا بیان

غیبت گناہ کبیرہ ہے اس کو گناہ نہ سمجھنے والا کافر ہے۔ آج کل یہ گناہ بہت عام ہے، ہماری گفتگو میں دلچسپی ہی اس سے پیدا ہوتی ہے بلکہ عصرِ حاضر کے دیندار طبقہ علما و مشائخ اور صلحا میں بھی غیبت کا یہ سلسلہ چل پڑا ہے، ایک دوسرے پر تنقید کرنے اور اپنی فوقیت و برتری کا سکہ اپنے متعلقین، مریدین اور شاگردوں وغیرہ پر جمانے کی بیماری عام ہوگئی ہے، حالاں کہ غیبت انہی بیماریوں میں سے ہے جن کی وجہ سے عموماً امت مسلمہ میں جھگڑے و فسادات برپا ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے دلوں میں ظلمت و نفاق اور بزدلی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے قلوب میں فتنہ و فساد کا بیج پڑتا ہے۔ غیبت کو قرآن مجید اور احادیثِ نبوی میں سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی انتہائی قباحت خباثت اور گندگی کو ذہن نشین کرانے کے لیے قرآن و حدیث میں غیبت کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ غیبت کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ محشر غیبت کرنے والے کی نیکیاں ان تمام لوگوں میں تقسیم کر دے گا جن کی اس نے غیبت کی ہے اور جب اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اان لوگوں کے گناہوں کو اس غیبت کنندہ کے سر ڈال دے گا اور اس کے بعد وہ شخص دوزخ کے سخت ترین عذاب میں پھینک دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دوزخ کے عذاب سے بچائے۔ آمین

غیبت کی تعریف

غیبت کا مادہ "غ ـ ی ـ ب" ہے اور غیب کے معنی ہیں، غائب ہونا، پوشیدہ، غیر حاضر ہونا، چھپنا، اور ہر وہ چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اور غیبت کے معنی "کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں، یعنی کسی ایسے شخص کی برائی بیان کرنا جو وہاں حاضر اور موجود نہ ہو" غیبت یعنی پیٹھ پیچھے اور عدم موجودگی کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کی اس غیبت کرنے کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کی غیر موجودگی میں صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز اور ہم خیال ہوں یا کم از کم ان سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور وہ اس کے سامنے غیبت کنندہ کا یہ راز فاش

کر دیں گے۔ غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھناؤنا حرکت بنا دیتی ہے اس لیے کہ اس سے نہ حق کی حمیت و حمایت کا مقصد حاصل ہوتا ہے نہ کسی کی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے، بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا غیبت کا اصطلاحی معنیٰ اور اس کی جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ "کسی معین مسلمان یا ذمی ① کو ذلیل کرنے کے لیے اس کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی ایسا واقعی عیب بیان کرنا کہ اگر اس کی اطلاع اس کو ہو جائے تو اس کی ناگواری اور تکلیف کا سبب بنے"۔

غیبت کیا ہے کیا نہیں؟

غیبت کی مذکورہ تعریف کی رو سے مندرجہ ذیل امور خود بخود غیبت کے مفہوم اور حکم سے خارج ہو جاتے ہیں:

۱۔ اگر کسی کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بری بات کہی جائے جو اس میں موجود نہ ہو تو یہ غیبت نہیں، بلکہ غیبت سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے جس کو بہتان و افتراء اور تہمت کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ" غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اس طرح کرو جس کو وہ (اگر سنے تو وہ اس کو) ناگوار گزرے۔ کسی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اگر میں اپنے بھائی کی کوئی ایسی برائی بیان کروں جو واقعتاً اس میں موجود ہو (تو کیا یہ بھی غیبت ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ اغْتَبْتَهُ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهُ " غیبت جب ہی ہو گی جبکہ وہ برائی اور عیب اس میں موجود ہو اور اگر اس میں وہ برائی اور عیب موجود نہیں ہے (جو تم نے اس کی طرف نسبت کر کے بیان کیا) تو (پھر) یہ بہتان ہے (جو غیبت سے بھی زیادہ سخت اور سنگین گناہ اور جرم ہے)۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

---

① ذمی حکومتِ اسلامیہ کے غیر مسلم رعایا کو کہتے ہیں۔

۲۔ اگر کسی کے روبرو اس کی برائی بیان کی جائے کہ تو نے ایسا کیا ہے یا تو ایسا ہے اور اس سے مقصد اس کو نصیحت اور خیر خواہی ہو اور اس کا طرز، اس کی صورت اور طریقہ بھی نصیحت اور خیر خواہانہ ہو تو یہ نصیحت اور نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے اور اگر اس سے مقصود اس کی تذلیل ہو اور اس کا طرز وطریقہ ایسا ہو کہ اس میں نصیحت اور خیر خواہی کی آمیزش نہ ہو تو اس کو طنز و طعنہ کہا جاتا ہے جس کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔

۳۔ کسی کے خلاف تھانہ میں رپٹ لکھوانا بھی اس سے خارج ہو گیا کیونکہ اس صورت میں وہ غیبت نہیں کرتا، بلکہ حکومت کے ذریعے ظالم سے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے اور اس کو حکومت کے ذریعے پکڑ کر اس پر حکومت کے روبرو اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۔ کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا روبرو ہوتی ہے اور اس سے حق کی حمایت مقصود ہوتی ہے اور شہادتِ حق امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے۔

۵۔ انکارِ منکر روبرو بھی ہوتا ہے اور کسی کی اصلاح کے لیے اس کی خامیاں اس کے بڑوں کو بتانا جو اس کو ان جرائم سے روکے یہ بھی غیبت نہیں، بلکہ انکارِ منکر ہے اور اصلاح سے تو اس امت کا قیام وبقاوابستہ ہے۔

۶۔ جو شخص اعلانیہ گناہ کرتا ہے، مثلاً بر سر عام نشہ کرتا ہے یا لوگوں پر ظلم کرتا رہتا ہے، چغلیاں کرتا رہتا ہے وغیرہ تو ایسے شخص کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور ان سے لوگوں کو خبر دار کرنا جائز ہے تاکہ وہ اس فعلِ بد سے رک جائے یا کم از کم دوسرے لوگ اس ضرر سے بچ جائے یہ بھی غیبت نہیں، بلکہ انکارِ منکر اور نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے اور غیبت تو اس وقت ہوتی ہے کہ اس کی چھپی ہوئی برائی کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کیا جائے اور یہ تو خود اپنی برائی اور فعلِ بد پر گویا فخر کرکے دوسروں کو اس فعلِ بد کی دعوت دیتا ہے۔

۷۔ کوئی کسی کے بارے میں مشورہ طلب کرے کہ فلاں سے رشتہ کروں یا نہ کروں یا فلاں کے ساتھ تجارت میں شرکت کروں یا نہیں تو ایسی صورت میں صحیح مشورہ دینا ضروری ہے، بلکہ اگر کوئی سیدھا سادہ مسلمان کسی چور خائن کے ساتھ شراکت کرتا ہے اور وہ اس کی حالت سے واقف نہیں ہے ایسی صورت

میں اگرچہ اس نے مشورہ طلب نہ کیا ہو تب بھی اپنے مسلمان بھائی کی خیر خواہی اور ضرر سے بچانے کی غرض سے کسی کے متعلق کوئی بات کہی جائے تو یہ غیبت نہیں، بلکہ یہ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کو ضرر سے بچائے اور حق کی حمایت کرے۔

۸۔ دین کی حفاظت کے لیے غلط عقائد اور باطل باتوں کے پھیلانے والوں کی نشاندہی کرنا تاکہ عوام گمراہی مبتلا نہ ہو جائے جیسا کہ محدثین راویوں کے عیوب بیان کرتے ہیں کہ فلاں جھوٹا ہے وغیرہ، یہ بھی غیبت نہیں کیونکہ مقصود حفاظتِ دین ہے اور جرح و تعدیل پر تو شریعت کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ خبر اور خبر کے پہنچانے والے کے بارے میں خوب تحقیق کریں۔

مذکورہ بالا چند صورتوں کو ذکر کیا گیا ہے ان میں غور و فکر سے معلوم ہو گا کہ جن میں حق اور دینِ حق کی حمایت مقصود ہوتی ہے یا مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کو ضرر سے بچانا مقصود ہوتا ہے وہ اور اس طرح کے سارے امور غیبت کے مفہوم سے خارج ہیں۔

بعض گہری قسم کی غیبتیں

بعض دیندار لوگ ایسی گہری غیبت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عام لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ غیبت نہیں کرتے، حالاں کہ وہ غیبت کے جرم میں مبتلا ہوتے ہیں، مثلاً وہ جس شخص کی غیبت کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نام لیے بغیر اس کی غیبت ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ وہ حاضرینِ مجلس پر مخفی بھی نہ رہے اور اس کا نام لینے سے بھی اس لیے پرہیز کرتے ہیں کہ ان کی تقویٰ و پرہیز گاری پر حرف نہ آسکے اور بعض زیادہ مکار لوگ جس شخص کی غیبت کرنا چاہتے ہیں وہ اس کا نام لے کر اس کے اوصاف اور خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے ان خوبیوں کے پس پردہ اس کی غیبت کرتے ہیں، ان کا مقصد اس کی خوبیاں بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ حاضرین کے سامنے اس کا عیب کھولنا چاہتے ہیں جیسا کہ کوئی شخص دودھ یا شہد کے اوصاف بیان کرکے آخر میں کہہ دے کہ افسوس اس میں پیشاب کے قطرے نہ پڑے ہوتے" اور بعض حضرات تو اس سے بھی زیادہ مکارانہ غیبت میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ جب کسی شخص کا کوئی عیب بیان کرتے ہیں تو اپنے آپ کو بھی اس عیب میں شامل کرتے ہیں مثلاً وہ کسی کی خوبیاں بیان کرکے آخرم میں یوں کہہ

دیتے ہیں کہ ان ساری خوبیوں کے باوجود وہ بھی میری طرح فلاں روحانی مرض مثلاً تکبر میں مبتلا ہے اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اس مہلک مرض سے نجات دیدے۔

اس صورت میں یہ حضرات اپنی مذمت کی آڑ میں دوسروں کی غیبت بھی کرتے ہیں اور حاضرینِ مجلس پر اپنے تواضع اور انکساری کا سکہ بھی جمانا چاہتے ہیں، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نہ نام لیتے ہیں نہ اشارۃً غیبت کرتے ہیں، لیکن ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کے سامنے کسی شخص کی غیبت ہو رہی ہو تو وہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں مثلاً یوں کہتے ہیں کہ اوہو وہ بھی یوں کرتے ہیں ؟اور اس سے ان کا مقصد غیبت کنندہ کو خوش کرنا ہوتا ہے اور حاضرینِ مجلس کو یہ بتلانا ہوتا ہے کہ دیکھیے فلاں کس جرم عظیم میں مبتلا ہے، اس طرح وہ اس کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔

غرض غیبت کی بعض صورتیں بہت باریک اور گہری ہوتی ہیں اس لیے دوسروں کے متعلق تو نیک گمان رکھیں، لیکن خود اپنے آپ کو کرید کرید کر معلوم کر لیا کریں کہ آیا کسی مکاری اور چالاکی سے کسی کی غیبت کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں ؟ اگر آپ کی غیبت کو دوسرے لوگ نہ سمجھیں تو کیا ہوا؟ معاملہ تو علیم وخبیر کے ہاں پیش ہونا ہے جس پر نہ کسی کی نیت اور مقصد چھپ سکتا ہے اور نہ کسی کا خیال وحال اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ صورت میں غیبت کے ساتھ نفاق کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے کہ غیبت بھی کرتا ہے اور اپنی پرہیز گاری بھی جتلاتا ہے۔

غیبت کے بارے میں وعیدیں

قرآن مجید اور احادیثِ نبوی میں غیبت کی سخت مذمت اور اس کے بارے میں بڑی وعیدیں آئی ہیں چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۞ ”اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم برا سمجھتے ہو اور اللہ تعالیٰ (سے ڈرتے رہو اور اس) کی نافرمانی سے بچتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (حجرات:۱۲)

مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کی غیبت مت کرو کیوں کہ یہ ایسا برا عمل ہے جیسے اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا، حالاں کہ تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، لہٰذا جب تم اس عمل کو برا سمجھتے ہو تو غیبت کو بھی برا سمجھو۔

ذرا غور کریں! اس آیتِ کریمہ میں غیبت کو کس قدر گھناؤنا جرم قرار دیا گیا، ایک تو انسان کا گوشت کھانا اور آدم خور بن جانا کتنی قبیح بات ہے، پھر انسان بھی اپنا بھائی، پھر بھائی بھی زندہ نہیں بلکہ مردہ، اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا جس قدر سنگین جرم اور گناہ کی بات ہے اتنا ہی دوسرے مسلمان بھائی کی غیبت کرنا سنگین اور خطرناک ہے۔ نیز یہ غیبت کس قدر گھناؤنا عمل اور کتنا بدبودار اور بزدلانہ فعل ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کا اس حال میں گوشت کھا رہا ہے جبکہ وہ مردہ پڑا ہوا ہے اور اپنی مدافعت سے بالکل قاصر ہے، یہی حال غیبت کا ہوتا ہے کہ اس میں آدمی اپنے کسی مسلمان بھائی کی اس کے پیٹھ پیچھے برائی بیان کرتا ہے اور وہ اپنی صفائی پیش کرنے اور مدافعت سے قاصر ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں میرا گذر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے جن سے وہ اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے، میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ لوگوں کا گوشت کھاتے تھے (یعنی غیبت کرتے تھے) اور ان کی عزتوں اور آبروؤں پر حملے کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

غیبت زنا سے بھی بڑا گناہ ہے

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا "غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ غیبت زیادہ سنگین کیونکر ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ آدمی زنا کرلیتا ہے تو توبہ کرنے سے اس کی مغفرت اور بخشش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو سکتی ہے مگر غیبت کرنے والے کو جب تک خود وہ شخص معاف نہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے اس کی بخشش اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو گی۔ (بیہقی مشکوٰۃ)

غیبت کا زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہونے کی وجوہات

غیبت کا زنا سے زیادہ سخت اور سنگین گناہ ہونے کی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ جب مسلمان شخص زنا کا ارتکاب کر جاتا ہے تو وہ اپنی بد بختی پر روتا ہے اس کے دل پر خوفِ الٰہی طاری ہو جاتا ہے اور اس عظیم گناہ کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزنے لگتا ہے اور اپنے اس گناہ پر شرمندہ ہو کر آنسو بہاتا رہتا ہے اور صدق دل سے توبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی معافی اور بخشش ہو جاتی ہے جبکہ غیبت کرنے والے کو بہت کم احساس ہوتا ہے۔ غیبت کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے حق کو بھی اور حقوق العباد کو بھی ضائع کرتا ہے اس لیے جب تک وہ شخص جس کی اس نے غیبت کی ہے اس کو معاف نہ کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی نہ ہو گی۔

۲۔ غیبت کا سبب اگرچہ کسی کے ساتھ عداوت، دشمنی اور ناچاقی بھی ہوتا ہے، لیکن غیبت کا اکثری سبب تکبر ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اس لیے عموماً ان لوگوں کی غیبت کرتا ہے جن کے بارے میں یہ خطرہ ہو کہ کہیں وہ لوگوں کی نظروں میں مجھ سے نہ بڑھیں۔

۳۔ زنا کرنے والا اقراری مجرم ہے، وہ اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا ہے، جبکہ غیبت کرنے والوں کی اکثریت اپنے آپ کو گناہ گار نہیں سمجھتی، بلکہ اپنی غیبت کی طرح طرح کی تاویلات کر کے اپنے آپ کو غیبت سے پاکدامن سمجھتی ہے اس لیے غیبت کرنے والوں کو غیبت سے بہت کم توبہ کرنے کی توفیق ملتی ہے۔

۴۔ غیبت کرنے والے کی نظر دوسروں کے عیوب پر ہوتی ہے اسے اپنے عیوب کی طرف توجہ نہیں رہتی اس لیے اس کو اپنی اصلاح کی فکر ہی نہیں ہوتی۔

۵۔ غیبت کی وجہ سے دوسروں کی عزت خراب کی جاتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ عزت کو لوٹنے والا جان و مال کے لوٹنے والے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

غور کیجیے! جان کی حفاظت اور صحت کے لیے مال خرچ کیا جاتا ہے اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے جان و مال دونوں قربان کیے جاتے ہیں اور غیبت میں اس قیمتی چیز یعنی عزت پر ڈاکہ زنی ہے۔

غیبت کے دنیوی نقصانات

غیبت کی وجہ سے صرف آخرت برباد نہیں ہوتی، بلکہ اس کے دنیاوی نقصانات بھی بہت سنگین ہیں:

۱۔ غیبت کی وجہ سے باہمی اتفاق و اتحاد، الفت و محبت برباد ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائی بہنوں اور معاشرہ کے درمیان اختلافات باہمی عداوتیں اور دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۲۔ غیبت کرنے والے کے دل میں بزدلی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور دور خاپن بھی اور یہ دونوں بدترین امراض ہیں۔

۳۔ جو لوگ غیبت کر کے لوگوں کو رسوا اور ذلیل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دنیا میں بھی ذلیل ورسوا کرتے ہیں جیسا کہ یہ بات بہت سی حدیثوں سے ثابت اور سنن ابی داؤد اور ترمذی میں اس کی صراحت بھی موجود ہے کہ جو شخص مسلمان کے عیب کھولے گا اللہ تعالیٰ اس کو شرمندہ اور رسوا کرے گا اگرچہ وہ اپنے مکان میں چھپا ہوا ہو۔

غیبت سننا بھی ناجائز ہے

جس طرح غیبت حرام ہے اسی طرح غیبت کا سننا بھی ناجائز اور حرام ہے، اگر کوئی شخص کسی کی غیبت کر رہا ہے تو سننے والے پر لازم ہے کہ اس کو کاٹ دے یا کم از کم اس مجلس سے اٹھ جائے۔

غیبت کاٹنے اور دفاع کا اجر و ثواب اور نہ کرنے پر سزا و عذاب

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی مدد کرے، جس مجلس میں کسی مسلمان کی غیبت ہو رہی ہو تو دوسرے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے، اس کی عزت کو بچائے اور جو مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں اس کا اجر و ثواب دے گا۔

چناں چہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی غیبت کی جائے اور وہ اس مسلمان بھائی کی مدد کرنے پر قادر ہو پھر وہ اس کی مدد

کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی مدد کرے گا اور اگر وہ مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی گرفت کرے گا۔ (شرح السنۃ مشکوٰۃ)

نیز اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی پیٹھ پیچھے اس کا گوشت کھانے سے باز رکھے تو اس کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ سے آزاد کرے۔ (بیہقی مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے سامنے کسی مسلمان بھائی کی غیبت ہو رہی ہے اور وہ اس بری حرکت سے غیبت کرنے والے کو روکے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دے گا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد نہ کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو (اور غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہ روکے) تو اللہ تعالیٰ بھی (دنیا و آخرت میں) اس موقع پر اس شخص کی مدد نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا ہے (اور اس کی مدد کا محتاج ہو) اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر اس شخص کی مدد کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا ہے (اور اس کی مدد کا محتاج ہو)۔ (ابو داؤد مشکوٰۃ)

غیبت کا علاج اور اس سے توبہ

غیبت سے بچنے کے لیے چند تدابیر اور نسخے یہ ہیں:

۱۔ غیبت کا عذاب اور اس کی دنیاوی و اخروی نقصانات بار بار سوچیں اور موت کو یاد کریں۔

۲۔ اپنے اعمال اور زندگی کا محاسبہ کریں کہ بالغ ہونے کے بعد اب تک کتنے لوگوں کی غیبت کر چکے ہیں اور کس قدر اپنی نیکیاں ضائع کر کے دوسروں کے کھاتے میں ڈال دیے اور خواہ مخواہ دوسروں کے گناہ اپنے سر پر لے لیے۔

۳۔ غیبت پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیے، توبہ کریں اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کریں اور جن لوگوں کی غیبت کی ہے ان سے معافی مانگیں اور ان سے اپنا قصور معاف کرائیے، شرط یہ ہے کہ یہ

معافی مانگنا اور معاف کرانا صدق دل سے ہو، کیونکہ اگر ظاہر میں معافی مانگ لی اور معاف کرالیا اور دل میں نادم نہیں ہوا تو یہ توبہ اور معافی مانگنا نہیں بلکہ ریاکاری اور نفاق ہے۔

۴۔ جس شخص کی غیبت کی ہو اور وہ شخص مر گیا ہو یا وہ کسی ایسے شہر اور ملک چلا گیا ہے جس سے خط وکتابت یا اس سے ملاقات ہونا ناممکن ہو تو لازم ہے کہ ایسے شخص کے واسطے استغفار کرے اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسی تعریف کے بدلے ہم کو نہ پکڑے اور وہ شخص قیامت کے روز مجھ سے نہ جھگڑے۔

اسی طرح جس شخص کی غیبت کی ہے اور اس کو آپ کی غیبت کی خبر نہ ہو اور اس بات کا خطرہ ہو کہ اگر اس کو معلوم ہوا تو وہ الٹا میرے ساتھ عداوت اور دشمنی کرے گا اور اس کے دل میں بغض پیدا ہوگا تو اس کے لیے بھی دعائے خیر اور استغفار کریں اور اس کی لوگوں میں تعریف کریں اور آئندہ غیبت نہ کرنے کا عزم کریں۔

جن لوگوں کی غیبت کی ہے وہ معلوم نہیں اور بھول گئے ہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے خیر اور ان کے لیے استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے اور ان کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں اور کامیابیاں نصیب فرمائے۔ اور بعض روایتوں میں غیبت کا کفارہ جو بتایا گیا ہے کہ:

" غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش کی دعا مانگو جس کی تم نے غیبت کی ہے "۔ (مشکوٰۃ)

اس کا تعلق انہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جن کا بیان اس نمبر ۴ میں ہوا۔

۵۔ جو لوگ دوسروں کی غیبتیں کرتے ہیں ان سے اور جن مجالس میں غیبت ہو رہی ہو ان سے پرہیز کریں، اس کے برعکس ایسی مجالس اور ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں جو نیکوکار، پرہیزگار ہوں اور جن کی مجلس اور صحبت میں فکرِ آخرت اور غیبت وغیرہ گناہوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

غیبت سننے سے بچنے کا آسان علاج

بعض لوگ اگرچہ غیبت کرنے سے بچنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن جب کوئی دوسرا غیبت

شروع کر دیتا ہے تو وہ نہ اس کو خاموش کر سکتے ہیں اور نہ وہاں سے اٹھ سکتے ہیں ان پر مروت غالب آجاتی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ یہ سوچیں کہ اگر آپ کا بھائی بہن، بیوی یا شوہر یا آپ کے والدین یا کوئی بڑا حاکم اور افسر وغیرہ میں سے کوئی آپ سے یہ کہہ دے کہ میں آپ کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا چاہتا ہوں اگر آپ میری یہ بات نہیں مانیں گے تو میں ناراض ہو جاؤں گا، تو کیا آپ ایسی ہمت کر سکتے ہیں کہ صرف اس کی ناراضگی سے بچنے کے لیے اپنے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا پسند کر لیں ؟ ہر گز نہیں حالاں کہ اس میں صرف وقتی درد، سوزش اور نقصان ہے جبکہ غیبت سننے کی وجہ سے بندے کا دین برباد ہو جاتا ہے اور اس کو سخت عذاب ملتا ہے۔ یہ سوچ اور یہ غور و فکر آپ کے اندر غیبت سننے سے بچنے کی اہمیت اور ہمت پیدا کرے گا۔

۲۔ پھر جہاں کہنے کی ہمت ہو تو ہمت کر کے اس سے یوں کہہ دیں کہ آپ جس کی غیبت کر رہے ہو اگر واقعتاً اس سے یہ غلطی ہوئی ہے تو وہ گذشتہ زمانے کی بات ہے شاید اس نے توبہ کی ہو اور اس نے یہ گناہ چھپ کر کیا ہے آپ تو میرے سامنے غیبت کا گناہ کر رہے ہو۔ یا یوں کہیے کہ غیبت حرام ہے ہم کو اس سے بچنا چاہیے۔ یا وہاں اس شخص کی تعریف اور خوبیاں بیان کریں جس کی غیبت ہو رہی ہو۔

۳۔ اگر اس قدر ہمت نہیں تو غیبت کرنے والوں کے سامنے صرف اتنا کہہ دیں کہ آپ جس کے بارے میں یہ بات کر رہے ہو شاید وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم سے بہتر ہو اگر یہ ہمت بھی نہیں تو صرف اتنا کہہ دیں کہ "وہ مجھ سے بہتر ہے"۔

۴۔ اگر اس قدر ہمت بھی نہ ہو یا فساد کا خطرہ ہو تو کوئی حیلہ کر کے وہاں سے اٹھ جائیں مثلاً قضائے حاجت کے لیے چلے جائیں وغیرہ۔

دورخے پن کا بیان

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب دو آدمیوں یا دو گروہوں میں اختلاف اور جھگڑا ہو تو وہ دونوں کے دوست بن کر دونوں کے تعلقات کو اور خراب کر دیتے ہیں (1) اور ہر فریق سے مل کر دوسرے کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب کسی سے ملتے ہیں تو اس کے ساتھ اپنے حسنِ تعلق یا حسنِ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور جب اس کے پاس سے نکلے تو اس کے پیچھے اس کی برائی بیان کرتے ہیں ایسے آدمی کو عربی زبان میں "ذوالوجہین" اور اردو زبان میں "دورخا" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نفاق کی ایک قسم اور ایک قسم کی دھوکہ بازی ہے۔ قرآن مجید اور حدیثوں میں اس کی سخت ممانعت اور سخت وعیدیں آئی ہیں۔

دورخا پن منافقت ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۞ "اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف (مسلمانوں کے ساتھ) ہنسی (مذاق) کرنے والے ہیں۔"

یہ آیتِ کریمہ اگرچہ اعتقادی منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے لوگوں کا شمار بھی اخلاقی منافقین میں ہوتا ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس طرزِ عمل کو نفاق ہی سمجھتے تھے، چناں چہ ایک بار حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ "ہم لوگ امیروں اور حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں (اس کا حکم کیا ہے تو) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔ (صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب)

---

(1) یاد رہیں کہ اگر دو شخصوں میں اختلاف اور جھگڑا ہو اور کوئی شخص دونوں کے ساتھ مخلصانہ اور خیر خواہانہ تعلقات رکھے تو اس قسم کے تعلقات دورخا پن نہیں بلکہ وہ تو دونوں گروہوں یا دو آدمیوں کے درمیان اختلاف اور نزاع کے ختم کرانے کا سبب بن جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ دورخا اور دورویہ اصل میں منافق صفت آدمی کو کہا جاتا ہے اور یہ عملی نفاق ہے جو بندے کو اعتقادی نفاق تک پہنچادیتا ہے۔

قیامت کے دن دورخے بدترین حال میں ہوں گے

قیامت کے دن دورخے بدترین عذاب سے دوچار ہوں گے اور بدترین حال میں رہیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وَتَجِدُونَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَأْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ "تم قیامت کے دن سب سے برے حال میں ان لوگوں کو پاؤ گے جو دورخے ہوں گے ان کے پاس آئیں تو ان کی سی باتیں کریں اور اُن کے پاس جائے تو اُن کی سی باتیں کریں۔ (بخاری و مسلم)

نیز حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ كَانَ لَهُ وَجْهَانِ فِي الدُّنْيَا كَانَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ "جو شخص دنیا میں دورخا ہوگا (اور منافقوں کی طرح مختلف لوگوں سے مختلف قسم کی باتیں کرے گا) قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔ (ابوداؤد کتاب الادب)

دورخاپن چغلخوری سے بھی بدتر ہے

دورخے پن کی یہ بد اخلاقی چغلخوری سے بھی بدتر ہے کیوں کہ چغلخور صرف ایک دشمن کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخاپن آدمی دونوں مخالفوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے ظاہر ہے کہ اس چغلی کے ساتھ نفاق اور دوہری شیطانی بھی شامل ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو دو مخالفوں کے درمیان دشمنی کی آگ کے بھڑکاتے رہتے ہیں۔

دو مسلمانوں یا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرانے کی فضیلت

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنے درمیان نزاع اور جھگڑوں کو ختم کریں اور آپس میں الفت و محبت کے ساتھ متحد رہیں، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ "مؤمن تو آپس میں بھائی ہی ہیں پس اپنے بھائیوں میں صلح کرادو۔" (سورہ حجرات ۱۰)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا" کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتادوں جس کے ثواب کا درجہ روزے، صدقہ اور نماز کے ثواب سے زیادہ ہے" یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہاں (ضرور بتادیجیے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ الْحَالِقَۃُ" (آپس میں دشمنی رکھنے اور جھگڑا کرنے والے) دو شخصوں کے درمیان صلح کرانا۔ (اس کے بعد فرمایا کہ) اور دو آدمیوں کے درمیان فساد (اور جھگڑا) پیدا کرنا ہی ایک ایسی خصلت ہے جو (دین کو) مونڈنے والی (اور اس کا صفایا کرنے والی) ہے۔ (ابوداود، ترمذی، مشکوٰۃ)

دو مسلمانوں میں فساد اور جھگڑا پیدا کرنا شیطان کی کوشش ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اِنَّ الشَّیْطٰنَ قَدْ یَئِسَ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَھُمْ "شیطان اس سے تو ناامید ہو گیا ہے کہ جزیرۂ عرب کے اندر نمازی لوگ اس کی پرستش کریں لیکن ان کو آپس میں بھڑکانے پر لگا ہوا ہے۔ (مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مسلمانوں کے اندر اختلاف و فساد پیدا کرتے ہیں، دو مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بغض کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں وہ شیطان کے مشن میں لگے ہوئے ہیں اور یہ انسانی شیطان ہیں جو جنّی شیطان ابلیس کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں اور یہ لوگ شیطان کے بندے ہیں۔

اس کے برعکس رحمان کے بندوں کا کام یہ ہے کہ جب دو مسلمانوں یا مسلمانوں کے دو گروہوں میں، دو قبیلوں میں کوئی جدائی اور جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ان میں صلح و صفائی کر دیتے ہیں۔

بڑی تجارت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک بہت بڑی تجارت نہ بتاؤں؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں (ضرور بتائیے) آپ ﷺ نے فرمایا: صِلْ بَیْنَ النَّاسِ اِذَا تَفَاسَدُوْا وَ قَرِّبْ بَیْنَھُمْ اِذَا تَبَاعَدُوْا "جب لوگوں میں

فساد (اور جدائی) واقع ہو جائے تو ان کو آپس میں جوڑ دو اور جب ان میں دوری ہو جائے تو ان کو باہم قریب کر دو"۔ (الترغیب والترہیب ج۳ص ۳۲۱)

اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ:

"کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتادوں جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (ﷺ) راضی اور خوش ہوتا ہے؟ انہوں نے فرمایا (ضرور بتایئے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگوں میں جدائی وفساد واقع ہو جائے ان کو آپس میں جوڑ دو اور جب ان میں دوری ہو جائے تو ان کو آپس میں قریب کر دو۔ (طبرانی، ترغیب)

نیک گمانی اور بدگمانی کا بیان

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے اور اس وقت تک اس حق کا احترام کرے جب تک کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس حسنِ ظن کا حق دار باقی نہ رہا۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ "اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچتے رہو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"

(سورۂ حجرات:۱۲)

ایک دوسری جگہ مسلمانوں کو تنبیہ فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ: لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّ قَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۝ "جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مردوں اور عورتوں نے اپنے لوگوں کے ساتھ کیوں نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔ (سورۃ النور:۱۲)

مذکورہ دو آیتوں سے جو اصولی باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مسلمان بھائی کے بارے میں بدگمانی سے بچنا ضروری اور بلا وجہ بدگمانی جرم اور گناہ ہے۔

۲۔ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اس وقت تک حسنِ ظن یعنی نیک گمان رکھنا واجب ہے جب تک دلیل شرعی سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس حسنِ ظن اور نیک گمان کے حقدار نہ رہا۔

۳۔ اگر کسی مسلمان کے بارے میں کسی مسلمان کے سامنے ایسی بات کی جائے جو اس حسنِ ظن کو مجروح کرنے والی ہو تو وہ اس کو فوراً قبول نہ کرے، بلکہ اس کا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ ملزم کو بے گناہ سمجھے اور عیب و گناہ کی بات اس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دے۔

۴۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کے بارے میں عیب و گناہ کی خبر دے تو اس سے ثبوت کا مطالبہ کیا جائے کہ اگر تم سچے ہو تو شریعت کے مطابق گواہ لاؤ، اگر وہ گواہ پیش کرے تو اس کی بات قابلِ لحاظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ اپنے حق میں گواہ نہ لائے تو وہ خود مجرم ہے، کیوں کہ کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں کہ بلا ثبوت کسی کے اوپر عیب لگانے لگے جیسا کہ اس کا بیان قرآن مجید میں

موجود ہے۔ (دیکھیے سورۂ نور:۱۳)

۵۔ اگر کسی مسلمان کے بارے میں کسی مسلمان کے کان میں بری بات پڑ جائے تو وہ اس کی نقل وروایت شروع نہ کردے، بلکہ اس کو رد کردے اگر اس نے بلا ثبوت اس کا نقل کرنا شروع کر دیا تو یہ شخص بھی گناہ گار ہوگا۔

۶۔ جب کوئی مسلمان بدنام ہورہا ہو تو اس وقت غیر جانبداری کا رویہ بھی جائز نہیں، بلکہ حتی الامکان اپنے مسلمان بھائی کی مدافعت کرنی چاہیے، کیوں کہ ہر مسلمان پر اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کی حفاظت فرض ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے باب غیبت میں گذر چکا ہے۔

اسلامی اصول اور آج کا مسلمان

ایک طرف اسلامی اصول سامنے رکھیے دوسری طرف مسلمان معاشرے کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج اس کے بالکل برعکس اصول کارفرما ہیں۔ آج کل مسلمانوں کے معاشرہ میں بھی یہ نظریہ پھیل چکا ہے کہ ہر شخص بدگمانی کا قابل اور مستحق ہے الا یہ کہ کسی شخص کے ساتھ شخصی یا جماعتی وگروہی غرض وابستہ ہو اس کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بدظنی اور نفرت پیدا کرنے والی افواہیں ایک مستقل اور نہایت کامیاب پیشہ بن گیا ہے اور سب سے کامیاب اخبارات ورسائل وہی ہیں جو اس طرح کی افواہیں ایجاد کرنے میں زیادہ ماہر اور زیادہ تیز ہیں اور مسلمانوں کے معاشرے کا مزاج اس قدر فاسد اور بگڑ چکا ہے کہ لوگ اس طرح کے بیانات اور مضامین پڑھتے ہیں اور ان افواہوں کے متعلق یہ کہنا کہ "یہ تو صریح جھوٹ ہے" درکنار ان کی ہر بات اس طرح یقین کے ساتھ پھیلاتے ہیں کہ گویا وحی الٰہی نازل ہو چکی ہے۔

اچھے گمان اور برے گمان کے دنیوی فائدے اور نقصانات

۱۔ انسان کو اپنی زندگی میں جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کے بارے میں اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک فطری امر ہے اور یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا ہے یا توڑتا ہے اور یہی گمان معاشرے میں جوڑنے اور توڑنے کی بنیاد ہے۔

حسنِ ظن اور نیک گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا ہے، اس سے معاشرے میں ربط و اتحاد اور اتفاق پیدا ہوتا ہے، اس کے برعکس بد گمانی دلوں کو توڑتی ہے اور آدمی کو آدمی سے جدا اور دور کر کے معاشرے میں توڑ افتراق اور بگاڑ پیدا کر دیتی ہے اور اکثر معاشرتی خرابیوں، فسادات کی جڑ یہی بد گمانی ہو جاتی ہے۔

۲۔ بد گمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر ایسے بد گمان شخص کو ہر ایک کے کام اور بات میں بد نیتی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پریشانی زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کا دلی سکون درہم برہم ہو جاتا ہے اس کے برعکس حسن ظن اور نیک گمان والے کا دل مطمئن اور پر سکون ہوتا ہے۔

۳۔ دوسروں کے بارے میں نیک گمان آدمی کو نیک نفس اور شریف نفس بنا دیتا ہے اور بد گمانی انسان کو بد نفس اور خبیث نفس بنا دیتی ہے، نیک نفس کا مقام اور ٹھکانا جنت اور خبیث نفس کا مقام اور ٹھکانا جہنم ہے۔

بد ظنی اور بد گمانی کا عذاب

سوءِ ظن اور بد گمانی اسلام کی رو سے حرام ہے اور حرام کا مرتکب موت کے بعد قبر و حشر اور آخرت میں عذاب پائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا "تم بد گمانی سے بچو کیوں کہ بد گمانی سب سے بدتر جھوٹی بات ہے (اور غیر متعلقہ امور اور بلا ضرورت) دوسروں کے احوال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح رازدارانہ طریقے سے کسی کی عیب معلوم کرنے کی کوشش نہ کیا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو نہ آپس میں حسد کرو نہ ایک دوسرے کے ساتھ بغض و کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سارے مسلمان اللہ تعالیٰ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم مشکوٰۃ)

اس حدیث میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے یہ سب وہ ہیں جو دلوں میں بغض وعداوت پیدا کرکے آپس کے تعلقات کو خراب کرتی ہے، اگر ان باتوں سے اجتناب کیا جائے تو معاشرہ میں پھیلنے والی بہت سی خرابیوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس حدیث میں سب سے پہلے آپ ﷺ نے بدگمانی کا ذکر کرکے اس کو اکذب الحدیث سب سے جھوٹی بات قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے تو وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے، حالاں کہ اس کا یہ فیصلہ بلا کسی ثبوت کے ہوتا ہے اور یہ اس کے دل کا جھوٹا فیصلہ ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بدگمانی کو بدترین جھوٹ کا نام دے کر اس کی خباثت اور سڑاھنڈ سے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے تاکہ مسلمان اس خبیث مرض کا شکار ہوکر اپنی آخرت کو تباہ وبرباد نہ کرے اور جھوٹوں کا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہونا اوران کے لیے دردناک عذاب کا ہونا اور اس کی دنیوی اخروی ہلاکتوں اور عذابوں کا بیان جھوٹ کے بیان میں گذر چکا ہے۔

بدگمانی سے مراد کیا ہے؟

جس بدگمانی کی ممانعت آئی ہے اس سے وہ بدگمانی مراد ہے جو ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کرلیا جائے اوراس بدگمانی کے لیے کوئی پکا ثبوت اور دلیل موجود نہ ہو۔ اس سے مراد وہ بدگمانی اور وسوسہ نہیں جو محض خیال کے طور پر دل میں گذر جائے یہ تو ایک وسوسہ ہے جو شیطان کی طرف سے ڈالا جاتا ہے، جب تک دل اس کے مطابق فیصلہ اور یقین نہیں کرتا اور بندے کے اعضا وجوارح اس کے مطابق حرکت میں نہیں آتے اور نہ اسکے خلاف کوئی کاروائی کرتے ہیں تو اس وقت تک اس کو بدگمانی نہیں کہا جائے گا۔

نیک گمانی بہترین عبادت ہے

جس طرح بدگمانی گناہ اور بدترین جھوٹ ہے اسی طرح اس کے برعکس نیک گمانی بہترین عبادت ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ "اچھا گمان رکھنا منجملہ بہترین عبادت کے ہے۔ (احمد وابوداوُد مشکوٰۃ)

بلاشبہ مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے متعلق نیک گمان رکھنا ایک ایسی صفت ہے جو عبادت اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں حسن و کمال پیدا کرتی ہے اور ثواب کا درجہ بڑھاتی ہے اور حقیقت میں نیکوکار اور پرہیزگار شخص وہی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اور دوسرے لوگوں کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان اور نیک خیال رکھتا ہے۔

بدگمانی کا علاج اور اس سے نجات کا طریقہ

۱۔ جو شخص بدگمانی کا مریض ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مریض سمجھے اور ہمیشہ لوگوں کی خوبیوں پر نظر رکھے اور دوسروں کے عیوب سے اپنے آپ کو اندھا بنائے اور اللہ تعالیٰ سے روزانہ یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس مرض سے نجات دے۔

۲۔ کسی مسلمان کے بارے میں جب کوئی برا اور بدگمانی کا خیال آئے تو فوراً اپنے آپ کو جھوٹا سمجھ کر اپنے خیال کو دوسری طرف لگا دیں، اگر کوئی دوسرا آپ کے کان میں کسی کے متعلق کوئی ایسی بات ڈال دے جس کی وجہ سے اس کے متعلق تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہو تو اس کی بات کو یوں سمجھیں کہ شاید بغیر تحقیق کے یہ بات کہہ ڈالی ہے۔

۳۔ اپنی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رکھیں جو جھوٹ، غیبت اور دوسروں کے متعلق بری قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے پاک ہوں، سچے ہوں، اور پرہیزگار ہوں۔

۴۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ اور تاویل کریں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ اس کی بات یا عمل کی اچھی توجیہ و تاویل نکل سکتی ہو تو اس کے برے پہلو کو اختیار کرنا درست نہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھ سمیت تمام مسلمانوں کو حسنِ ظن اور نیک گمان والا بنائے اور باہمی بدگمانیوں اور جھوٹے خیالات اور برے اخلاق سے حفاظت فرمائے۔ آمین

بدگمانی پیدا کرنے والے کاموں اور باتوں سے بچنے کی کوشش کریں

تہمت کے مواقع اور بدگمانی پیدا کرنے والے کاموں اور باتوں سے پوری طرح بچنے کی کوشش کریں، تاکہ دوسرے لوگ بدگمانی کے فتنہ میں نہ پڑیں، اس طرح اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہو یا کسی ایسی

حالت یا جگہ میں ہو جس سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع ملے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی وضاحت کر کے لوگوں کی بدگمانی کو دور کر دے۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بیان کا خلاصہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معتکف تھے اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے گئی، آپ کی زیارت کر کے جب واپس ہونے لگی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے واپس پہنچانے کے لیے چلے، اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (میرے ساتھ) دیکھا تو تیز تیز چلنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً آواز دی کہ ٹھہرے رہو یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہیں، انہوں نے عرض کیا سبحان اللہ یا رسول اللہ (ہم آپ کے متعلق کیسے بدگمانی کر سکتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ وَاِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یَّقْذِفَ فِیْ قُلُوْبِکُمَا شَرًّا اَوْ قَالَ شَیْئًا "بلاشبہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہے اور مجھے خطرہ ہوا کہ شیطان تمہارے دل میں کوئی شر یا یوں فرمایا کہ (بدگمانی کی) کوئی چیز ڈال دے (اس لیے میں نے اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی)۔ (صحیح مسلم و بخاری)[1]

حفاظتِ زبان کے واقعات

[1] صحیح مسلم باب بیان انہ یستحب لمن رأی خالیا بامرأۃ الخ ۲/ ۲۱۶ وصحیح بخاری کتاب الصوم باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ ۱/ ۱۷۳

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو ادب سکھاتے ہیں

ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دیوار کے نیچے بیٹھے ہیں اور اپنی زبان کا کنارہ پکڑے ہوئے گویا کہ اس زبان کو ادب سکھا رہے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر بہت تعجب ہوا اور پوچھنے لگے: اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ رضی اللہ عنہ کیا کر رہے ہیں؟ اپنی زبان کو کیوں سزا دے رہے ہیں؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے استغفار کرتے ہوئے فرمایا: اسی زبان نے تو مجھے تباہی کی جگہوں پر پہنچایا ہے۔ (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ۱۰۰ قصے: ص ۷۴)

ایک عورت کی حفاظتِ زبان

حضرت عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حج کے بعد واپس آ رہا تھا کہ ایک سواری کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب سواری قریب آئی تو مجھے پتا چلا کہ اس پر کوئی عورت سوار ہے۔ میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے جواب میں کہا! سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ۔ اس نے آیت پڑھی تو میں سمجھ گیا کہ اس نے میرے سلام کا جواب دیا ہے۔ میں نے پوچھا! آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ کہنے لگی: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (تم حج اور عمرہ اللہ کے لیے مکمل کرو)۔ میں سمجھ گیا کہ یہ زیارتِ حرمین شریفین کے بعد واپس آ رہی ہے۔ میں نے پوچھا: یہاں کیسے؟ کہنے لگی: مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (جسے اللہ گمراہ کرے اُسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہوتا)۔ میں سمجھ گیا کہ یہ راستہ بھول گئی ہے۔ میرے اندازہ میں وہ بوڑھی عورت تھی۔ میں نے پوچھا: اماں کدھر جانا چاہتی ہو؟ کہنے لگی: اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ۔ میں سمجھ گیا کہ شہر جانا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے بھی شہر جانا ہے، لہٰذا میں آپ کو راستے کی رہنمائی کر دیتا ہوں۔ کہنے لگی: وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (تم نیکی کرو، اللہ تعالیٰ نیکو کاروں سے محبت کرتے ہیں)۔ میں سواری کی نکیل پکڑ کر چل پڑا۔

کچھ دور چلنے کے بعد میں نے عربی کے چند اشعار پڑھنے شروع کر دیے وہ کہنے لگی: فَاقْرَءُوْا مَا

تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (پڑھو جو کچھ تمہارے لیے قرآن میں سے آسان کیا گیا)۔ میں خاموش تو ہو گیا مگر سوچتا رہا کہ یہ عورت کون ہے؟ میں نے کچھ اُس کی گھریلو تفصیل معلوم کرنا چاہی تو اس نے کہا: لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ میں سمجھ گیا کہ گھریلو معاملات پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں چلتا رہا۔ شہر کے قریب آکر میں نے اس سے پوچھا: شہر میں آپ نے کس سے ملنا ہے؟ کہنے لگی: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ میں سمجھ گیا کہ اللہ نے اس کو مال اور بیٹے بھی عطا کیے ہیں۔ چنانچہ میں شہر میں داخل ہوا۔ مجھے قافلے والے ملے جو حج کرنے کے بعد واپس آئے تھے اور انہوں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے بیٹوں کے نام کیا ہیں؟ کہنے لگی: اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے بیٹوں کے یہ نام ہیں، میں نے بلند آواز سے پکارا تو تین بچے بڑے خوبصورت، بڑے علم و فضل والے تر و تازہ چہروں والے آئے۔ وہ پریشان تھے کہ ہماری امی کدھر رہ گئی۔ وہ امی کو قافلے میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ خیر جب آپس میں ملے تو بہت خوش ہوئے۔ میں نے سوچا: اب میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ اس وقت اس عورت نے پھر قرآن پاک کی آیت پڑھی! وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ۔ بچوں کو اشارہ کیا کہ کچھ کھلاؤ۔ بچے کچھ پھل لے کر آئے، میں نے کھانے سے معذرت کی۔ اس نے آیت پڑھی! اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (ہم تو اللہ کی رضا کے لیے آپ کو کھلاتے ہیں)۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یا خدایا یہ کیا معاملہ ہے، یہ عقدہ مجھ سے حل نہیں ہو رہا۔ میں نے کچھ پھل کھائے اور بچوں سے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ جب سے آپ کی والدہ مجھ سے کلام کر رہی ہے، میرے ہر بات کے جواب میں یہ قرآن پاک کی آیت پڑھ رہی ہے۔ وہ کہنے لگے: ہاں یہ ہماری والدہ ماجدہ قرآن پاک کی حافظہ اور حدیث کی عالمہ ہے، اس کے دل میں خوفِ خدا بیٹھ چکا ہے کہ قیامت کے دن مجھے اپنی باتوں کا جواب دینا پڑے گا۔ لہٰذا بیس سال سے قرآن کی آیات کے سوا کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلا۔ سبحان اللہ! خشیتِ الٰہی کا عجیب انداز دیکھیے کہ کلامِ الٰہی کے سوا کوئی ایک لفظ زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ (خطباتِ فقیر: ج ۱، ص ۹۸)

شہزادے کی حکایت

حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ لدھیانوی کے ایک وعظ ''حفاظتِ زبان'' میں ایک شہزادے کی دلچسپ حکایت لکھی ہے کہ: کسی شہزادے نے کہیں خاموشی کے فوائد اور بولنے کے نقصانات پڑھ لیے،

لٰہذا اُس نے تہیہ کر لیا کہ ہمیشہ خاموش رہوں گا اور کبھی نہیں بولوں گا۔ بادشاہ کو جب پتا چلا کہ شہزادہ کی بول چال بند ہو گئی چوبیس گھنٹے سکوت ہی سکوت طاری ہے تو بہت فکر مند ہوا اور علاج کا حکم دیا، بڑے بڑے نامور اطباء بلائے گئے۔ انہوں نے علاج کیا مگر بے سود، پھر سوچا شاید کسی نے جادو کر دیا یا چڑیل لگ گئی، کوئی بھوت سوار ہو گیا۔ لٰہذا عامل بلائے گئے۔ انہوں نے ہر قسم کے تعویذ گنڈے ٹونے ٹوٹکے کر کے دیکھ لیے مگر شہزادہ اب بھی بول کر نہ دیا۔ بادشاہ کی تشویش اور بڑھی جب سارے علاج ناکام ہو گئے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو آخری علاج یہ سوچا کہ اپنے ماحول سے دور کہیں پہاڑوں، جنگلوں کی طرف اسے لے جاؤ اور تفریح کراؤ شاید آب و ہوا کی تبدیلی سے اس کی زبان کُھل جائے یا شکار کھیلنے سے اس کی طبیعت کُھل جائے اور خوش ہو کر کوئی بات کر لے جیسے آج کل لوگوں نے عورتوں کی بھی یہی علاج شروع کر دیا ہے، عجیب زمانہ آگیا ہے، بے دینی کی نحوست سے عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ عورتیں تو ہیں ہی پاگل مگر خاوند اُن سے بڑھ کر پاگل۔ عورت کو ذرا سی تکلیف ہو جائے یا یونہی مکر کرنے لگے تو اس کی صحیح تشخیص اور علاج کی بجائے عورتوں کو تفریح کرواتے ہیں گھر سے نکالو دور دراز تفریح کرواؤ، سیر سپاٹے سے طبیعت بحال ہو جائے گی، یہ کون سا علاج ہوا؟ اس بے پردگی اور بے حیائی سے تو اس کا دماغ اور خراب ہو گا۔ وہ تو بار بار یہی کہے گی میں بیمار ہوں مجھے اور تفریح کرواؤ۔

شہزادے کو لے گئے تفریح کے لیے جنگل میں چلتے ہوئے کسی طرف سے تیتر کی آواز آئی۔ شکاری نے فوراً نشانہ لگایا اور اسے مار گرایا۔ اب شہزادہ بولا: ''اور بول'' مطلب یہ کہ چکھ لیا بولنے کا مزا ذرا اور بول۔ بس پھر خاموش، وہ لوگ سمجھ گئے کہ یہ تو مکار ہے جان بوجھ کر نہیں بولتا بادشاہ کو بھی غصہ آگیا اور اُس نے حکم دے دیا کہ اس کی پٹائی لگاؤ اسے کوئی عذر نہیں بلکہ یہ مکار ہے سب کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے لگاؤ اس کی پٹائی دیکھیں کیسے نہیں بولتا۔ یہ سنتے ہی کارندوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا جب کافی مار لگ چکی تو پھر بولا: ''ایک بار بولنے پر تو اتنی مار کھا لی دوبارہ کبھی بولا تو تیرا کیا بنے گا'' بس یہ کہتے ہی پھر خاموش، مار پڑتی رہی لیکن وہ دوبارہ کبھی بول کر نہ دیا۔ (حفاظتِ زبان: ص ۳۵)

☆......☆......☆

اللہ تعالیٰ کی محبت کا بیان

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ودود ہے۔ اس کی تجلی اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر پڑتی ہے اور ہر ایک چیز اپنی خداداد صلاحیت و استعداد کے مطابق اس کے اثر کو قبول کر لیتی ہے۔ اس محبت کی وجہ سے ہی دنیا کی یہ ساری چمک دمک اور سوز و گداز ہے، یہی وہ محبت اور رأفت ہے جس کی بنا پر مائیں اپنی اولاد کی پرورش اور ان کی حفاظت کرتی ہیں اور اسی کی بدولت ایک مخلوق دوسری مخلوق سے مربوط ہے اور عشق و محبت ہی وہ آگ ہے کہ جب یہ کسی ایک چیز پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر انسان اس کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ دنیا میں آج تک جتنے نمایاں کام انسانوں نے انجام دیے ہیں یا دیے جا رہے ہیں ان سب میں اسی جذبۂ محبت کی قوت کار فرما ہے۔ جب کسی کو اپنے فرقے یا اپنی جماعت سے، یا کسی کو مال و دولت اور دنیوی جاہ و حشم سے، یا کسی کو کسی شخص یا کسی ازم یا نصب العین، یا کسی کو اپنی قوم یا وطن سے انتہائی محبت ہو جاتی ہے تو وہ اس کے لیے وہ نمایاں کام سرانجام دیتا ہے کہ عقلِ انسانی حیرت میں گم ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ جب بھی انسان کی محبت کا مرکز و محور کوئی ایک چیز بن جائے تو وہ دل کی گہرائیوں سے اس کا غلام اور بندہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہی محبت انسان کی تمام پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بھی بن جاتی ہے اور انسان کی ساری پریشانی و پراگندگی کا حل و علاج بھی۔ اگر محبت دنیائے فانی سے ہے تو انسان پریشان حال اور ناکام و نامراد ہو جاتا ہے اور یہی محبت اور تعلق اگر جمالِ لازوال، حسنِ اَزلی و ابدی، خالقِ کائنات، رب العالمین کے ساتھ اور اس کے لیے ہو تو انسان کو قلبی سکون و راحت میسر آجاتی ہے اور انسان ابدی فلاح پا جاتا ہے۔

مؤمن کا حقیقی محبوب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے

انسان ہمیشہ نفع بخش چیزوں اور حسن و کمال سے محبت کرتا ہے۔ جو شخص بھی حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک، رب العالمین اور تمام صفاتِ کمال کا مالک مانتا ہو اور یہ حقیقت کھل کر اس کے سامنے آچکی ہو کہ جملہ مخلوقات اور پوری کائنات کی چیزوں میں جو بھی حسن و خوبی اور کمال نظر آرہا ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفاتِ کمال کی تجلیات کی وجہ ہے، تو یقیناً اس کی محبت کا واحد مرکز صرف اور صرف اللہ

تبارک و تعالیٰ کی ذات بن کر رہ جاتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کا خاص حق بھی ہے کہ اُس کی محبت دوسری تمام چیزوں پر مقدم ہو، دوسری تمام چیزوں کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو اور جو محبتیں اللہ تعالیٰ کی محبت و خوشنودی سے ٹکراتی ہوں ان سے نفرت اور بیزاری ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ”اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اس کا ہم پلہ اور مد مقابل بنا رکھا ہے جن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے اور ایمان والے تو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ ہی سے محبت رکھتے ہیں۔“

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱۶۵)

محبت و عداوت متعدی صفات ہیں

جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ دینِ اسلام میں محبت کا اصل مرکز و محور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو یہ سمجھ لیں کہ محبت و عداوت متعدی صفات ہیں۔ جب کسی سے محبت پیدا ہو جاتی ہے تو محبت کی لہریں دوڑ کر خود بخود ان چیزوں سے بھی محبت پیدا کر دیتی ہیں جو چیزیں اس سے وابستہ ہوں۔ یہی حال عداوت اور دشمنی کا بھی ہے، حتّٰی کہ ایک ہی شخص سے محبت یا دشمنی کی وجہ سے اس سے وابستہ لوگ اور چیزیں بھی محبوب یا مبغوض بن جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی فطری بات ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ایک سچا عاشق اپنے محبوب کے محبوب سے، اس کے گھر اور وطن سے، اس کی زبان اور باتوں سے اور اس کے طور طریقوں سے محبت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے خالص محبت رکھنے والا کون ہے؟

اس تمہید کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی اور خالص محبت کرنے والا شخص وہی ہے جس کی تمام محبتیں اور چاہتیں اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی کے تابع ہوں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ اور آپ ﷺ پر اتری ہوئی تعلیمات و ہدایات سے ہوگی اور اس کے بعد ان لوگوں سے ہوگی جو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی دعوت اور تعلیمات پر مر مٹنے کو تیار ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی اور اس کی نامزد کردہ تمام چیزوں کے ساتھ حسبِ مراتب محبت رکھے اور ان کا دل سے ادب کرتا ہو، مثلاً: اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیا اللہ رحمہم اللہ، کتاب اللہ، اللہ تعالیٰ کے احکامات و تعلیمات، بیت اللہ، مساجد وغیرہ۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ذَالِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ”یہ بات ہو چکی اور جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم واحترام کرتا ہے تو یہ دلوں میں تقویٰ (ہونے کی وجہ) سے ہے“۔

کسی جذبہ کو پیدا کرنے کے لیے ایک اصولی بات

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبت وہ عظیم نعمت ہے جس کی بدولت انسان دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور دائمی راحت و سکون پالیتا ہے، لیکن یہ نعمت حاصل کیسے کی جائے؟ اس کے حصول کے لیے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیجیے۔ وہ یہ کہ جس جذبے کے جو آثار و علامات ہوتی ہیں، اُنہی آثار و علامات کو اس جذبے کے حصول کی خاطر بتکلف اختیار کیا جائے تو ان شاء اللہ وہ جذبہ نصیب ہو جائے گا۔ مثلاً: دل میں رحم پیدا کرنا ہے تو بتکلف فقیروں سے ہمدردی کیا کریں اور یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کریں کیونکہ یہی رحم و مہربانی کے آثار میں سے ہے (کہ جس کے دل میں رحم ہو تو اس سے خود بخود ایسے مہربانی کے کام صادر ہو جاتے ہیں) اور یہی اس کے حصول کا طریقہ بھی ہے۔ اگر دل میں رحم کم ہے تو بتکلف یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیر لیا کریں اور بتکلف فقیروں کی امداد کیا کریں ان شاء اللہ کسی وقت خود بخود اللہ تعالیٰ کے فضل سے دل میں رحم کا چشمہ ابل پڑے گا اور پھر بے تکلف مہربانی کے کام صادر ہوتے رہیں گے۔

جب یہ قاعدہ معلوم ہو گیا تو اب ذرا تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار و علامات لکھ دیتے ہیں کہ یہی اس محبت کی علامات و آثار بھی ہیں اور اگر محبت کم ہے تو انہیں کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل بھی کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار و علامات

۱۔ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کو ادب سے لینا اور اس کے لکھے ہوئے نام یا اس کی بات کو پاک صاف

جگہ رکھنا۔

۳۔ اسی کی عبادت کرنا، اسی کے ساتھ محبت رکھنا اور اسی کی پرستش میں مشغول رہنا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم اس طرح ماننا جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے بتلایا ہو، نیز ان کتابوں کا احترام کرنا جن میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور ہدایات کی تشریح و تفصیل موجود ہو۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ممنوع فرمائی ہیں ان سے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے بیزار رہونا۔

۶۔ آسمانوں اور زمین کی چیزوں میں غور و فکر کرنا، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کے انعامات کو سوچنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔

۷۔ انبیا علیہم السلام کا احترام کرنا، ان سے محبت رکھنا اور ان کے احترام میں ذرہ برابر کمی نہ کرنا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو محبت سے دیکھنا۔

۹۔ شعائر اللہ مثلاً: بیت اللہ اور مساجد کا ادب و احترام کرنا، ان میں کوئی ایسی بات اور کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو ادب و احترام کے منافی ہو۔

۱۰۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہ رحمھم اللہ ؛ غرض ان تمام لوگوں سے محبت کرنا اور ان کا احترام کرنا جن کے ذریعے سے یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور ہدایات ہم تک پہنچی ہیں یا جن سے فی زمانہ یہ تعلیمات و ہدایات سیکھی جاتی ہیں۔

یہ چند علامات و آثار پیش کیے گئے ہیں، لیکن ان تمام آثار و علامات میں سے رسولوں کی جو شان ہوتی ہے اور ان کے ساتھ جو محبت کرنی چاہیے وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ اور برتر ہونی چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور تعلیمات لوگوں تک پہنچانے والی یہی ہستیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان سے محبت نہیں ، ان کی قدردانی ، ان کا ادب و احترام اور تعظیم نہیں تو پھر نہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات و ہدایات کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے فوراً بعد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی محبت کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی تعظیم و تکریم پر بہت ہی زور دیتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ

كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

"اے ایمان والو اپنے باپ اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور تم میں سے جو بھی ان کے ساتھ (ایسی صورت میں) دوستی رکھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ آپ کہہ دیجیے! اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ مالِ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ پیارے ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (یعنی سزا اور عذاب) بھیجے، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔" (سورۃالتوبہ: آیت ۲۳،۲۴)

دینِ اسلام حقوق العباد پر جس قدر زور دیتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ والدین کو اُف تک نہ کہو۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے بھی بہت زیادہ حقوق مقرر فرمائے ہیں اور والدین کے حقوق سب پر مقدم ہیں۔ سب سے زیادہ حقوق والدین کے ہیں، لیکن اگر والدین بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت میں رکاوٹ بنتے ہیں تو ان کے حقِ اطاعت و محبت کو نظر انداز کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔

ان آیات کا عام حکم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ااور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے ساتھ اس درجہ کی محبت لازم ہے جس پر کوئی بھی دوسری محبت اور تعلق غالب نہ آئے۔ محبت کے مقدم اور غلبۂ محبت کے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اگر کسی موقع پر اللہ اور اس کے رسول کی وجہ سے اپنے والدین اور اپنی اولاد وغیرہ تمام محبوب چیزیں ترک کرنی پڑیں تو ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور حکم پر قربان کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُمت کو یہ تعلیم دی ہے کہ: لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ یعنی "

تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اپنے باپ، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔ (بخاری و مسلم)

اس طرح متعدد صحیح احادیث میں یہ تعلیم موجود ہے کہ جب تک ایک اُمتی میں آپ ﷺ کی محبت دنیا کی ہر چیز حتّٰی کہ اپنی جان سے بھی زیادہ نہ ہو اُس وقت تک وہ ایمان کی حقیقت اور اس کی لذت کو نہیں پا سکے گا۔ صرف یہی نہیں کہ تمام چیزوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت کو مقدم کرنا ضروری ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے ساتھ اس کے دشمنوں کی محبت کو بھی جمع نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس بات کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے کہ محبت کے لیے ضروری ہے کہ محبوب کے دشمن کے ساتھ دشمنی کی جائے، اور ایمان و اسلام کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں اور گستاخوں کے ساتھ محبت نہ رکھی جائے، اور یہی قرآن مجید کی تعلیم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

" آپ کبھی ایسی قوم کو نہ پاؤ گے (اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ) جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اگرچہ یہ (مخالفت و عداوت رکھنے والے) ان کے باپ، بیٹے، بھائی اور برادری ہی کے لوگ کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان رکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی، اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا گروہ (اور جماعت) ہے، اور خبردار! یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ فلاح پانے والا ہے"۔ (سورۃ المجادلہ: آیت ۲۲)

بلاشبہ وہی کامل مؤمن ہے اور وہی ایمان کی حلاوت اور لذت پا سکتا ہے جس کی محبت اور تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے رسول ﷺ سے اس قدر زیادہ اور مضبوط ہو کہ اس پر وہ تمام تعلقات اور محبتوں کو قربان کر سکتا ہو، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلہ اور مخالفت میں جو تعلق اور محبت بھی آئے وہ بیزاری اور بغض میں تبدیل ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ثلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ ”تین باتیں ہیں، وہ جس شخص میں ہوں، ایمان کی (حقیقی) لذت پا سکتا ہے، (ایک) یہ کہ اسے اللہ اور رسول کی محبت تمام چیزوں سے زیادہ ہو، (دوسرے) وہ جب کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرے، اور (تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد) کفر میں واپس جانا اس کو اتنا ہی برا لگے جیسا کہ آگ میں داخل ہونا“۔ (بخاری و مسلم)

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ”جو شخص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت رکھے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بغض و عداوت رکھے اور اللہ ہی کے لیے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لیے روکے تو یقیناً اس نے ایمان کامل کیا“۔ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ)

مذکورہ بالا آیات اور احادیث سے عقلی اور نقلی طور پر یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ اگرچہ دینِ اسلام افراد اور اشخاص سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا، مگر اللہ تعالیٰ، ایمان، ایمان والوں اور شعائر اللہ کی محبت اور اس کے برعکس کفر، گناہوں، اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دینِ اسلام کے دشمن فرقوں اور جماعتوں سے نفرت کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ جس کو ایمان، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت ہو گی اس کے دل میں لازماً شعائر اللہ کی تعظیم و محبت ہو گی اور وہ تمام اُمتِ مسلمہ سے بحیثیت اُمت محبت کرے گا، کفر، دینِ اسلام کی ممنوع کردہ چیزوں اور دشمنانِ اسلام سے بیزار اور متنفر ہو گا۔ اگر اس کی حالت درمیانی ہے کہ اسلام سے بھی کچھ محبت ہے اور کفر سے بھی کچھ محبت، تو یہ نفاق ہے۔

تمام شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی چیزوں خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی توہین کفر ہے

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ تمام شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کے ساتھ محبت رکھنا توحید، ایمان اور پرہیز گاری کی علامت اور نشانی ہے اور یہ سب کچھ ایمان اور توحید کے مفہوم میں داخل ہے۔ ان کے بغیر نہ ایمان ہے اور نہ توحید۔ بلکہ شعائر اللہ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی توہین اور گستاخی تو ایسا کفر ہے کہ اس جرم کے مرتکب کی سزا قتل ہے، اس کے متعلق علمائے اسلام میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی مسلمان انبیا علیہم السلام کی شان میں یا سیدنا محمد ﷺ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا مرتکب ہوا اور پھر اس نے توبہ بھی کی تو اس کی توبہ قبول ہو گی یا نہیں۔ کیا پھر بھی اس کو قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ اس کے متعلق بعض فقہائے اِسلام کہتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں، ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور بعض فقہائے اسلام کے نزدیک اس کی توبہ قبول ہے اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ وہ سچی توبہ کرے اور اپنے آپ کو سچا اور پکا مسلمان اور محب الرسول ﷺ ثابت کرے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر اسے قتل کر دیا جائے گا۔

غرض یہ کہ انبیا علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ اقدس میں توہین، گستاخی اور بے ادبی کرنا بالاجماع کفر ہے۔ البتہ قتل اور قبولیتِ توبہ کی تفصیلات میں علمائے اسلام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اصل مسئلہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ کیونکہ دین و ایمان کی پوری عمارت انبیا علیہم السلام کی باتوں پر اعتماد کر کے کھڑی کی جاتی ہے اور ان کی توہین اور بے ادبی اللہ تعالیٰ ہی کی توہین اور بے ادبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ شعائر اللہ کی تعظیم کے حکم میں انبیا علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کا حکم بھی موجود ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ صرف محبت رکھنے کی ترغیب نہیں، بلکہ محبت کے ساتھ آپ کی تعظیم اور تکریم کا بھی بار بار حکم دیا ہے، اور ہر اس چیز سے منع کیا ہے جس سے آپ ﷺ کی توہین اور بے ادبی کا پہلو نکلے یا جس سے آپ ﷺ کی عزت مجروح ہوتی ہو یا آپ ﷺ کی شان گھٹتی ہو۔ اس کے متعلق قرآن مجید کے چند ارشادات پڑھ لیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "پس جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائے اور اس کی (محبت و تعظیم کے ساتھ) حمایت کی اور (مخالفین کے مقابلہ میں) اس کی مدد کی اور اس نور (قرآن مجید) کے تابع ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

(سورۃ الاعراف: آیت ۱۵۷)

۲۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ "اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

۳۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞

"اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان کے ساتھ اس طرح بلند آواز سے بات کیا کرو جس طرح اونچی آواز سے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (بے ادبی کی وجہ سے) تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں اپنی آوازیں (رسول اللہ کی عظمت اور احترام کی وجہ سے) پست کر لیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیے ہیں انہی کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے"۔

(الحجرات: آیت ۲۔۳)

۴۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا "تم لوگ رسول (کریم ﷺ) کے بلانے کو ایسا نہ بنالو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو"۔ (سورۃ النور: آیت ۶۳)

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ "اے ایمان والو! تم (لفظ) "راعنا" نہ کہا کرو اور "انظرنا" کہا کرو، اور (آپ کی بات توجہ سے) سنا کرو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۰۴)

اس آخری آیت کے علاوہ اوپر کی آیات کے معنی اور مطالب تو بالکل واضح ہیں۔ اس آخری آیت کا مفہوم اور پس منظر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد مبارک کو اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو عرض کرتے: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاعِنَا یعنی ہماری رعایت فرمائیے (کیونکہ ہم پوری طرح نہیں سمجھ سکے، دوبارہ سمجھا دیجیے) لیکن چونکہ اس لفظ کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں جس میں بے ادبی پائی جاتی ہے، اور بد باطن اسی لفظ کو بے ادبی والے دوسرے معنی میں استعمال کر کے اپنی خباثت کا مظاہرہ کر سکتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو یہ حکم دیا کہ اس لفظ سے احتراز کریں، بلکہ اس کی جگہ اُنْظُرْنَا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف التفات کریں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف توجہ فرمائیں، کہا کریں۔

مذکورہ بالا آیات کو غور سے بار بار پڑھیں تو واضح طور پر چند موٹے موٹے احکام اور ہدایات سامنے آئیں گے:

۱۔ حقیقی موحد اور مؤمن وہی ہے جس کے رگ رگ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کی روح دوڑ رہی ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم و تعظیم میں کوئی کمی نہ کرے، اور دل و جان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی روشنی یعنی قرآن و سنت کے احکامات کو توجہ سے سن یا پڑھ کر اس کی مکمل اتباع کرے، نیز انتہائی محبت و عظمت کے ساتھ دین کی نصرت اور اس کی تائید کرے اور اس کے مقابلے میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔

۲۔ وہی لوگ متقی، پرہیز گار ہیں اور اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے دلوں کو تقویٰ و پرہیز گاری کے لیے پرکھ لیتے ہیں اور انہی کے دلوں کو تقویٰ کے لیے خاص کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت و محبت ہو اور اس کا نتیجہ اور علامت یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔

۳۔ جن لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت و محبت ہو، یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت ہے، اور انہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی اور بہت بڑا ثواب ہے۔

۴۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے متعلق ہر ایسے لفظ سے پرہیز کیا جائے جس میں بے ادبی اور تنقیص کا شائبہ ہو اور آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے حضور میں ایسا عمل بھی ممنوع ہے جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو، مثلاً: آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے حضور میں آواز اونچی کرنا۔

۵۔ انبیا علیہم السلام اور سیدنا رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی قصداً توہین و تنقیص تو کفر ہے ہی، بلکہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے بارے میں ایسا کلمہ کہنا یا آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے حضور میں ایسا عمل کرنا جس میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی توہین یا تنقیص یا بے ادبی کا ادنیٰ سا شائبہ ہو یہ بھی ایک مسلمان کے لیے باعثِ کفر بن سکتا ہے اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان کے سابقہ تمام اعمال برباد ہو سکتے ہیں اور اسے اپنے کفر اور بربادیٔ اعمال کا کوئی پتا بھی نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

توحید کے نام پر توہین کرنے والے

آج کل بعض لوگ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی شان میں جو سوقیانہ باتیں کرتے ہیں ان کو اپنا انجام خود سوچ لینا چاہیے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اُمت مسلمہ کے دلوں سے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی محبت و عظمت نکالنے کی مذموم تقریریں کرتے ہیں اور اسی کو وہ توحیدِ الٰہی کہتے ہیں، حالانکہ وہ لوگوں کو توحیدی کے بجائے توہینی بناتے ہیں۔ بلکہ ان کی طرف بعض باتیں جو منسوب کی جاتی ہیں اگر واقعی وہ ایسی باتیں کرتے ہیں تو پھر ایسے مسلمانوں پر سخت افسوس ہے جو ایسے لوگوں کی تقریریں سنتے ہیں، اگر وہ ایسی گستاخانہ باتیں سن لیتے ہیں تو وہ ایسے مقرر اور خطیب کا علاج کیوں نہیں کرتے؟۔

چونکہ وہ باتیں جو یقیناً کفر ہیں اور ان کا کہنے والا واجب القتل ہے، یقینی ذرائع سے ثابت نہیں اس لیے میں ان پر کوئی بحث نہیں کرتا اور نہ ان کو نقل کرتا ہوں۔ البتہ جو بات عام سننے میں آتی ہے وہ یہ کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا جسدِ اطہر قبر شریف میں سالم نہیں اور آپ (العیاذ باللہ) مٹی ہو گئے ہیں، اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ آپ کا جسدِ اطہر قبر شریف میں سالم ہے اُن کو طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں اور اس کو وہ بڑی تحقیق اور اپنے زعم کے مطابق توحیدِ الٰہی سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ نہ یہ تحقیق ہے اور نہ توحید، بلکہ ایسی باتوں کو جس انداز میں بیان کیا جاتا ہے اس میں کفر کا اندیشہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرکت پیدا ہونا محال ہے

آپ ان کی اس بات پر ذرا غور کریں کہ آخر آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کے سالم ہونے کا نظریہ رکھنے میں کونسی بات توحید کے منافی ہے۔ اگر کسی شخص کا جسم سالم ہو تو کیا وہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ہو جاتا ہے؟ آخر جنت میں انسان کی جسمانی صلاحیتوں کا ذکر جو قرآن و حدیث میں موجود ہے، مثلاً: ہمیشہ زندہ رہنا، جسم میں کوئی تغیر نہ ہونا، ہمیشہ جوان رہنا اور اس قدر طاقت کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو دیکھ سکے اور جو چاہے وہ اس کو ملنا وغیرہ۔ کیا وہ ان بہت سی صلاحیتوں اور خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ہو جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں، کوئی کسی وقت بھی خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، کسی صلاحیت یا خصوصیت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرکت نہیں کر سکتا۔

باقی رہی یہ بات کہ اس بات کا قائل ہونا علم غیب کا دعویٰ ہے، یہ بھی بہت بڑی حماقت بلکہ ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مترادف ہے، کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ کا جسدِ اطہر سالم نہیں، یہ کون سے علم کی بنیاد پر ہے، کیا قرآن مجید وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ جو لوگ آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کی سالمیت کے قائل ہیں ان کے لیے کچھ نقلی دلائل بھی موجود ہیں جیسے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۞ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

یعنی ''اور جو اللہ (تعالیٰ) کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں، اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر خوش حال ہیں اور جو (مسلمان) ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گیے ہیں اور ابھی ان کے پاس (عالم قبر و برزخ میں) نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے (بھی یہ شہید لوگ) خوش ہو رہے ہیں کہ ان پر بھی نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل پر خوش ہوتے ہیں اور اس پر کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے اجر کو ضائع

نہیں کرتا۔"   (سورۂ آل عمران: آیت ۱۶۹ تا ۱۷۱)

قبر برزخ کی زندگی اور اس میں درجات

جو بھی شخص اس دنیا سے رحلت کر کے دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے جسے قبر اور برزخ کی زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی انبیا علیہم السلام و غیر انبیا، مؤمن و کافر اور صالح و فاسق وغیرہ ہر ایک کو ملتی ہے۔ اس کی بدولت ہر کوئی قبر و برزخ، عذاب یا انعام کو محسوس کر لیتا ہے۔ قبر کی یہ زندگی بھی دنیا کی طرح قوت و ضعف، خوشی و غم، لطافت و کثافت وغیرہ کے لحاظ سے تقسیم ہے اور اس کے بہت سے درجات ہو سکتے ہیں، طبقہ یا جماعت کے لحاظ سے بھی اور طبقہ میں باہمی تفاضل کی رو سے بھی۔ پھر چونکہ طبقہ یا جماعتِ شہدا کی زندگی قوت و انعام کے لحاظ سے عام لوگوں کی قوت و انعام پر ہر لحاظ سے اعلیٰ و برتر ہے اور ان کو ایک خاص قسم کی زندگی ملتی ہے اس لیے شہدا کے لیے خاص طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ان کو مردہ نہ سمجھو، یہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے رزق پا رہے ہیں، خوش و خرم ہیں وغیرہ۔ اب یہ زندگی کیا ہے اور کیسی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں البتہ دنیا میں جس طرح ریاضت، مجاہدے اور معصیت و گناہوں کے اثرات جسموں پر نمایاں ہوتے ہیں، اسی طرح طبقۂ شہدا کے قوی ارواح کا اثر بسا اوقات ان کے جسم پر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے اجسام بگڑنے اور متغیر ہونے سے بچ جاتے ہیں جیسا کہ تاریخی واقعات اور مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کے بدن سالہا سال بعد بھی صحیح و سالم دنیا والوں نے دیکھے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی بابرکت روحیں اس قدر قوی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے جسموں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہیں اور پھر اپنے اجسام سے دوری کے باوجود ان کی قوی روحوں کی شعاعیں ان کے اجسام پر پڑتی ہیں اور عام مردوں کی بہ نسبت ان کے روح کا تعلق جسموں سے زیادہ قوی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے جسم تغیر و تبدل اور بگڑنے سے بچ جاتے ہیں۔ واللہ اعلم!

بہر حال قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتوں میں طبقہ و جماعتِ شہدا کی حیات کا حال بیان کیا گیا ہے جب اس جماعت و طبقہ کی حیات کا یہ حال ہے تو انبیا علیہم السلام اور اُس جماعت و طبقہ کی روحانی حیات کا کیا حال

ہو گا جن کی عظمت، پرہیز گاری، سچائی و صداقت مسلّم ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اور تعلیمات لوگوں تک پہنچانے کے لیے دنیا میں چن لیا تھا اور جن کی تعلیمات اور جن کے حکم پر لڑ کر یہ طبقۂ شہدا اس عظیم حیات کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ والدین کے حقوق بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا "تو انہیں اف (تک بھی) نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو"۔

(سورۃ الاسراء: آیت ۲۳)

اس آیتِ کریمہ میں جب اُف تک کہنے کی ممانعت ہے تو انہیں مارنے اور قتل کرنے کا تو بہت ہی بڑا عذاب ہو گا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے "اُف" کہنے اور جھڑکنے سے منع کیا ہے نہ کہ مارنے اور قتل کرنے سے، تو بلاشبہ یہ شخص ایسی حماقت کرتا ہے جس کو بچے بھی سمجھ جائیں گے۔

اس طرح طبقۂ شہدا کے متعلق خصوصی و امتیازی حیات مان لینا اور طبقۂ انبیا علیہم السلام کی قوتِ ارواح اور ان کی حیات کو شہدا سے بھی اعلیٰ و ارفع نہ ماننا بہت بڑی جہالت ہے۔ پھر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح و حیات کا کیا حال ہو گا جو تمام انبیا علیہم السلام کے امام و سردار ہیں، ان کے متعلق چہ مگوئیاں کرنا تو جہالت پر جہالت ہے۔ اب عام انبیا علیہم السلام کی جماعت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد مبارک بھی پڑھ لیجیے۔

حضرت اوس بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے افضل ترین دنوں میں سے ایک جمعہ کا دن ہے۔ اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے، اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی میں صور پھونکا جائے گا، اور اسی دن میں صور کی آواز سے لوگوں پر بے ہوشی طاری ہو گی، لہٰذا تم اسی جمعہ کے روز مجھ پر درود کی کثرت کیا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس طرح ہمارا درود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پیش کیا جائے گا، جبکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مٹی میں مل چکے ہوں گے (یعنی ریزہ ریزہ ہوں گے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء (علیہم السلام) کے اجسام کو حرام کر دیا ہے (کہ وہ ان کو کھائے)۔ (ابوداؤد و نسائی وغیرہ)

یہ حدیث اگر ایک طرف اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ پیغمبروں کے اجسام صحیح سالم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتلاتی ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک کا آپ ﷺ کے جسد اطہر سے ایسا تعلق ہے کہ درود شریف ان دونوں پر پیش کیا جاتا ہے، ورنہ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس جواب کے بجائے کہ "پیغمبروں کے جسموں کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے" یہ جواب دیتے کہ اس میں جسد کا کیا سوال، درود شریف تو روح پر ہی پیش کیا جاتا ہے اور روح ایک غیر مادی چیز ہے جس کے ریزہ ریزہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قبر میں انبیا علیہم السلام کی ممتاز حیات ایک مسلمہ حقیقت ہے

یہاں انبیا علیہم السلام کی ممتاز اور خاص قسم کی حیات مقصود نہیں کیونکہ اس مسئلہ کے حق میں قرآن مجید اور احادیث میں صرف یہ ایک آیت اور یہ حدیث نہیں بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں اس کی بہت سے دلائل موجود ہیں۔

مثلاً: انبیا علیہم السلام کا اپنی قبروں میں نمازیں پڑھنا، حج پر جاتے ہوئے لبیک کہنا، معراج شریف کے موقع پر متعدد انبیا علیہم السلام کے ساتھ آپ ﷺ کا ملاقات کرنا، ان کے ساتھ آپ ﷺ کا بات چیت کرنا اور آپ ﷺ کے پیچھے تمام انبیا علیہم السلام کا مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنا۔

اس طرح کی بہت سی باتیں آپ ﷺ کی تعلیمات و ارشادات میں موجود ہیں جن سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، اور نہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس میں کسی نے اختلاف کیا ہو، بلکہ یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیا علیہم السلام کو قبر و برزخ میں ایک خاص قسم کی ممتاز حیات و زندگی حاصل ہے، البتہ علمائے اسلام کے درمیان اس خاص قسم کی حیات و زندگی کی نوعیت میں اختلاف موجود ہے۔

لیکن چونکہ یہ قبر و برزخ کا معاملہ ہے اور ہم اس کی نوعیت کو معلوم کرنے سے عاجز ہیں اس لیے بہتر راہ یہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور متقدمین کی طرح ایسے مسائل میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا زیادتی نہ کی جائے اور جیسا قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس کو دل و جان سے قبول کر کے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے، کیونکہ ایسے مسائل کی تفصیلات اور ان کی نوعیت معلوم کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ اس کے ہم مکلف ہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ شہدا کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۞ "اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۵۴)

البتہ علمائے اسلام دہریوں اور دوسرے باطل پرستوں کو جواب دیتے وقت مختلف جوابات دیتے ہیں، یا بعض حضرات کو کشف یا خواب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کچھ بتلا دیتے ہیں، وہ بالکل الگ بات ہے، اس کا نہ انکار ہے اور نہ اس سے بحث۔

برزخی زندگی کو دنیا پر قیاس نہ کیا جائے یہ شرعی مسائل کا حل نہیں

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ قبر اور برزخ کی زندگی کو دنیا پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ انسان کے ادراکات اور احساسات میں ترقی جاری ہے۔ ماں کے پیٹ میں ہمارے جو ادراکات اور احساسات تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس عالم دنیا کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اسی طرح قبر کی زندگی کے احساسات و ادراکات کچھ اور ہوں گے اور قیامت میں تو انسان اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھ سکے گا۔

لہٰذا اگر کوئی مردوں کے سننے کا قائل ہو تو اس کی تردید میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کسی زندہ شخص کو گڑھے میں دفنائیں پھر اس کے جانے پہچانے لوگ ایک ایک آکر سلام کریں، پھر اسے گڑھے سے باہر نکال دیں، اگر اس نے سلام سنا ہوگا اور آدمیوں کی آواز کو پہچانا ہوگا تو مردوں کا سننا صحیح ورنہ غلط۔ جب وہ مرا نہیں تو صرف زندہ شخص گڑھے میں دفنانے سے نہ اس پر قبر و برزخ کا عذاب آتا ہے اور نہ اس کو برزخ کے احساسات و ادراکات حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل لغویات ہیں، ان میں مشغول نہ ہوں، البتہ ایسے مسائل کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے متعلق قرآن و حدیث کیا کہتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ شاگرد اور قرآن و حدیث کے عملی نمونے ہیں ان کا اس مسئلہ میں اختلاف تھا یا اتفاق؟ اگر اختلاف ہے تو جو مسئلہ اول سے اختلافی ہو اس کی وجہ سے ایک دوسرے پر طعن، کفر و شرک اور بدعت کے فتوے لگانا جائز نہیں، اور اگر وہاں یہ مسئلہ اتفاقی ہے پھر اس میں ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں کہ اسے تسلیم کرے۔ اس پوری بحث سے اتنی بات تو کھل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر نقل و حدیث کی رو سے بالکل صحیح و سالم اور تر و تازہ ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ بعض لوگوں کے اجسام مرنے کے بعد صحیح وسالم رہ جاتے ہیں

اب رہی یہ بات کہ تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ جب بھی کوئی گدھا وغیرہ مرجاتا ہے، وہ ہمارے سامنے ہوتا ہے تو چند روز کے بعد وہ ریزہ ریزہ ہو کر ختم ہو جاتا ہے، نیز بعض قبرستانوں میں قبر کھودتے وقت پرانی قبر کھل جاتی ہے تو اس میں بعض انسانوں کی صرف ہڈیاں ملتی ہیں اور بعض کی ہڈیاں بھی ریزہ ریزہ ہو کر مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جاتی ہیں، تو اس کا کیا جواب ہے ؟

پہلے تو اس کے متعلق اتنی بات کافی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کافی ہے۔ وہ جو فرماتے ہیں اُس کو بسر و چشم تسلیم کریں، البتہ اگر کوئی راہِ فرار اختیار کرنے کرنے کے لیے یا شکی مزاج ہونے کی بنا پر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات تو تسلیم ہے مگر اس کے ثبوت میں تردد ہے۔ اس لیے پھر تجربہ اور طبعی قوانین کو ترجیح دی جائے گی اور طبعی قانون یہ ہے کہ مرنے کے بعد مردے کا جسم زیادہ دیر تک صحیح وسالم نہیں رہ سکتا۔

اس کے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی قوی ثبوت کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے کہ بعض بدنوں کو زمین نہیں کھاسکتی اور نہ ان کو دنیا کی ہوا وغیرہ نقصان پہنچاسکتی ہے۔

اس کے متعلق چند واقعات

اس مسئلہ کے متعلق بہت سے واقعات میں سے صرف چند کو یہاں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے کام لے رہے تھے، انہیں خدمت پر لگا رکھا تھا اور وہ مقررہ کاموں میں مصروف و مشغول تھے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آپہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں ان پر موت طاری کی جب وہ لاٹھی کے سہارے عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے، یا تخت پر بیٹھ کر اپنے عصا کو ٹھوڑی کے نیچے دے کر اس پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ وہ اسی طرح بدستور عرصۂ دراز تک اُسی عصا کے سہارے کھڑے یا تخت پر بیٹھے رہے، چہرہ اسی طرح تروتازہ رہا، جسم میں کوئی تغیر نہیں آیا، اس لیے جنات اس وقت تک اپنے اپنے کام کرتے رہے جب تک وہ اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو دیمک نے اپنا کام (لاٹھی چاٹنا) شروع کیا۔ بالآخر لاٹھی خوب کھوکھلی ہو گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام زمین پر آگئے اور جنات کو اس کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان

علیہ السلام کب کے دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد خود جنات پر بھی اور ان کے معتقد انسانوں پر بھی یہ حقیقت کھلی کہ جنات کو علم غیب حاصل نہیں، ورنہ وہ اتنی دراز مدت تک سخت محنت و مزدوری اور مشقت میں مبتلا نہ رہتے۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۞ "پھر جب ہم نے اس (یعنی سلیمان) پر موت کا فیصلہ کر دیا (اور وہ انتقال کر گئے) تو ان (جنوں) کو موت کا پتا دینے والی دیمک کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی جو ان (یعنی سلیمان) کے عصا کو کھا رہی تھی، پھر جب وہ (زمین پر) آگرے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جانتے تو (اتنا طویل عرصہ) رسوا کن عذاب (یعنی سخت محنت و مشقت) میں نہ رہتے"۔

(سورۂ سبا: آیت ۱۴)

اگر ایک مرے ہوئے جانور کے پاس خشک لکڑی رکھ دی جائے تو چند دن کے بعد وہ جانور گل سڑ کر مٹی میں مل جائے گا جبکہ خشک لکڑی پر اس کی بہ نسبت بہت کم اثر ہوگا، کیونکہ عادۃً گوشت پوست لکڑی کے مقابلہ میں جلد گل سڑ جاتا ہے اور جسم میں بہت جلد ہی تغیرات رونما ہوتے ہیں، لیکن قرآن مجید بتلاتا ہے کہ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، گوشت پوست کا انسان تو عرصہ دراز تک ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہا اور اس کا بدن اور چہرہ بالکل تر و تازہ اور ایسا کھل رہا تھا کہ کسی کو یہ شک بھی نہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں، حتّٰی کہ آپ کی وفات صرف اس بات سے معلوم ہوئی کہ آپ کی خشک عصا کو دیمک نے کھا کر آپ کے سہارے کو ختم کر دیا اور آپ زمین پر آگرے، تب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو کب کے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

۲۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ حضرت عبد الرحمن بن صعصعہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ حضرت عمرو بن جموح اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں انصار میں سے تھے، ان کی قبر سیل یعنی رَو کے متصل واقع تھی اور سیل یعنی رَو نے قبریں کھود ڈالیں۔ یہ دونوں انصاری غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تھے اور ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔ جب دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبروں کو پوری طرح کھولا گیا (تو ان کے متعلق راوی کہتے ہیں کہ): فَوُجِدَا لَمْ يَتَغَيَّرَا كَأَنَّهُمَا مَاتَا

بِالْاَمْسِ وَكَانَ اَحَدُ هُمَا قَدْ جُرِحَ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى جُرْحِهٖ فَدُفِنَ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَاُمِيْطَتْ يَدُهٗ عَنْ جُرْحِهٖ ثُمَّ اُرْسِلَتْ فَرَجَعَتْ كَمَا كَانَتْ وَكَانَ بَيْنَ اُحُدٍ وَبَيْنَ يَوْمَ حُفِرَ عَنْهُمَا سِتٌّ وَّ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً یعنی ”توان دونوں کو ایسی حالت میں پایا گیا کہ ذرا بھی تغیر نہ تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ کل دفن کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب جب زخمی ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا اور اسی حالت میں ان کو دفن کر دیا گیا تھا، قبر سے نکلنے کے بعد ان کا ہاتھ جب زخم سے ہٹا کر چھوڑا جاتا تو وہ ہاتھ اسی طرح زخم پر پھر جا چمٹتا، حالانکہ غزوۂ اُحد اور جس دن ان کی قبر کھودی گئی ان کے درمیان چھیالیس سال کی مدت گزر چکی تھی“۔ (موطا امام مالک ص ۴۸۲ ابواب الجهاد)

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ان کے چہرے پر جو زخم تھا ان کا ہاتھ زخم پر رکھا ہوا تھا، لوگوں نے وہاں سے ہاتھ ہٹایا تو تازہ خون بہنے لگا، پھر ہاتھ دوبارہ وہاں رکھا گیا تو خون بند ہو گیا۔

(دیکھیے طبقات ابنِ سعد: ج ۳)

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک اجاڑ زمین کھودی گئی تو اس میں عبد اللہ بن تامر کی لاش نکلی، انہوں نے اپنے سر (کنپٹی) پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ جب زخم سے ان کا ہاتھ ہٹا لیا جاتا تھا تو خون بہنے لگتا اور جب اس کو چھوڑ دیا جاتا تو پھر اپنی جگہ پر جا چمٹتا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لوہے کی انگوٹھی تھی اس پر ربی اللہ لکھا ہوا تھا۔ جب یہ اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی تو انہوں نے یہ لکھ بھیجا کہ تم نے جس حال پر ان کو پایا ہے، اسی حالت میں دفن کر دو۔ (دیکھیے تفسیر خازن ابن کثیر، قرطبی اور مظہری: سورہ بروج)

عبد اللہ بن تامر رضی اللہ عنہ کا عجیب واقعہ سورۃ البروج کی تفسیر میں اصحاب الاخدود کے تحت مفسرین نے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے قبل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی ولی اللہ کا واقعہ ہے جو یمن کے شہر نجران میں پیش آیا تھا اور عبد اللہ بن تامر شہید کو وہاں دفن کیا گیا تھا۔ یہ ایک طویل واقعہ ہے، اس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں اور صحیح مسلم کی کتاب التفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۴۔ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، اس وقت عراق میں بادشاہت تھی، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہما کی قبریں اس وقت یہاں (جامع مسجد سلیمان رضی اللہ عنہ) کے احاطے میں نہیں تھیں، بلکہ یہاں سے کافی فاصلے پر دور دریائے دجلہ اور مسجد کے درمیان کسی جگہ واقع تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں بادشاہِ وقت

نے خواب دیکھا کہ حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہما فرمارہے ہیں کہ ہماری قبروں میں پانی آرہاہے، اس کا مناسب انتظام کرو۔ یہی خواب بار بار اس نے دیکھا۔ غالباً اس وقت عراق کے کسی عالم نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا۔ اس وقت مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں بزرگوں کی قبروں کو کھول کر دیکھا جائے، اگر پانی وغیرہ آرہا ہو تو ان کے جسموں کو منتقل کیا جائے۔ اس وقت کے علما نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ چونکہ قرنِ اول کے دو عظیم بزرگوں اور صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبروں کو کھولنے کا واقعہ تھا جو کہ بہت اہم تھا اس لیے حکومتِ عراق نے اس کا بڑا زبردست اہتمام کیا اور اس کے لیے تاریخ مقرر کی تاکہ لوگ اس عمل میں شریک ہو سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ مقررہ تاریخ پر نہ صرف اندرون عراق بلکہ دوسرے ممالک سے بھی لوگوں کا اس قدر اژدہام ہوا کہ حکومتِ عراق نے سب کو یہ عمل دکھانے کے لیے بڑی بڑی اسکرینیں دور تک نصب کیں تاکہ جو لوگ براہِ راست قبروں کے پاس یہ عمل نہ دیکھ سکیں، وہ ان اسکرینوں پر اس کا عکس دیکھ لیں۔ اس طرح یہ مبارک قبور کھولی گئیں اور ہزارہا افراد کے سمندر نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تقریباً تیرہ صدیاں گزرنے کے باوجود دونوں بزرگوں کی نعش ہائے مبارکہ صحیح و سالم اور تروتازہ تھیں، بلکہ ایک غیر مسلم ماہر امراض چشم وہاں موجود تھا، اس نے نعشِ مبارک کو دیکھ کر بتایا کہ ان کی آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک موجود ہے جو کسی مردے کی آنکھوں میں کچھ دیر تک انتقال کے بعد موجود نہیں رہ سکتی، چنانچہ وہ ڈاکٹر یہ منظر دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

نعش مبارک کو منتقل کرنے کے لیے پہلے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قریب جگہ تیار کر لی گئی تھی، وہاں تک لے جانے کے لیے نعش مبارک کو جنازے پر رکھا گیا۔ اس میں لمبے لمبے بانس باندھے گئے اور ہزارہا افراد کو کندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس طرح اب ان دونوں بزرگوں کی قبریں موجودہ جگہ پر بنی ہوئی ہیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد انصاری مدظلہم کا بیان ہے کہ ۱۹۲۹ء کا یہ واقعہ مجھے یاد ہے۔ اس زمانے میں اخبارات کے اندر اس کا بڑا چرچا تھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ماہنامہ البلاغ، محرم الحرام ۱۴۰۶ھ بمطابق ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۵ء، راس امید سے دجلہ تک، پانچویں قسط)

یہ چند واقعات بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں اور جسموں کا صحیح و سالم ہونا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور

گذشتہ لوگوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ افغانستان کے جہاد میں بھی بہت سے واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ بہت عرصہ کے بعد شہیدوں کو پایا گیا اور وہ بالکل صحیح و سالم اور تروتازہ تھے، نیز اس کے علاوہ بھی بہت سے مشاہدات سامنے آئے ہیں، مثلاً خود میرے والد ماجد مد ظلہم کو ایک ملنگ نامی افغانی بوڑھے شخص نے ایک واقعہ سنایا، اس نے کہا کہ افغانستان کے جہاد سے قبل ہم ایک عمارت کے لیے مزدوروں کے طور پر کھدائی کر رہے تھے۔ جب کھدائی اتنی گہری ہوئی کہ اس میں کھودانی ڈوب جائے تو ایک قبر نکل آئی جس میں ایک حسین و جمیل جوان عورت پڑی تھی۔ اس کا کفن بالکل گیس کی سفید جھلی کی طرح ہو چکا تھا، اس کا چہرہ اور بدن اس قدر تروتازہ تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی اس کو دفن کیا گیا ہے اور اسی سال بارشوں و سیلابوں میں میانوالی وغیرہ کے قبرستانوں میں سے بعض قبروں سے صحیح و سالم لاشیں برآمد ہوئیں۔ بعض لاشیں ایسی بھی برآمد ہوئیں جو قریب دو تین سال پہلے دفن کی گئی تھیں اور ان کو ان کے ورثا، دوست احباب خوب پہچان رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل کے جنگ اخبار میں شائع ہونے والی یہ خبر بھی پڑھ لیجیے۔

پرانی قبر نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا

چکوال (نمائندہ جنگ) یہاں سے ۴۵ کلومیٹر دور جھیک (بشارت) کے مقام پر چالیس سال پرانی ایک قبر نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا جبکہ حالیہ مسلسل تیز بارش کی بدولت اس میں بڑی دراڑ پڑ گئی، مگر فرمان شاہ نامی شخص (جن کا انتقال چالیس سال قبل ہوا تھا) کی لاش بمعہ کفن اپنی ساخت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ اس معجزے کو دیکھنے کے لیے دور دراز سے لوگ آئے۔ **(روزنامہ جنگ)**

آپ نے دیکھ لیا کہ نقل و مشاہدہ دونوں اس بات کی پوری پوری تائید و تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض جسموں کو صحیح سالم، تروتازہ رکھتے ہیں، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ جسم کا صحیح سالم ہونا توحید کے منافی نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ فرعون کے جسم کو تو ضرور مٹی کر کے مٹی میں ملا دیتے، کیونکہ اس نے تو خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اس کی قوم نے اس کو اپنا رب مان لیا تھا، لیکن چونکہ جسم کا سالم ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسان ہی تھا اور ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مغرور اور متکبر و سرکش کے ڈھانچے کو بچا

لیا تا کہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ فرعون اپنے آپ کو غرق ہونے سے بچا کر آسمان پر چلا گیا ہو گا۔

بعد میں آنے والے لوگ اس سے اور اس کے پورے واقعے سے عبرت اور سبق لے لیں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ یہی وہ خدائی کا دعوٰی کرنے والا ہے جو اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر غرق ہو کر آج بھی مصر کے عجائب گھر میں دنیا کے سامنے بے بس پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ فرعون کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً "پس آج ہم تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں اور ان میں گلنے سڑنے سے) بچائیں گے تا کہ تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے (عبرت کی) نشانی بنے۔" (سورۂ یونس: آیت ۹۲)

دوسروں کی حفاظتِ جسم پر انبیا علیہم السلام کی حیات اور اجسام مبارکہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا

یہاں یہ بات یاد رہے کہ بدباطن اور کج فہم یہ نہ سمجھے کہ (العیاذ باللہ) انبیا علیہم السلام کے مبارک جسموں کا صحیح سالم ہونا بھی دوسروں کی طرح ہو گا اور ان میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ ان میں اور دوسروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مثلاً: خنزیر کا گوشت کھانا حرام ہے اور انسان کا بھی، لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک کا نجس ہونے کی بنا پر حرام ہے اور دوسرے کا تکریم اور اعزاز کی بنا پر۔ اسی طرح کتے و بھیڑیے کا گوشت بھی حرام ہے اور حرم کے شکار کبوتر وغیرہ کا گوشت بھی، لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلا اس لیے کہ وہ پلید اور گندا ہے اور کبوتر وغیرہ کا شکار پاک وصاف ہے، لیکن بیت اللہ اور حرم کی عظمت کی وجہ سے حرام ہے۔ نیز قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام بھی تا قیامت موجود رہے گا اور فرعون اور شیطان کا بھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تا قیامت مدح، تعریف کی جائے گی، ان پر سلام بھیجا جائے گا اور دوسرے فریق کی تا قیامت مذمت کی جائی گی اور اس پر لعنت بھیجی جائے گی۔

ان مثالوں کے بعد یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ فرعون کی لاش کو سمندر کی موجوں اور سمندر میں گلنے سڑنے سے بچا کر سمندر سے باہر نکالنا، اس کو لوگوں کے سامنے منظرِ عام پر لانا اور پھر انسانوں کے ہاتھوں اس کی لاش کی حفاظت کرانا اس لیے تھا کہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ فرعون اپنی خدائی کا مظاہرہ کر

کے آسمان پر چلے گئے، نیز یہ کہ اس کی تحقیر و تذلیل ہو اور آئندہ نسلوں کے لیے سامانِ عبرت ہو۔ رہا انبیا علیہم السلام کا معاملہ، ان کی اجسام کی تو شان ہی اور ہے اور ان کی تو روحانی قوت و تقدس اور عظمت اس قدر ہے کہ زمین، اور دنیا کی آب و ہوا ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں کر سکتی۔ غیر انبیا کے وہ پاکیزہ اجسام جو زمین کے اندر سے سالہا سال بعد صحیح سالم بر آمد ہو جاتے ہیں ان کو بھی حضرات انبیا علیہم السلام کے اجسام پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ ان دونوں طبقات کے درمیان جو فرق ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، البتہ انبیا علیہم السلام کی ارواح کی قوت، ان کا اعتدال، ان کی طہارت و تقدس اور عظمت کو جس قدر برتری اور جس قدر امتیازات دوسروں پر حاصل ہیں اسی قدر امتیازات کے ساتھ ان کی قبر و برزخ کی زندگی ہو گی اور اسی قدر امتیازات کے ساتھ ان کے اجسامِ مبارکہ زمین کے اندر باقی رہتے ہوں گے۔

پھر میرے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تمام انبیا علیہم السلام کے سردار کی حیاتِ قبر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو کس قدر امتیازات حاصل ہوں گے، جن کے متعلق ساری کائنات اور تمام جہانوں کے پروردگار یہ فرماتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ

"بے شک آپ اخلاق کے عظیم الشان مرتبہ پر فائز ہیں"۔ (سورۃ القلم: آیت ۴)

اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ "اور ہم نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔ (سورۃ الانبیاء: آیت ۱۰۷)

اور جن کی شان یہ ہے کہ سرکش کفار و مشرکین تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مطالبہ کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یوں آجائے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَاَنۡتَ فِیۡہِمۡ وَمَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمۡ وَہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ۞ "اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ آپ ان کے درمیان موجود ہوں اور ان کو عذاب میں ڈال دے، اور نہ اللہ تعالیٰ ایسی حالت میں ان پر عذاب نازل کرنے والا ہے جبکہ وہ (اللہ تعالیٰ سے) معافی مانگ رہے ہوں"۔ (سورۃ الانفال: آیت ۳۳)

نیز ایسے محبوبِ الٰہی کی شان کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی وحی کے تحت یہ فرماتے ہیں کہ: اَنَاسَیِّدُوَلَدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَاَوَّلُ مَنْ یَّنْشَقُّ عَنْہُ الْقَبْرُ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ ”قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے قبر سے میں ہی اٹھوں گا، نیز سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہو گی“۔ (مسلم)

جس ہستی کی شان اور نام کو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی بلند کرتا ہے اور جس کو آخرت میں اول و آخر کے تمام لوگوں کے سامنے مقامِ محمود پر فائز کیا جاتا ہے۔ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ”اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا“۔ (سورۃ الم نشرح: آیت ۴)

عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

”قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقامِ محمود میں پہنچا دے“۔ (سورۃ الاسراء: آیت ۷۹)

تو ایسی ہستی جن کی علوّ شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مقام یہ ہو، اور جن کو اللہ تعالیٰ نے عظمت، علوّ شان عطا کی ہو ان کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرنا اپنی رسوائی اور خسران کے سوا کچھ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بے باک زبان کی غلطی

مذکورہ بالا پوری بحث سامنے رکھ لیں تو ان لوگوں کی غلطی سامنے آجائے گی جن کی زبانیں حضور ﷺ کی شان میں اس قدر بے باک ہیں اور ان کی باتیں سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا وہ بالکل غیر مسلم ہیں، کم بخت ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں، حالانکہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف بھی ہو یا حدود سے تجاوز کرنے والوں کا جواب دینا ہی مقصود ہو جو رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہرانے کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ خود میرے آقا ”فداہ ابی و امی“ نے فرمایا کہ: لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی اِبْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا: عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ ”مجھے حد سے نہ بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو حد سے بڑھایا (کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور جز قرار دیا)، میں اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو“۔ (بخاری و مسلم)

تو یہ کب جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے رتبہ سے گھٹایا جائے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بعد مخلوقِ الٰہی میں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیا علیہم السلام؛ سب سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز اور سب کے سردار آپ ﷺ ہی ہیں اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ کیا توحید یا لوگوں کو تجاوز سے روکنے کا یہی طریقہ ہے کہ خود بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی توہین الرسول ﷺ میں مبتلا کر کے خود بھی گمراہ ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دو۔

ذرا دیکھو تو سہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں اس قدر تجاوز کیا گیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور جز قرار دیا گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو سب کچھ اختیار حاصل ہے اور فرشتے وانبیا ہر ہر چیز اس کی مخلوق ہیں، پھر بھی وہ عیسائیوں کے غلط عقیدہ کی تردید کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان وعظمت کو برقرار رکھتا ہے۔ کبھی قرآن مجید ان کو کلمۃ اللہ یعنی اللہ کا کلمہ سے تعبیر کرتا ہے اور عیسائیوں کے بد عقیدہ کے باوجود قرآن مجید میں ان کے معجزات اور عجائب کو بیان فرماتا ہے کہ وہ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک دیتے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا، مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کرتے تھے، کوڑھیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے درست کرتے تھے اور لوگ جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے تھے اور جو کچھ ذخیرہ کر لیتے تھے یہ سب کچھ وہ ان کو بتایا کرتے تھے۔

(دیکھیے آل عمران: آیت ۴۹، المائدہ: آیت ۱۱۰)

پھر قرآن مجید عیسائیوں کے اس غلو و تجاوز کے باوجود صرف ان کے کمالات کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان گھٹانے کے لیے جو کچھ کیچڑ ان پر اور ان کی والدہ پر اچھالا تھا اس سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کی پوری برأت و پاکیزگی کو پیش کرتا ہے۔

اس کے برعکس آج کل ظالموں کی توحید یہ رہ گئی ہے کہ بس سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کے دین پر مرمٹنے والے اولیاء اللہ کی کمزوریوں کو جھوٹ موٹ بنالیا جائے اور پھر ان کو اچھال اچھال کر بیان کیا جائے اور ان کی شان کو گھٹا کر اُمت میں ان کی ناقدری کا تخم بویا جائے، حالانکہ یہ ایک ایسی غلطی اور جرم ہے کہ اس کے کنارے کفر سے جاملتے ہیں، اور یہ ایک ایسا رویہ ہے کہ آج سے پہلے مسلمانوں کے بجائے کفار کا شیوہ تھا، بس رسول اللہ ﷺ کی توہین

میں توحید کو ڈھونڈنا سراسر شرک و کفر ہے اور کسی بھی مخلوق کو خدائی اختیارات کا مالک ماننا خواہ وہ ذاتی ہوں یا عطائی، یہ بھی سراسر گمراہی اور شرکِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ افراط و تفریط سے بچائے۔ آمین!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت بھی لازمی ہے

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ محبت اور عداوت دونوں متعدی صفات ہیں، یہ بجلی کا ایسا کرنٹ ہے کہ جس کے ساتھ بھی اس کا تار جڑا ہوا ہو، وہاں تک بجلی کی لہریں دوڑتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو لازماً اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ وابستہ چیزوں سے بھی محبت ہو گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو گی، قرآن مجید سے محبت ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے محبت ہے تو لازماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت ہو گی، اہلِ بیت پاک سے محبت ہو گی، اسی طرح یہ سلسلہ آخر تک بلکہ تمام اُمت مسلمہ تک پھیل جاتا ہے اور ایک مسلمان فی الجملہ تمام اُمتِ مسلمہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

لٰہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ، اولیاء اللہ اور دینِ اسلام کی تعلیمات پہنچانے والوں کے ساتھ محبت اور ان کے ساتھ وفاداری و خیر خواہی میں کمی تو بہت بڑی بات ہے، اگر اُمت مسلمہ سے بھی محبت، وفاداری اور اس کی خیر خواہی دل میں نہیں تو یہ بھی نفاق کی چھپی ہوئی لہر ہے جو اندر ہی اندر دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے: اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ "یعنی دین اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے پیشواؤں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی اور وفاداری کا نام ہے"۔ (دیکھیے صحیح بخاری اور صحیح مسلم: کتاب الایمان)

یہ بات تو ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ خلوص، وفاداری اور خیر خواہی اس وقت ہو سکتی ہے جب اس کے ساتھ محبت بھی ہو۔

صحابی کون ہوتا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جس شخص نے مسلمان ہونے کے بعد بیداری اور ہوش کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی ہو اور اسی ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا ہو وہ صحابی ہے۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی کوئی مسلمان ہوا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت وملاقات کا شرف حاصل نہیں کیا، یا عہد مبارک میں کوئی بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ اس کی ملاقات بھی ہو گئی لیکن وہ اس وقت اس قدر چھوٹا تھا کہ اس کو کوئی تمیز اور ہوش نہ تھا، یا کسی شخص نے آپ ﷺ کے زمانے کے بعد کشف یا خواب کی حالت میں آپ ﷺ کی زیارت کی، بلکہ آپ ﷺ سے کلام کر کے آپ ﷺ سے استفادہ بھی کیا ہو؛ تو ان صورتوں میں وہ درجۂ صحابیت کو نہ پا سکے گا۔

موجودہ زمانے میں سلف صالحین اور صحابیت کے خلاف زہر پھیلانے والے کون ہیں؟

آج کل متعدد تحریکات ایسی پائی جاتی ہیں جو مسلم عوام کے دلوں سے سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، فقہائے اسلام اور اولیاء اللہ کا اعتقاد و اعتماد اٹھا کر ان میں گمراہانہ نظریات کی آبیاری کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ ان میں سے اسلام اور صحابیت کے خلاف زہر پھیلانے والا ایک تو یورپ، امریکہ وغیرہ کا طبقۂ مستشرقین ہے۔ ان میں بعض تو ایسے وہ ہیں جنہوں نے اسلام کے ساتھ ہمدردی کے اظہار اور اس کی تعریف و توصیف پر بہت سے صفحات سیاہ کر کے ان میں الحاد، زندقہ اور عداوتِ اسلام کے خبیث جراثیم چھپا دیے ہیں اور مسلمانوں کو شیرینی میں زہر ملا کر پلایا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اول سے سبائیت اور خارجیت کے شکار چلے آرہے ہیں۔

اور تیسرا گروہ خود مسلمانوں کے اندر ایسے لوگوں کا پیدا ہو چکا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمالات کو بہت سطحی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کو وہ وزن دینے کے لیے تیار نہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کی نظر صرف ان چیزوں پر پڑتی ہے جن سے کسی طرح ان کے عیب اور نقص کی بات نکل سکتی ہے۔ ایسے بعض لوگ تو اس عظیم جرم کے ارتکاب کے باوجود اپنے نام کو اہل سنت والجماعت سے بھی نہیں کاٹنا چاہتے۔ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے بغیر لکھے جانے والے تاریخ کے جھوٹے خوابوں سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کچھ لغزشیں اور کوتاہیاں جمع کرتے ہیں اور پھر ان کو تحقیق و اجتہاد کا نام دے کر اپنے گندے اور خبیث تبصرہ کے ذریعہ قرآن و حدیث کا فیصلہ جھٹلا کر اپنے کفر و گمراہی کا سامان کرتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ پہلے تو تاریخی واقعات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے شمار خوبیوں اور قربانیوں کے سمندر میں جب معمولی سا نقص کا پہلو نکل آتا تو ایک منصف مزاج مؤرخ اس کے ساتھ یہ وضاحت کرتا تھا کہ تاریخی روایات رطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہیں جن میں صحیح بھی ہوتی ہیں اور سقیم بھی۔ لیکن

آج کل جوشِ تحقیق میں مست گمراہانِ زماں کا مشغلہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیچڑ اُچھالنا بن گیا ہے۔ یہ لوگ تاریخ کے انہی جھوٹے خوابوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کچھ لغزشیں ذہن میں رکھ کر کسی عنوان کو ترتیب دیتے ہیں، پھر مختلف جگہوں سے لغزشوں کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے مضمون کا حصہ بنا کر دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور پھر نادانستہ طور پر سبائیوں، رافضیوں، خارجیوں اور دیگر دشمنانِ اسلام کی خدمت سرانجام دیتے ہیں، جن کا بنیادی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ دینِ حق کی اصلی ہیئت کو بگاڑنے کے لیے قرآن و سنت پہنچانے والوں کے اعتماد کو زائل کیا جائے، جس کے بعد دینِ اسلام کا کوئی بھروسہ نہیں رہے گا اور اس کے بعد جو بھی اسلام میں تغیر و تبدل کرنا چاہے آسانی سے کر سکے گا، بلکہ ایسے لوگوں کا اصل وار دانستہ یا نادانستہ طور پر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی ہے۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان گھٹانے کا ایک خبیث قدم صحابیت کو داغ دار کرنا ہے

چنانچہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان گھٹانے کا ایک خبیث قدم صحابیت کو داغ دار کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہ کسی ماہر استاد کی قابلیت اس کے شاگردوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اگر کسی ماہر استاد کا کمال اور مہارت ختم کرنا ہو تو پہلے براہِ راست اس کی ذات پر حملہ کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی حالت ایسی ہو کہ اس کے فن و مہارت پر نکتہ چینی چاند پر تھوکنے کے مترادف ہو، تو پھر ایسی صورت میں اس کا مخالف اور دشمن اس کا بظاہر مدّاح بن کر اس کے شاگردوں پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے خلاف افواہیں اڑایا کرتا ہے، تاکہ شاگردوں کی بدنامی سے خود بخود استاد کی قابلیت داغ دار ہو جائے۔

نیز کسی حکیم و ڈاکٹر کی قابلیت کا اندازہ اس کے سپرد کیے ہوئے مریضوں سے لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح پیغمبروں کے کمالات و اوصاف اور ان کی تربیت کا صحیح رنگ ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقوں اور یہود وغیرہ کا شروع سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) یہ رویہ رہا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اہمیت گھٹانے کے لیے جو مختلف طریقے اختیار کرتے تھے ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ صحابیت کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن ان خبیثوں کی خباثت کا اثر ایک عرصہ بہت کم رہا۔ اگرچہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے شروع

میں ارتداد اور ادائیگی زکوٰۃ سے انکار اور سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت میں انہی منافقوں اور یہود کا ہاتھ تھا، لیکن پھر بھی یہ اثر ایسا نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے عقائد، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی سیاسی قوت و یک جہتی پر اثر انداز ہو سکتا۔

عبداللہ بن سبا یہودی کی سازش اور یہودیوں کی تحریکِ سبائی

لیکن سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے مبارک دورِ خلافت میں چونکہ اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور ایران و مصر وغیرہ ممالک اسلامی پرچم و اقتدار کے تحت اطمینان کے ساتھ رہنے لگے، ایسی حالت میں اگرچہ مسلمانوں کی نئی نسل کی بہت بڑی تعداد ایسی جوان ہو چکی تھی جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گود میں پرورش پائی تھی اور وہ تقویٰ و پرہیزگاری کے لباس سے آراستہ تھے اور اسلامی شعور و فراست حاصل کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی اس سے کہیں بڑھ کر ایک عظیم تعداد ایسے مسلمانوں اور نو مسلموں کی بھی تھی جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استفادہ نہیں کیا تھا اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تربیت یافتہ نہ تھے، بلکہ ایران و مصر جیسے مفتوحہ ممالک میں نو مسلموں کی بہت بڑی تعداد ایسی بھی پائی جاتی تھی جو مسلمان تو ہو گئے مگر نہ وہ اسلامی تعلیمات سے باخبر تھے اور نہ وہ اسلام کی حقانیت و صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے، بلکہ وہ صرف مسلمانوں کے اخلاق و کردار اور سیاسی برتری سے مرعوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو بہت بڑی مقدار میں ایسے کچے اور بے شعور مسلمان مل گئے جنہیں وہ اپنے ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے تھے، لہٰذا دشمنوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی تحریک اور تیز کر دی۔

اس تحریک کے اصل پیشوا یہود تھے، انہی کے مشوروں سے بعض نے نفاق کے نقاب چہروں پر ڈال کر اپنے آپ کو مسلمان باور کرایا اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوئے۔ منافقوں کی اس جماعت کا سربراہ ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا تھا، جو بہت زیادہ چالاک اور مکار شخص تھا۔ اس کے سینے میں اسلام دشمنی کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی سیاسی قوت اور دینی سرمایہ کو ختم کرنے کے لیے ایک خفیہ جماعت بنائی۔ اس نے زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز کی کہ کسی نہ کسی طرح صحابیت کو بدنام کیا جائے۔ چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا، اس وقت چمکتے ہوئے ستاروں کو داغ دار ثابت کرنے اور ان پر تھوکنے

کا نتیجہ اپنی تحقیر ورسوائی کے سوا کچھ نہیں تھا، اس لیے اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے ”تقیہ“ یعنی حصولِ مقصد کی خاطر ہر قسم کے جھوٹ کو روا رکھا اور ان خبیثوں نے بیک وقت دو کام شروع کیے۔ ایک یہ کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے تھے اور دوسرا جھوٹی حدیثیں گھڑ کر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

بلاشبہ ان شیطانوں نے ابلیس کے اشاروں پر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے جو صورت تجویز کی تھی، اس خبیث کام کے لیے اس سے بہتر تجویز کوئی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اگر یہ تحریک پوری طرح کامیاب ہو جاتی تو اس سے چند نتائج کا وجود لازمی تھا:

۱۔ جھوٹی حدیثوں کی بنیاد پر اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ایک ایسا مذہب وجود میں آجاتا جو اسلام کی بدنامی اور اسلام و پیغمبرِ اسلام سے تنفر کا سبب بن جاتا۔

۲۔ صحابیت کی بدنامی سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تزکیہ و تربیت مشکوک ہو جاتی اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان خود بخود گر جاتی۔

اگر کسی ڈاکٹر کے سپرد کیے ہوئے لاکھوں زکام کے مریضوں میں سوائے چار پانچ کے باقی تمام کے تمام زکام کے بجائے ٹی بی میں مبتلا ہو جائیں، تو ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ یہ ڈاکٹر تو کیا ایک عام انسان سے بھی بدتر ہے، کیونکہ اس کے علاج اور مریضوں کا حال یہ ہے کہ اس کے مشوروں پر چلنے سے تمام مریض پہلے سے بھی بڑھ کر خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ باقی رہا لاکھوں میں سے چار پانچ کا شفا یاب ہو جانا، یہ کوئی کمال نہیں۔ لاکھوں انسانوں کو زہریلی چیز کھلائی جائے تو ضروری نہیں کہ سب کے سب مر جائیں، بلکہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو یہی زہریلی چیز کھا کر کسی اور بیماری سے نجات بھی پا جائیں۔ غرض یہ کہ صحابیت کو بدنام کرنے کے بعد سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و عظمت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و قیمت خود بخود گر کر ختم ہو جاتی جس کے بعد نہ صرف اسلام کی طرف غیر مسلموں کی کشش ختم ہو جاتی بلکہ آئندہ نسل کے مسلمان، جنہوں نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہوتا اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و اخلاق کو، ان کے دلوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت باقی نہ رہتی جو کہ دینِ اسلام کی روح ہے اور جس کے بغیر ایک انسان نام نہاد مسلمان اور منافق تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی

مؤمن و مسلمان کبھی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ صحابیت کو بدنام کرنے کے بعد قرآن مجید اور سارا کا سارا دینِ اسلام خود بخود مشکوک اور مشتبہ ہو جاتا، کیونکہ قرآن مجید، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے افعال کو نقل کرنے والے یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اگر ان پر اعتماد نہ رہا تو صرف یہی نہیں کہ مسلمان قرآن و حدیث کے مفہوم کو متعین نہ کر سکیں گے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی لازمی نتیجہ ہو گا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ قرآن مجید رہے گا اور نہ ارشادات و افعالِ رسول اللہ ﷺ کا ذخیرہ، کیونکہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید اور سنتِ نبویا علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی زنجیر کی وہ پہلی مضبوط کڑی ہے جو بعد میں آنے والی نسلوں کو قرآن و سنت کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ان شیطانوں نے اس بات کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اگر صحابیت کی اس عظیم جوہری قوت پر کاری ضرب لگائی جائے تو اس کے بعد نہ اسلام کی تعلیمات و ہدایات رہیں گی اور نہ مسلمانوں کی سیاسی قوت و اقتدار اور یک جہتی، اس لیے ان خبیثوں نے سارا زور اسی کام پر لگا دیا۔

پرہیزگاری کے لباس میں جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر آپ ﷺ کی طرف منسوب کرنے لگے، اہلِ بیتِ پاک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھوٹی محبت کا اظہار کر کے پس پردہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف طرح طرح کی افواہیں، جھوٹے پروپیگنڈے اور واقعات کی باطل اور غلط توجیہات شروع کیں، اور جب کبھی ضرورت پڑتی تو انہی میں سے بعض شیطانوں کو اس بات کے لیے چنتے کہ وہ دوسرے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق جھوٹی محبت کا اظہار کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیتِ پاک وغیرہ پر وار کر کے جارحیت کو اختیار کر لیں تاکہ پوری صحابیت خواہ وہ اہل بیتِ پاک کی صورت میں ہو یا غیر اہلِ بیت کی صورت میں؛ سب کے سب ختم ہو جائیں۔

اس سبائی فتنے نے اس قدر سخت سازش کی کہ اس کے نتیجے میں خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین، خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آپ ﷺ کے نواسے (جگر گوشہ) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادتوں کے عظیم واقعات پیش آئے۔

یہود اور عبد اللہ بن سبا کی سازش اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودی اور سبائی سازش اس قدر طاقتور، خبیث اور خطرناک تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شاملِ حال نہ ہوتا تو ان یہودیوں نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو ساول و پولس کے نظریات و عقائد میں تبدیل کر کے عیسائی مذہب کو بالکل ختم کر دیا تھا، اسی طرح یہ لوگ قرآن مجید اور اسلام میں تحریف و تبدل کر کے اسلام کو پوری طرح سبائیت میں تبدیل کر دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ ہی دینِ اسلام کا محافظ تھا اور اسی نے اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے باشعور اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تربیت یافتہ مسلمانوں اور پھر ان کے شاگردوں سے وہ کام لیا اور انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ دینِ اسلام کی تعلیمات کو وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور دینِ اسلام کی تعلیمات کے معاملہ میں ان خبیثوں کی ہر کوشش و محنت کو بالکل ناکام بنا دیا، البتہ ان خبیثوں کی وجہ سے ایک تو مسلمانوں کی سیاسی قوت اور یکجہتی کو وقتی طور پر بہت نقصان پہنچا اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ انہوں نے کچھ کچے مسلمانوں کو صرف سیاسی طور پر نہیں بلکہ مذہبی طور پر بھی جدا کر کے اپنے باطل مذہب سبائیت و خارجیت کا پیروکار بنا لیا۔

اگرچہ خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جس طرح بہت سے سبائی زندیقوں کو جلا کر راکھ کر دیا اسی طرح خارجی شیطانوں کو بھی قتل کر کے سخت سزائیں دیں، لیکن کچھ عرصہ بعد اس سبائی فتنے اور خارجی فتنہ کے پروردہ لوگوں نے مذہبِ سبائیت یعنی مذہب شیعہ اور خارجیت کو قائم کیا اور یہی لوگ اس وقت سے آج تک آستینوں کے سانپ بنے ہوئے ہیں۔ جس قدر نقصان شروع سے لے کر آج تک ان خبیثوں نے مسلمانوں کو پہنچایا ہے اس کے مقابلے میں دوسرے غیر مسلموں کا پہنچایا ہوا نقصان شاید ایک فیصد بھی نہ ہو گا۔

نیز ان لوگوں کی جھوٹی افواہوں، پروپیگنڈوں، واقعات کی غلط توجیہات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واہل بیتِ پاک پر جو کچھ کیچڑ اچھالا گیا تھا؛ سبائی فتنے کے شکار مؤرخین نے ان سب غلط اور صحیح کو جمع کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا اور اس کے بعد بھی تقریباً جتنے مؤرخین نے تاریخ لکھی ہے اُن سب نے لوگوں کے سنے سنائے افسانوں اور ان ہی تاریخی افواہوں اور غیر مستند روایات کو نقل کیا ہے۔

اگرچہ بعض محققین نے تاریخی واقعات کو پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے، لیکن سبائیوں اور خارجیوں نے تاریخ میں ایسا زہر ملا دیا ہے کہ اس کا جو اثر دوسری تاریخ میں ہوا ہے وہ اس کے ازالے کے لیے ناکافی ہے۔ سبائی افواہوں اور افسانوں کا زہر اس قدر خطرناک ہے کہ اگر کوئی ان کی تاریخ کو پوری طرح قبول کر لے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کی عقیدت و محبت خطرے میں پڑ جائے گی۔

لیکن الحمد للہ! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث موجود ہیں۔ ان کے پاس صحیح بخاری و مسلم وغیرہ کی ایسی کتابیں ہیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مستند تاریخ اور واقعات کی صحیح صورتِ حال لکھی گئی ہے اس لیے وہ ہر تاریخی روایت کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے اور نہ وہ تاریخ کی کسی ایسی غیر مستند روایت کو ایک لمحہ کے لیے قبول کر سکتے ہیں جو صحابیت کی شان و عظمت کے منافی ہو، کیونکہ ایک مسلمان اس بات کو خوب جانتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقویٰ و پرہیزگاری، ان کی باہمی محبت و شفقت اور ترحم تواتر اور یقین کے ساتھ ثابت ہے، ان کی دیانت و امانت، خلوص اور باہمی ایثار و محبت اس قدر مسلّم ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دشمنانِ اسلام بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ جن کی تقدس و پاکیزگی اس قدر یقین کے ساتھ ثابت ہو تو ان کے خلاف غیر مستند تاریخی روایات اور وہ روایات جنہیں سبائیوں اور جھوٹوں نے نقل کیا ہے یا ان کذابوں پر اعتماد کر کے کسی نے نقل کیا ہے ان کی بنیاد پر کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے کردار کو مجروح کرنا نہ شریعت کی رو سے جائز ہے اور نہ عقل کی رو سے۔

فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

علمائے اسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل، دین کی خاطر ان کی قربانیوں اور ان کی سوانح پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و محاسن کی پوری تفصیل تو انہی کتابوں میں مل سکتی ہے تاہم یہاں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ ارشادات بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج انسان پر خود بخود یہ بات کھل جائے گی کہ تاریخ کی بعض روایات قطعاً جھوٹی ہیں یا بہت ہی غلط رنگ میں پیش کی گئی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان و تقویٰ تھا اور وہ کفر و معصیت سے سخت بیزار تھے

وَلٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۞ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۞

"لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان محبوب بنا دیا اور اس (ایمان) کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر و فسق اور (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہدایت یافتہ ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔ (سورۃ الحجرات: آیت ۷۔۸)

اور ایک دوسری جگہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق فرماتے ہیں: فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۞ "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مؤمنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور تقویٰ کے کلمہ کو ان پر لازم کر دیا۔ وہی اس کے زیادہ حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔ (سورۃ الفتح: آیت ۲۶)

مذکورہ بالا آیتوں کا نزول ہجرت کے بعد ہوا ہے جبکہ ہزاروں قدسی اسلام لا چکے تھے، جن میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سرِ فہرست ہیں۔ ان آیات سے یہ چند باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایمان محبوب ہے اور وہ مؤمن وایماندار لوگ ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایمان سے مزین و منقش کیا تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان و تقویٰ کو ان کے ساتھ لازم کیا تھا اور ان کے دلوں میں خوب پیوست کر دیا تھا، اور یہی لوگ کلمۂ تقویٰ کے زیادہ حق دار ہیں اور یہی لوگ اس کے اہل تھے۔ اس لیے ان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں ایمان و تقویٰ ایسا رچ بس گیا تھا کہ ان کے ایک ایک قول و فعل سے ایمان و تقویٰ

کی خوشبو ٹپکتی تھی، اور یہی لوگ اس کلمہ تقویٰ اور انعام واحسان کے مستحق بھی تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و تقویٰ کا صرف ایک واقعہ جو بظاہر تقویٰ کے خلاف معلوم ہوتا ہے

ان کے تقویٰ کی حالت نیکیوں میں ہی نہ دیکھو، ان کی خطائیں بھی ایسی تھیں جن سے ان کے تقویٰ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو شان ہی کیا ہوگی، عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تقویٰ کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔

حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ طھّرنی یعنی "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے پاک کر دیجیے" (یعنی مجھ سے جو گناہ سرزد ہوگیا ہے اس کی حد جاری کریں تاکہ وہ میرے گناہ کی معافی کا سبب بن جائے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَیحکَ ارجِع فَاستَغفِر اللہَ وَتُب اِلَیہِ یعنی تجھ پر ہزار افسوس ہے، واپس چلا جا اور اللہ تعالیٰ سے (دل وجان سے) بخشش مانگ اور توبہ کر، چنانچہ وہ چلے گئے اور تھوڑی دور جاکر (چونکہ خوفِ الٰہی کی چنگاری بھڑک رہی تھی اس لیے) پھر واپس آگئے اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے پاک کر دیجیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی الفاظ فرمائے جو پہلے فرمائے تھے۔ چار مرتبہ اسی طرح ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو استغفار وتوبہ کی ترغیب دے کر واپس فرماتے، لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزاں وترساں وہ پھر واپس آجاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پاک کرنے کی درخواست کرتے۔ چوتھی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تجھے کس چیز اور کس وجہ سے پاک کروں؟ انہوں نے عرض کیا: (حد جاری کرکے) زنا سے پاک کر دیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی بات سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے) فرمایا: کیا یہ دیوانہ ہے؟ (کہ خود اپنے گناہ کا رازافشاء کرکے اپنے آپ کو سنگسار کرانا چاہتا ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیا گیا کہ دیوانہ نہیں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اس نے شراب پی ہے؟ (یہ سن کر) ایک شخص کھڑے ہوئے اور ان کا منہ سونگھا، لیکن ان کے منہ میں شراب کی بو بھی نہیں پائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ماعز رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا (واقعی) تو نے زنا کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ "ہاں"۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنگسار کیے

جانے کا حکم دیا، چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ دو تین دن اسی طرح گزر گئے کہ آپ ﷺ کی مجلس مبارک میں ماعز رضی اللہ عنہ کی سنگساری سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی، پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ (مجلس میں) تشریف لائے اور فرمایا: اِسْتَغْفِرُوْا لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ۔۔۔۔ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ یعنی "ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے لیے بخشش مانگو، یقیناً اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس (کے ثواب) کو پوری اُمت پر تقسیم کیا جائے تو وہ سب کے لیے کافی ہو جائے"۔ (دیکھیے صحیح بخاری و مسلم وغیرہ)

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تقریباً حدیث کی تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس واقعہ سے حدود کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ کتبِ فقہ میں موجود ہیں، لیکن ایک عام صحابی کے ایمان و تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا اندازہ لگائیے کہ گواہوں کے نہ ہونے کے باوجود از خود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلطی کا اقرار کیا۔ اس میں ان کی عزت کا سوال بھی تھا، قوم و قبیلہ اور دوستوں کے سامنے رسوائی کا احساس بھی تھا اور جان چلے جانے کا یقین بھی، پھر سیدنا رسول اللہ ﷺ تفصیل پوچھے بغیر ان کو بار بار واپس کرتے ہیں اور استغفار و توبہ کی ترغیب دے کر گویا ان کو یہ بات بتلاتے ہیں کہ ندامت کے آنسو بہاؤ اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرو، اللہ تعالیٰ مہربان ہے آپ کو معاف کرے گا۔ لیکن ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان و تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی آگ کو دیکھ لیجیے کہ نہ عزت کو دیکھا نہ کسی کے طعن کو اور نہ لوگوں کے سامنے رسوائی اور نہ سنگساری کی سخت تکلیف دہ اور رسوا کن موت کی پروا کی۔ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے لرز اٹھے تھے اور ان کو یہ احساس تھا کہ میں نے اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کی ہے، ایک ایسا کام کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، اس نے اسے جرم ٹھہرایا ہے، اب اللہ تعالیٰ راضی ہو اور یہ کہ میں پاک و صاف ہو کر اللہ تعالیٰ سے قیامت میں ملوں۔ اسی چیز نے دوسری تمام چیزوں سے انہیں بے پرواہ کر دیا تھا۔

اسی ایک واقعہ کو دیکھ لیجیے کہ ایک عام صحابی جس نے خاص اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت رسول اللہ ﷺ کی بہت کم صحبت اٹھائی تھی ان کے ایمان وغیرہ کا یہ حال تھا تو جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمانوں کی کیا حالت ہو گی؟ پھر خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر و حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ایمان و تقویٰ کی شان کیا ہو گی۔

آپ اس ایک واقعہ سے ان لوگوں کی کج فہمی کا اندازہ بھی لگائیے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی غلطی بیان کر کے اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان کے دل کی خباثت کی وجہ سے نہیں بلکہ غیر ارادی اور اتفاقی طور پر کوئی غلطی صادر ہو گئی تو بھی انہوں نے توبہ ایسے اعتراف سے کی کہ ان کی یہی غلطی مع توبہ کے ایک ایسی نیکی بن گئی کہ ہماری تمام نیکیاں اس پر قربان اور وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے تو بعض علما فرماتے ہیں کہ لاکھوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین، چار یا کم و بیش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو غلطیاں صادر ہونی تھیں جن پر حد شرعی جاری ہو سکتی تھی ، یہ انہوں نے قصداً نہیں کی تھیں، بلکہ ان سے تکوینی طور پر کرائی گئی تھیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی تمام عملی احکامات اور حدود کا پورا نقشہ سامنے آجائے اور اس پر پوری طرح عمل کر کے دنیا کے سامنے بھی پیش کیا جائے (واللہ اعلم)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ راضی ہے اور سب کے سب جنتی ہیں

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

”یقیناً اللہ (تعالیٰ) مؤمنوں سے راضی ہوا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور جو (صدق، ایمان اور خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو اس نے ان (صحابہ رضی اللہ عنہم) پر سکینہ نازل فرمایا اور انہیں فتح قریب عنایت کی“۔ (سورۃ الفتح: آیت ۱۸)

یہ آیت ہجرت کے بعد صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقریباً پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی غلط خبر ملی تو ان سب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کی بیعت کی تھی۔ ان بیعت کرنے والوں میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ تو شامل تھے ہی بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن کے لیے بیعت کی جا رہی تھی وہ بھی اس مبارک بیعت میں شامل تھے اور ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کو ان کا ہاتھ قرار دیا، اور اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا تا کہ وہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو سکیں۔

اس آیتِ کریمہ سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سچے مؤمن اور پکے ایماندار لوگ تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کو پرکھ لیا اور ان میں جو صدق و اخلاص اور تقویٰ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب جان لیا تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں سے راضی ہوا اور ان پر سکینہ نازل فرمایا اور انہیں فتحِ قریب عنایت فرمائی۔

۴۔ وہ فسق و فجور، کفر، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے سخت متنفر اور بیزار تھے۔

۵۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنتی اور بخشے بخشائے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ راضی ہے

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس شخص سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، اسے اپنی رضا کی جگہ یعنی جنت میں داخل فرمادیتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ: لَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ مِّمَّنْ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ یعنی ایسا ایک بھی شخص جہنم میں نہیں جائے گا جس نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے۔ (مسلم وابوداؤد وغیرہ)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ پہلے اور آخر میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے راضی ہونے کا اعلان فرما کر اپنی رضا کی جگہ یعنی جنت کا وعدہ فرماتے ہیں: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞ "اور جن مہاجرین اور انصار نے ایمان لانے میں سبقت کی (یعنی سب سے پہلے ایمان لائے) اور جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی اتباع (اور پیروی) کی، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہے اور وہ اس (اللہ تعالیٰ) سے راضی ہیں، اور اس نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے"۔ (سورۃ التوبہ: آیت ۱۰۰)

یہ آیت غزوۂ تبوک کے سلسلۂ آیات میں نازل ہوئی اور اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بہت زیادہ ہوچکی تھی۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ چند باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ مہاجرین اور انصار سے راضی ہوچکا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوگئے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے اپنی رضا لازم کردی ہے، اور ان کے لیے پہلے سے جنتیں اور باغات تیار کیے ہیں، اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

۳۔ یہی مہاجرین اور انصار متبوع ہیں، بقیہ امت کے لیے مقتدا ہیں۔ جو لوگ خواہ وہ نو عمر صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں یا تابعین ہوں یا بعد میں آنے والی بقیہ امت ہو، اگر وہ اعمالِ حسنہ اور دینی امور میں مہاجرین اور انصار کی محبت و اخلاص کے ساتھ پیروی کریں گے تو ان سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہوگا اور انہیں بھی جنت اور عظیم کامیابی مل جائے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی شفقت و محبت، ان کا کردار اور ان سے جلنے والے کافر لوگوں کا بیان

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۚ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ (تعالیٰ) کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں) وہ کافروں کے مقابلے میں تو بہت سخت ہیں اور آپس میں نہایت مہربان۔ تو جب ان کو دیکھے گا تو وہ رکوع و سجود میں مشغول ہوں گے اور (یہ سب کچھ دنیوی مال و جاہ کے لیے نہیں بلکہ صرف) اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کررہے ہیں اور ان (کے ایمان وبندگی اور صداقت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے، ان کے یہ اوصاف تورات میں (بھی) ہیں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی، پھر اس کو قوی کیا،

پھر وہ کھیتی بتدریج بڑھتی ہوئی خوب موٹی ہوئی تو وہ اپنے نال پر سیدھی کھڑی ہوئی اور اپنی سرسبزی وشادابی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی (اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اسی طرح بتدریج بڑھا کر ان کو مضبوط ترین جماعت بنا دیا) تاکہ کافروں کو (ان کے حسد اور غصہ کی آگ میں) جلائے، اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے"۔

(سورۃ الفتح : آیت ۲۹)

اس آیتِ کریمہ نے چند باتوں کو واضح طور پر بیان فرمایا:

۱۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کفار پر تو سخت اور ان کے مقابلہ میں زبردست اور فولادی چٹان ہیں جن کو کوئی لالچ، کوئی تعلق اور رشتہ داری وغیرہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی۔

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینے آپس کے کینہ و بغض اور حسد سے بالکل پاک و صاف تھے اور وہ آپس میں ایک دوسرے پر شفقت اور مہربانی کرنے والے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنے فضل و کرم سے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت اور الفت ڈال دی تھی جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔

۳۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی عبادت و پرستش کرنے کا انتہائی شوق و ذوق اور اس سے انتہائی لگاؤ ہے، اس لیے وہ جب بھی فارغ وقت دیکھتے ہیں تو رکوع و سجود (عبادتِ الٰہی) میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

۴۔ یہ سب کچھ محنت و مشقت دنیوی مال و جاہ کی محبت کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ سے انتہائی محبت ہے اور ہر عمل اور ہر حال میں وہ صرف اسی کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں۔

۵۔ ان کے چہروں اور پیشانی پر عبادت و بندگی، ایمان اور صداقت کے آثار نمایاں ہیں (اور دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹے نہیں ہو سکتے)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے

۶۔ مذکورہ بالا اوصاف سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم روحانی قوت ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ محبت خود بخود معلوم ہوگئی، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ کی خاطر صرف اپنے محبوب کاموں اور انسانوں کو چھوڑا ہی نہیں بلکہ ان سے متنفر ہو گئے، اور اپنے محبوب رشتوں جیسے بیٹے اور باپ وغیرہ کے صرف اس لیے مخالف ہوگئے اور ان کے مقابلہ میں آگئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف اور کافر تھے، اس کے برعکس ان کو ان چیزوں اور ان انسانوں سے محبت ہو گئی جو پہلے ان کو محبوب اور مرغوب نہ تھے، وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہونے کی وجہ سے محبوب ہوگئے، جس سے بخوبی یہ معلوم ہوا کہ ان حضرات کی محبت کا مرکز صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ تھے، اللہ تعالیٰ کے لیے ان کی محبت تھی اور اسی کے لیے ان کا بغض تھا، بلکہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اس قدر رچ بس گئی تھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والے اور ان پر ایمان رکھنے والے لوگ بھی ان کو اس قدر محبوب ہوگئے کہ وہ ان پر شفقت اور رحم کرنے والے بن گئے، اور یہی ایمانِ کامل اور فرطِ محبت کی نشانی ہے۔

۷۔ یہی بات اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوگئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت، ان کے اوصاف وکمالات اور ان کے ایمان افروز مناظر ان لوگوں سے نہیں دیکھے جاتے جو اسلام، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن ہیں۔ یہی لوگ صحابیت کی دشمنی اور ان کے بغض وحسد میں مبتلا ہیں اور ان کی وجہ سے حسد کی آگ میں جل بھن رہے ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بغض، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ بغض ہونے کی وجہ سے ہے۔

اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: اَللّٰہَ اللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ

"یعنی اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے معاملے میں، میرے بعد ان کو (تنقید و تشنیع کا) نشانہ نہ بناؤ، کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا"۔ (الحدیث)

اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے ان کو ایذا پہنچائی، اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو

عذاب میں گرفتار کرے گا۔ (دیکھیے سنن ترمذی)

صحابیت اور صحابہ میں ازواجِ مطہرات اور رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں اور نواسے بھی شامل ہیں

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم صرف صحابی نہیں، بلکہ وہ اہلِ بیت ہونے کی وجہ سے اہلِ بیت کے فضائل میں بھی شریک ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی بیویاں مثلاً: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وغیرہ صرف صحابیات ہی نہیں، بلکہ وہ تو آپ ﷺ کے اہلِ بیت بھی ہیں اور اس پر مزید یہ کہ وہ قرآن مجید کی رُو سے تمام اُمت کی روحانی مائیں بھی ہیں اور یہ روحانی رشتہ اس قدر اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ نسبی ماؤں کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور اعلیٰ ہے۔

لہٰذا جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت وعقیدت نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت وعقیدت نہیں ہے، اسی طرح اس سے بڑھ کر جس شخص کو اہلِ بیت پاک یعنی ازواجِ مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد سے محبت وعقیدت نہ ہو تو چاہے وہ محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کے لاکھ دعوے کرے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے محروم ہے۔

محبتِ الٰہی: محبتِ رسول ﷺ، محبتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور محبتِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی بنیاد

رسول ﷺ کا ارشادِ پاک ہے: اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِعَمِہٖ وَاَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللّٰہِ وَاَحِبُّوْا اَھْلَ بَیْتِیْ بِحُبِّیْ یعنی "تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اس لیے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے، اور مجھ سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے محبت رکھو، اور میری محبت کی وجہ سے اہلِ بیت سے محبت رکھو"۔ (ترمذی)

اس حدیث شریف میں جس طرح ایک حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اسی طرح ایک علاج بھی بتلایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کا مرکز ہے اور ہونا بھی چاہیے، اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں رچ بس جائے تو وہ خود بخود اللہ تعالیٰ کی نامرضیات اور ناپسند چیزوں سے متنفر ہو جائے گا اور اس کی محبوب چیزیں اس کو محبوب ہو جائیں گی، جیسا کہ اس کا بیان پہلے مفصل گزر چکا ہے،

یہاں بتلایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جائے گی تو رسول اللہ ﷺ کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہے، کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے پیغام کا واحد ذریعہ ہیں، اور جب رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا ہو گی تو پھر اہلِ بیت کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہے۔ اسی طرح محبت چونکہ متعدی ہے اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت ہونا اور آپ ﷺ کے طریقوں اور سنتوں سے محبت ہونا اور عربی زبان سے محبت ہونا خود بخود لازم ہوتا چلا جائے گا۔ کیونکہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں، وہ جنتی ہیں اور ان کے ایمان و محبت کو وقتی ماننا کفر ہے

۸۔ مذکورہ بالا آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ اوصاف عارضی اور وقتی نہ تھے، بلکہ یہ اول سے ان کے لیے مقرر اور مقدر تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان اوصاف کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں جیسے تورات اور انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے وحی فرمایا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ پہلے آسمانی کتابوں میں بہت کچھ مٹایا جا چکا ہے اور اہلِ کتاب کا یہ طرزِ عمل اپنی کتابوں کے ساتھ پہلے سے ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک تک بھی تورات و انجیل میں آپ ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق واضح علامات اور پیشن گوئیاں موجود تھیں، پھر اس کے بعد بھی بہت کچھ تحریف و تبدل ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں سیدنا رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ ان کا مفصل بیان حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ کی کتاب "اظہار الحق" جس کا ترجمہ اور مزید تشریح و تحقیق "بائبل سے قرآن تک" میں موجود ہے، نیز راقم نے بھی "دہریت سے اسلام تک" کے دوسرے حصے میں ان کے متعلق ضروری تفصیل نقل کی ہے وہ تو وہاں پڑھ لیجیے، البتہ یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق آج کے موجودہ محرف انجیل میں سے کچھ نقل کر دیتا ہوں۔

چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تمثیل دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک وعظ میں یوں فرماتے ہیں:

"اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے

پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے، پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آ پہنچا۔ پھر اس نے کہا کہ ہم خدا کی بادشاہی کو کس سے تشبیہ دیں۔ کس تمثیل میں اسے بیان کریں؟ وہ رائی کے دانے کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر جب بو دیا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ میں بسیرا کرتے ہیں"۔ (مرقس: باب ۴: آیت ۲۶ تا ۳۲)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ان کے حواری یوحنا کو جو مکاشفہ ہوا اس میں وہ باتیں بیان کی گئی تھیں جو بعد میں واقع ہونے والی تھیں، اس مکاشفہ کے چودھویں باب میں ہے:

"پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ برّہ سیّون کے پہاڑ پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار اشخاص ہیں جن کے ماتھے پر ان کا اور ان کے باپ کا نام لکھا ہے، اور مجھے آسمان پر سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو زور کے پانی اور بڑی گرج کی سی آواز تھی اور جو آواز میں نے سنی وہ ایسے تھی جیسے بربط نواز بربط بجاتے ہیں۔

وہ تخت کے سامنے اور چاروں جانداروں اور بزرگوں کے آگے گویا ایک نیا گیت گارہے تھے اور ان کے ایک لاکھ چوالیس ہزار اشخاص کے سوا جو دنیا میں سے خریدے گئے تھے، کوئی اس گیت کو نہ سیکھ سکا۔ یہ وہ ہیں جو عورتوں کے ساتھ آلودہ نہیں ہوئے بلکہ کنوارے ہیں، یہ وہ ہیں جو برہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں جہاں تک وہ جاتا ہے۔ یہ خدا اور برہ کے لیے پہلے پھل ہونے کے واسطے آدمیوں میں سے خریدے گئے ہیں اور ان کے منہ سے کبھی جھوٹ نہ نکلا تھا، وہ بے عیب ہیں۔

پھر میں نے ایک اور فرشتے کو آسمان کے بیچ میں اڑتے دیکھا جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور قبیلہ اور اہلِ زبان اور اُمت کے سنانے کے لیے ابدی خوشخبری تھی اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تمجید کرو کیونکہ اس کی عدالت کا وقت آ پہنچا ہے، اور اسی کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کیے ہیں"۔ (مکاشفہ: باب ۱۴، آیت ۱ تا ۷)

یہ پیشنگوئی اور مکاشفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے متعلق ہے، کیونکہ "برہ" سے مکاشفات کی

اصطلاح میں وہ مقدس مخلوق مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے برتر ہو اور سیون سے عرفات کا میدان اور کوہِ عرفات مراد ہے اور آپ ﷺ کے ساتھ حج میں ایک لاکھ چوالیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جن کی پیشانی پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور ایمان و صداقت کے اثرات نمایاں تھے جیسا کہ قرآن مجید مذکورہ بالا آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق فرماتا ہے سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (ان کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے جن کی تسبیح و تحمید اور تہلیل سے میدانِ عرفات اور اس کے مقدس پہاڑ گونج رہے تھے اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے براہِ راست خطبہ سننے کا شرف انہی کو حاصل ہے، اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی مؤمنین کی پہلی جماعت تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے خرید لیا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے سب سے پہلے امتی اور مؤمنوں کے متعلق ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ "بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جان اور مال قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے"۔ (سورۃ التوبۃ: آیت ۱۱۱)

اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تو تھے جو آپ ﷺ کی سچی اتباع کرنے والے تھے اور آپ ﷺ کے قدم بقدم چلنے والے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ و متقی جماعت ہی تو تھی جو سب کے سب عادل اور ثقہ، جھوٹ سے پرہیز کرنے والے تھے، اسی طرح جو جو اوصاف اس مکاشفہ میں لکھے ہیں وہ سارے کے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بدرجہ اتم موجود تھے اور مکاشفہ میں "ابدی خوشخبری" سے مراد قرآن مجید ہی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے، جو سینوں میں محفوظ ہے، نہ چھینا جا سکتا ہے نہ جلایا جا سکتا ہے، نہ چرایا جا سکتا ہے نہ تحریف کیا جا سکتا ہے اور آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اسی طرح محفوظ ہے اور ابد تک محفوظ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے ہی اٹھا رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ "بے شک ہم نے یہ نصیحت اتاری اور یقیناً ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"۔ (سورۃ الحجر: آیت ۹)

اور یہی قرآن ابدی، دائمی اور عام خوشخبری ہے جو کسی زمانے یا کسی قوم وقبیلہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام عالم انسان وجنات کی قیامت تک رہنمائی کرتی رہے گی۔ اس پر عمل کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اوران کے بعد عرصۂ دراز تک دنیا نے عدالت اور عدل و قسط کو پالیا تھا، اسی طرح آج بھی اسی قرآن و بیان پر عمل کر کے دنیا میں عدالت اور عدل و قسط قائم کیا جاسکتا ہے، اس کے بغیر نہ دنیا میں امن و عدالت قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ابدی نجات پا سکتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید بھی گواہی دیتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف پچھلی کتابوں میں موجود تھے اور اللہ تعالیٰ بھی قرآن مجید میں جابجا ان کے اوصاف بیان کرتا ہے اور ان سے راضی ہونے کا اعلان فرماتا ہے اور ان کو جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

یہ ساری چیزیں اس بات کی شہادت و گواہی دیتی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی کامل و مکمل ایمان اور انہی اخلاقِ حسنہ، باہمی محبت وغیرہ پر موت آئی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے رضا کا اعلان فرمایا ہے۔

اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم مبارک پر تنقید کرتا ہے، کیونکہ راضی ہونے کا اعلان اور جنت کی بشارت یہ عملی احکامات میں سے نہیں کہ وقت اور شخص کے لحاظ سے بدلتا رہے جیسا کہ اول سے لے کر خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے تک بدلتے رہے، بلکہ اس میں اخلاقِ حسنہ اور ایک حال کی گواہی بھی ہے اور مستقبل اور آئندہ کی خوشخبری بھی، اور یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی شخص سے راضی ہو سکتا ہے جو مستقبل میں بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اللہ تعالیٰ تو اسی شخص کو جنت کی خوشخبری دے گا جس کے متعلق یہ طے ہو کہ وہ ایسی حالت میں دنیا سے جائے گا کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گا۔ غرض یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل اور دل کے خلوص و تقویٰ کی شہادت، ان سے راضی ہونے کا اعلان اور ان کے لیے جنت کا تیار کرنا؛ یہ سب چیزیں اخبار سے تعلق رکھتی ہیں اور خبر میں تبدیلی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ کو بھول چوک لاحق ہوئی، آئندہ اور مستقبل پر اللہ تعالیٰ کا علم کامل نہیں، اس لیے انجام سے بے خبری کی وجہ سے دلوں کے خلوص وغیرہ اور رضا اور ان کے لیے جنتی ہونے کے اعلان میں ایسی غلطی کی اور پشیمان ہو گئے اور اس نے پہلی اطلاع و خبر سے رجوع کیا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دشمن بعض زندیقوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دشمنی اور اسی طرح دوسرے اغراض کی خاطر یہ خود ساختہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھول چوک، رائے کی غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک کفریہ اور احمقانہ عقیدہ ہے جس کا صرف قرآن مجید ہی انکار

نہیں کرتا بلکہ عقلِ سلیم بھی اس بات کو ایک لمحہ کے لیے ماننے کو تیار نہیں۔ بلاشبہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک تمام مخلوقات، ان کے تمام اعمال اور ان کی تمام چیزوں و احساسات وغیرہ کا تفصیلی علم رکھتا ہے اور اسی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلوص، ایمانداری، حسنِ کردار و اخلاق کی گواہی دی اور اسی نے ان سے راضی ہونے کا اعلان فرمایا اور جنتوں کی بشارت دی، تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کی موت اور انجام بھی اسی حالت پر ہی ہوگا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان، عقائد اور عمل اُمت کے لیے نمونہ اور معیارِ حق ہیں

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے اور نہ کوئی آئے گا، شاید اس لیے قرآن مجید اور حدیثوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و کمالات تفصیل سے آئے ہیں، تاکہ آنے والی دنیا کے لیے کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بطورِ نمونہ چھوڑا جائے اور انہی کی اقتدا و اتباع کا حکم دیا جائے، کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دل و دماغ میں دینِ اسلام رچ بس گیا تھا، وہ شریعتِ مطہرہ میں فنا ہو چکے تھے اور انہوں نے زندگیوں میں دینِ اسلام کو اسی طرح اتار لیا تھا کہ وہ ایمان و عمل کے اعتبار سے ٹھیک اس معیار پر پہنچ چکے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد تھا، اس لیے وہ دوسرے تمام لوگوں کے لیے نمونہ اور معیارِ حق بن گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کے لیے ایمان و عمل کا صحیح معیار کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سامنے لایا ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ”پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو (پھر) تو وہ ہدایت پالیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو (پھر معلوم ہوا کہ) وہ ضد (اور ہٹ دھرمی) میں پڑ گئے“۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱۳۷)

اس آیتِ کریمہ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ایک مثالی ایمان اور دوسروں کے لیے نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ایمان و عقیدہ مقبول ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا اور جو عقیدہ و ایمان اس سے ذرہ برابر بھی خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار کے بیان کے بعد فرماتے ہیں: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ "اور (بقیہ قیامت تک آنے والی اُمت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیروکار ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس (اللہ) سے راضی ہوئے"۔ (سورۃ التوبہ: آیت ۱۰۰)

اس آیت کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا "جو شخص سیدھی راہ معلوم کرنے کے بعد (بھی) رسول اللہ کی مخالفت کرے اور مؤمنوں کے راستے کے خلاف دوسرے راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے (دنیا میں تو) ادھر ہی چلنے دیں گے اور (آخرت میں) ہم اس کو جہنم میں ڈال دیں گے، اور وہ بہت (ہی) بری جگہ ہے"۔
(سورۃ النساء: آیت ۱۱۵)

اجماعِ امت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستہ کی مخالفت

اس آیتِ کریمہ میں دو چیزوں کو عظیم جرم قرار دے کر موجبِ جہنم بتلایا گیا ہے: ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دوسری مؤمنوں کی راہ (یعنی مسلمانوں کے عقیدے و عمل کا وہ متفقہ راستہ جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے، اُس) سے ہٹ کر دوسری راہ پر چلنا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا اجماع کبھی بھی کسی ایسے عمل و عقیدے پر نہیں ہو سکتا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، لہٰذا اگر اس آیتِ کریمہ سے ایک طرف اجماعِ امت کا ثبوت مل سکتا ہے تو دوسری طرف یہ آیتِ کریمہ کھل کر اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں اور مؤمنوں کی سب سے پہلی اور اول جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات، ان کا ایمان اور ان کے اعمال اس قدر ٹھیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو چکے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی راہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع و پیروی ہی میں منحصر ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ راستے کی مخالفت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کی مخالفت و نافرمانی ہے، اس لیے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کی مخالفت کرنے والا جہنم میں پھینکا جائے گا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماعی

عقیدے اور ان کے متفقہ راستے و عمل کا انکار کرنے والا اور اس کے مخالف دوسرے راستے کو اختیار کرنے والا بھی جہنم کا ایندھن بنے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معیارِ حق ہونے کا مطلب

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب و سنت ہی اصل معیارِ حق ہیں، اجتماعی و انفرادی طور پر عمل کو ان پر جانچا جائے گا۔ لیکن چونکہ قرآن و حدیث ضوابطِ حیات ہیں، جو عملاً ناطق نہیں۔ سنت کا جو حصہ عملاً ناطق ہے اس کے ناقل اور راوی بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں، عملی زندگی میں قرآن و سنت تک رسائی اور ان کی صحیح اتباع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے ہی ہو گی۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد و اعمال ذریعہ اور معیار ہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و عقائد اور ان کے اعمال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت و گواہی سے کتاب اللہ اور سنتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہیں، لہٰذا جو شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و عمل کو نمونہ بنائے بغیر یا ان کی مخالفت کر کے براہِ راست قرآن و سنت پر اپنے آپ کو جانچے گا تو غالباً وہ ٹھوکر کھا کر گمراہ ہی ہو جائے گا جیسا کہ گمراہ فرقوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیشگوئی کی صورت میں فرمائی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: بلاشبہ بنی اسرائیل کے بہتّر فرقے تھے اور عنقریب میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے ایک گروہ کے سوا باقی سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کونسی جماعت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما انا علیه و اصحابی** یعنی جس راستے پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم قائم ہیں۔ (ترمذی و مشکوٰۃ)

اور یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تو خلفائے راشدین یعنی حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی تو شان ہی اور ہے۔

خلفائے راشدین کے طریقوں کی اتباع کا حکم

چنانچہ ان کے متعلق تو خصوصی طور پر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **عَلَیۡکُمۡ بِسُنَّتِیۡ وَسُنَّةِ الۡخُلَفَاءِ الرَّاشِدِینَ الۡمَهۡدِیِّینَ تَمَسَّکُوۡا بِهَا وَعَضُّوۡا عَلَیۡهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِیَّاکُمۡ وَمُحۡدَثَاتِ**

الْاُمُورِ فَاِنَّ کُلَّ مُحدَثَۃٍ بِدعَۃٌ وکلّ بِدعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَ کُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ ''اے لوگو! تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین (ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم) کی سنت کو اختیار کرو، ان کو خوب تھام لو اور ان کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ خبر دار! (دین میں) نئی نئی باتوں سے بچنا کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں (لے جانے والی) ہے۔

(ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، کذا فی المشکوۃ)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت و طریقہ کی طرح شریعتِ مطہرہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں فنا وہدایت یافتہ لوگوں کے طریقوں کو بھی واجب الاتباع قرار دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین اُمت مسلمہ کے بہترین لوگ ہیں

حضرت عمران حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَیرُ اُمَّتِی قَرنِی ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ''میری امت کے بہترین لوگ میرے دور کے لوگ (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں، پھر وہ جو ان سے متصل (یعنی تابعی) ہیں اور پھر وہ جو ان سے متصل (یعنی تبع تابعین) ہیں''۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوۃ)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَکرِمُوا اَصحَابِی فَاِنَّھُم خِیَارُکُم ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ''میرے اصحاب رضی اللہ عنہم کی تکریم و تعظیم کرو کیونکہ وہ تمہارے بہترین لوگ (اور بزرگ ترین لوگ) ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے متصل (یعنی تابعین) ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان کے متصل (یعنی تبع تابعین) ہیں۔'' (مشکوۃ، نسائی)

مذکورہ بالا حدیثوں اور اس طرح کی اور احادیث سے نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، بلکہ جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد طبقۂ تابعین جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تربیت یافتہ ہیں اور پھر ان کے بعد تبع تابعین جو تابعین کے تربیت یافتہ ہیں، ان کی فضیلت بھی معلوم ہو گئی۔ یہی تین طبقے ہیں جو بتدریج امت کے سب سے بہترین لوگ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے سردار اور مقتدا ہیں۔ یہ تینوں طبقے انتہائی محترم و مکرم ہیں اور باقی امت پر ان کی تکریم و تعظیم لازم ہے، اور پھر ان تینوں میں پہلے طبقے یعنی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و منزلت کی تو شان ہی اور ہے۔ اس مقدس گروہ کا مقام ہی ایسا ہے کہ ان کے بعد اگر کوئی شخص علم و فضل، ذہانت و ذکاوت، تقویٰ و پرہیز گاری اور عزیمت و استقامت کے کتنے ہی بلند درجہ پر پہنچ جائے مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس کو کبھی بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صحابی پر تنقید کرے یا اس کے عمل و کردار پر نکتہ چینی کرے۔ اگر کوئی شخص اس طرح کی جرأت کرتا ہے تو اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ ایسے باکردار حضرات کے متعلق سب و شتم یا کوئی اور لغو باتیں کرنا تو دینِ اسلام کے واسطے کی انتہائی ناقدری ہے اور بغضِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پردے میں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر تیر چلانا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والا ملعون ہے

ایسے منافقین کی مذمت اور ان کے کفر کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَسُبُّوْنَ اَصْحَابِيْ فَقُوْلُوْا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى شَرِّكُمْ "جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو برا کہتے ہیں تو ان سے کہو کہ تمہارے شر (اور بری حرکت) پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو"۔ (ترمذی و مشکوۃ)

اور حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (رسالت اور پیغمبری کے لیے) چنا ہے اور میرے لیے میرے اصحاب چنے ہیں، پھر انہی میں سے میرے لیے وزیر، داماد اور میرے معاون بنائے ہیں (آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں): فَمَنْ سَبَّهُمْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ "پس جو ان کو برا بھلا کہتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول کرے گا اور نہ نفل"۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۶۳۲ طبرانی ج ۱۷ ص ۱۴۰)

صحابیت کا ناشکرا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یاعلی سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ قَوْمٌ يَّنْتَحِلُوْنَ حُبَّنَا اَهْلِ

الْبَيتِ لَهُمْ نَبزٌ يُسَمُّوْنَ الرَّافِضَةَ فَاقْتُلُوهُمْ فَإِنَّهُمْ مُشْرِكُوْنَ "اے علی رضی اللہ عنہ! میری امت میں ایک گروہ ہو گا جو ہم اہل بیت سے محبت کا دعویٰ کرے گا (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر) طعن و تشنیع ان کی علامت ہو گی، ان سے جنگ کرنا کیونکہ وہ (نام نہاد مسلمان در پردہ یہود اور) مشرک ہوں گے"۔

(رواہ الطبرانی ج ۱۲ ص ۲۴۲ واسنادہ حسن مجمع الزوائد: ج ۱۰، ص ۲۱)

اسی طرح بہت سی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صرف فضائل ہی بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان پر تنقید اور سب و شتم سے بھی منع فرمایا گیا ہے اور اس حرکت اور جرأت کو موجبِ لعنت فرمایا ہے اور آئندہ قیامت تک آنے والی تمام دنیا کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کرتا ہے وہ کبھی دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا پیروکار نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات پر چلنا اس وقت ممکن ہے جب کہ پیغمبرِ اسلام کے تربیت یافتہ افراد اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کے قول و عمل نقل کرنے والا طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت و تعلق ہو، ان کی تمام باتوں پر اعتماد ہو اور ان کی تعظیم و تکریم ہو، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے راشدین و اکابر صحابہ کے ساتھ بغض رکھنے والے کا نہ قرآن مجید پر ایمان ہو سکتا ہے اور نہ پیغمبرِ قرآن پر۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقدس و تقویٰ یقینی ہے

مذکورہ بالا بحث میں بطورِ نمونہ چند قرآنی آیات کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو پیش کیا گیا ہے ورنہ قرآن و حدیث میں صحابیت، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (اور اس کے علاوہ خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی رضی اللہ عنہم، حضرت امیر معاویہ، اہل بیتِ پاک حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ اور دوسرے خاص خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے فضائل و مناقب کثرت سے موجود ہیں۔ ان تمام سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ان کی پوری زندگی سے یہ یقینی طور سے ثابت ہے کہ وہ انتہائی ایماندار، امانت دار اور دیانت دار تھے، سچائی و راستی کے پیکر تھے، وہ سخی، شجاع اور پاکیزہ کردار تھے، نیز ان کی باہمی الفت و محبت اور ایک دوسرے پر مہربانی، ایثار و ہمدردی بے مثال ہے، ان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں ایمان و تقویٰ اور محبتِ حق اس قدر رچ بس گئی تھی کہ وہ کفر، فسق، نافرمانی، جھوٹ وغیرہ تمام گناہوں سے نہ صرف بچنے کی

کوشش کرتے تھے بلکہ ایسی چیزوں سے طبعاً متنفر تھے۔

غرض وہ ان تمام اچھے اوصاف کے پیکر تھے جو ایک مخلوق کے لیے ممکن ہوسکتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے فکر و عمل کا عکس انہی میں دکھائی دیتا ہے، اس لیے یہ لوگ بحیثیتِ جماعت پوری دنیا کے لیے آپ ﷺ کے بعد عمدہ نمونہ بن کر رہ گئے تھے اور یقیناً قیامت تک آنے والی نسلوں کو انہی کی اجتماعی فکر و عمل کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے اور اسی میں اُمت کی نجات ہے۔

اب آپ خود ہی سوچیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ اوصاف جو یقین کے ساتھ ثابت ہیں اور جن کی گواہی خالقِ کائنات علاّم الغیوب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ دے رہے ہیں اگر اس کے مقابلے میں کوئی تاریخی روایت اور تاریخی واقعہ ایسا دیکھنے میں آئے جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت داغ دار ہوتی ہے، تو وہ شریعت کی رو سے تو قطعاً مردود ہے ہی، عقل کی رو سے بھی ناقابلِ قبول ہے کیونکہ عقل بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ایک یقینی چیز کے ہوتے ہوئے اس کے مقابلے میں مشکوک یا جھوٹی چیز کو مانا جائے۔

مثلاً: اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ایسی خبر دے جو اس کی ظاہری حالت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تو ایسی صورت میں عقلِ انسانی اس وقت تک اس خبر کو قبول نہیں کرتی جب تک اس کے متعلق واضح ثبوت مہیا نہیں ہو جاتا، مثلاً: اگر کسی شفیق اور مہربان کے متعلق کوئی یہ سنے کہ انہوں نے اپنے اکلوتے اور معصوم بیٹے کو قتل کیا ہے، یا کسی مسلمان، صالح، پاکیزہ اور حیادار شخص کے متعلق یہ بات سننے میں آئے کہ وہ کھلے عام شراب پی رہا تھا، تو کوئی سمجھ دار شخص ایسی خبروں کو بغیر پکے ثبوت کے قبول نہیں کرتا، بلکہ بسا اوقات تو سچی خبر کی تحقیق و ثبوت کے بعد بھی اس کی تاویل و توجیہ کو تلاش کرتا ہے، مثلاً یہ کہ شاید اس کے بچے کا قتل خطا کی وجہ سے ہوا ہو، یا اسی طرح کوئی وجہ اس کے لیے تلاش کرتا ہے۔

اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ جس شخص کی مجموعی زندگی اچھی اور پاکیزہ ہے، اس پر اگر کسی گناہ کا الزام لگ جاتا ہے تو وہ صرف شریعت کی رو سے نہیں بلکہ عقل و فطرت کی رو سے بھی اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ مضبوط اور قطعی دلائل سے ثابت نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان حضرات کے تقدس، عدالت اور تقویٰ وغیرہ کی گواہی اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ نے دی ہے اور وہ قرآن، سنتِ متواترہ اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور ان کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انبیا علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہستیاں ہیں، اور یقینی دلائل کے سامنے تاریخ کی جھوٹی بے سند اور ضعیف روایتوں کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تو مقام یہ ہے کہ ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہ مانی جائے جو اُن کے اُن اوصاف کے منافی ہو جنہیں قرآن و سنت دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسی بہتان تراشیوں اور دشمنوں کی ملمع سازی کے زہر آلود واقعات سن کر اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو خوب یاد رکھیں:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۞ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞

"جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم کیوں نہ بول اٹھے کہ ہمارے لیے ایسی بات زبان سے نکالنا بھی مناسب نہیں، (اے اللہ!) تو پاک ہے، یہ تو ایک عظیم بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا اگر تم مؤمن ہو"۔ (سورۃ النور: آیت ۱۷)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اُصول سمجھا دیا ہے کہ جس شخص کی عفت و پاکیزگی مسلم ہو ایسے شخص کے متعلق اگر کوئی اپنے بغض و عناد کا اظہار کرتے ہوئے کوئی تہمت تراش لے تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی افواہوں کی بلا تامل تردید کرے، نہ ان کو زبان پر لائے اور نہ کسی طور اس پر کان دھرے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں عقیدہ

نبی کریم ﷺ کے بعد اُمت کا مقدس ترین طبقہ آپ ﷺ کے بلاواسطہ تربیت یافتہ اور فیض یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بالکل اسی طرح اطاعت کی جس طرح سیدنا رسول اللہ ﷺ نے بتلایا تھا اور عمل کر کے دکھلایا تھا۔ یہی حضرات آپ ﷺ کی رسالت اور دینِ اسلام کے اولین مبلغ اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے نمائندے اور قرآن و سنت کا صحیح عملی نمونہ تھے۔ وہ سب کے سب پرہیز گار، پاک دل، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مخلوقِ الٰہی خصوصاً انسانیت کے ہمدرد و محسن تھے اور سب کے سب عدول یعنی سچے، امین اور معتبر تھے، وہ

سب کے سب سیدھے راستے پر چلنے والے اور دوسروں کو سیدھی راہ پر چلانے والے تھے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش تھے، اور ان سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم وصفِ صحابیت میں برابر ہیں

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم وصفِ صحابیت میں برابر ہیں، مگر ان میں بعض کے خصوصی فضائل ہیں اور ان کی جماعت بھی ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بہت سے مدارج میں تقسیم ہے جیسا کہ ہر جماعت کے افراد میں یہ تقسیم جاری ہوتی ہے، خواہ وہ فرشتوں کی جماعت ہو، علما و صلحا کی جماعت ہو یا اہلِ حق و اہل ہنر کا گروہ ہو، لیکن فرقِ مراتب اور فرقِ فضائل و مدح و مدارج کے باوجود تمام کے تمام محترم اور قابلِ قدر ہیں، کیونکہ نفسِ صحابیت میں توسب برابر ہیں اگرچہ کوئی زیادہ محترم ہے اور کوئی اس سے کم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت انبیا علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس، اعلیٰ صفات، کمالات اور غیر معمولی امتیازات رکھنے والی جماعت ہے اور اس جماعت کے ادنیٰ صحابی رضی اللہ عنہ کا مقام اس قدر بلند ہے کہ ان کے مقام اور درجہ کو پوری امت کے اولیا بھی نہیں پہنچ سکتے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت اگرچہ انتہائی پرہیز گار تھی لیکن وہ انبیا علیہم السلام کی طرح معصوم نہ تھی۔ اس لیے عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض سے جو لغزش و خطا کا صدور ہوا وہ ان کے دل کی کسی برائی یا خباثت کی وجہ سے ہرگز نہ تھا، ان کے اس گناہ کی وجہ سے ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا، اور نہ ان کے تقویٰ پر کوئی داغ دھبہ آسکتا ہے کیونکہ اتفاقی لغزش و خطا اُن کے دل کی حالت اور اُن کی بزرگی پر کوئی اثر نہ کر سکی، بلکہ ان کی اس لغزش و خطا ہی نے دنیا پر ان کے باطنی حسن، خوف و خشیتِ الٰہی اور انابت الیٰ اللہ کو ظاہر کیا کہ انہوں نے جان و آبرو سب قربان کر کے ایسی عظیم توبہ کی کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے توسب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔

اس لیے علمائے اُمت انہیں غیر معصوم کہنے کے باوجود دین کے بارے میں ان کو نکتہ چینی اور تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں، بعد کے لوگوں کو یہ حق نہیں کہ ان کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی مشاجرات کے متعلق

یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر ان کے درمیان آپس میں کہیں مقابلہ اور جنگ کی صورت بھی پیش آئی تو وہ کوئی حق و باطل یا طاعت و معصیت کی جنگ نہ تھی، بلکہ خطا اور صواب کا مقابلہ تھا۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں مجتہد سے اگر خوب کوشش کے باوجود بھی غلطی ہو جائے تو اس پر بھی ایک ثواب اور اجر ملتا ہے، سزا نہیں ملتی۔ لہٰذا ان کے باہمی تنازعات اور معاملات جو کہ نیک نیتی اور پاک نفسی پر مبنی تھے، ان کے بارے میں کسی کے متعلق نہ بدگمانی جائز ہے اور نہ بدزبانی اور بے ادبی۔ ان کے باہمی تنازعات میں کون حق پر تھا اور کس سے کیا غلطی سرزد ہوئی؟ ایسے سوالات کے متعلق صاف راہ یہ ہے کہ ان کے باہمی مشاجرات اور تنازعات پر کوئی کلام نہ کیا جائے، ان کے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں، ہم سے ان کے متعلق کوئی پوچھ نہ ہو گی، اور ایسے سوالات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو یاد رکھیں: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۞ "یہ ایک امت تھی جو گزر گئی، ان کے لیے ان کے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، اور تم سے ان کے کیے ہوئے اعمال کی پوچھ نہ ہو گی"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۳۵)

سچے اور جنتی گروہ کی پہچان

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت پر ہی ان کے بعد فرقوں، گروہوں اور لوگوں کو پرکھا جائے گا اور ان کی برکت ہی سے حق و باطل کا فرق کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی فرد یا فرقہ اور جماعت کی حقانیت معلوم کرنی ہے تو اس کے متعلق دو چیزوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ یہ کہ وہ جماعت اور گروہ یا وہ شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بدظن اور ان کے متعلق بدگمان تو نہیں ہے؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و عظمت ان کے دل میں ہے یا نہیں؟

۲۔ پھر اگر کوئی شخص یا جماعت اور فرقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت اور ان کی تعظیم و تکریم کا دعویدار ہے تو اس کے بعد اس کے عقائد کی تحقیق کی جائے گی کہ کیا ان کے عقائد بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ہیں یا نہیں؟

اگر اس فرد یا گروہ کے عقائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماعی عقائد و اصولوں سے متصادم ہیں تو باوجود لاکھ دعوائے محبتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھی وہ گمراہی اور باطل پر ہیں، نہ ان میں اخلاص ہو گا اور نہ سچی محبت، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت بحیثیتِ مجموعی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی جیتی جاگتی تصویر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ نمونہ کی پوری تشریح ہے۔ پس جس جماعت، گروہ یا فرد کے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام و تعظیم ہو، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مدّاح ہو اور اس کا عقیدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عقیدے کے مطابق ہو تو وہی شخص و فرقہ حق پر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق آخری بات

خلاصہ یہ کہ انبیا علیہم السلام کے بعد افضل ترین لوگ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے لیے چن لیا تھا۔ اس مقدس گروہ کا ہر فرد اپنی ذات اور شخصیت کے اعتبار سے متقی و پرہیز گار، صالح و ایماندار اور وفادار ہے اور ہر صحابی رضی اللہ عنہ محترم ہے اور بقیہ امت پر اس کا احترام واجب ہے، ان سے محبت اور عقیدت ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض و کینہ اور دشمنی دراصل اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ اسلام سے دشمنی ہے۔

نیز بحیثیتِ مجموعی قیامت تک آنے والے انسانوں کی نجات بھی اس جماعت کی اتباع پر منحصر ہے اور وہ من حیث المجموع پوری امت کے لیے معیارِ حق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہیں، اس لیے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کا منکر بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے واقعات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو شدید ترین محبت تھی وہ تو شاید کسی بھی پڑھے لکھے مسلمان پر پوشیدہ نہیں، لیکن پھر بھی یہاں مختصر طور پر ان کی محبت کے چند واقعات بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی؟ تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے، اپنی اولادوں سے، اپنی ماؤں سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔ (الشفاء)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نے قیامت کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت رکھتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم اُس کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت رکھتے ہو"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے بعد وہ کسی چیز پر اتنے خوش نہیں ہوئے جتنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خوش ہوئے (کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی)۔ اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میں نے ان حضرات جیسے (بہت زیادہ اور عمدہ) اعمال نہیں کیے ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ سالن میں سے کدو کے ٹکڑوں کو تلاش کر کے نوش فرما رہے ہیں تو ان کو اسی دن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے کدو بھی اس قدر محبوب ہو گیا کہ اس دن کے بعد سالن میں اگر کدو ڈال سکتے تھے تو ڈلوا لیتے تھے۔ (دیکھیے بخاری و مسلم وغیرہ)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حجام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مونڈھ رہا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کا بالِ مبارک کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔ (دیکھیے مسلم)

۵۔ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال مبارک ہیں، ہم نے انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یا (یہ کہا کہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے پاس سے حاصل کیا ہے تو حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال مجھے بھی مل جائے تو ساری دنیا سے اور جو اس دنیا میں ہے اس سے وہ مجھ کو زیادہ پیارا ہو گا۔
(صحیح بخاری، کتاب الوضو)

۶۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مولیٰ یسار رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے وقت راستے میں دیکھا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ جو کچھ اس میں تھا، اسے پی رہے ہیں۔ جب حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ وہ کام کر آئے؟ تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کام؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ان کو اپنے پچھنے کے خون کا غسالہ دیا تھا تاکہ یہ اسے بہادیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: قسم اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا! اسے تو یہ پی گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم اسے پی گئے؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیوں؟ تو انہوں نے عرض کیا: مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے نقصان پہنچے گا یعنی شہید کیے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والے مبتلائے عذاب ہوں گے، تمہیں جہنم کی آگ نہ پہنچے گی مگر وعدہ الٰہی وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا کے پورا کرنے کے لیے (جس کے ایفا کے لیے پلِ صراط پر سے گزرنا ہو گا)۔ (کنز العمال: ج۴، ص۵۶)

۷۔ عبد اللہ بن عبد اللہ بن اُبی نے جب اپنے والد (جو مشہور منافق تھا) کے بارے میں یہ سنا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو معزز، ذلیل کو نکال دے گا تو وہ مدینہ کے دروازے پر باپ کے مقابلہ پر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ کیا تم ہی نے ایسا کہا تھا؟ اللہ کی قسم! ابھی معلوم ہو جائے گا کہ عزت

تمہارے لیے ہے یا رسول اللہ ﷺ کے لیے۔ تم مدینہ کے سائے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اجازت کی بغیر نہیں جاسکتے، چنانچہ انہوں نے اس وقت تک اسے مدینہ منورہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جب تک رسول اللہ ﷺ نے اسے اجازت نہ دے دی۔ (تفسیر طبری)

۸۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب مکہ مکرمہ کے کفار نے حضرت زید دثنہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے سرزمین حرم سے نکالا تو ابوسفیان بن جزنے ان سے کہا کہ میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ آج تیری جگہ محمد ہو اور تم اپنے گھر میں مامون و محفوظ رہو؟ حضرت زید دثنہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو بہت بڑی بات ہے، اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ تو بہت بڑی بات ہے، خدا کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں، اس پر ابوسفیان نے کہا کہ میں نے ساری عمر کسی کو کسی کے ساتھ ایسی محبت کرنے والا نہیں دیکھا جیسا کہ محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔ (دیکھیے شفاء ابن ہشام)

۹۔ بنی دینار کی ایک مسلمان خاتون کے والد، بھائی اور شوہر غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے۔ جب اس کو ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملتی رہی کہ وہ شہید ہو گیا تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھتی اور بے قراری سے یہ دریافت کرتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ آپ ﷺ صحیح وسالم ہیں۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگی کہ مجھے بتاؤ تاکہ دیکھ کر یقین کرلوں۔ جب اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا تو کہنے لگی: كل مصيبة بعدك جلل یعنی آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے۔ (سیرتِ ابی ہشام، بیہقی وغیرہ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اس قدر شدید ترین محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی جانیں اور اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلتے اور اپنے اعزاء، رشتہ داروں اور وطن چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہادت ان کو محبوب ہوگئی اور انہوں نے وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے کہ پوری دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔

محبت در حقیقت ایمان اور تمام دین کی روح اور جان ہے، کیونکہ یہ جذبہ ہی اعمالِ صالحہ کا سب سے بڑا محرک ہے۔ جب کسی انسان کے دل میں اس جذبہ کی شمع روشن ہو جاتی ہے تو پھر شریعت کے احکام

کی پابندی بھی ضرور ہوتی ہے، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی کے دل میں محبت کا جذبہ حقیقی موجود ہو اور وہ محبوب کے احکام کی پابندی نہ کرے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اسی جذبہ کی آگ جب دل میں بھڑک اٹھتی ہے تو محبوب کے احکام کی تعمیل تو کیا اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے انسان جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہی جذبہ، نفاق و افتراق کو دور کرتا ہے اور اسی جذبہ کی بدولت انسان کی تسخیری قوتوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو دنیا و آخرت میں عظیم الشان کامیابی و سربلندی نصیب ہوتی ہے۔

آج امتِ مسلمہ کی شریعتِ مطہرہ پر عمل میں کوتاہی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی فرمانبرداری سے غفلت اور نفس پر ہر گراں گزرنے والی چیز مثلاً جہاد سے وحشت؛ یہ سب کچھ اس عظمت و محبت کا احساس نہ ہونے کا نتیجہ ہے جس پر قرآن و حدیث میں بہت ہی زور دیا گیا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے کہ صرف آخرت میں ہی نہیں، بلکہ جس طرح اس سے پہلے یہ جذبہ مسلمانوں کی حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ثابت ہوا ہے، آج بھی اگر اس جذبے کو پیدا کیا جائے تو اتفاق و اتحاد باہمی ربط و محبت مسلمانوں کی قوت اور غلبہ واقتدار کی وہی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام اس بات کی سرتوڑ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح حبِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ختم کیا جائے خواہ وہ صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم پر کیچڑ اچھالنے کی صورت میں ہو، درود شریف کی اہمیت کو کم کرنے کی صورت میں ہو یا کسی دوسری صورت میں، تاکہ مسلمانوں کے مرکزِ محبت پر ہی وار کیا جائے جس کے بعد نفاق و افتراق کا آنا لازمی ہے۔

جیسا کہ اس خبیث تحریک کے نتائج سامنے آرہے ہیں کہ محبت کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں پر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع بھی گراں گزرنے لگی ہے۔ سیاسی لیڈروں اور اپنی اپنی جماعتوں کے مطالبات سے ان کی دلچسپی زیادہ ہو گئی ہے اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف اپنی نسبت اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی غلامی کو شرف سمجھنے سے گریز ہونے لگا ہے، یہاں تک کہ اسلامی ممالک بھی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر اتری ہوئی تعلیمات و احکامات سے ہٹ کر قومیت، وطنیت، اشتراکیت اور یورپ کے دوسرے جدید فلسفوں اور تہذیبوں کو اپنانے لگے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج اُمتِ مسلمہ دنیا میں مسلسل زوال پذیر ہے، کامیابی کے بجائے گھاٹے میں

پڑی ہوئی ہے اور اسے دنیا میں کوئی عزت حاصل نہیں، بلکہ جب سے اس جذبۂ محبت و عظمتِ رسول ﷺ میں کمی آئی ہے، اس وقت سے مسلمان تنزل کا شکار ہوئے ہیں، اور دوسری قوموں پر بھروسہ کر کے اللہ تعالیٰ پر بھروسے و اعتماد کی دولت کو کھو بیٹھے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کمزور ہو گئے اور بالآخر مسلمانوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ حاکم کے بجائے محکوم اور آقا کے بجائے غلام بن گئے۔

وہی انسان جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا　　　وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

بس اُمتِ مسلمہ کو چاہیے کہ دوسری راہوں کے بجائے پھر لوٹ کر سیدھی راہ کی طرف آئیں، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی تمام تعلیمات پر مضبوطی سے قائم رہیں، اور مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و عظمت بٹھانے کی کوشش کریں، اسی میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کو جب ان کے بعض ساتھیوں نے یہ مشورہ دیا کہ اتنی بڑی بڑی فتوحات اور اسلام کے وسیع اقتدار کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انہیں ایک بڑی حکومت کے سربراہ کی شان اختیار کرنی چاہیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اِنَّکُمْ کُنْتُمْ اذل النَّاس فاعَزَّکم اللّٰہُ بِالاسلَامِ فَمهمَا تَطلبُوا العِزَّ بِغَیْرِہٖ یُذِلُّکُم اللّٰہُ یعنی "تم سب سے زیادہ ذلیل لوگ (سمجھے جاتے) تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت دے دی، تو جب بھی تم اسلام کے بغیر (کسی دوسری راہ سے) عزت طلب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کر دے گا"۔ (البدایہ والنھایہ: ج۷، ص۶۰)

حضرت طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ کا واقعہ

(از مولانا سید اصغر حسین صاحب)

جب جناب سرور کائنات ﷺ نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ کی تشریف آوری سے کئی روز پہلے سے مشتاقانِ جمال شہر سے نکل کر راستہ پر آ بیٹھے تھے اور شام کو مایوسانہ واپس ہو جاتے۔ بہت انتظار اور بڑی آرزوؤں کے بعد جب آپ تشریف لائے تو وہ دن اہل مدینہ کے لیے عید ہو گیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللہ ﷺ المدینۃ اضاء منھا کل شئ

"یعنی جس روز رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ کے جمال سے مدینہ منورہ کی تمام چیزیں نورانی ہو گئیں"۔

بڑوں کے ساتھ بچے بھی خوشی منا رہے تھے اور لڑکیاں خوشی اور مبارک باد کے یہ سیدھے سادھے گیت گا رہی تھیں:

؎ طلع البدر علینا من ثنیات الوداع — وجب الشکر علینا ما دعیٰ للہ داع

"ثنیات الوداع سے ہم پر بدرِ کامل نے طلوع کیا اس لیے خدا کا شکر ہم پر ہمیشہ کے لیے واجب ہوا۔"

لوگ ہر طرف سے آ رہے تھے اور زیارت کر رہے تھے، انصار میں سے ایک نوجوان طلحہ بن براء حاضر خدمت ہوئے تو بے اختیار آپ کو لپٹے جاتے تھے اور آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں کو خوب بوسے دیے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ مجھے جس کام کو چاہیں ارشاد فرمائیں، میں ہر گز کسی بات میں بھی آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ جناب سرور عالم ﷺ اس نو عمری میں ان کی اس پختگی اور جرأت کو دیکھ کر ہنس پڑے اور بطورِ امتحان فرمایا کہ جاؤ! اپنے والد براء کو قتل کر آؤ۔ طلحہ تو تیار ہی کھڑے تھے اور ان کی جانثاری کچھ زبانی تو تھی ہی نہیں، فوراً تعمیل ارشاد کے لیے چلنے لگے۔ جناب سرور کائنات ﷺ نے ٹھہرا لیا اور فرمایا کہ یہ محض آزمائش تھی، مجھ کو اللہ تعالیٰ نے قطع رحمی کے لیے مبعوث نہیں کیا (یعنی رشتہ داروں کے تعلقات قطع کرنے اور صلہ رحمی کے خلاف معاملہ کرنے کے لیے مجھ کو خدا تعالیٰ نے نہیں بھیجا)۔

افسوس ہے کہ اس وفادار عاشق رسول کی عمر نے وفا نہ کی۔ جوانی ہی میں وعدہ آن پہنچا اور ایسے بیمار ہوئے کہ زندگی کی امید نہ رہی۔ آخری وقت میں جب رسول اللہ ﷺ ان کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تو عجیب حسرت کا وقت تھا۔ ایک وفادار خادم اور بے ریا مخلص بستر مرگ پر پڑا ہے اور دنیا سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہے، سامنے جان و مال سے زیادہ پیارا سردار اور ماں باپ سے زیادہ شفیق مربّی کھڑا صورت کو دیکھ رہا ہے۔ حکم خداوندی سے کچھ چارا نہیں، دیکھتا اور با چشم پُر آب واپس ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے ان سے علیحدہ ہو کر بعض لوگوں سے فرمادیا کہ طلحہ پر علاماتِ موت ظاہر ہو گئے ہیں، اب غالباً یہ زندہ نہیں رہیں گے، جب انتقال ہو جائے تو مجھے اطلاع کر دینا تا کہ آکر نماز پڑھوں، اور

تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا کیونکہ مسلمان کی نعش کا گھر میں ڈالے رکھنا مناسب نہیں۔

حضرت عمرو بن عوف کا یہ محلہ جس میں یہ انصاری بیمار تھے، مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر مسجد قبا کے اطراف میں تھا اور راستے میں یہودی لوگ آباد تھے۔ آپ ﷺ وصیت و نصیحت فرما کر دن ہی کو مدینہ منورہ واپس آ گئے۔

جس طرح دن کا آخری حصہ جلد جلد گزر رہا تھا اسی طرح طلحہ کے بیماری کے آخری سانس ختم ہوتے جاتے تھے۔ رات ہو گئی اور طلحہ کا بالکل آخر وقت آ گیا مگر واہ رے محبت! نہ اپنے مرنے کا غم ہے نہ عزیز و اقارب کی دائمی مفارقت کا رنج، خیال ہے تو جناب سرورِ عالم کا اور فکر ہے تو آپ ﷺ کی حفاظت کی۔ مرنے سے پہلے ہوش آیا تو اپنے تیمارداروں کو بلا کر فرمایا کہ دیکھنا جب میں مر جاؤں تو تم لوگ خود ہی نماز جنازہ پڑھ کر مجھے دفن کر دینا، جناب رسول اللہ ﷺ کو اطلاع نہ کرنا، رات کا وقت ہے، جگہ دور ہے، راستہ میں یہودیوں کے مکانات اور ان کا زور ہے، وہ ہر وقت ایذا رسانی کی فکر میں رہتے ہیں اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، مبادا وہ اپنی شرارت سے کوئی سازش کریں اور میری وجہ سے حضور اقدس ﷺ کو کوئی گزند پہنچے۔

مرنے کے بعد ایک سچے مسلمان کی اس سے بڑھ کر کیا آرزو ہو سکتی ہے کہ خود سرور عالم ﷺ اس کے جنازے پر آ کھڑے ہوں، نماز پڑھائیں، استغفار و دعا کر کے اس کو گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل کراویں۔ آپ ﷺ کی نماز اور دعا سے قبر میں نور اور روح پر رحمت ہو، لیکن عقلمند طلحہ رضی اللہ عنہ نے اس اپنی دینی آرزو کا خون ہونا گوارا کیا لیکن سید عالم ﷺ کی ذات مقدس کی حفاظت اور آپ ﷺ کو خطرہ سے بچانے کا اسلامی فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ کیوں نہ ہو، آخر یہ بھی تو انہی انصار میں سے تھے جن کی مدح خود حق تعالیٰ نے اس طرح فرمائی ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ [1]۔

---

[1] مطلب آیت کا یہ ہے کہ دوسروں کی مصلحت کو اپنی ذاتی ضرورتوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو کتنی ہی تکلیف اور دشواری پیش آئے اگرچہ نزول اس آیت کا انصار کے ایک خاص کنبے اور گھرانے کی نسبت ہوا ہے لیکن مفہوم اس کا عام ہے اور تمام انصار کی صفات و مدح معلوم ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ طلحہ رضی اللہ عنہ نے ذاتی فوائد پر قومی منافع کو ترجیح دی۔ کیونکہ وجود باجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام مسلمانوں کے لیے موجب ہدایت و برکت تھا اور تمام عالم کے لیے رحمت۔

انصار نے ان کی وصیت پر عمل کیا اور رات ہی کو طلحہ رضی اللہ عنہ اس پہلی منزل میں پہنچ گئے جس میں آرام یا تکلیف کے ساتھ ہر شخص کو قیامت تک ٹھہرنا ہے اور جس کی راحت و تکلیف کو سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر اور جامع الفاظ نے اس طرح ظاہر فرمایا دیا ہے :اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِّنَ النَّارِ ”قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔“

صبح کو اس محلہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طلحہ رضی اللہ عنہ کی وصیت اور وفات اور تجہیز و تکفین کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ بقول شخصے

ے آئے تھے تم کل جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل دیا وہ رات سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طلحہ رضی اللہ عنہ مرحوم کی وفات اور مخلصانہ خیر خواہی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بہت اثر ہوا اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہمراہ لے کر محلہ بنی عمرو میں تشریف لے گئے۔ تشریف آوری کی خبر سن کر حسب عادت بہت سے انصار جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر پر تشریف لائے اور سب حاضرین صف باندھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ وہ حالت تھی کہ طلحہ رضی اللہ عنہ مرحوم کا بدن نہیں تو روح ضرور وجد کر رہی ہو گی۔ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو گی کہ دین و دنیا کا سردار دونوں ہاتھ اُٹھائے قبر پر کھڑا ہے اور کامل الایمان مخلص مسلمان آمین کہنے کے لیے تیار ہیں۔

طلحہ رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری اور محبت وایثار علی النفس کا انعام ملنے والا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا فرمائی جو آج تک کسی کے لیے نہیں فرمائی تھی: اَللّٰهُمَّ اَلْقِ طَلْحَةَ وَاَنْتَ تَضْحَكُ اِلَيْهِ وَهُوَ يَضْحَكُ اِلَيْكَ ”اے اللہ! طلحہ رضی اللہ عنہ سے ایسی حالت میں ملنا کہ آپ اسے دیکھ کر ہنستے ہوں اور وہ آپ کو دیکھ کر ہنستے ہوں۔“

یقین ہے کہ سید الانبیاء کی درخواست منظور ہو کر خوش نصیب طلحہ رضی اللہ عنہ کو محبت کے صلہ اور انعام

میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا مندی کی وہ نعمت مل گئی ہو گی جس سے بڑھ کر نہ دنیا میں کوئی دولت وراحت ہے نہ آخرت اور جنت میں، ہم بھی اس دعا میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں کہ: رضی اللّٰہُ تعالیٰ عنہ وعن الصحابۃ اجمعین وصلی اللّٰہُ تعالیٰ علی سیدنا سید الانبیاء والمرسلین۔ (آمین) (کشکول ص ۴۳ تا ص ۴۷)

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ امتیاز انہی کو حاصل ہے کہ ان کا نام قرآن کریم میں مذکور ہے: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَراً..... (سورۂ احزاب)

یہ اعزاز کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کی ایک امتیازی سعادت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا اور اس کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے والد (حارثہ) قبیلہ بنو کعب سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی والدہ سُعدیٰ بنو معن کے قبیلے سے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لڑکپن کے زمانے میں ان کی والدہ اپنے میکے گئیں تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ جاہلیت کا زمانہ تھا اور قبائل عرب کے درمیان جنگیں چلتی ہی رہتی تھیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ننھیال پر ایک دشمن قبیلہ حملہ آور ہوا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قید کر کے لے گیا اور انہیں غلام بنالیا۔ یہ بے چارے اپنے والدین سے دور غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جب عکاظ میں میلہ لگا تو ان کا آقا انہیں اس میلے میں بیچنے کے لیے لایا۔ اتفاق سے وہاں امّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے) تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے چار سو درہم میں یہ غلام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے خرید لیا۔

اس کے بعد جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو انہوں نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بطورِ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقاعدہ غلامی میں آ گئے۔

ادھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد حارثہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ان کا کوئی پتانشان نہیں ملتا تھا۔ انہی کی یاد میں انہوں نے یہ شعر بھی کہا کہ:

بکیتُ علی زید ولم أدر ما فعل   أحیٌّ فیرجی أم أتی دونه الأجل

"میں زید پر روتا ہوں، معلوم نہیں کہ اس کا کیا بنا؟ پتا نہیں وہ زندہ ہے کہ کبھی اس سے ملنے کی امید کی جائے یا اس کو موت آچکی ہے"۔

جب حج کا موسم آیا تو بنو کعب کے کچھ لوگ حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ وہاں انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو پہچان گئے اور حضرت زید نے بھی انہیں پہچان لیا اور ان سے کہا کہ میرے گھر والوں کو میرا یہ شعر پہنچا دینا

أحنّ إلی قومی وإن کنتُ نائیا   بأنی قطین البیت عند المشاعرِ

یعنی "میں اپنی قوم کو اب بھی یاد کرتا ہوں، اگرچہ میں دور ہوں اور مقاماتِ مقدسہ کے پاس بیت اللہ کا مجاور بن چکا ہوں"۔

یہ لوگ جب واپس پہنچے تو انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد کو سارا واقعہ بھی سنایا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا پتا بھی بتا دیا۔ حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے چچا کعب ان کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ پتا چلا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے آکر عرض کیا کہ:

"آپ عبد المطلب کے بیٹے ہیں، وہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ آپ لوگ حرمِ کعبہ کے پاسبان ہیں اور آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ غلاموں کو آزاد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہمارا بیٹا آپ کا غلام ہے، ہم اس کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں، آپ ہم پر احسان کیجیے، جو فدیہ بھی آپ طلب کریں ہم وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں، انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیجیے، وہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ تو کچھ مشکل بات نہیں، میں ابھی ان کو بلا لیتا ہوں، ان سے ان کی مرضی معلوم کر لیجیے۔ اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہیں تو میں کسی فدیہ کے بغیر انہیں آپ کے حوالے

کر دوں گا، لیکن اگر انہوں نے خود میرے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تو جو شخص میرے ساتھ رہنا پسند کرے اسے چھوڑ کر فدیہ لینا مجھ سے نہ ہو سکے گا"۔

انہوں نے کہا: "آپ نے ہماری آدھی سے زیادہ مشکل تو حل کر دی"۔

(ان کا خیال تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ یقیناً اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانا پسند کریں گے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان سے پوچھا کہ: "ان دونوں کو پہنچانتے ہو؟"

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جی ہاں! یہ میرے والد اور وہ میرے چچا"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میرے ساتھ ایک مدت تک رہ چکے ہو، اب تمہیں اختیار ہے، چاہو تو میرے ساتھ رہو اور چاہو تو ان کے ساتھ"۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "میں آپ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، آپ میرے باپ بھی ہیں اور چچا بھی"۔

باپ اور چچا نے یہ سنا تو چیخ پڑے۔ "زید! تمہیں کیا ہو گیا؟ تم آزادی پر غلامی کو اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں پر ایک اجنبی کو ترجیح دے رہے ہو؟"

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "جی ہاں! میں نے ان صاحب کے پاس ایک ایسی چیز دیکھی ہے کہ اس کے بعد ان کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو سنی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر حطیم کی طرف لے گئے اور بلند آواز سے فرمایا:

"تمام لوگ گواہ رہیں کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہو گا اور میں اس کا"۔ ①

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی مطمئن ہو گئے اور خوش دلی سے واپس چلے گئے۔ ②

---

① شروع میں منہ بولے بیٹے کو وارث بنایا جا سکتا تھا بعد میں قرآن کریم نے یہ حکم منسوخ فرما دیا۔ اب کوئی منہ بولا بیٹا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ بعد میں یہ حکم بھی آ گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔

② یہ پورا واقعہ حافظ ابن حجر ؒ نے "الاصابہ: ۵۴۶/۱-۵۴۵ میں، نقل فرمایا ہے۔

اس کے بعد لوگ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو "زید بن حارثہ" کے بجائے "زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کہنے لگے، یہاں تک کہ قرآن کریم میں سورۂ احزاب کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ حکم دیا گیا کہ متبنّٰی کو بھی اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کر کے پکارنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی جنگی مہمات کا امیر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا اور اس طرح یہ عملی سبق دیا کہ اسلام میں فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے غلامی اور آزادی نہیں، یہاں تک کہ آخری بار غزوۂ موتہ کی سربراہی انہیں سونپی گئی اور وہ شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وصحبت کی خاطر اپنے باپ، چچا اور پورے خاندان کو چھوڑ دیا تھا، اللہ کے دین کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر اس اجنبی سرزمین میں آسودہ ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأرضاہ۔ (جہان دیدہ ص۲۳۵ تا ص۲۳۹)

دو ننھے مجاہدوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

سیدنا عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے کہ میں بدر کی لڑائی میں میدان میں لڑنے والوں کی صف میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں جانب انصار کے دو کم عمر لڑکے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ میں اگر قوی اور مضبوط لوگوں کے درمیان ہوتا تو اچھا تھا کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کر سکتے۔ میرے دونوں جانب بچے ہیں، یہ کیا مدد کر سکیں گے۔ یہ دونوں صاحبزادے معاذ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن جموح اور معاذ رضی اللہ عنہ بن عفرا ہیں۔ اتنے میں ان دونوں لڑکوں میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: چچا جان! تم ابو جہل کو بھی پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! پہچانتا ہوں، تمہاری کیا غرض ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیاں بکتا ہے، اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو دیکھ لوں تو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہوں گا کہ وہ مر جائے یا میں مر جاؤں۔ مجھے اس کے اس سوال اور جواب پر تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نے یہی سوال کیا اور جو پہلے نے کہا تھا وہی اس نے بھی کہا۔ اتفاقاً میدان میں ابو جہل دوڑتا ہوا مجھے نظر آ گیا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ تمہارا مطلوب، جس کے بارے میں تم مجھ سے سوال کر رہے تھے، وہ جا رہا ہے۔ دونوں یہ سن کر تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے ایک دم بھاگے چلے گئے اور جا کر اپنی اپنی تلواریں اس کے پیٹ میں گھونپ دیں۔ وہ گر پڑا، جان توڑ رہا تھا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کی چھاتی پر پاؤں رکھ کر

سر کاٹا اور داڑھی سے پکڑ کر سر اٹھالیا۔ آپ ﷺ نے ہر سہ (تینوں) کی خدمات کو منظور فرمایا۔

ے فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

عمارہ رضی اللہ عنہ بن زیاد زخموں سے چور جان کنی کی حالت میں تھے کہ آنحضرت ﷺ سرہانے پہنچ گئے۔ فرمایا: کوئی آرزو ہو تو کہو۔ عمارہ رضی اللہ عنہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر آپ کے قریب کر دیا اور اپنا سر آپ ﷺ کے قدموں پر رکھ کر عرض کی :

اگر کوئی آرزو ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے:

ے گلستان میں جا کر ہر گل کو دیکھا نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے
نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہی دل کی خواہش یہی آرزو ہے

(صحیح اسلامی واقعات:۷۷)

حضور ﷺ کے جسم مبارک کا بوسہ لینا

حضرت ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بڑے نیک، ہنس مکھ اور خوبصورت آدمی تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر کے لوگوں کو ہنسا رہے تھے کہ اتنے میں حضور ﷺ نے ان کے پہلو میں انگلی ماری۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے مارنے سے مجھے درد ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بدلہ لے لو۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ نے تو قمیض پہنی ہوئی ہے اور میرے جسم پر کوئی قمیض نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے اپنی قمیض اوپر اٹھالی۔ یہ (بدلہ لینے کے بجائے) حضور ﷺ کے سینے سے چمٹ گئے اور حضور ﷺ کے پہلو کے بوسے لینے شروع کر دیے، اور پھر یوں کہا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میرا مقصد تو یہ تھا (بدلہ لینے کا تذکرہ تو میں نے ویسے ہی کیا تھا، مقصد آپ کا بوسہ لینا تھا)۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ اپنے شام کے سفر نامے میں لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے ہم اس مزار پر حاضر ہوئے جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور اسلام کے لیے ان کی خدمات سے کون مسلمان ناواقف ہے؟ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی آتے ہی عقیدت و محبت کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس نہ کرتا ہو۔ مکہ مکرمہ میں اسلام سے پہلے انہوں نے غلامی کی زندگی گزاری۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ ان چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ اس دور میں جب حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعارف حاصل کرنے لیے آپ سے پوچھا کہ: "(توحید کے) اس پیغام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی اور کون ہے؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: حرّ وعبد یعنی "ایک شخص آزاد ہے اور ایک غلام" آزاد شخص سے مراد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے اور غلام سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ۔

اسلام لانے پر ان کے آقا نے ان پر جو ظلم و ستم توڑے، اس کے واقعات مشہور ہیں۔ انہیں چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں پر لٹایا جاتا اور لات وعزّٰی کو معبود ماننے پر مجبور کیا جاتا لیکن ان کے منہ سے احد، احد کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ بالآخر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید کر آزاد کیا۔

اس کے بعد سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور آپ کے باقاعدہ مؤذن قرار پائے۔ ان کی فضیلت کے لیے ایک ہی حدیث کافی ہے جس میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فجر کی نماز کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: "مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ جو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ امید افزا ہو، کیونکہ میں نے آج رات جنت میں تمہارے پاؤں کی آہٹ اپنے سامنے سنی"۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "میں رات دن میں کسی بھی وقت جب کبھی وضو کرتا ہوں تو اپنے پروردگار کے لیے جتنی توفیق ہوتی ہے نماز ضرور پڑھتا ہوں"۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسی مکہ مکرمہ میں جہاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کلمہ طیبہ پڑھنے کی خاطر اذیتیں دی جاتی تھیں، جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ

شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں، چنانچہ آپ نے پہلی بار مکہ مکرمہ میں کعبے کی چھت سے اذان دی۔

سرکار دوعالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مدینہ طیبہ میں نہ رہا گیا اور وہ جہاد کے لیے شام آکر مقیم ہوگئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت ہی میں شام آگئے تھے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں روک لیا تھا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ شام کے قیام کے دوران حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خواب میں زیارت کی۔ دیکھا کہ آپ ﷺ ان سے فرمارہے ہیں: "بلال! ایسی بھی کیا بے مروتی؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم مجھ سے آکر ملو؟" یہ بیدار ہوئے تو غمگیں تھے، فوراً سواری منگائی اور مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے، وہاں روتے رہے، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما وہاں تشریف لے آئے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے انہیں گلے سے لگالیا۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے ان سے فرمائش کی کہ "ہمارا آپ کی اذان سننے کو دل چاہتا ہے"۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے چھت پر کھڑے ہوکر اذان دینی شروع کی۔ ابھی الله اکبر الله اکبر کہا تھا کہ مدینہ گونج اٹھا، اشهدأن لا اله الّا الله کہا تو کہرام مچ گیا اور جب اشهدأن محمدارسول الله کہا تو پردہ نشین خواتین تک بے تابی کے عالم میں گھروں سے نکل آئیں اور کہنے لگیں: "رسول اللہ ﷺ دوبارہ مبعوث ہوگئے"۔ کہتے ہیں کہ لوگ اس دن سے زیادہ کسی اور دن مدینہ طیبہ میں روتے نہیں دیکھے گئے۔

یہ روایت سنداً کمزور ہے، اس کے مقابلے میں وہ روایت زیادہ مضبوط ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ شام میں پیش آیا یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان کی فرمائش کی اور جب انہوں نے اذان دی تو لوگ رونے لگے اور اس دن سے زیادہ کسی اور دن روتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی سیرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ آخرت میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کے انتظار سے عبارت تھا چنانچہ جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ بے خودی کے عالم میں یہ شعر پڑھ رہے تھے

غداً نلقی الاحبّہ محمّداً وحزبہ

کل ہماری محبوب شخصیتوں سے ملاقات ہوگی، محمد اور آپ کے صحابہ سے۔

موت کی شدت دیکھ کر آپ کی اہلیہ نے کہا:

وَاوَیلَاہ (ہائے افسوس!)

لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

وَافَرِحَاہ (واہ رے خوشی!) (جہانِ دیدہ:۲۵۱تا۲۶۰)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت

انسان کو جب کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو اس کے تمام متعلقات سے الفت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ حضرت امام ربانی قدس سرہ کے سواد قلب میں حق تعالیٰ شانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت راسخ ہوگئی تھی، اس لیے حرمین شریفین کے خس وخاشاک تک کو آپ محبوب سمجھتے اور خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ مدنی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر صندوقچہ میں رکھ لیتے اور کبھی کبھی سفوف بنا کر پھانکا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ لوگ حرمین شریفین کی چیزوں زم زم کے ٹین اور تخم خرما کو یوں ہی پھینک دیتے ہیں، یہ نہیں خیال کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسی ہوئی حضرت نے صندوقچہ میں سے نکال کر مجھے عطا فرمائی کہ لو اس کو پھانک لو۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی املی مجھے کھلائی اور ایک دفعہ مدینۃ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ لو اس کو کھالو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مٹی کھانا تو حرام ہے۔ آپ نے فرمایا: ”میاں وہ مٹی اور ہوگی“۔ (تذکرۃ الرشید:۴۸-۴۷)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا عالم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کناروں پر کھڑے ہوئے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”بیٹھ جاؤ۔“ جس وقت آپ نے یہ حکم دیا اس وقت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ باہر سڑک پر تھے اور مسجد نبوی کی طرف آرہے تھے اور ابھی مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ اس وقت ان کے کان میں حضور

ﷺ کی یہ آواز آئی : "بیٹھ جاؤ"۔ آپ وہی سڑک پر بیٹھ گئے، خطبہ کے بعد جب حضور اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ: "میں نے تو بیٹھنے کا حکم ان لوگوں کو دیا تھا جو یہاں مسجد کے کناروں پر کھڑے ہوئے تھے لیکن تم تو سڑک پر تھے، اور سڑک پر بیٹھنے کو تو میں نے نہیں کہا تھا، تم وہاں کیوں بیٹھ گئے؟" حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جب حضور کا یہ ارشاد کان میں پڑ گیا کہ "بیٹھ جاؤ" تو پھر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مجال نہیں تھی کہ وہ ایک قدم آگے بڑھائے۔

یہ بات نہیں تھی کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس بات کو جانتے نہیں تھے کہ حضور ﷺ مجھے سڑک پر بیٹھنے کا حکم نہیں دے رہے تھے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ جب حضور ﷺ کا یہ ارشاد کان میں پڑ گیا کہ "بیٹھ جاؤ" تو اب اس کے بعد قدم نہیں اٹھ سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کا یہ حال تھا، ویسے ہی صحابہ کرام نہیں بن گئے تھے، عشق و محبت کے دعوے دار تو بہت ہیں لیکن ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا عشق کوئی لے کر تو آئے۔

میدانِ جنگ میں ادب کا لحاظ

میدانِ احد میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی طرف تیر برسائے جا رہے ہیں، تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ یہ چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے آڑ بن جائیں لیکن اگر ان تیروں کی طرف سینہ کر کے آڑ بنتے ہیں تو حضور ﷺ کی طرف پشت ہو جاتی ہے اور یہ گوارا نہیں کہ میدانِ جنگ میں بھی حضور ﷺ کی طرف پشت ہو جائے چنانچہ آپ نے اپنا سینہ حضور اقدس ﷺ کی طرف اور پشت کفار کے تیروں کی طرف کر دی اور اس طرح تیروں کو اپنی پشت پر لے رہے تھے تاکہ جنگ کے میدان میں بھی یہ بے ادبی نہ ہو کہ حضور اقدس ﷺ کی طرف پشت ہو جائے۔ (اصلاحی خطبات: ۱۶۳/ ۲-۱۶۲)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے موقع پر معاملات طے کرنے کے لیے حضور ﷺ کے ایلچی بن کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر اپنے چچازاد بھائی کے گھر ٹھہر گئے اور جب صبح کے وقت

مکہ کے سرداروں سے مذاکرات کے لیے گھر سے جانے لگے تو اس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر آدھی پنڈلی تک تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ تھا کہ ٹخنوں سے نیچے ازار لٹکانا تو بالکل ناجائز ہے، اگر ٹخنوں سے اوپر ہو تو جائز ہے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول اور عادت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آدھی پنڈلی تک اپنا ازار رکھتے تھے، اس سے نیچے نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی نے کہا کہ جناب! عربوں کا دستور یہ ہے کہ جس شخص کا ازار اور تہبند جتنا لٹکا ہوا ہو، اتنا ہی اس آدمی کو بڑا سمجھا جاتا ہے اور سردار قسم کے لوگ اپنے ازار کو لٹکا کر رکھتے ہیں اس لیے اگر آپ اپنا ازار اس طرح اونچا پہن کر ان لوگوں کے پاس جائیں گے تو اس صورت میں ان کی نظروں میں آپ کی وقعت نہیں ہوگی اور مذاکرات میں جان نہیں پڑے گی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے چچازاد بھائی کی باتیں سنیں تو ایک ہی جواب دیا فرمایا: لا! ھکذا ازرۃ صاحبنا صلی اللہ علیہ وسلم "نہیں میں اپنا ازار اس سے نیچا نہیں کر سکتا، میرے آقا سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ازار ایسا ہی ہے"۔

یعنی اب یہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، میری عزت کریں یا بے عزتی کریں، جو چاہیں کریں مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ازار دیکھ چکا ہوں اور آپ کا جیسا ازار ہے ویسا ہی میرا رہے گا اسے میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فاتح ایران ہیں۔ جب ایران میں کسریٰ پر حملہ کیا گیا تو اس نے مذاکرات کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے دربار میں بلایا، آپ وہاں تشریف لے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو تواضع کے طور پر پہلے ان کے سامنے کھانا لاکر رکھا گیا چنانچہ آپ نے کھانا شروع کیا۔ کھانے کے دوران آپ کے ہاتھ سے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اگر نوالہ نیچے گر جائے تو اس کو ضائع نہ کرو وہ اللہ کا رزق ہے اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے کونسے حصے میں برکت رکھی ہے، اس لیے اس نوالے کی ناقدری نہ کرو بلکہ اس کو اٹھالو، اگر اس کے اوپر کچھ مٹی لگ گئی ہے تو اس کو صاف کرلو اور پھر کھالو۔ چنانچہ جب نوالہ نیچے گرا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حدیث یہ یاد آگئی اور آپ نے اس نوالے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ نیچے بڑھایا، آپ کے برابر ایک صاحب بیٹھے تھے، انہوں نے آپ کو کہنی مار

کر اشارہ کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو دنیا کی سپر طاقت کسریٰ کا دربار ہے، اگر تم اس دربار میں زمین پر گرا ہوا نوالہ اٹھا کر کھاؤ گے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں تمہاری وقعت نہیں رہے گی اور یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑے ندیدہ قسم کے لوگ ہیں اس لیے یہ نوالہ اٹھا کر کھانے کا موقع نہیں ہے، آج اس کو چھوڑ دو۔

جواب میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ: أأترك سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھؤلاء الحمقی؟ "کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ دوں؟" چاہے یہ اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، عزت کریں یا ذلت یا مذاق اڑائیں، لیکن میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔

اب بتائیے کہ انہوں نے اپنی عزت کروائی یا آج ہم سنتیں چھوڑ کر کروا رہے ہیں؟ عزت انہوں نے ہی کروائی اور ایسی کرائی کہ ایک طرف تو سنت پر عمل کرتے ہوئے نوالہ اٹھا کر کھایا تو دوسری طرف ایران کے وہ کج کلاہ جو غرور کے مجسمے بنے ہوئے تھے، اُن کا غرور ایسا خاک میں ملایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ: اذا ھلك کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ "جس دن کسریٰ ہلاک ہوا، اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہے۔" دنیا سے اس کا نام ونشان مٹ گیا۔

اپنا لباس نہیں چھوڑیں گے

اس واقعہ سے پہلے یہ ہوا کہ حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہما جب مذاکرات کے لیے جانے لگے اور کسریٰ کے محل میں داخل ہونے لگے تو اس وقت وہ اپنا وہی سیدھا سادہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ چونکہ لمبا سفر کر کے آئے تھے اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ کپڑے کچھ میلے بھی ہوں۔ دربار کے دروازے پر جو دربان تھا اس نے آپ کو اندر جانے سے روک دیا۔ اس نے کہا کہ تم اتنے بڑے بادشاہ کسریٰ کے دربار میں ایسے لباس میں جا رہے ہو؟ اور یہ کہہ کر اس نے ایک جبہ دیا کہ آپ یہ جبہ پہن کر جائیں۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے اس دربان سے کہا کہ اگر کسریٰ کے دربار میں جانے کے لیے اس کا دیا ہوا جبہ پہننا ضروری ہے تو پھر ہمیں اس کے دربار میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہم جائیں گے تو اسی لباس میں جائیں گے اور اگر اس کو اس لباس میں ملنا منظور نہیں تو پھر ہمیں بھی اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں لہٰذا ہم واپس جا رہے ہیں۔

اس دربان نے اندر پیغام بھیجا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ آئے ہیں جو جبہ لینے کو بھی تیار نہیں۔ اس دوران حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار کے اوپر لپٹی ہوئی کترنوں کو درست کرنے لگے، جو تلوار کے ٹوٹے ہوئے حصے پر لپٹی ہوئی تھیں۔

اس چوکیدار نے تلوار دیکھ کر کہا: ذرا مجھے اپنی تلوار تو دکھاؤ۔ آپ نے وہ تلوار اس کو دے دی۔ اس نے وہ تلوار یکھ کر کہا کہ کیا تم اس تلوار سے ایران فتح کروگے؟ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابھی تک تم نے صرف تلوار دیکھی ہے تلوار چلانے والا نہیں دیکھا، اس نے کہا کہ اچھا ہاتھ بھی دکھادو۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھ دیکھنا چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ تمہارے پاس تلوار کا وار روکنے والی جو سب سے زیادہ مضبوط ڈھال ہو وہ منگوالو اور پھر میرا ہاتھ دیکھو۔ چنانچہ وہاں جو سب سے زیادہ مضبوط لوہے کی ڈھال تھی جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کوئی تلوار اس کو نہیں کاٹ سکتی وہ منگوائی گئی، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی شخص اس کو میرے سامنے لے کر کھڑا ہو جائے، چنانچہ ایک آدمی اس ڈھال کو لے کر کھڑا ہو گیا تو حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار جس پر کترنیں لپٹی ہوئی تھیں اس کا ایک وار جو کیا تو اس ڈھال کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سب لوگ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خدا جانے یہ کیسی مخلوق آگئی ہے۔

بہر حال! اس کے بعد دربان نے اندر پیغام بھیجا کہ یہ ایک عجیب و غریب مخلوق آئی ہے جو نہ تمہارا دیا ہوا لباس پہنتی ہے اور ان کی تلوار بظاہر تو ٹوٹی پھوٹی نظر آتی ہے لیکن اس نے ڈھال کے دو ٹکڑے کر دیے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ان کو اندر بلوایا گیا.... کسریٰ کے دربار کا دستور یہ تھا کہ وہ خود تو کرسی پر بیٹھا رہتا تھا اور سارے درباری سامنے کھڑے رہتے تھے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے کسریٰ سے کہا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے پیروکار ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے منع کیا ہے کہ ایک آدمی بیٹھا رہے اور باقی آدمی اس کے سامنے کھڑے رہیں، لہٰذا ہم اس طرح سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار نہیں، یا تو ہمارے لیے بھی کرسیاں منگوائی جائیں یا کسریٰ بھی ہمارے سامنے کھڑا ہو۔ کسریٰ نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ تو ہماری توہین کرنے کے لیے آئے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ ایک مٹی کا ٹوکرا بھر کر ان کے سر پر رکھ کر ان کو واپس روانہ کر دو میں ان سے بات نہیں کرتا، چنانچہ ایک

مٹی کاٹوکرا ان کو دے دیا گیا۔

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب دربار سے نکلنے لگے تو جاتے ہوئے یہ کہا کہ اے کسریٰ ! یہ بات یادرکھنا کہ تم نے ایران کی مٹی ہمیں دے دی۔ یہ کہہ کر روانہ ہوگئے۔ ایرانی لوگ بڑے توہم پرست قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ جو کہا کہ ’’ایران کی مٹی ہمیں دے دی‘‘ یہ تو بڑی بدفالی ہوگئی۔ اب کسریٰ نے فوراً ایک آدمی پیچھے دوڑایا کہ جاؤ! جلدی سے وہ مٹی کاٹوکرا واپس لے آؤ۔ اب حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کہاں ہاتھ آنے والے تھے، چنانچہ وہ لے جانے میں کامیاب ہوگئے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا کہ ایران کی مٹی انہی ٹوٹی ہوئی تلوار والوں کے ہاتھ میں آئے گی (یعنی ایران فتح ہوگا)۔

آج مسلمان ذلیل کیوں؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی اتباع میں آپ کی سنتوں کی تعمیل میں ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دنیا بھر میں اپنا لوہا منوایا اور آج ہم پر یہ خوف مسلط ہے کہ اگر فلاں سنت پر عمل کرلیا تو لوگ کیا کہیں گے، اگر فلاں سنت پر عمل کرلیا تو دنیا والے مذاق اڑائیں گے، انگلینڈ مذاق اڑائے گا، فلاں ملک والے مذاق اڑائیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیامیں آج ذلیل ہورہے ہیں۔ آج دنیا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں کی ہے، آج دنیامیں جتنے مسلمان ہیں اتنے مسلمان اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے اور آج مسلمانوں کے پاس جتنے وسائل ہیں اتنے وسائل اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تمہاری تعداد تو بہت ہوگی، لیکن تم ایسے ہوگے جیسے سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے ہوتے ہیں، جن کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ اپنے دشمنوں کو راضی کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ اپنے اخلاق چھوڑے، اپنے اعمال چھوڑے، اپنی سیرتیں چھوڑیں، اپنے کردار چھوڑے اور اپنی صورتیں تک بدل ڈالیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک ان کی نقل اتار کر یہ دکھادیا کہ ہم تمہارے غلام ہیں، لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں ہیں اور روزانہ پٹائی کرتے ہیں، کبھی اسرائیل پٹائی کررہاہے کبھی کوئی دوسرا ملک پٹائی کررہاہے، لہٰذا ایک مسلمان جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑدے گا تو یاد رکھیں! اس کے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں۔

ایک شاعر گزرے ہیں اسعد ملتانی مرحوم، انہوں نے بڑے اچھے حکیمانہ شعر کہے ہیں۔ فرماتے

ہیں کہ

؎ کسی کا آستانہ اونچا ہے اتنا — کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا
ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے — زمانہ تم پہ ہنستا ہی رہے گا

جب تک تم اس بات سے ڈرو گے کہ فلاں ہنسے گا، فلاں مذاق اڑائے گا تو زمانہ ہنستا ہی رہے گا اور دیکھ لو کہ ہنس رہا ہے، اور اگر تم نے نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کے قدم مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور آپ کی سنتوں کی اتباع کر لی تو پھر دیکھو کہ دنیا تمہاری کیسی عزت کرتی ہے۔

صاحبِ ایمان کے لیے اتباعِ سنت لازم ہے

یہاں ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ سنتیں چھوڑنے سے ذلت ہوتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سارے کفار و مشرکین، امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک والے سب نے سنتیں چھوڑ رکھی ہیں اور اس کے باوجود وہ خوب ترقی کر رہے ہیں اور خوب ان کی عزت ہو رہی ہے، ان کو کیوں ترقی ہو رہی ہے؟۔

بات دراصل یہ ہے کہ تم صاحبِ ایمان ہو، تم نے محمد رسول اللہ ﷺ کا کلمہ پڑھا ہے، تم جب تک ان کے قدموں پر سر نہیں رکھو گے اس وقت تک اس دنیا میں تمہاری پٹائی ہوتی رہے گی اور تمہیں عزت حاصل نہیں ہو گی۔ کافروں کے لیے تو صرف دنیا ہی دنیا ہے وہ اس دنیا میں ترقی کریں، عزت کرائیں، جو چاہے کرائیں تم اپنے آپ کو ان پر قیاس مت کرو۔ چودہ سو سال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں جب تک مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کیا اس وقت تک عزت بھی پائی، شوکت بھی حاصل کی، اقتدار بھی حاصل کیا، لیکن جب سے سنتیں چھوڑ دی ہیں اس وقت سے دیکھ لو کیا حالت ہے۔

اپنی زندگی کا جائزہ لیں

بہر حال! تقریریں تو ہوتی رہتی ہیں، جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن اس تقریر کے نتیجے میں ہمارے اندر کیا فرق واقع ہوا؟ اس لیے آج ایک کام کا عہد کریں کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ہم حضور اقدس ﷺ کی کونسی سنت پر عمل کر رہے ہیں اور کونسی سنت پر عمل نہیں کر رہے اور کون سی سنت ایسی ہے جس پر ہم فوراً عمل شروع کر سکتے ہیں اور کون سی سنت ایسی ہے جس میں تھوڑی سی توجہ کی

ضرورت ہے ؟ لہٰذا جو سنت ایسی ہے جس پر ہم فوراً عمل شروع کر سکتے ہیں وہ آج سے شروع کر دیں اور اس کا اہتمام کریں۔ (اصلاحی خطبات:۱۷۰/۲-۱۶۴)

المرء مع من أحب

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ! مجھے آپ سے اپنی جان سے اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبت ہے، میں بعض دفعہ گھر میں ہوتا ہوں آپ مجھے یاد آجاتے ہیں تو پھر جب تک حاضر خدمت ہو کر آپ کی زیارت نہ کرلوں مجھے چین نہیں آتا۔ اب مجھے یہ خیال آیا ہے کہ میرا بھی انتقال ہو جائے گا آپ بھی دنیا سے تشریف لے جائیں گے اور آپ تو نبیوں کے ساتھ سب سے اوپر کی جنت میں چلے جائیں گے اور میں نیچے کی جنت میں رہ جاؤں گا تو مجھے ڈر ہے کہ میں وہاں آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا (تو پھر میرا جنت میں دل کیسے لگے گا؟)۔ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام یہ آیت لے کر آئے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ "اور جو شخص اللہ ورسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء۔" (سورۂ نساء: آیت ۶۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے اتنی زیادہ محبت ہے کہ جب آپ مجھے یاد آجاتے ہیں تو اگر آپ کی زیارت نہ کرلوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میری جان نکل جائے گی۔ اب مجھے یہ خیال آیا کہ اگر میں جنت میں گیا بھی تو مجھے آپ سے نیچے کی جنت ملے گی (اور میں وہاں آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا) تو مجھے جنت میں بڑی مشقت اٹھانی پڑے گی، اس لیے میں چاہتا ہوں جنت کے درجہ میں میں آپ کے ساتھ ہو جاؤں (تاکہ جب دل چاہے گا آپ کی زیارت کرلیا کروں گا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ "اور جو شخص اللہ ورسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص

بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء۔" (سورۂ نساء: آیت ٦٩)

پھر حضور ﷺ نے اس آدمی کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

حضرت بحریہ رحمہا اللہ کہتی ہیں میرے چچا حضرت خِداش رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو ایک پیالہ میں کھاتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے حضور ﷺ سے وہ پیالہ بطورِ ہدیہ مانگ لیا۔ (حضور ﷺ نے ان کو وہ پیالہ دے دیا) چنانچہ وہ پیالہ ہمارے ہاں رکھا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ پیالہ میرے پاس نکال کر لاؤ۔ ہم زم زم کے پانی سے بھر کر وہ پیالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لاتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں سے کچھ پیتے اور کچھ (برکت کے لیے) اپنے سر اور چہرے پر ڈال لیتے۔ پھر ایک چور نے ہم پر بڑا ظلم کیا کہ وہ ہمارے سامان کے ساتھ اسے بھی چوری کر کے لے گیا۔ پیالہ کی چوری کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے اور حسب سابق پیالہ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا: اے امیر المؤمنین! وہ پیالہ تو ہمارے سامان کے ساتھ چوری ہو گیا۔ حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ چور تو بڑا سمجھ دار ہے جو حضور ﷺ کا پیالہ چرا کر لے گیا۔ راوی کہتے ہیں: اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ تو چور کو برا بھلا کہا اور نہ اس پر لعنت بھیجی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیینہ بن حصن بن (حذیفہ بن) بدر رضی اللہ عنہ (مدینہ) آئے اور وہ اپنے بھتیجے حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرے۔ حضرت حر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قریب رکھتے تھے اور عبادت گزار علما ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں ہوتے تھے چاہے وہ جوان ہوتے یا عمر رسیدہ۔ حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تمہیں امیر المؤمنین کے ہاں بڑا درجہ حاصل ہے تم ان سے میرے لیے آنے کی اجازت حاصل کرو۔ انہوں نے جا کر اپنے چچا کے لیے حضرت رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ جب وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو ان سے یہ کہا: اے ابن خطاب! دیکھو اللہ کی قسم! آپ ہمیں زیادہ نہیں دیتے اور ہمارے درمیان عدل کا فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ کو سزا دینے کا ارادہ فرما لیا۔ حضرت حر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے اپنے

نبی ﷺ سے فرمایا: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۞ ’’سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجیے اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجیے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجیے۔‘‘

(سورۂ اعراف: آیت ۱۹۹)

اور یہ بھی ان جاہلوں میں سے ہے (اس لیے آپ ان کی اس بات سے کنارہ کرلیں)۔ جب حضرت حر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں رک گئے (اور سزا دینے کا ارادہ چھوڑ دیا) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی صفت تھی کہ وہ کسی کام کا ارادہ کرلیتے، پھر انہیں بتایا جاتا کہ اللہ کی کتاب اس کام سے روک رہی ہے تو فوراً اس ارادہ کو چھوڑ دیتے اور ایک دم رک جاتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ جب بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر غصہ آیا، پھر کسی نے ان کے سامنے اللہ کا نام لے لیا، یا انہیں آخرت کی پکڑ سے ڈرایا، یا ان کے سامنے قرآن کی آیت پڑھ دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں جس کام کا ارادہ کرچکے ہوتے تھے اس سے ایک دم رک جایا کرتے تھے۔ (حیات الصحابہ: ۴۸۵/ ۲-۴۸۴)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کھردرا کرتا پہننے لگے۔ جوں ہی وہ کرتا ہنسلی کی ہڈی سے نیچے ہوا تو انہوں نے فوراً یہ دعا پڑھی:

الحمد للهِ الَّذِی کَسَانِی مَا اُوَارِی بِهٖ عَورَتِی وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِی حَيَاتِی

پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں نے یہ دعا کیوں پڑھی؟ ساتھیوں نے کہا: نہیں آپ بتائیں تو ہمیں پتا چلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ کے پاس نئے کپڑے لائے گئے جنہیں آپ نے پہنا پھر یہ دعا پڑھی:

الحمد للهِ الَّذِی کَسَانِی مَا اُوَارِی بِهٖ عَورَتِی وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِی حَيَاتِی

پھر فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق دے کر بھیجا! جس مسلمان بندے کو اللہ تعالیٰ نئے کپڑے پہنائے اور وہ اپنے پرانے کپڑے کسی مسکین مسلمان بندے کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے پہنا دے تو جب تک اس مسکین بندے پر ان کپڑوں کا ایک دھاگہ بھی باقی رہے گا اس وقت تک یہ پہنانے والا اللہ کی

حفاظت، پناہ اور ضمانت میں رہے گا چاہے زندہ ہو یا مر کر قبر میں پہنچ جائے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کرتے کو پھیلا کر دیکھا تو آستین انگلیوں سے لمبی تھی تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے میرے بیٹے! ذرا چوڑی چھری لانا۔ وہ کھڑے ہوئے اور چھری لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آستین کو اپنی انگلیوں پر پھیلا کر دیکھا تو جو حصہ انگلیوں سے آگے تھا اسے اس چھری سے کاٹ دیا۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! کیا ہم کوئی درزی نہ لے آئیں جو آستین کا کنارہ سی دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں۔ حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ بعد میں میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس آستین کے دھاگے ان کی انگلیوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ انہیں روک نہیں رہے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نیا کرتا پہنا، پھر مجھ سے چھری منگوا کر فرمایا: اے میرے بیٹے! میرے کرتے کی آستین کو پھیلاؤ اور میری انگلیوں کے کنارے پر دونوں ہاتھ رکھ کر جو انگلیوں سے زائد کپڑا ہے اسے کاٹ دو۔ چنانچہ میں نے چھری سے دونوں آستینوں کا زائد کپڑا کاٹ دیا (وہ چھری سے سیدھا نہ کٹ سکا اس لیے) آستین کا کنارہ ناہموار اونچا نیچا ہو گیا۔ میں نے ان سے عرض کیا: اے ابا جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں قینچی سے برابر کر دوں۔ انہوں نے فرمایا: اے میرے بیٹے! ایسے ہی رہنے دو، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔ چنانچہ وہ کرتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بدن پر اسی طرح رہا یہاں تک کہ وہ پھٹ گیا اور میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ اس کے دھاگے پاؤں پر گر رہے ہوتے تھے۔

حضرت اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: سن لے اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے نہ نقصان دے سکتا ہے اور نہ نفع، اگر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارا استلام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تمہارا استلام نہ کرتا (استلام یہ ہے کہ حجر اسود کو آدمی چومے یا اسے ہاتھ یا لکڑی لگا کر اسے چومے) پھر حجر اسود کا استلام کیا، اس کے بعد فرمایا: ہمیں رمل سے کیا لینا؟ (رمل طواف کے پہلے تین چکروں میں اکڑ کر چلنے کو کہتے ہیں) ہم نے تو رمل مشرکوں کو (اپنی قوت) دکھانے کے لیے کیا تھا، اب اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا (لہٰذا اب بظاہر ضرورت نہیں ہے) پھر فرمایا: رمل

ایک ایسا کام ہے جسے حضور ﷺ نے کیا اس لیے ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔

(حیات الصحابہ:۴۷۷/۲-۴۷۶)

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں میدان عرفات میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، جب وہ قیام گاہ سے چلے تو میں بھی ان کے ساتھ چلا۔ وہ امامِ حج کی جگہ پر پہنچے اور ان کے ساتھ ظہر اور عصر کی نماز ادا کی۔ پھر انہوں نے جبلِ رحمت پر وقوف فرمایا۔ میں اور میرے ساتھی بھی ان کے ساتھ تھے یہاں تک کہ (غروب کے بعد) جب امام عرفات سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوا تو ہم بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مازمین مقام سے پہلے ایک تنگ جگہ پہنچے تو انہوں نے اپنی سواری بٹھائی تو ہم نے بھی سواریاں بٹھادیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام نے، جو ان کی سواری کو تھامے ہوئے تھے، اس نے کہا: نہیں! یہ نماز نہیں پڑھنا چاہتے بلکہ انہیں یاد آگیا ہے کہ حضور ﷺ جب اس جگہ پہنچے تھے تو آپ قضائے حاجت کے لیے رکے تھے اس لیے یہ بھی یہاں قضائے حاجت کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک درخت کے پاس جب پہنچتے تو اس کے نیچے دوپہر کو آرام فرماتے اور اس کی وجہ یہ بتایا کرتے کہ حضور ﷺ نے اس درخت کے نیچے دوپہر کو آرام فرمایا تھا۔

حضرت رافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ کے آثار ونشانات کا بہت زیادہ اتباع کیا کرتے تھے چنانچہ جس جگہ حضور ﷺ نے (دورانِ سفر) کوئی نماز پڑھی ہوتی وہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ضرور نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے آثار کا ان کو اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ ایک سفر میں حضور ﷺ ایک درخت کے نیچے ٹھہرے تھے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس درخت کا بہت خیال رکھتے اور اس کی جڑ میں پانی ڈالتے تاکہ وہ خشک نہ ہو جائے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے چلتے چلتے جب وہ ایک جگہ کے پاس سے گزرے تو راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہو لیے۔ ساتھیوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا، راستہ کیوں چھوڑ دیا؟ انہوں نے فرمایا میں نے حضور ﷺ کو یہاں ایسے ہی کرتے

دیکھا تھا اس لیے میں نے بھی ایسے ہی کیا۔ (حیاۃ الصحابہ:۲/۴۷۹)

ایک دفعہ حضرت اقدس نے بہت افسوس کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ میرا ساری زندگی کا معمول عمامہ کا تھا مگر بیماری نے جہاں بہت کچھ چھڑا دیا وہاں یہ بھی چھوٹ گیا۔ اب کئی سال سے دماغ پر اتنی شدید گرمی ہے کہ سخت سردیوں میں بھی سر پر ململ کی ٹوپی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں رکھ سکتا ورنہ اس سے پہلے عمامہ کا میرا ہمیشہ معمول رہا۔ (ماخوذ از اطاعت رسول ﷺ)

احقر راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ وہ منظر گویا کہ میری آنکھوں کے سامنے ہے جبکہ تقسیم ہند سے قبل احقر کو حضرت کی پہلی مرتبہ زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو حضرت سیاہ عمامہ باندھے ہوئے چارپائی پر تشریف فرما تھے۔

افسوس کہ یہ سنت مستمرہ متروک ہو رہی ہے حتی کہ سردیوں میں بھی اونی ٹوپیوں کے پہنے کا رواج ہو گیا ہے حالاں کہ عمامہ اپنی ہیئت کی وجہ سے کن پٹیوں پر بھی آجاتا ہے اور اس کے شملہ سے گرمی میں گردن کے بھی حفاظت رہتی ہے اور ان دونوں جگہوں پر گرمی، سردی سے نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں ایک تنبیہ ضروری ہے کہ اونی ٹوپی کسی متبع سنت جن کی زندگی میں اتباع سنت نمایاں ہو پہنے ہوئے دیکھ کر اعتراض بھی نہیں کرنی چاہیے ممکن ہے ان کو کوئی اور عذر ہو۔ لیکن جن حضرات کو کوئی عذر نہ ان کو محض تساہل کی وجہ سے عمامہ باندھنے میں سستی کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ اس دور میں جب کہ عام طور سے یہ سنت متروک ہو رہی ہے، اہتمام سے اس کو اپنانے کی کوششیں کرنی چاہیے۔ اس میں ان شاء اللہ بڑے اجر کی امید ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کا اتباعِ رسول

حضرت شیخ دام مجدہم فرماتے ہیں کہ میرا اور میرے چچا جان (حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی رحمہ اللہ) کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ اپنی ایک شبانہ حاضری کاندھلہ میں جملہ اعزہ کے گھروں میں جا کر ان سے ایک ایک دو دو منٹ کے لیے ضرور ملتے۔ میرا کاندھلہ جانا چھ ماہ، آٹھ ماہ میں ایک شب کے لیے ہوتا تھا۔

ایک دفعہ آٹھ ماہ بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا اور اپنی عادت کے موافق سب گھروں کا چکر لگایا۔ میرے محترم عزیز برادر معظم ماسٹر محمود الحسن کاندھلوی مرحوم اس وقت کاندھلہ میں تھے۔ میرے ساتھ وہ بھی بادل نخواستہ میری خاطر میں مٹر گشت میں چل دیے۔ میں ایک عزیز کے گھر گیا جو ایک معمولی سی بات پر اور محض غلط فہمی سے اپنے دل میں مجھ سے ناراض تھے جس کا مجھے احساس تک بھی نہ تھا۔ (جس کا مفصل قصہ آپ بیتی نمبر ۳ صفحہ ۷۹ میں "آموں والا قصہ" کے عنوان سے درج ہے، یہاں اختصار کے خیال سے درج نہیں کیا) میں نے جاکر سلام کیا، انہوں نے منہ پھیر لیا۔ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے، مرحوم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھائی محمود کا اس وقت غصہ کے مارے چہرا سرخ ہو رہا تھا۔

میں نے ایک مونڈھا کھینچا اور ان عزیز کے قریب بیٹھ کر چلا آیا۔ انہوں نے میری طرف منہ نہیں کیا۔ جب وہاں سے واپس آرہا تھا راستے میں بھائی محمود نے کہا: بے غیرت، بے حیا! پھر بھی ان کے یہاں آئے گا؟

میں نے کہا: ضرور آؤں گا، یہ ان کا فعل تھا جو انہوں نے کیا، وہ میرا فعل ہوگا جو میں کروں گا۔ ہمیں حدیث پاک میں صِلْ مَنْ قَطَعَكَ کا حکم دیا گیا ہے۔

مگر مالک کا ایک عجیب احسان یہ رہا کہ جس جس سے ابتداءً لڑائی رہی اس سے انتہاءً وہ تعلقات بڑھے کہ شاید و باید۔ یہ مرحوم عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ آخر میں ان کا یہ اصرار کہ "تجھ ہی سے بیعت ہوں گا۔ اور تیرے ہی پاس ٹھہر کر مروں گا" اتنا بڑھا کہ حد و حساب نہیں۔

ف: یہ اتباعِ شریعت و سنت کی برکت ہے کہ رحمٰن و وَدُود جل شانہ دلوں میں محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

(اتباع سنت و عشق رسول ﷺ: ۶۴ تا ۶۵)

حضرت کا اتباع سنت میں جو کی روٹی کھانا

حضرت اقدس نے کھانے پینے میں بھی کوئی ایک سنت عمل کیے بغیر نہیں چھوڑی۔ یہاں اختصار کے پیش نظر مختصر لکھا جاتا ہے۔

کھانے سے اول اور بعد ہاتھ دھونا سنت ہے جس کا بہت ہی اہتمام دیکھا گیا۔ اس سنت کا رواج بھی آج کل چمچوں اور ٹشو پیپروں کی وجہ سے بہت کم ہو رہا ہے۔

مولانا یوسف متالا صاحب لکھتے ہیں کہ:

تیسرے سال حضرت نے جَو پسوا کر روزانہ دوپہر کو جَو کی روٹی کھانا شروع کی۔ بلاناغہ کئی ماہ تک یہ معمول مسلسل چلتا رہا کہ بڑے عشق کے ساتھ اور مزے لے کر حضرت وہی جَو کی روٹی اتباعِ سنت کی نیت سے کھاتے رہے اور مہمانوں کے لیے جو گیہوں کی روٹیاں بھی پکتی تھیں اس میں بھی تھوڑا سا جو کا آٹا ملانے کا اہتمام فرمایا تھا۔ اسی طرح ٹھنڈے میٹھے پانی کا اہتمام فرمانا جو حدیث پاک میں آیا ہے حضرت کے ہاں بھی ٹھنڈے پانی کا بہت اہتمام رہا۔

مولانا عبد الرحیم متالا صاحب اپنے حضرت کے یہاں قیام کا بتاتے ہیں کہ حضرت روزانہ صبح کے وقت شہد اور کلونجی نوش فرمایا کرتے تھے۔ اور سرکہ کے استعمال کا معمول بھی بہت رہا۔ ان سب چیزوں کے استعمال کا احادیث میں ذکر آیا ہے ایک حدیث پاک میں حضور ﷺ کو کدّو کے مرغوب ہونے اور شوربے میں سے چن کر کھانے کا ذکر بھی ہے۔ چنانچہ احقر مدینہ پاک میں مہمانوں کے لیے جب کھانا اتارتا تو سالن میں سے کدو کے قتلے چن کر ایک طشتری میں حضرت اقدس کے لیے لے جاتا۔ حضرت بہت ہی مسرت کے ساتھ قبول فرما کر نوش فرماتے۔ (اتباع سنت و عشق رسول ﷺ :۷۱)

احقر نے حضرت کو کبھی اکیلے کوئی چیز کھاتے آج تک نہیں دیکھا مگر سہارنپور کے ابتدائی قیام میں کبھی کبھی جب مہمان ہوتے تو بعض اوقات حضرت ان سب کو حضرت رائپوری رحمہ اللہ کی زیارت کے لیے رائے پور جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب کا بیان ہے کہ ایک روز کوئی بھی مہمان نہ تھا اور خود مولانا عبد الحفیظ صاحب تو وہاں طالب العلم تھے مہمان نہ تھے، مگر ان کا کھانا حضرت کے ساتھ ہی ہوتا رہا اس دن محض دال اور روٹی دستر خوان آئی تو حضرت نے ان کو فرمایا بھائی ہمارا کھانا تو یہی ہے اور جو تم روزانہ دستر خوان پر رونق دیکھتے ہو وہ مہمانوں کے اکرام کی بہت سی احادیث میں تاکید اور فضائل ہیں۔ (اتباع سنت و عشق رسول:۷۲)

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کا نمونہ

اگرچہ جتنے قصے اب تک نقل کیے گئے ہیں وہ سب ہی محبت کے کرشمے تھے کہ محبت ہی ان حضرات کی والہانہ زندگی کا سبب تھی جس کی وجہ سے نہ جان کی پرواہ تھی نہ زندگی کی تمنا، نہ مال کا خیال تھا

نہ تکلیف کا خوف نہ موت سے ڈر۔ اس کے علاوہ محبت حکایت کی چیز بھی نہیں، وہ ایک کیفیت ہے جو الفاظ وعبارات سے بالاتر ہے۔ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو دل میں بس جانے کے بعد محبوب کو ہر چیز پر غالب کر دیتی ہے، نہ اس کے سامنے ننگ وناموس کوئی چیز ہے نہ عزت وشرافت کوئی شے، حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف سے اور اپنے محبوب کے وسیلہ سے اپنی اور اپنے پاک رسول ﷺ کی محبت عطا فرمائیں تو ہر عبادت میں لذت ہے اور دین کی ہر تکلیف میں راحت۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اعلانِ اسلام اور تکلیف

ابتدائے اسلام میں جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ اپنے اسلام کو حتی الوسع مخفی رکھتا تھا۔ حضور ﷺ کی طرف سے بھی اس وجہ سے کہ ان کو کفار سے اذیت نہ پہنچے اخفا کی تلقین ہوتی تھی جب مسلمانوں کی مقدار انتالیس تک پہنچی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اظہار کی درخواست کی کہ کھلم کھلا علی الاعلان تبلیغ کی جائے حضور اقدس ﷺ نے اول انکار فرمایا، مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اصرار پر قبول فرمالیا اور ان سب حضرات کو ساتھ لے کر مسجد کعبہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تبلیغی خطبہ شروع کیا۔ یہ سب سے پہلا خطبہ ہے جو اسلام میں پڑھا گیا اور حضور اقدس ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی دن اسلام لائے ہیں اور اس کے تین دن بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے ہیں۔ خطبہ کا شروع ہونا تھا کہ چاروں طرف سے کفار ومشرکین مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی باوجودیہ کہ مکہ مکرمہ میں ان کی عام طور سے عظمت وشرافت مسلم تھی اس قدر مارا کہ تمام چہرہ مبارک خون میں بھر گیا۔ ناک کان سب لہولہان ہو گئے تھے۔ پہچانے نہ جاتے تھے جوتوں سے لاتوں سے مارا، پاؤں میں روندا اور جو نہ کرنا تھا سب ہی کچھ کیا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ہوش ہو گئے۔

بنو تیم یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبیلہ کے لوگوں کو خبر ہوئی وہ وہاں سے اٹھا کر لائے کسی کو بھی اس میں تردد نہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وحشیانہ حملہ سے زندہ نہ بچ سکیں گے۔ بنو تیم مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اگر اس حادثہ میں وفات ہوگئی تو ہم لوگ ان کے

بدلے میں عتبہ بن ربیعہ کو قتل کریں گے عتبہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مارنے میں بہت زیادہ بد بختی کا اظہار کیا تھا۔ شام تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بے ہوشی رہی۔ باوجود آوازیں دینے کے بولنے یا بات کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شام کو آوازیں دینے پر وہ بولے تو سب سے پہلا لفظ یہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے اس پر بہت ملامت کی کہ ان ہی کی بدولت یہ مصیبت آئی اور دن بھر موت کے منہ میں رہنے پر بات کی تو وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا جذبہ اور ان ہی کی لے۔ لوگ پاس سے اٹھ کر چلے گئے کہ بد دلی بھی تھی اور یہ بھی کہ آخر کچھ جان باقی ہے کہ بولنے کی نوبت آئی اور آپ کی والدہ ام خیر سے کہہ گئے کہ ان کے کھانے پینے کے لیے کسی چیز کا انتظام کر دیں وہ کچھ تیار کر کے لائیں اور کھانے پر اصرار کیا مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وہی ایک صدا تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گذری۔ ان کی والدہ نے فرمایا کہ مجھے تو خبر نہیں کیا حال ہے آپ نے فرمایا کہ ام جمیل رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن) کے پاس جاکر دریافت کرلو کہ کیا حال ہے؟ وہ بے چاری بیٹے کی اس مظلومانہ حالت کی بے تابانہ درخواست کو پورا کرنے کے واسطے ام جمیل رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دریافت کیا۔ وہ بھی عام دستور کے موافق اس وقت تک اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھیں۔ فرمانے لگیں میں کیا جانوں کون محمد اور کون ابو بکر تیرے بیٹے کی حالت سن کر رنج ہوا اگر تو کہے تو میں چل کر اس کی حالت دیکھوں۔ ام خیر رضی اللہ عنہا نے قبول کرلیا۔ ان کے ساتھ گئیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حالت دیکھ کر تحمل نہ کر سکیں۔ بے تحاشا رونا شروع کر دیا کہ بد کرداروں نے کیا حال کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کیے کی سزا دے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ام جمیل رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ سن رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے خوف نہ کرو تو ام جمیل رضی اللہ عنہا نے خیریت سنائی اور عرض کیا بالکل صحیح سالم ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ اس وقت کہاں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ ارقم کے گھر تشریف رکھتے ہیں آپ نے فرمایا کہ مجھ کو خدا کی قسم ہے کہ اس وقت تک کوئی چیز نہ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کرلوں۔ ان کی والدہ کو تو بے قراری تھی کہ وہ کچھ کھالیں اور انہوں نے قسم کھالی کہ جب تک زیارت نہ کرلوں کچھ نہ کھاؤں گا۔ اس لیے والدہ نے اس کا انتظار کیا کہ لوگوں کی آمد ورفت بند ہو جائے۔ مبادا کوئی دیکھ لے اور کچھ اذیت پہنچائے۔ جب رات کا بہت سا حصہ گذر گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارقم

کے گھر پہنچیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی لپٹ کر روئے اور مسلمان بھی سب رونے لگے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یہ میری والدہ ہیں آپ ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمادیں اور ان کو اسلام کی تبلیغ بھی فرمائیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اول دعا فرمائی اس کے بعد ان کو اسلام کی ترغیب دی۔ وہ بھی اسی وقت مسلمان ہو گئیں۔

ف: عیش وعشرت، نشاط و فرحت کے وقت محبت کے دعوے کرنے والے سینکڑوں ہوتے ہیں محبت وعشق وہی ہے جو مصیبت اور تکلیف کے وقت بھی باقی رہے۔ (حکایات صحابہ: ۱۶۵ تا ۱۶۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مارنا

حضرت کعب بن علقمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت غرفہ بن حارث کندی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ صحابی ہیں، انہوں نے سنا کہ ایک نصرانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہہ رہا ہے تو انہوں نے اسے ایسا مارا کہ اس کی ناک ٹوٹ گئی۔ یہ معاملہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت غرفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ہم تو ان سے امن دینے کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ حضرت غرفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی پناہ! یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہیں اور ہم ان کے معاہدے کا پھر بھی لحاظ کریں؟ ہم نے تو ان شرطوں پر ان سے معاہدہ کیا ہے کہ ہم ان کے عبادت خانوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ اپنے عبادت خانوں میں جو چاہیں کہیں اور ہم ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ان پر نہیں ڈالیں گے اور اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ہم ان کی طرف سے لڑیں گے اور ان کے احکام میں ہم کوئی دخل نہیں دیں گے۔ ہاں اگر یہ ہمارے احکامات پر راضی ہو کر ہمارے پاس فیصلہ کروانے آئیں گے تو ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اگر یہ اپنے معاملات کے بارے میں ہم سے الگ تھلگ رہیں گے تو ہم انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اس پر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی گواہی

صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سفیر کی حیثیت سے مشرکین قریش کی طرف سے آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ وہ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت کو بھی دیکھتا رہا کہ

جب آپ ﷺ تھوکتے ہیں تو صحابہ کرام اپنا ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور آپ ﷺ کا تھوک کسی نہ کسی ہاتھ میں پڑتا ہے اور وہ اس کو اپنے چہرے پر مل لیتا ہے، اور جب وضو کرتے ہیں تو لوگ آپ کے وضو پر ہجوم بنا دیتے ہیں اور آپ ﷺ کے بدن مبارک سے گرنے والے ایک قطرے پر بھی لڑ کر ہاتھوں ہاتھ لے جاتے ہیں۔ اس طرح کے حالات کو دیکھ کر اس نے اپنی قوم کو یوں کہہ دیا کہ:

اے لوگو! اللہ کی قسم میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں۔ قیصر و کسریٰ، نجاشی کا دربار دیکھا ہے مگر اللہ کی قسم! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا ہے جس کی اس قدر تعظیم اور محبت ہو جس طرح محمد ﷺ کے صحابہ محمد ﷺ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! جب وہ تھوکتے ہیں تو آپ ﷺ کا تھوک کسی نہ کسی ہاتھ میں پڑ جاتا ہے اور وہ اس کو اپنے بدن اور چہرے پر مل لیتا ہے، جب وہ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کے لیے جھگڑتے ہیں اور جب وہ بات کرتے ہیں تو سب اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اور ادب کی وجہ سے ان کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے (یعنی آپ ﷺ کے ساتھ آنکھیں نہیں ملا سکتے)۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیہ)

حضور ﷺ کی قبر دیکھ کر ایک عورت کی موت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئیں اور آکر عرض کیا کہ مجھے حضور ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرا دو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حجرہ شریفہ کھولا۔ انہوں نے زیارت کی اور زیارت کرکے روتی رہیں اور روتے روتے انتقال فرما گئیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ارضاھا۔

فائدہ: کیا اس عشق کی نظیر بھی کہیں ملے گی کہ قبر کی زیارت کی تاب نہ لا سکیں اور وہیں جان دے دی۔

......☆......☆......☆......

تبرک باآثار الصالحین کابیان

اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت وہاں نازل ہوتی ہے جہاں خیر و برکت کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اپنی وحی و رسالت اور نبوت سے نوازا، پہلے اُن کو بہترین صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا اور ان کی فطرت اور قلوب کی ہر قسم کے غل و غش اور آلودگیوں سے حفاظت کی۔ جب ان کی یہ خداداد صلاحیتیں بار آور ہوئیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی کا نزول شروع ہوا۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تمام انسانوں میں بہترین و افضل ترین لوگ ہوتے ہیں اور ان کے قلوب پر وہ خیر اترتی ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی خیر و رحمت اور برکت ہو نہیں سکتی۔ جو لوگ ان کی تعلیمات سے فیض یاب ہوتے ہیں ان کو دنیا و آخرت کی دائمی عزتیں، کامیابیاں اور رحمتیں مل جاتی ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، شفقتیں اور عنایتیں نازل ہوتی ہیں اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ جن مقامات پر وحی نازل ہوتی تھی، یا جو چیزیں ان مبارک ہستیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یا جہاں انہوں نے نشست و برخاست کی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا اثر پہنچتا ہے۔ جو لوگ ان ہستیوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں وہ بھی اپنی محبت کی لہروں اور تاروں میں ان کے فیوض و برکات اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل کر لیتے ہیں۔ ذیل میں انبیا علیہم السلام کے آثار، ان کی نشانیوں اور تبرکات کی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

نشانیاں اور تبرکات کس وقت بابرکت اور رحمتِ الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان کا جس شخص سے محبت اور تعلق ہو تو جب وہ شخص غائب ہو جائے تو اس کے آثار و نشانیاں انسان کے دل میں محبت کی آگ بھڑکا دیتی ہیں۔ انبیا علیہم السلام اور ان کی سچی اتباع کرنے والوں کے آثار اور نشانیاں بھی ان لوگوں کے دلوں میں عشق و محبت کی آگ بھڑکا دیتی ہیں جن کے دلوں میں ان حضرات کی محبت ہو اور ان سے تعلق ہو۔ ان آثار و تبرکات سے ان لوگوں کو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں:

ا۔ اس کی وجہ سے ایک تو ان کے اندر نشان والے صالح شخص کی یاد اور اس کی محبت جاگ اٹھتی ہے اور پہلے سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے جیسا کہ فوت شدہ بیٹے کے لباس کو دیکھ کر بیٹے کی یاد تازہ اور محبت و

تعلق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور صالحین کے ساتھ محبت و تعلق حدود کے اندر شریعت میں مطلوب ہے اور یہی محبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب بن جاتی ہے۔

۲۔ اس کی وجہ سے دوسرا فائدہ انہیں یہ ہوتا ہے کہ انہیں آثار و نشانیوں کے ذریعے اس صالح شخص کے فیوض و برکات حاصل ہو جاتے ہیں جیسا کہ پائپ یا نل کے ذریعے ٹنکی سے پانی آتا ہے، لیکن یہ فائدے اس وقت ملتے ہیں کہ جب ان سے عقیدت و محبت بھی ہو، ورنہ اگر عقیدت و محبت نہ ہو تو ایسے لوگ خود اپنے اوپر صالحین کے فیوض کے نلوں کو بند کر دیتے ہیں۔ ایک منافق کو اُس کے مرنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے خود اپنا کرتہ پہنایا، لیکن چونکہ وہ منافق تھا، عقیدت و محبت نہیں تھی تو اس مبارک کرتے نے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچایا۔

خلاصہ یہ کہ برکت و خیر اور نفع دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ خیر و برکت اسی کو نصیب کرتا ہے جس کے اندر خیر و برکت کو قبول کرنے کی استعداد ہو۔ اس ضروری تمہید کے بعد اب قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ سے اس باب کے متعلق کچھ نقل کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ”اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (نعمتوں) کے دروازے کھول دیتے، لیکن انہوں نے (انبیا علیہم السلام اور ان پر اتری ہوئی ہدایات و تعلیمات کو) جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب پکڑ لیا“۔

(سورۃ الاعراف: آیت ۹۶)

ایمان و تقویٰ والی زندگی کا فائدہ اگرچہ اصلاً آخرت میں ملنے والا ہے لیکن جو لوگ اپنے ایمان و تقویٰ کو ثابت کریں تو ان پر دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

۲۔ حضرت نوح علیہ السلام اور جو لوگ اور قومیں ان کے ساتھ تھیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ”کہا گیا: اے نوح!

اُترو ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر اور ان قوموں پر جو تمہارے ساتھ ہیں"۔ (سورۃ الھود: آیت ۴۸)

اس آیتِ کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کو ان قوموں پر مقدم کیا جو ان کے ساتھ تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے نزول کے سب سے زیادہ حق دار حضرت نوح علیہ السلام تھے، دوسروں پر اللہ تعالیٰ کی یہ سلامتی اور برکتیں حضرت نوح علیہ السلام کی اتباع اور راہِ حق میں دوڑ دھوپ کرنے کی وجہ سے نازل ہوتی رہیں۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ "اے ابراہیم کے گھر والو! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں"۔ (سورہ ھود: آیت ۷۳)

۴۔ نیز سورۂ بقرہ میں صابرین اور صبر و استقامت والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ "یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں (مہربانیاں) اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت والے ہیں"۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱۵۷)

ان چند آیات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ برکات، فیوض اور خیر و بھلائی کا سرچشمہ، ان کا لائق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے کہ وہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے، جسے چاہے مبارک بنائے اور جسے چاہے لوگوں کو خیر و برکت پہنچانے کا ذریعہ بنائے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ بعض مقامات کو مبارک و مقدس بناتا ہے

جن مقامات میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہتی ہے جیسا کہ مساجد، وہ تو ہیں مقدس مقامات، ان کے علاوہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کے کسی رسول پر وحی اُتری ہے یا جن مقامات پر انہوں نے نشست و برخاست اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تھا اور نماز پڑھی تھی، وہ بھی مقدس اور مبارک ہو جاتی ہیں۔

مبارک و مقدس مقامات، اوقات اور انسانوں کا ذکر قرآن مجید میں

مقدس و مبارک مقامات اور انسانوں کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے۔

۱۔ چنانچہ بیت اللہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ "بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان والوں کے لیے ہدایت کا مرکز"۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۹۶)

۲۔ بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ اور اس کے ارد گرد کے مقامات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے (یعنی محمد رسول اللہ) کو لے گئی ایک رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جس کے ارد گرد کو ہم نے بابرکت بنایا تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک سمیع و بصیر وہی ہے"۔ (سورۃ الاسراء: آیت ۱)

۳۔ وادی طویٰ کے بارے میں ارشاد ہے: فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰی ۝ اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ۝ "پھر جب وہ اس آگ کے پاس آیا تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! میں ہی تمہارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اُتارو، کیونکہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو"۔

(سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۱۔۱۲)

طویٰ اس وادی (اور میدان) کا نام ہے جو کوہِ طور (کوہِ سینا) کے دامن میں واقع ہے۔

ساری زمین اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے، جس ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص نسبت ہو جائے اس کو خاص شرف حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں اس وادی کو خاص شرف حاصل ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی تجلی اور اپنے کلام سے نوازا۔ اس وجہ سے اس پہاڑ اور اس وادی کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔

۴۔ ایک دوسری جگہ اس مقام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیِٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنۡ یّٰمُوۡسٰۤی اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ "پھر

جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچے تو وادی کے دائیں کنارے سے برکت والے خطے میں ایک درخت سے ان کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، سارے جہانوں کا رب"۔ (سورۃ القصص: آیت ۳۰)

۵۔ جس رات قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا اُس رات کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ "بے شک ہم نے اس (قرآن مجید) کو ایک مبارک رات میں نازل فرمایا"۔

(سورۃ الدخان: آیت ۳)

مبارک رات سے مراد لیلۃ القدر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ "بے شک ہم نے اس (قرآن مجید) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا"۔

(سورۃ القدر: آیت ۱)

اور یہ لیلۃ القدر لازماً رمضان المبارک میں ہے جیسا کہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا"۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱۸۵)

۶۔ انسانوں کا بابرکت اور مبارک ہونا پہلے بھی گزر چکا ہے، یہاں ہم اس سے متعلق صرف ایک آیت مزید پیش کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۙ وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ "(حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں) کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی بنایا، اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے مبارک (خیر و برکت کا ذریعہ) بنایا ہے"۔ (مریم: آیت ۳۰)

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو مبارک کہا مطلب یہ ہے کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا وجود وہاں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ بابرکت انسان و مقامات اور اوقات لوگوں کے لیے خیر و برکت کے اسباب و ذرائع ہیں اور ان راہوں سے خیر و برکت حاصل ہوتی ہیں بشرطیکہ کوئی اللہ تعالیٰ سے خیر و برکت کا طالب بنے اور قرآن مجید اور احادیث میں ان انسانوں کے تبرکات کو اہمیت دی گئی ہے۔

مقامِ ابراہیم علیہ السلام

چنانچہ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى "اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۱۲۵)

مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ (یعنی خانہ کعبہ) کو تعمیر کیا تھا اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو حج کی دعوت دی تھی۔ یہ پتھر آج بھی موجود ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان ہیں۔ (دیکھیے صحیح بخاری: ج ۲، کتاب التفسیر)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے نماز کی اہمیت

۱۔ حضرت ابوبردہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میرے گھر چلیے: فَاسْقِيْكَ فِيْ قَدَحٍ شَرِبَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلّمَ وَتُصَلِّيْ فِيْ مَسْجِدٍ صَلّٰى فِيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَليه وَسَلَّمَ فَانْطَلَقْتُ مَعَهٗ فَسَقَانِيْ سَوِيْقًا وَاَطْعَمَنِيْ تَمْرًا وَصَلَّيْتُ فِيْ مَسْجِدِهٖ "میں آپ کو اس پیالہ میں پلاؤں گا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا ہے اور آپ ایسی مسجد (یعنی جائے نماز) میں نماز پڑھیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے تو میں ان کے ساتھ گیا، تو انہوں نے مجھے ستو پلایا اور کھجوریں کھلائیں، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد (یعنی جائے نماز) میں نماز پڑھی"۔ (بخاری: کتاب الاعتصام)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ ان کے گھر تشریف لائیں فَيُصَلِّيْ فَنَتَّخِذُهٗ مُصَلًّى (اور میرے گھر میں کسی جگہ) نماز پڑھیے تاکہ ہم اس جگہ کو جائے نماز بنائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُم سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ (دیکھیے سنن نسائی، جامع الاصول، ج ۶، ص ۳۰۹)

۳۔ حضرت محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"حضرت عتبان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی نظر کی کمزوری کی شکایت کی اور عرض کی: میں

اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں، لیکن جب بارش ہو جاتی ہے اور ندی نالے بہہ جاتے ہیں تو میں ان کی مسجد میں نہیں جاسکتا کہ ان کو نماز پڑھاؤں"۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ وَوَدِدْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَّکَ تَاْتِیْنِیْ فَتُصَلِّیْ فِیْ بَیْتِیْ فَاَتَّخِذَہٗ مُصَلًّی یعنی "یارسول اللہ ﷺ! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ میرے گھر تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز پڑھیں تاکہ میں اس جگہ کو اپنی جائے نماز بنالوں"۔ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ میں عنقریب یہ کام کروں گا۔

حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کل (یعنی دوسرے دن) اشراق کے وقت نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمارے گھر تشریف لائے اور بیٹھنے سے پہلے فرمایا کہ اَیْنَ تُحِبُّ اَنْ اُصَلِّیَ مِنْ بَیْتِكَ (تم اپنے گھر میں سے کس جگہ کو پسند کرتے ہو کہ میں اس میں نماز پڑھوں)۔ حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے گھر کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا تو آپ ﷺ وہاں کھڑے ہو گئے اور 'اللہ اکبر' کہہ کر نماز شروع کی اور ہم نے بھی آپ ﷺ کے پیچھے صف باندھ کر نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا"۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے بخاری: باب المساجد فی البیوت و صحیح مسلم: باب ترک الجماعۃ بعذر)

۴۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تو ہر اس جگہ نماز پڑھا کرتے کہ جس جگہ نبی کریم ﷺ نے ایک بار بھی نماز پڑھی ہو۔

(دیکھیے صحیح بخاری: باب المساجد التی علی طرق المدینہ والمواقع التی صلی فیھا النبی ﷺ، صحیح مسلم)

قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ اور یہ احادیثِ مبارکہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ جن مقامات پر نیکوکار لوگ نشست و برخاست کریں اور جہاں وہ نیک کام کریں وہ مقامات مبارک ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان جگہوں کو محفوظ بھی کرتے تھے اور ان کے دلوں میں ان مقامات کی قدر اور محبت بھی ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور نبی کریم ﷺ کا ادب واحترام اور محبت تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مبارک درخت کو کیوں کاٹا جس کے نیچے بیعتِ رضوان جیسا مبارک عمل وجود میں آیا تھا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس درخت کے نیچے بیعتِ رضوان جیسا مبارک عمل ہوا تھا، جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر موجود ہے، آخر اس مبارک درخت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیوں کاٹا؟ اس روایت سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لیا ہے کہ العیاذ باللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس درخت کی کوئی قدر و اہمیت نہیں تھی، اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا، لیکن بندہ کے نزدیک یہ بات قطعاً غلط اور بے سوچی سمجھی ہے، کیونکہ جب قرآن مجید اور صحیح احادیث سے سلف صالحین کے آثار اور نشانیوں کی اہمیت ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور ان شاء اللہ بعد میں بھی آئے گا تو پھر آثار سلف صالحین کے متعلق ایسی بات کہنا قرآن و حدیث سے بے خبری کی علامت ہے۔ اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایت منقول ہے اس کا جواب پڑھ لیجیے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درخت کاٹنے کے واقعے کو ابنِ سعد رحمہ اللہ نے حضرت نافع رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ لوگ اس درخت کے پاس جا جا کر نمازیں پڑھنے لگے تھے تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو انہوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور پھر اس کے کاٹنے کا حکم فرمایا۔

(دیکھیے طبقاتِ ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۰)

صرف اسی ایک روایت سے یہ سمجھنا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور آثارِ مقدسہ کی کوئی اہمیت نہ تھی، کئی وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جس کا وجود صحاح ستہ میں بھی مذکور نہیں ہے، جبکہ اس کے برعکس آثار سلف صالحین کی اہمیت قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور صحیح احادیث سے بھی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ان کی اہمیت اور ان کی قدردانی بہت سی صحیح حدیثوں سے ثابت ہے تو اس سے یہ استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک اثارِ صالحین کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس درخت

کی تعظیم واحترام میں بہت سے نئے مسلمان جہالت کی بنیاد پر حدودِ شرعیہ سے تجاوز کر گئے تھے اور اس کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنے لگے تھے اور اس کے پاس جمع ہو کر نماز وغیرہ میں اس قدر مشغول ہو گئے تھے کہ گویا بس یہی جائے نماز اور عبادت ہے۔ اس لیے درخت کے کاٹنے کا حکم دیا گیا، جیسا کہ اس کی طرف حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اشارہ کیا، لہٰذا یہاں اس کا کاٹنا اس لیے نہ تھا کہ العیاذ باللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں مقاماتِ مقدسہ یا آثارِ سلف صالحین کی اہمیت نہ تھی۔

۳۔ بہت زیادہ صحیح روایتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو وہ درخت کاٹا ہی نہیں گیا، یا اگر کاٹا گیا تو وہ یہ درخت قطعاً نہیں تھا جس کے نیچے بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔ اس سے متعلق چند روایات کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

حضرت نافع رحمہ اللہ جن سے درخت کاٹنے کی روایت کو نقل کیا گیا ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ بیعتِ رضوان کے کئی سال بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس درخت کو تلاش کیا، مگر اسے نہ پہچان سکے اور بات میں اختلاف ہو گیا کہ وہ درخت کون سا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۵)

حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے والد بیعتِ رضوان میں شریک تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضاء کے لیے گئے تو ہم اس درخت کو بھول چکے تھے، تلاش کرنے پر بھی ہم اسے نہ پا سکے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ایک طرف تو وہ درخت خود ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی گم ہو گیا تھا جو اس مبارک بیعت میں شریک تھے جس کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا، دوسری طرف بہت سے جاہل عوام نے از خود اپنی طرف سے ایک درخت کو متعین کیا تھا اور اس کے پاس جا جا کر اس کے تحت بھیڑ لگائی ہوئی تھی اور اس کے نیچے نمازیں پڑھنے لگے تھے جس سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ آگے چل کر لوگ کہیں اس کی پرستش شروع نہ کر دیں اور اس درخت کو قبلہ بنا کر اس کو سجدے کر کے شرک و گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، جیسا کہ پہلی قوموں کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ درختوں وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔

اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس درخت کو کاٹنے کا واقعہ صحیح ہے تو اس کی یہی توجیہ کی جا سکتی ہے، ورنہ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وہ درخت معلوم تھا اور اسی درخت کے متعلق انہوں نے

کاٹنے کا حکم دیا تھا تو پھر اس سے تو بیعتِ رضوان کی جگہ خوب متعین ہو گئی ہو گی کہ یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں بیعتِ رضوان ہو چکی ہے، کیونکہ درخت کے کاٹنے سے جگہ اور مقام تو تبدیل نہیں ہو سکتے، مقام اور جگہ تو وہیں کی وہیں رہ جاتی ہیں، اور بیعتِ رضوان میں تو اس **تحت الشجرة** یعنی "درخت کے نیچے جگہ" کی اہمیت زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں درخت کی اہمیت کم ہے، لیکن وہ لوگ درختوں کو سجدے کرنے چلے آئے تھے اس لیے درخت کو اگر اس وجہ سے کاٹا ہو گا تو یہ بعید نہیں کیونکہ مسلمان شرک کے معاملہ میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔

حضرت طارق بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں حج کو گیا اور ایسے لوگوں پر میرا گزر ہوا جو ایک جگہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سی مسجد ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے کہ جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ رضوان لی تھی۔

حضرت طارق بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے پاس آیا اور ان کو اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تو حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے والد بیعتِ رضوان میں شریک تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضاء کے لیے گئے تو ہم اس درخت کو بھول گئے، تلاش کرنے کے باوجود بھی ہم اسے نہ پا سکے۔ اس کے بعد حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: **إِنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَعْلَمُوْهَا وَعَلِمْتُمُوْهَا أَنْتُمْ فَأَنْتُمْ أَعْلَمُ** "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم تو اس درخت کو نہ جانتے تھے اور تم جانتے ہو اور تم ان سے اس (درخت) کو زیادہ جاننے والے ہو گئے"۔ **(صحیح بخاری و مسلم)**

اس صحیح حدیث سے ایک تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس درخت کی اہمیت اور وقعت تھی، اس لیے جب وہ دوسرے سال معاہدہ کے مطابق عمرہ کے لیے آئے تو انہوں نے اس درخت کو تلاش کیا، لیکن وہ ان کو ملا نہیں، ورنہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گزشتہ سال کے قضاء عمرہ کے لیے آ رہے ہیں اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ موجود ہیں، سفر بھی پیادہ اور دور کا ہے، اور جس مقام یعنی حدیبیہ میں یہ درخت تھا وہ مقام بھی ہنوز مشرکینِ مکہ کے قبضے میں تھا، پھر بھی وہ اس درخت کو تلاش کر رہے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس درخت کی اہمیت اور وقعت ان کے دلوں میں تھی۔

دوسری بات یہ ثابت ہوگئی کہ وہ درخت یا تو خشک ہو کر ختم ہو گیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ نہیں ملا یا درخت اس قدر زیادہ تھے کہ وہ درختوں کے جھنڈ میں اسے پہچان نہ سکے۔ نیز حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تابعی ہیں اور یہ بات وہ اپنے شاگرد سے کرتے ہیں۔ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کے کاٹنے کا حکم فرمایا ہوتا تو کیا وہ اس کو نہ کہتے کہ وہ درخت تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کاٹ دیا گیا ہے، اب وہ درخت پھر کہاں سے وجود میں آگیا۔

نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ اپنے عہدِ خلافت میں حدیبیہ کے مقام سے گزرے تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ درخت کہاں ہے جس کے نیچے بیعت ہوئی تھی؟ کسی نے کہا کہ فلاں درخت ہے اور کسی نے کہا کہ فلاں۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چھوڑ دو، اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔ (تفسیر ابن جریر)

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیعتِ رضوان والا درخت تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ یا تو خشک ہو کر ختم ہو گیا تھا اور یا درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

سلف صالحین کی چھوڑی ہوئی چیزیں اور قرآن مجید

بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی چیزیں مثلاً کپڑے، جوتے، عصا وغیرہ اور تورات کی کچھ تختیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور اپنی فتح ونصرت کا سامان سمجھتے تھے۔ وہ اس صندوق کو اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑائی کے موقع پر اپنے آگے رکھتے تھے۔ اس صندوق کو ان کے دشمنوں نے ایک لڑائی کے موقع پر ان سے چھین لیا تھا۔ جب وہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو بنی اسرائیل کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے برے دن آگئے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے اس وقت کے پیغمبر حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ کوئی امیر یا سپہ سالار ہمارے لیے مقرر کر دیجیے تا کہ اس کی ماتحتی میں ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں۔ بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب حضرت شموئیل علیہ السلام نے ان کے لیے سپہ سالار 'طالوت' نامی شخص کا انتخاب کیا تو بنی اسرائیل نے ان سے طالوت اور اس کی حکومت پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نشانی اور دلیل مانگی تو

اللہ تعالیٰ کی وحی اور حکم سے ان کے لیے اسی صندوق کی آمد کو طالوت کی حکومت کی نشانی ٹھہرادیا گیا، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۞

"اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے اطمینان و تسکین (کا سامان) ہے اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے، اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھنے والے ہو"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۴۸)

یہ صندوق ان کے پاس کیسے پہنچا؟ اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دشمن فلستی اس صندوق کو جس بستی میں رکھتے وہاں وبائیں پھوٹ پڑتیں، اس طرح ان کی کئی بستیاں وباؤں کی لپیٹ میں آگئیں۔ اس سے انہوں نے برا شگون لیا اور جب اللہ تعالیٰ کو اس صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو انہوں نے اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر اپنی آبادی سے نکال دیا اور گاڑی کو بغیر کسی گاڑی بان کے بنی اسرائیل کی آبادی کی طرف ہانک دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے اس گاڑی کو سیدھا بنی اسرائیل کی طرف لے آئے اور بیل گاڑی طالوت کے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔

اس آیتِ صندوق سے تبرکات کے متعلق چند باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ پہلی بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ سلف صالحین کے آثار اور یادگاریں اگر صحیح عقیدے اور عقیدت کے ساتھ ہوں تو ان لوگوں کے لیے خیر و برکت کا سامان ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ ان تبرکات میں اطمینان و تسکین کا سامان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، از خود ان چیزوں میں کوئی نفع و نقصان نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی "اس (صندوق) میں تمہارے لیے اطمینان و تسکین کا سامان ہے، تمہارے رب کی طرف سے۔"

۳۔ تیسری بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے تبرکات سے فائدہ صرف ان لوگوں کو پہنچاتا ہے جو صحیح عقیدہ وعقیدت کے ساتھ پیروکار ہوں۔ دیکھیے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اس میں تمام لوگوں کے لیے تسکین کا سامان ہے بلکہ فرمایا کہ تمہارے لیے تسکین کا سامان ہے اور بنی اسرائیل ہی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام وغیرہ کے پیروکار بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی عقیدت بھی تھی۔

۴۔ چوتھی بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ یہی صندوق جب مخالف دشمن کے ہاتھ میں تھا تو ان کے لیے اس میں کوئی خیر وبرکت نہیں نکلی بلکہ الٹا ان پر وبائیں پڑ گئیں۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ نفع ونقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ تبرکات سے خیر و بھلائی صرف ان لوگوں کو نصیب فرماتا ہے جن کا عقیدہ بھی صحیح ہو اور سچی عقیدت ومحبت بھی ہو۔

۵۔ پانچویں بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ انبیا علیہم السلام اور سلف صالحین کی یادگاریں دیکھ کر ان کی خداداد صفات وکمالات اور دینی خدمات سامنے آتی ہیں، ان سے تعلق اور محبت مضبوط تر ہو جاتا ہے، ان کی سچی اتباع نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ کنجی ہے جس سے خیر وبھلائی کے دروازے کھلتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نیزے اور انگوٹھی کی قدر وقیمت

۱۔ سیدنا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک نیزہ لیا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے وہ پھر لے لیا، پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ مانگ لیا، پھر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دنیا سے رحلت فرما گئے تو وہ نیزہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پھر واپس لے لیا، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے وہ نیزہ مانگ لیا۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پھر وہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے وہ مانگ لیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو اس کے بعد وہ نیزہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آل کے پاس آ گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پھر واپس مانگ کر لے لیا اور یہ نیزہ ان کی شہادت تک ان کے ساتھ رہا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری: کتاب الغازی، باب اشہود الملئکہ بدرًا)

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی جس پر لفظ محمد رسول اللہ نقش تھا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

دستِ مبارک میں رہتی تھی اور ان کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہتی تھی اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اور ان کے پاس چھ سال رہی، بالآخر وہ ان کے ہاتھ سے بئر اریس میں گر گئی۔ انہوں نے اس انگوٹھی کو بہت تلاش کیا، مگر وہ نہ ملی۔ (بخاری، نسائی، ابنِ سعد وغیرہ دیکھئے، فتح الباری: ج ۱۰، ص ۳۱۳)

ان چیزوں کی قدر و قیمت جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹ مبارک لگے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیالہ سے پیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پیالہ کو محفوظ کر لیا اور جس مشکیزے میں سے پانی پیا، اس مشکیزے کے منہ کو کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ یہاں اس سلسلہ کی چند روایات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پیالے کو محفوظ کر رکھا تھا اور جب ان کے پاس کوئی معزز مہمان آتا تو وہ اس کو اس مبارک پیالے میں پانی پلاتے تھے۔ (بخاری: کتاب الاعتصام)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، گھر میں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھڑے مشکیزے کے منہ سے پانی پی لیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہم نے مشکیزے کا منہ کاٹ لیا اور وہ (مشکیزے کے منہ کا ٹکڑا اب بھی) ہمارے پاس موجود ہے۔ (دیکھیے الفتح الربانی لترتیب المسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی: ج ۲، ص ۷۰)

۳۔ حضرت بحریہ رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ میرے چچا خداش رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پیالہ میں کھاتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ پیالہ بطورِ ہدیہ مانگ لیا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ پیالہ دے دیا) چنانچہ وہ پیالہ ہمارے ہاں رکھا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ پیالہ میرے پاس لاؤ۔ جس وقت وہ ہمارے ہاں آتے تو ہم زمزم کے پانی سے وہ پیالہ بھر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لاتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں سے کچھ پیتے اور کچھ (برکت کے لیے) اپنے سر اور چہرے پر ڈال لیتے۔ پھر ایک چور نے ہم پر بڑا ظلم کیا کہ وہ ہمارے سامان کے ساتھ اسے بھی چوری کر کے لے گیا۔ پیالے کی چوری کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے اور حسبِ دستور پیالے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! وہ پیالہ تو ہمارے سامان کے ساتھ چوری ہو گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا

کہ وہ چور تو بڑا سمجھ دار ہے جو حضور ﷺ کا پیالہ چرا کر لے گیا ہے۔

(ابن سعد وغیرہ دیکھئے، حیاۃ الصحابہ: ج ۲، ص ۶۸۴)

۴۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا (صحابیہ) کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے لٹکے ہوئے مشکیزہ کے منہ سے پانی پی لیا، اور میں مشکیزہ کے منہ کی طرف اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کو کاٹ لیا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ)

نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس نبی کریم ﷺ کا پہنا ہوا ایک جبہ (یعنی چغہ) مبارک تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ جبہ ان کی بہن حضرت اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہما نے لے لیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضٰى وَنَسْتَشْفِىْ بِهَا یعنی ہم مریضوں کے لیے اس کو دھوتے ہیں اور (اس کا پانی مریضوں کو پلاکر) اس کے ذریعے شفا طلب کرتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح مسلم: کتاب اللباس)

نبی کریم ﷺ کا پسینہ مبارک

صحیحین کی روایت میں ہے کہ حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پسینہ مبارک کو جمع فرماتیں اور پھر اس کو خوشبو میں ملایا کرتیں، اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اس کو کیا کرتی ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا: نَرْجُوْا بَرَكَتَهٗ لِصِبْيَانِنَا یعنی "ہم اسے اپنے بچوں کے لیے باعثِ برکت و تبرک سمجھتے ہیں"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اَصَبْتِ یعنی "تم نے ٹھیک کیا"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نبی کریم ﷺ کے خون مبارک کو زمین پر گرنے نہ دینا

۱۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام کیسان رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ (جو کچھ اس میں ہے) اسے پی رہے ہیں۔ اتنے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ وہ کام کر آئے؟ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا کام تھا؟ تو آپ ﷺ نے

فرمایا کہ میں نے اس کو اپنے پچھنے کے خون کا غسالہ دیا تھا تاکہ جو کچھ اس میں ہے یہ اسے بہادیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اسے تو یہ پی گئے ہیں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم اسے پی گئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے (یعنی تم شہید کیے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوگی) تمہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی، صرف اللہ تعالیٰ کی قسم پوری کرنے کے لیے پلِ صراط سے گزرنا پڑے گا۔

(اخرجہ ابو یعلی والبیہقی والحاکم، والطبرانی والبزار وابن عساکر، تفصیل کے لیے دیکھیے حیاۃ الصحابہ: ج۳، ص۴۲۰ تا ۴۲۱)

۲۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور مجھے فرمایا کہ اس خون کو درندوں، پرندوں، جانوروں اور انسانوں سے بچاکر کسی جگہ دفن کر آؤ تو میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے لے گیا اور چھپ کر اسے پی گیا۔ پھر واپس آکر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا (کہ میں تو اسے پی گیا ہوں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ (رواہ الطبرانی ورجالہ ثقات کذافی مجمع الزوائد: ج۸، ص۲۷۰)

۳۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب جنگِ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا تو میرے والد حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کو چوس کر نگل لیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ کیا تم خون پی رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک پی رہا ہوں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے خون کے ساتھ میرا خون مل گیا ہے لہٰذا انہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ (اخرجہ الطبرانی کذافی مجمع الزوائد: ج۸، ص۲۷۰)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون مبارک کو بھی زمین پر گرنے نہیں دیا اور اسے پی لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عمل کو سراہا۔ خون مبارک تو بہت بڑی چیز ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر عشق و محبت اور عقیدت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشاب بھی جس کو پیشاب کے برتن میں ملا اس نے اس کو بھی پی لیا۔

(دیکھیے مجمع الزوائد: ج۸، ص۲۷۰ تا ۲۷۱)

نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک اور منہ مبارک سے لگے ہوئے پانی کی قدر و قیمت

نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک اور منہ مبارک سے جو چیز بھی لگ گئی وہ بڑی بابرکت ہے۔مبارک وجود کے ساتھ لگی ہوئی چیز مبارک ہی ہوا کرتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے بدن اور منہ مبارک سے لگے ہوئے پانی کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔اس کے متعلق بھی اختصار کے ساتھ چند روایات پڑھ لیجیے:

۱۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ وضو فرماتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے وضو سے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ (دیکھیے صحیح بخاری کتاب الوضوء)

اور ایک صحیح روایت میں ہے کہ وضو سے بچے ہوئے اور وضو میں مستعمل ہو کر بدن سے جدا ہونے والے پانی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے بدنوں پر مل لیتے تھے۔اگر کسی کے ہاتھ پانی نہ لگتا تو وہ دوسرے کے ہاتھوں میں لگی ہوئی تری کو اپنے ہاتھ سے مل لیتا اور پھر اسے اپنے بدن پر مل لیتا۔

(متفق علیہ، دیکھیے مشکوۃ: باب السترۃ)

۲۔ امام نسائی رحمہ اللہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ہم وفد بن کر حاضر ہوئے تو ہم نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ ﷺ کو خبر دی کہ ہمارے علاقے میں نصاریٰ کی ایک عبادت گاہ (یعنی گرجا) ہے (اس کو ہم کیا کریں؟) ہم نے آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے وضو سے بچا ہوا پانی مانگا تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور وضو فرمایا اور منہ میں پانی ڈال کر کلی کی، پھر اس کو ہمارے لیے چھاگل میں ڈال دیا اور ہمیں فرمایا کہ جس وقت اپنے علاقے میں پہنچ جاؤ تو اپنے گرجے کو توڑ دو اور اس کی جگہ پر یہ پانی چھڑک کو اور اس کو مسجد بنا دو۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارا شہر دور ہے اور گرمی بھی سخت ہے، یہ پانی تو وہاں تک جا کر ختم ہو جائے گا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مُدُّوْهُ مِنَ الْمَآءِ فَاِنَّهٗ لَا یَزِیْدُهٗ اِلَّا طِیْبًا یعنی "اس میں اور پانی ڈال دو، اس سے اس کی پاکیزگی اور طہارت میں ہی اضافہ ہوگا"۔ (نسائی، مشکوۃ: باب المساجد)

۳۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا، پہلے آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اور منہ اس میں دھوئے اور اس میں کلی کی، پھر حضرت ابو

موسیٰ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اس میں سے کچھ پی لو اور کچھ اپنے چہروں پر مل لو۔

(دیکھیے صحیح بخاری: کتاب الوضو)

۴۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ لیتے تو مدینہ والوں کے خادم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی کا برتن لاتے (تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک سے یہ پانی لگ جائے)۔ جو برتن وہ لاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں اپنا ہاتھ مبارک ڈالتے۔ (صحیح مسلم: ج ۲، ص ۲۵۶)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تھوک کو بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو وغیرہ سے بچے ہوئے پانی کا بیان تو آپ کے سامنے آیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت اور عقیدت تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تھوک کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ (دیکھیے صحیح بخاری: کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کی ایک جامع روایت

صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے قریش کے سفیر کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل گفتگو کرتے رہے اور اپنی نظریں بچا بچا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت معلوم کرتے رہے، واپس جا کر کفارِ قریش کے سامنے انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت و محبت ان الفاظ میں بیان کی۔

"اے قریش! میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں گیا ہوں، قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور وہ تھوکتے ہیں تو اس تھوک کو لپک کر لے لیتے ہیں اور جس کے ہاتھ پر پڑ جائے تو اس کو وہ اپنے بدن اور چہرے پر مل لیتا ہے، اور جب وہ ان کو کسی بات کا حکم فرماتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت دبی آواز سے بولتے ہیں، ادب کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گر جائے تو اس کو اٹھا لیتے ہیں۔ غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا

جنتی محمد ﷺ کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔ تو جس قوم کو اپنے سر دار کے ساتھ اس قدر محبت ہو تو اس پر غالب آنا ناممکن ہے۔ (ماخوذ از صحیح بخاری: کتاب الشروط، سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۲۸)

نبی کریم ﷺ کے موئے (بال) اور ناخن مبارک کا بطورِ تبرک رکھنا

سابقہ روایات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک سے لگی ہوئی چیزوں کو خیر و برکت کا ذریعہ سمجھتے تھے، لیکن پھر بھی ذیل میں نبی کریم ﷺ کے موئے (یعنی بال) مبارک اور ناخن مبارک کے بارے میں چند روایات مزید نقل کرتا ہوں تاکہ تبرکات کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں کوئی کھٹکا نہ رہے۔

۱۔ حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی کا ایک پیالہ دے کر بھیجا تو وہ چاندی کی ایک ڈبیہ جیسا برتن لے کر تشریف لائیں جس میں نبی کریم ﷺ کے مبارک بالوں میں سے کچھ بال تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: وَكَانَ إِذَا أَصَابَ الْإِنسَانَ عَيْنٌ أَوْشَيْئٌ بَعَثَ إِلَيْهَا مِخْضَبَةً فَاطَّلَعْتُ فِي الْجُلْجُلِ فَرَأَيْتُ شَعَرَاتٍ حُمْرًا "اور جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا کوئی اور تکلیف ہوتی تو وہ ان (حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا) کے پس لگن بھیجتا (اور وہ نبی کریم ﷺ کے بالوں والی ڈبیہ کو اس پانی میں ہلا دیتیں پھر وہ اسے پی لیتا) وہ (یعنی حضرت عثمان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس ڈبیہ میں جھانکا تو اس میں چند لال رنگ کے بال دیکھے"۔ (دیکھیے صحیح بخاری: کتاب اللباس، باب مایذکر فی الشیب)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَلَّاقُ يَحْلِقُهُ وَأَطَافَ بِهِ أَصْحَابُهُ فَمَا يُرِيْدُوْنَ أَنْ تَقَعَ شَعْرَةٌ إِلَّا فِيْ يَدِ رَجُلٍ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے حال میں دیکھا کہ حجام آپ ﷺ کی حجامت کر رہا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (پروانوں کی طرح) آپ ﷺ کے ارد گرد چکر لگاتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کے ہاتھ نبی کریم ﷺ کا کوئی بال مبارک آجائے۔ (دیکھیے صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب قربہ او تبرکھم ج ۲، ص ۲۵۶)

۳۔ حضرت جعفر بن حکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے جنگِ یرموک کے موقع پر اپنی ٹوپی گم ہوگئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا کہ اس کو تلاش کرو، تلاش کرنے کے باوجود نہ ملی۔

آپ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ حکم فرمایا کہ اس کو تلاش کرو۔ بالآخر وہ ٹوپی مل گئی تو دیکھا کہ وہ پرانی سی ٹوپی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ ادا کیا اور اپنا سر مبارک منڈوایا تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی طرف لپکے۔ میں لوگوں سے آگے بڑھ گیا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کے بال مبارک لے لیے اور ان کو اس کلاہ اور ٹوپی میں رکھ لیا ہے، جب میں کسی لڑائی میں حاضر ہوتا ہوں اور یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ فتح دیتا ہے۔

(ابو یعلی، الطبرانی، حاکم وغیرہ دیکھیے حیاۃ الصحابہ: ج۳، ص۷۷۵)

غور کیجیے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو موئے مبارک سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ ان کو کلاہ اور ٹوپی میں محفوظ رکھا ہوا تھا اور سر کے اوپر رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ عقیدہ بھی کس قدر صاف ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ جب یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے فتح دیتا ہے۔

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بال مبارک عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں پر تقسیم کیے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد الشیبانی: ج۲۲، ص۷۰)

۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن مبارک کٹوائے اور عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے ساتھی کو دیے۔

(الفتح الربانی: ج۲۲، ص۷۰)

۶۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ رحمہ اللہ سے کہا کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال مبارک ہیں، ہم نے انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یا (یہ کہا کہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں سے حاصل کیا ہے تو حضرت عبیدہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال بھی مجھے مل جائے تو ساری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے وہ مجھے اس سے زیادہ پیارا ہو گا۔

(صحیح بخاری: کتاب الوضو، جلد اول، ص۹۶)

۷۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں آنے کے بعد جمرہ عقبہ کے پاس تشریف لائے اور وہاں کنکریاں ماریں، پھر منیٰ میں اپنی قیام گاہ میں تشریف لائے اور اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کیا۔ اس کے بعد حجام کو بلایا اور اپنے سر کا دایاں حصہ اس کے سامنے کیا (کہ پہلے یہاں سے شروع کرو) چنانچہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس (دائیں) حصے کو مونڈ دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہ

انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کو وہ بال مبارک دے دیے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کا بایاں حصہ حجام کی طرف کر کے فرمایا کہ اب اسے مونڈو، چنانچہ اس نے اسے بھی مونڈ دیا۔ یہ بال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو دیے اور فرمایا اقسمه بين الناس یعنی "یہ بال لوگوں میں تقسیم کرو"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم دیکھیے مشکوٰۃ: کتاب الحج، باب الحلق)

تبرکات کے بارے میں اور بھی بہت سی روایات و واقعات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن مسئلہ کے ثبوت کے لیے یہی روایات کافی وشافی ہیں۔

سلف صالحین کی یادگاروں اور تبرکات کے بارے میں نصوص کا خلاصہ

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیات اور احادیث کی رو سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ سلف صالحین کی یادگاروں اور ان کے تبرکات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کو فدائین کے لیے طمانیت و تسکین اور برکت کا سامان بتلایا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان جگہوں میں نماز پڑھتے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہو اور ان پیالوں میں پانی پیتے اور پلاتے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ اور موئے مبارک کا پانی مریضوں کو پلاتے تھے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وضو کا پانی لوگوں کو دیتے تھے تاکہ وہ اس کو پئیں اور اپنے بدنوں پر مل لیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے ہوئے پانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک کو حاصل کرنے میں اس قدر حریص تھے کہ وہ ان پر ٹوٹ پڑتے تھے بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ان پر لڑ پڑتے تھے اور خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک بال اور ناخن مبارک کو محفوظ کر لیا اور وہ بال مبارک وغیرہ ان کے نزدیک آسمان و زمین کے برابر سونے و چاندی سے زیادہ محبوب تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے فدائین پر اپنے بال اور ناخن مبارک تقسیم فرماتے تھے۔ تو قرآن مجید کی آیتوں اور اس قدر زیادہ صحیح حدیثوں کے باوجود بھی اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ سلف صالحین کی یادگاروں اور ان کے تبرکات کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو ایسا شخص قرآن وحدیث سے بے خبر ہے اس لیے صرف ایک بے سوچی سمجھی اور سنی سنائی بات کہہ رہا ہے یا پھر وہ یہودیوں کی اس تحریک سے متاثر یا اس کا ایک حصہ ہے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلاف کی محبت کو نکالنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور مسلمانوں کے

اندر خود ایسے لوگ بلکہ متعدد جماعتیں ایسی پیدا کی ہیں جو اسلام کے نام پر لوگوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کی محبت و عقیدت کو ختم کر رہی ہیں۔

یہودیوں اور دشمنانِ اسلام کے حربے

یہودی اور دشمنانِ اسلام مسلمانوں کے خلاف سخت سازشیں کرتے رہتے ہیں، اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ادارے اور تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اسلام اور مسلمانوں کو پوری طرح ختم کرنا چاہتے ہیں، ان تنظیموں اور اداروں میں سے بعض تنظیمیں اس کام کے لیے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ کی محبت کو نکالیں اور جن اسباب سے نبی کریم ﷺ کی محبت سینوں میں بھڑک سکتی ہے ان اسباب ہی کو ختم کیا جائے، یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جس قوم کے دل میں اپنے پیغمبر کی والہانہ محبت و عقیدت نہ ہو وہ کبھی بھی اپنی مذہبی حیثیت سے دوسری قوموں پر غالب نہیں آسکتی۔ اس حقیقت سے دشمنانِ اسلام خوب واقف ہیں اس لیے وہ مختلف طریقوں سے اس محبت کو جڑوں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی طرح نبی کریم ﷺ کی یادگاروں، تبرکات اور مبارک مقامات کو سرے سے ختم کیا جائے۔ اس کام کے لیے وہ مسلمان قوم اور مسلمانوں میں سے ہی اپنے کام کے لوگ چن لیتے ہیں اور ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تربیت کر کے مسلمانوں کے اندر چھوڑ دیتے ہیں اور توحید وغیرہ کے خوشنما الفاظ کے نام پر مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ کی محبت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین کی محبت نکالتے ہیں، ان پر سے اعتماد ختم کر دیتے ہیں اور ان کے ذریعے مسلمانوں کے اندر اختلافات اور دنگا وفساد برپا کر دیتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے بندہ کی کتاب "مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور ان میں راہِ محبت" کو پڑھ لیجیے)

تبرکات اور محبت و عقیدت کے نام پر شرک سے بچیے

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اسلام توحید کا علمبردار ہے۔ شرک اور شرکیہ اعمال بلکہ شرکیہ الفاظ اور جہاں شرک کا شائبہ بھی ہو اسلام اس کو برداشت نہیں کرتا جیسا کہ اس کی تفصیل "شرک کا بیان" میں گزر چکی ہے۔ لہٰذا جس طرح مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام مخالف اسباب اور محرکات سے بچیں اور محتاط رہیں جو محبت اور عقیدت میں کمزوری کا باعث بنتے ہیں، اسی

طرح وہ اس بات کے بارے میں بھی چوکنے اور ہوشیار رہیں کہ کسی طرح بھی عقیدۂ توحید کو داغدار نہ ہونے دیں اور عقیدت و محبت کے پردے میں شرک یا شرکیہ افعال کے بدبودار گھڑے کے قریب بھی نہ جائیں۔

یادگاروں کے دیکھنے اور تبرکات سے فائدہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟

مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نفع و نقصان، عزت و ذلت، خیر و شر، ہر خوبی اور ہر کمال کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ہر قسم کی خیر و بھلائی اور نفع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خیر و بھلائی وغیرہ کے اسباب پیدا فرماتا ہے اور ان اسباب کے پردوں میں لوگوں کو نفع و خیر پہنچاتا ہے۔ لہٰذا ان تبرکات اور مبارک مقامات میں بذاتِ خود کوئی نفع و نقصان، خیر و بھلائی نہیں بلکہ ان مقامات یا اوقات میں بہت سے خیر کے کام ہوئے ہیں اور ان میں بہت ساری نیکیاں وجود میں آئی ہیں، ان بھلائیوں اور عبادتوں کی وجہ سے ان مقامات پر اور ان پرہیز گاروں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ جو شخص ان پرہیز گاروں سے محبت اور عقیدت رکھتا ہے ان یادگاروں اور ان تبرکات کو دیکھ کر اس کے دل میں دبی ہوئی عقیدت و محبت کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کے ساتھ محبت اور عقیدت ہی ایک ایسی چابی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے پہاڑ کی بلندی پر چشمہ ہو۔ اس کے پانی کو بڑی ٹینکی میں گھیر لیا گیا ہو اور اس ٹینکی سے پائپ گھروں میں آئے ہوں، تو جو شخص جس قدر بڑا پائپ لگائے گا اور جس قدر ٹونٹی کھولے گا اسی قدر اس کے نل وغیرہ چل پڑیں گے، لیکن اگر وہ پائپ کا رابطہ (کنکشن) ٹینکی سے کاٹ دے یا اس کو ٹینکی کے ساتھ جوڑے ہی نہیں، بلکہ یوں ہی پائپ ہی سے پانی کا طلب گار رہے تو بڑے سے بڑا نل بھی بے کار اور باعثِ خسارہ ثابت ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے نفع و خیر اور بھلائی کا امیدوار نہ ہو، صرف تبرکات ہی کو اصل سمجھے تو اس نے اپنا رابطہ اور کنکشن اللہ تعالیٰ سے کاٹ دیا، اس کو خیر و فائدہ تو کیا ملے گا بلکہ شرک کی گندگی میں پڑ کر دنیا و آخرت کو خراب کرے گا۔

تبرکات کے بارے میں چند ہدایات

تبرکات اور یادگاروں کے متعلق بھی چند ہدایات لکھ دیتا ہوں تاکہ تبرکات کو محبت اور حصولِ برکت کے بجائے شرک وبدعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے

(۱) تبرکات میں ازخود کوئی نفع نہیں

تبرکات میں ازخود کوئی نفع ونقصان نہیں ہوتا، بلکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر وبرکت اور اطمینان وتسکین نازل ہوتی ہے۔ غور کیجیے! قرآن مجید کی جس آیت میں تبرکات والے صندوق کا بیان آیا ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرمایا کہ اس میں تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف سے تسکین کا سامان ہے، وہی تبرکات والا صندوق موجود تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو فتح ونصرت دیتا تھا، لیکن پھر جب بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایت سے پھر گئے تو اس مبارک صندوق کی موجودگی کے باوجود بدترین شکست کھا گئے اور وہ تبرکات والا صندوق بھی دشمن لے گیا اور اس صندوق نے ان کو ذرہ برابر بھی نفع نہ دیا اور جب یہی تبرکات والا صندوق دشمن لے گیا تو چونکہ یہ دشمن بھی اللہ تعالیٰ سے پھرے ہوئے مشرک لوگ تھے اور اُن کو ان پیغمبروں سے کوئی عقیدت ومحبت نہ تھی جن کے یہ تبرکات تھے تو ان کو بھی ان تبرکات سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا، بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہی صندوق ان کے لیے بلاؤں اور مصیبتوں کا ذریعہ بن گیا۔ اسی طرح آج بھی تبرکات تو کیا خود بزرگانِ دین، انبیا علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کی قبریں موجود ہیں جن میں ان کے مبارک جسم مدفون ہیں، لیکن جب مسلمان اللہ تعالیٰ سے پھر گئے تو ان مبارک مقامات پر دشمنانِ اسلام کا تسلط اور غلبہ آگیا ہے اور مسلمان طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

لہٰذا نفع ونقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی کے ساتھ لو لگائے رکھیں۔ البتہ جن لوگوں کے دلوں میں نیکوکاروں کی محبت اور ان سے عقیدت ہو تو ان تبرکات کو دیکھ کر ان کے اندر اللہ والوں کے عشق ومحبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ان کے کارنامے سامنے آجاتے ہیں اور ان کی پیروی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں نازل ہوجاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی برکت اور رحمت نیکوکاروں پر ہی برستی ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) تبرکات اور یادگاروں پر عرس نہ کریں

ان تبرکات اور یادگاروں کے متعلق اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ان پر عرس نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تبرکات کے لیے سال بھر میں یا کسی خاص موسم میں کوئی خاص وقت مقرر نہ کیا جائے اور نہ یادگاروں کے لیے ملکی و علاقائی سطح پر کوئی خاص وقت متعین کریں کہ بس اس دن لوگ ان یادگاروں کی زیارت کریں۔ جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر مبارک کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا ''اور میری قبر کو عید (کی طرح میلہ) مقرر نہ کرو''۔

(نسائی، مشکوٰۃ: باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ)

عید کی اصل عَوْدٌ تھی۔ چونکہ یہ خوشی کا دن ہر سال لوٹ کر آتا ہے اس لیے اس کو عید کہا جاتا ہے۔ اس حدیث شریف کے اس جز کا مفہوم یہ ہے کہ میری قبر پر تم عید اور میلہ مقرر نہ کرو کہ سال یا ماہ میں کسی خاص دن میری قبر پر اس طرح جمع ہو جس طرح عید گاہ میں یا جائے میلہ میں لوگ سال یا ماہ کے خاص دن میں جمع ہوتے ہیں۔

جب نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر جس میں خود نبی کریم ﷺ کا بدنِ مبارک مدفون ہے، اس پر میلہ اور عرس جائز نہیں تو کسی دوسرے کی قبر پر عرس کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہی حکم دوسری یادگاروں اور تبرکات کا بھی ہے کہ ان کے لیے سال بھر یا مہینہ میں کوئی خاص دن نہ مقرر کیا جائے تاکہ لوگ ان تبرکات اور یادگاروں پر سالانہ یا ماہانہ عید یا میلہ نہ منائیں۔ یہی میلے اور دلچسپ اجتماعات بالآخر شرک کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور لوگ اللہ تعالیٰ کی پرستش کے بجائے مخلوق پرستی کے بدترین مرض اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۳) یادگاروں اور تبرکات کی زیارت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ کریں

یادگاروں اور تبرکات کی زیارت میں شریعت کی حدود کا خیال رکھیں۔ مثلاً ان کو سجدہ و رکوع نہ کریں، ان کے گرد طواف نہ کریں اور ان پر نذر و نیاز نہ چڑھائیں۔

(۴) یادگاروں اور مبارک مقامات کی زیارت کو حج کا جز نہ قرار دیا جائے

یادگاروں اور مبارک مقامات کی زیارت کو حج کا جز اور حصہ نہ قرار دیا جائے کہ عوام یہ خیال

کرنے لگیں کہ گویا جس نے ان یادگاروں کی زیارت نہیں کی اس کا حج یا عمرہ ادا ہی نہیں ہوا یا جس نے یہ زیارتیں نہ کیں تو گویا اس کا حج یا عمرہ ناقص رہا، بلکہ ان یادگاروں کی زیارت کو عشق و محبت کے تقاضوں کی حد تک محدود رکھا جائے۔ عشق و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک سچا عاشق اور محب جب اپنے غائب محبوب کے دیار میں جاتا ہے تو وہ محبوب کی یادگاروں سے عشق و محبت کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس عشق کی آگ کی بھاپ سے آنسوؤں کی بارش برسا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک حاجی جب اپنا فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے حج کو جاتا ہے تو وہ ان یادگاروں کی زیارت کو حج کا جز نہ قرار دے، بلکہ ان یادگاروں کی زیارت صرف اس کی محبت و عقیدت کا تقاضا ہو کہ جب آ ہی گیا ہوں تو ان مقامات کی زیارت بھی کرلوں جہاں تاریخی واقعات کا صدور ہوا ہے۔

(۵) یادگاروں میں نماز اور نوافل کو ضروری نہ قرار دیا جائے

جن مقامات کے بارے میں نماز و نوافل کی فضیلت شریعت میں منقول نہیں ہے وہاں نماز و نوافل کا اس طرح اہتمام نہ کیا جائے کہ لوگ وہاں نماز اور نوافل پڑھنا ضروری سمجھیں کہ جس نے وہاں نفل نماز ادا نہ کی تو گویا اس نے اس جگہ کی زیارت ہی نہیں کی جس کی وجہ سے وہ عظیم ثواب سے محروم ہو گیا۔

(۶) یادگاروں کی زیارت نہ کرنے والوں پر نکیر نہ کریں

جو لوگ یادگاروں کی زیارت نہ کرتے ہوں، ان میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوں، اُن پر نکیر نہ کی جائے، نہ ان لوگوں کو برا بھلا کہا جائے، نہ ان کو اس وجہ سے بدعقیدہ اور گنہگار سمجھا جائے اور نہ ہی اُن پر کسی قسم کے فقرے چسپاں کیے جائیں۔

(۷) تبرکات کو نمائش اور کمائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے

جس کے پاس نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کوئی تبرک مثلاً موئے مبارک ہوں تو وہ اس کو نمائش اور کمائی کا ذریعہ نہ بنائے کہ لوگوں سے اس کی زیارت کرانے پر مال و دولت کا مطالبہ کرے یا کسی بھی صورت میں اس کو مال کمانے کا ذریعہ بنائے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت کی علامت؛ شعائر اللہ کی تعظیم اور ان سے محبت ہے

مذکورہ بالا پوری بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ انسان کی محبت کا اصل محور و مرکز اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ہونی چاہیے اور یہی دین و ایمان کی روح ہے، لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو گی اس کو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے ساتھ لازماً محبت ہو گی، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم، نیکوں پرہیزگاروں اور اولیاء اللہ سے محبت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی محبت، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل، اس کے شعائر اور اس کی نامزد اشیاء ہی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت، اس کی عظمت اور ایمان کی علامت، شعائر اللہ کی محبت، اُن کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل ہی ہے۔

اس لیے ایک مؤمن لازماً رسول اللہ ﷺ پر فدا ہو گا، آپ کی سنتوں کا شیدائی ہو گا، نیکوکاروں سے اس کو محبت ہو گی، جن راستوں سے دینِ اسلام ملا ہے ان راستوں کی قدردانی، ان کی عظمت اس کے دل میں ہو گی، شعائر اللہ کی تکریم و تعظیم اور ان سے محبت کی ادائیں اس سے ٹپکتی ہوں گی۔ فسق و فجور اور دشمنانِ اسلام سے اس کو نفرت ہو گی اگرچہ وہ اس کا باپ، بیٹا اور قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ اس کی محبت اور دشمنی صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہوتی ہے، اس لیے وہ مؤمنوں سے محبت کرتا ہو گا اور دینِ اسلام کے دشمنوں سے دشمنی کرتا ہو گا۔ وہ اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے انتہائی بہادری اور بے جگری سے لڑے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کے لیے کافروں کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہنا لازمی ہے۔ اسلام تو اشخاص و افراد کے لیے سلامتی کا پیغام ہے مگر کفر اور غیر اسلامی ظالمانہ قانون کے ساتھ وہ کسی علاقہ اور تعلق کا روادار نہیں۔

لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کا مدعی ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی عظمت و محبت یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و محبت یا اللہ تعالیٰ کے شعائر کی عظمت و محبت اس کے دل میں نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی نامزد اشیاء کی تعظیم و تکریم پوری طرح نہیں کرتا یا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور شعائر اللہ کی تعظیم اور محبت کا دم نہیں بھرتا ہے، آپ ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے اور اطاعت سے روگردانی کرتا ہے تو اس طرح کے تمام لوگ سراسر دھوکے میں پڑے ہیں۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم و محبت کی حدود شریعتِ مطہرہ میں مقرر ہیں۔ اگر کوئی محبت و عقیدت کے پردے میں ان حدود سے تجاوز کرے

گا اور تعظیم و تکریم اور محبت کو عبادت کی حدود میں داخل کرے گا تو ایسا شخص شرک کا ارتکاب کرے گا، اللہ تعالیٰ افراط و تفریط سے بچائے۔ یاد رہے کہ اسی کتاب جواہر الاسلام میں عبادت کی وضاحت بھی موجود ہے جس سے عبادت ، تعظیم و تکریم اور مخلوق کے لیے جائز و ناجائز تعظیم کی حدود کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

عدل وانصاف کا بیان

عدل عربی میں سیدھا کرنے، برابر کرنے، موازنہ کرنے اور صحیح توازن وتناسب کو کہتے ہیں تو نظامِ کائنات میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء کی مقدار اور کیفیت میں صحیح تناسب وتوازن قائم ہو، ایک جز کی دوسرے سے مقدار یا کیفیت میں مناسبت اور توازن قائم ہو۔ عالمِ انسانی میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد واعمال، معاملات، باہمی حقوق اور جذبات میں صحیح توازن اور تناسب ہو اور ان کی ادائیگی بھی اعتدال اور حق کے ترازو میں ایسی تلی ہوئی ہو کہ افراط اور تفریط سے کوئی پلڑا جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اس پورے نظام کو عدل پر قائم کیا ہے۔ اس کارخانۂ ہستی میں بناؤ سنگھار، جمال، کمال اور حسن وخوبی جو کچھ ہے، یہ سب کچھ عدل اور صحیح تناسب وتوازن کی وجہ سے ہے۔

مثلاً: جسمانی صحت کو دیکھ لیجیے۔ یہ ایک جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے اگر اس کا کوئی جز بھی حالتِ اعتدال سے نکل جائے تو جسم کی شکل وصورت بگڑ جاتی ہے۔ صحت وتندرستی اور حسن وجمال بھی اسی اعتدال کی وجہ سے ہے۔ جس شخص کے اعضاء وجوارح یا رنگ وغیرہ میں جس قدر اعتدال وتوازن ہو اسی قدر وہ حسین وجمیل نظر آتا ہے۔

اشعار وغیرہ کی حلاوت بھی اسی وجہ سے ہے کہ مصرعوں کی ترکیب میں تناسب واعتدال ہوتا ہے۔ اگر ایک مصرع بھی بے جوڑ ہو تو شعر کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس زمین پر عرصۂ دراز سے ہوا، پانی اور خشکی میں جو مخلوقات پائی جاتی ہیں انہیں کو دیکھ لیجیے، ان کی زندگی اس لیے تو برقرار ہے کہ ان کے اسباب میں پورا پورا عدل وتوازن اور تناسب پایا جاتا ہے، ورنہ ان سب اسباب میں ذرہ برابر بھی بے اعتدالی (1) پیدا ہو جائے تو یہاں زندگی کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا۔

یہ بے حد وحساب ستارے اور سیارے جو فضا میں گھوم رہے ہیں، یہ عظیم الشان قوتیں جو عالم میں کام کر رہی ہیں، یہ بے شمار مخلوقات اور اشیا جو اس جہاں میں پائی جاتی ہیں؛ ان سب میں ایسی عدالت

---

(1) اس کی کچھ مثالیں: کتاب "دہریت سے اسلام تک" باب سوئم سائنسی دلائل میں ملاحظہ فرمائیں۔

وموزونیت کا قانون کارفرما ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑ کر بند کر رکھا ہے۔ نظامِ شمسی کا ہر کرّہ اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے۔ کوئی ایک بھی ذرہ برابر اس سے نہ ہٹ سکتا ہے اور نہ انحراف ومیلان کرتا ہے۔ اگر ان کے درمیان یہ کمال درجہ کا تناسب وتوازن قائم نہ ہو تو یہ نظام ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکے گا۔ اگر نظام کا ایک کرّہ بھی اس قانونِ عدالت سے ہٹ جائے تو فوراً دوسرے کروں سے ٹکرا جائے گا اور تمام نظامِ شمسی بگڑ جائے گا۔ غرض دنیا کا تمام نظام عدل وتوازن پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ حقیقت نہ رہے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف جگہ جگہ اشارے کیے ہیں، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۞ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۞ "اس (اللہ تعالیٰ) نے آسمان کو (پیدا کرکے) بلند کیا اور (اجرامِ سماویہ وغیرہ کے لیے قانون عدالت) میزان رکھ دیا (تو اس کا تقاضا یہ ہے) کہ میزان (اور عدالت) میں خلل نہ ڈالو۔ اور انصاف کا ترازو قائم رکھو اور تول (یعنی اس نظامِ عدالت) میں (کسی طرح) کمی (اور بے انصافی اور بے اعتدالی) مت کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین، آفتاب ومہتاب غرض تمام کائنات کے سارے نظام کو حق وعدل کی بنیاد پر اعلیٰ درجہ کے توازن وتناسب کے ساتھ قائم کیا ہے اور وہ اپنی حدود نظامِ عدل سے تجاوز نہیں کرتے۔ اسی طرح تم بھی راہِ حق اور عدل وانصاف پر قائم رہو، ہر بات میں حق کہو اور حق پر عمل کرو، عقائد وعبادات، معاملات اور خالقِ کائنات اللہ رب العالمین کے حقوق سے لے کر مخلوقات کے حقوق بلکہ اپنے نفس کے حقوق تک کی پوری رعایت اور اس میں عدل وانصاف کا پورا اہتمام کرو۔ بات چیت کرنے، چلنے، پھرنے، سونے جاگنے وغیرہ غرض دنیوی اور دینی سب امور میں حق پر قائم رہو۔

اسی طرح سورۃ الملک میں ارشاد گرامی ہے: اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۞ "یعنی جس نے اوپر نیچے سات آسمان بنا دیے (اے دیکھنے والے)

کیا تمہیں رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی (اور بے اعتدالی) دکھائی دیتی ہے ؟ پھر نگاہ پلٹ کر دیکھو تیری نگاہ تھکی ماندی ہو کر تیری طرف ناکام لوٹ کر آئے گی (لیکن اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کائنات اور انتظامات میں ذرہ برابر بے اعتدالی، بے ربطی اور خلل نہیں پاسکو گے) (سورۃ الملک: ۳،۴)

یہاں دنیا بھر کے انجنیئروں ماہرینِ علومِ لطیفہ اور ہر سمجھدار شخص کو دعوت دی جارہی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے آسمان، زمین میں پہاڑ ہر قسم کے جاندار اور بے جان مخلوق سب کو دیکھو، غور سے دیکھو، تنقیدی نظر سے دیکھو، ایک بار نہیں بار بار دیکھو اور بتاؤ تمہیں کارخانۂ ہستی میں کوئی عیب کوئی نقص کوئی بے ربطی اور شگاف یا ترتیب و توازن میں کوئی کوتاہی نظر آتی ہے ہرگز نہیں بلکہ پوری کارخانۂ ہستی کی بندش ایسی چست اور متوازن ہے اور ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ کہیں بھی نظامِ کائنات کا تسلسل نہیں ٹوٹتا اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جیسا بنادیا ہے اس سے بہتر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس لیے تم خواہ کتنی ہی جستجو کرلو تمہیں اس میں کسی جگہ کوئی بے ربطی نقص بے اعتدالی اور رخنہ نہیں مل سکتا۔

نیز سورۂ آل عمران کی آیت شہادت میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ یعنی " اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور اہلِ علم کی گواہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی اور اہل علم کی یہ بھی گواہی ہے کہ) وہ (پوری کائنات میں) عدل و انصاف (یعنی صحیح توازن و تناسب و نظامِ عدالت) کا قائم رکھنے والا ہے (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔۔ الآیۃ (آل عمران ۱۸)

اس آیت کریمہ میں دو حقیقتیں بیان ہوئیں:

ایک حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے اور ان دو حقیقتوں پر تین قسم کی گواہیاں پیش کی گئیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی گواہی، فرشتوں کی گواہی، اور اہلِ علم کی گواہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس نظام کو چلا رہا ہے اس سے صاف یہ شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہے کوئی اس کا شریک و حصہ

دار نہیں اور پوری کائنات میں صرف اسی کا تصرف و اختیار چلتا ہے، پھر نظامِ کائنات میں غور و فکر کریں تو یہی نظر آئے گا کہ کائنات کی ہر چیز آسمان و زمین سورج، چاند، ستاروں، ہواؤں اور پانی وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک میزان وعدل و قسط کا قانون رکھا ہے مجال نہیں کہ کوئی چیز بھی اپنے مقررہ حدود اور معین محور و مدار سے ایک ذرہ بھی ادھر ادھر ہو سکے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور تمام کائنات کو ایسا بنایا ہے اور اس کے نظام کو اس طرح چلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل خود اس بات کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں ہے اور نہ اس کے سوا کوئی معبود بنائے جانے کے لائق ہے اور یہ کہ وہ پوری کائنات میں عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے۔

مذکورہ بالا دو حقیقتوں پر یہ تو اللہ تعالیٰ کی وہ شہادت ہوئی جو کائنات کی فعلی کتاب کے ایک ایک ذرے سے ایسا واضح اور ثابت ہے جس سے کوئی صاحبِ عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں توحید وعدل کو یوں مدلل اور ثابت فرمایا ہے کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس آیت میں دوسری گواہی فرشتوں کی ہے، فرشتے اللہ تعالیٰ کے خاص کارندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے اجراء و نفاذ کا ذریعہ ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے عدل و قسط پر قائم ہونے کے اول گواہ اور عینی شاہد ہیں، نیز وہ اپنے عمل و کارکردگی اور اللہ تعالیٰ کی نہایت فرمانبرداری سے عملاً یہ شہادت دے رہے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں سرگرداں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی مالک اور معبود نہیں مانتے۔

اور اللہ تعالیٰ کے یہ انتظامی اہل کار و کارندے کائنات کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور منشا کے مطابق جس عدل و قسط سے چلا رہے ہیں تو یہ سب کچھ فرشتوں کی توحید و عدل کی وہ گواہی ہے جو وہ اپنے عمل و کارکردگی سے بندوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کی وحی پہنچانے کا واسطہ یہی فرشتے ہوتے ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل و قسط پر مبنی دین اور دستور زندگی کو پیغمبروں کے پاس لے آتے ہیں۔[1]

---

(1) فرشتوں کا پورا بیان جواہر اسلام کی کتاب العقائد میں پڑھ لیجئے۔

اس آیتِ کریمہ کی تیسری گواہی اہلِ علم کی ہے۔ اہلِ علم سے علمِ حقیقی کے تمام حاملین انبیا علیہم السلام اور ان کے سچے وارث مراد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ان سب کی متفقہ شہادت یہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ وہ عدل وقسط کو قائم رکھنے والا ہے۔

(سورۃ رحمٰن: آیت ۸-۹)

توحید عدل وقسط پر مبنی عقیدہ ہے اور شرک عدل سے ہٹی ہوئی بات اور ظلم عظیم ہے

یادرکھیں کہ توحید یعنی صرف ایک اللہ تعالیٰ کو معبود ماننا، اس کے سوا کسی کی بندگی کو نہ ماننا اور نہ اختیار کرنا ہی عدل وقسط پر مبنی عقیدہ ہے، اور اس کی کائنات میں کسی دوسرے کو حصہ دار یا شریک یا نفع نقصان کا مالک ماننا اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو اس کی عبادت اور بندگی میں شریک کرنا عدل وانصاف سے ہٹی ہوئی بات اور بہت بڑا ظلم ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ”بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔“ (۲) (سورۃ القمان: آیت ۱۲)

یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ توحید اور دینِ توحید سراسر عدل وانصاف ہے اور جو چیز جس قدر توحید اور دین توحید سے ہٹی ہوئی ہوگی وہ اسی قدر ظلم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو عدل پسند ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ بات پکی شہادتوں اور مضبوط دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کے ہر گوشے اور ہر ذرے میں عدل وقسط کا میزان رکھا ہے اور اس عدل وقسط کے میزان پر ساری کائنات قائم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو آسمان وزمین درہم برہم ہو جائے۔ اس سے خالق کائنات (اللہ تعالیٰ) کا ذوق اور رویہ معلوم ہوا کہ وہ بے حد عدل والا اور عدل پسند ہے۔ آخر جب اللہ تعالیٰ اپنی وسیع تر کائنات میں مسلسل عدل وقسط کو قائم کرتا اور رکھتا ہے تو وہ انسان کے معاملہ میں خلافِ عدل وقسط سے کیسے راضی ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ انسان سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں اسی طرح عدل وانصاف اور توازن وقسط کو ملحوظ رکھیں اور عدل وقسط کے میزان میں دھاندلی اور خرابی پیدا نہ کرے ورنہ انسان کے

---

(۲) توحید وشرک کا پورا بیان جواہر الاسلام کتاب العقائد میں پڑھ لیجیے۔

سارے نظام معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا جسکی وجہ سے اس کی دنیا وآخرت دونوں تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عدل وقسط کا میزان کون سا ہے جس کے مطابق وہ اپنی اختیاری زندگی گزارے تو اس کا جواب بھی اسی آیت شہادت کے بعد متصل دوسری آیت میں موجود ہے، وہ یہ کہ: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ معبودِ حقیقی وحدہ لاشریک لہٗ عدل والے، عدل کو قائم رکھنے والے، عزیز وحکیم اللہ رب العالمین نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل وقسط پر قائم کرنے اور رکھنے کے لیے عدل وقسط پر مبنی دین اور طریقہ زندگی عطا فرمایا ہے اور وہ دینِ اسلام ہے [1]۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کا حقیقی دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک پہنچایا ہے۔

آیتِ شہادت کی تفسیر

اس آیتِ شہادت کی تفسیر میں علمائے اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں اس کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

وہ اپنی تفسیر تدبرِ قرآن میں لکھتے ہیں کہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہلِ علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔ ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر اسی نظامِ کائنات سے قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے، مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور ومدار سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہوسکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق وفاطر عدل وقسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز

---

[1] اسلام کیا ہے؟ اس کے معنی ومطلب جواہر الاسلام کے باب عقائد میں پڑھ لیجئے۔

اس عدل وقسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق ومالک اس کو ایک نظام عدل وقسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل وقسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کی حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کرلیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کردیتا ہے اور دوسری قوم کو اس کا وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود توحید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کررہے ہیں اور خاص اس موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقت توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے: **فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا** (اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا وسزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے: **اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۞ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۞** "کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کردیں گے، تمہیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟" (قلم: ۳۴-۳۵)

تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند وناپسند اور اپنے اوامر ونواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے

آثار ونشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں، لیکن انہوں نے ان آثار وروایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات وعقائد میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی، لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے، بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انہیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق وباطل کے درمیان فرقان بنا کر اُتارا، تاکہ حق وعدل کی صراط مستقیم پھر سے واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے، بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امر واقعی کا اظہار وبیان ہے۔ کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں، اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اس کی مخلوقات میں شاہد اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطعِ نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعتِ باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کی بھی۔ اس لیے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارش حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے، ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے: وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۞ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۞ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۞ "اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک متعین مقام

ہے، اور ہم تو صفیں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں، اور ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔"

(سورہ صافات: آیت ۱۶۴-۱۶۶)

ملائکہ کے بعد اولوا العلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علمِ حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے دنیا کو ملا ہے۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے۔ یہ مصلحین و مجددین کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنہوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقائد کو توحید خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں یامرون بالقسط کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے ساتھ حاملینِ علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علمِ حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرہ سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل و قسط کا درجہ صفاتِ الٰہی میں اتنا بلند وارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک اِنَّهٗ کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک ٹھیک عدل و قسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

قِسْطٌ کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل اور انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کی ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال؛ غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطۂ اعتدال یا بالفاظ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھیے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات

عدل وقسط کے منافی ہو گی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم وجور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بدصورتی اور بدہیئتی سے، اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق وعدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حسن وجمال سے، لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہو گی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالقِ کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق ومالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس کے نظام تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعتہً اسی کے کار فرما ہاتھ اس کو درست کرنے کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں، تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق وعمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لیے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج وپامال ہونے کے لیے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت کرتا ہے اور ہمارے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کو از سر نو درست کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لیے اس نے مکافات عمل کا قانون رکھا، اسی کے لیے اس نے انبیا وشرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات وبدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین ومصلحین اس کی اصلاح وتجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج وزوال کو ان کے اخلاقی عروج وزوال کے تابع کیا، اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل وقسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزان عدل نصب ہو گی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے کون سا نہیں، اور پھر اسی کے

مطابق جزا و سزا ہو گی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمۂ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب اہلِ کتاب کے لیے سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملین علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور وہ اِلٰہ اُمورِ دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے، وہ دندناتے پھریں اور وہ حیّ و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے، بلکہ وہ تمہاری خواہشوں کے علی الرغم اپنے نظام عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہ لاشریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لیے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھنڈرا ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۞

الدین سے مراد دین حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا الکتٰب پر ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم کر چکے ہیں۔

العلم سے مراد علمِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لیے نازل ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے، اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے۔ یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظام تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر

فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود و نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضدم ضدا کی وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ دین کھڑے کر لیے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض شرارتِ نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی پچ میں تھا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت پا کر ضائع کر دی۔ اللہ تعالیٰ چونکہ حیّ و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظامِ عدل و قسط یعنی اسلام کو از سر نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراطِ مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انہوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انہیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔ (ماخوذ تدبر قرآن: ۴۷/۲-۵۲)

انسان کے لیے ضروری ہے کہ عدل وقسط کے ساتھ پوری زندگی گزارے

جب یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہم ایک متوازن کائنات میں رہتے ہیں جس کا سارا نظام عدل واعتدال پر قائم ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ آسمان وزمین میں جتنی چیزیں ہیں یہ انسان کے لیے بنائی گئی ہیں اور تمام چیزوں سے انسان ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ فائدہ اٹھا رہا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ عدل وقسط اور اعتدال کا قانون انسان کے لیے بنائی ہوئی دنیا کی ہر ایک چیز میں تو نافذ ہو، لیکن اس کو انسان کے افکار اور اس کے اعمال کے لیے بے اثر مانا جائے۔

بلاشبہ انسان کے لیے ازحد ضروری ہے کہ وہ بھی عدل وانصاف پر قائم رہے۔ اور جس جس دائرہ میں اس کو اختیار دیا گیا ہے اس میں اگر وہ ناانصافی کرے گا اور جن حق داروں کے حقوق اس کے ذمے ہیں اگر وہ ان کی حق تلفی کرے گا تو یہ فطرتِ کائنات سے اس کی بغاوت اور ٹکر ہوگی اور کائنات کی فطرت ظلم، بے انصافی اور حق تلفی کو قبول نہیں کرتی۔ یہاں ایک بڑا ظلم تو درکنار اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا بہت ہی معمولی حق بھی مار لیتا ہے تو اس کو اس بے اعتدالی اور ظلم کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

ظلم بغیر اثر کیے نہیں رہتا

اگر چہ فی الحال اس ظلم کا اثر معلوم نہ ہو لیکن ظلم بغیر اثر کیے نہیں رہتا۔ جس طرح مادیات میں حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح انسانی اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔

مثلاً شکر اور چینی کا اثر یہ ہے کہ وہ اشیاء کو میٹھا کر دیتی ہے۔ اب اگر دس سیر پانی میں چینی کا ایک دانہ ڈال دیا جائے تو اس کا اثر معلوم نہ ہو گا، لیکن اثر اس نے ضرور کیا ہے، کیونکہ اگر اسی طرح اس پانی میں ایک ایک دانہ ڈالتے جائیں تو ایک خاص مقدار تک پہنچ کر اور خاص وقت میں حل ہونے کے بعد پانی میں اس کی مٹھاس محسوس ہونے لگے گی، پھر جتنے جتنے چینی کے دانے ڈالتے جائیں گے پانی کی مٹھاس میں اضافہ ہوتا جائے گا، اس سے ثابت ہوا کہ پہلے دانے نے ضرور اثر کیا ہے ورنہ دوسرے تیسرے وغیرہ کا اثر کیسے نمایاں ہوا؟۔

اسی طرح آگ کا اثر گرم کرنا ہے۔ اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا۔ لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور کی تکمیل کے لیے ایک مقرر وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ چولہے پر ایک دیگ رکھ دی جائے تو فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے کسی ظالم شخص یا ظالم معاشرہ کی ظاہری خوشحالی سے دھوکہ نہ کھائیں، بلکہ اگر وہ سرکشی اور ظلم سے باز آ کر توبہ نہ کر لیں تو ان کی ہلاکت اور تباہی اپنے وقت مقررہ پر یقینی ہے۔

انسان کو عدل اختیار کرنے کا حکم

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ذرہ برابر ظلم بھی اثر کیے بغیر نہیں رہتا تو ضروری یہ ہوا کہ ہم اپنے قول و عمل میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں، مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں، کسی ادنیٰ یا اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کریں، سب لوگوں کے لیے اپنے آپ سے انصاف کا مطالبہ کریں، کسی انسان کو قول و عمل سے ظاہراً و باطناً کوئی ایذا و تکلیف نہ پہنچائیں، جب

دو فریق اپنے کسی معاملے کا محاکمہ آپ کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کریں اور ہر معاملہ میں خواہ عقائد ہوں، اعمال ہوں یا اخلاق ہوں۔ غرض ہر چیز میں افراط و تفریط کے راستوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عدل و انصاف کے اپنانے کا حکم اور بار بار تاکید فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤءِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ یعنی "اللہ (تعالیٰ) عدل و احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور برائی، بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق سیکھ لو۔"

(سورۃ النحل: آیت ۹۰)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۤءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا... "اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور محض اللہ کے لیے گواہ بنو، اگرچہ انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات، یا تمہارے والدین اور قریبی رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ (فریق معاملہ) خواہ دولت مند ہو یا فقیر۔ اللہ تم سے زیادہ ان دونوں کا خیر خواہ ہے (تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ مالدار کی دولت کے لالچ میں یا محتاج کی محتاجی پر ترس کھا کر سچی بات کہنے سے جھجکو) لہٰذا اپنی خواہش کی پیروی میں حق اور عدل سے نہ ہٹو۔

انسان اپنی پوری زندگی میں عدل کو کیسے قائم کر سکتا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ ہم اپنی فکر و عمل، معاملات وغیرہ میں کیسے اعتدال کو قائم رکھیں اور وہ کون سا قانون اور لائحہ عمل ہے جو ہر قوم و طبقہ، چھوٹے بڑے، فقیر و امیر، حاکم اور محکوم؛ ساری انسانیت کے لیے مبنی بر انصاف ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس عظیم ذات اللہ تعالیٰ نے بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت و سکون کے لیے عدل و توازن کا حیرت انگیز نظام بنایا ہے اور اسی وجہ سے کارخانۂ کائنات برقرار اور بدستور حسن و خوبی سے چل رہا ہے جس کو قانونِ فطرت یا میزانِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فکر اور اُن کی ایک ایک حرکت اور ہر ایک کام کے لیے ایک قانون بنایا ہے جس کو قانونِ شریعت یا میزانِ شریعت کہا جاتا ہے۔ تا کہ اس کی روشنی میں انسان زندگی بسر کر کے کامیاب ہو جائے۔ اسی قانونِ عدل کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا اور پھر ان کے بعد دوسرے انبیا علیہم السلام یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجے اور ان پر کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے تا کہ ان تعلیمات کی وجہ سے انسان کے اعمال وافکار میں اعتدال وعدالت قائم ہو جائے اور دنیا میں اسی قانون کے ذریعے امن وامان قائم ہو اور ہر انسان اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اسی راہِ اعتدال اور انصاف کو اپنا شعار بنا لے، اور جو سرکش لوگ وعظ ونصیحت اور تعلیم وتبلیغ کے ذریعے عدل وانصاف پر نہ آئیں اور اپنی سرکشی پر اڑے رہیں تو اُن کو قانون سیاست اور تعزیر وسزا کے ذریعے انصاف پر قائم رہنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ "ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات دے کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب اور (عدالت واعتدال کے) ترازو کو نازل فرمایا تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے اتارا لوہا، اس میں سخت جنگ ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ (سورۃ الحدید: آیت ۲۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے بھیجنے اور کتابوں کے نازل کرنے کا سارا نظام انسانوں اور جنوں کے افکار واعمال میں صحیح توازن وتناسب، اعتدال اور ان کے درمیان عدل وانصاف کے لیے قائم کر دیا گیا ہے۔ رسولوں کی بعثت اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لیے عمل میں آیا تا کہ انسانیت اپنے تمام افکار اور اعمال میں عدل وقسط پر قائم ہو کر اپنی دنیا وآخرت کو سنوارے اور دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہو جائے۔

اسی میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ سب لوگوں کو انصاف اور عدل پر لانے اور اس پر قائم رکھنے کے لیے صرف وعظ ونصیحت ہی کافی نہ ہو گی، بلکہ کچھ شریر اور ظالم لوگ ایسے بھی ہیں جن کو لوہے کی زنجیروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مرغوب اور مغلوب کر کے انصاف پر قائم کیا جائے گا یا ان شریروں، فتنہ انگیزوں اور فاسد مادہ کو جڑ سے کاٹ کر باہر پھینک دیا جائے گا تا کہ صاف ستھرا معاشرہ

باقی رہ جائے۔

غرض عالمِ انسانی میں اعتدال وعدالت اور مبنی برانصاف صرف اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو انبیا علیہم السلام کی وساطت سے نوعِ انسانی کو پہنچا ہے۔ یہی قانون اور تعلیمات فطری دین ہے اور یہی دین القیم یعنی سیدھا اور درست دین ہے جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی وہ قانون اور تعلیمات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ترمیم وتحریف اور تبدیلی سے پاک اور مکمل کر کے اپنے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا اور اس کی حفاظت خود اپنے ذمے لے کر آئندہ کے لیے قیامت تک نئے نبی ورسول کے آنے کا دروازہ بند کیا۔ آپ کے بعد جو کوئی بھی نبوت کا دعویٰ کر کے اٹھے گا وہ کذّاب ودجال ہو گا۔

بس نجات اور حسن صرف اور صرف اعتدال میں ہے۔ جو انسان دل وجان سے اسلام کے سانچے میں جس قدر ڈھلا ہوا ہو گا وہ اسی قدر معتدل اور عادل ہو گا، اسی قدر وہ دنیا میں مطمئن اور پرسکون زندگی گزارے گا اور موت کے بعد قبر (عالمِ برزخ) میں اور اس کے بعد آخرت کی دائمی زندگی میں خوش وخرم رہے گا اور اعلیٰ درجات پائے گا اور جو شخص جس قدر اس میں نقصان کرے گا اسی قدر بے اعتدالی اور ظلم کا مرتکب اور ظالم ہو گا۔

عدل واعتدال کے چند اہم اجزا

اب عدل اور اعتدال کے چند موٹے موٹے اجزا کو بیان کرتے ہیں تاکہ ان کو عمل کے لیے یاد کرنے میں آسانی ہو۔

۱۔ عقائد اور عبادات میں عدل کرنا، یعنی اپنے عقائد کو قرآنی تعلیمات کے مطابق بنانا اور عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) کو شریعتِ مطہرہ کے مطابق ادا کرنا۔

۲۔ معاملات جیسے خرید وفروخت، نکاح، طلاق وغیرہ میں عدل وانصاف اور شریعتِ مطہرہ کی پوری رعایت کرنا۔

۳۔ مخلوق اور ہر بندے کو اس کا حق ٹھیک ادا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کے مقررہ حقوق میں ذرہ برابر کمی نہ کرنا۔

۴۔ قوتِ شہوت، قوتِ غضب اور قوتِ رحم کو اعتدال پر لانا، ان قوتوں کے اعتدال سے انسان کی

سیرت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں۔

۵۔ محاکم یعنی فریقین میں فیصلہ کرتے وقت عدل وانصاف کی پوری رعایت کرنا اور اس میں رشتہ داری اور مسلک وغیرہ کا کوئی لحاظ نہ کرنا، جس کا جو حق بنتا ہے اس کو دے دینا۔

۶۔ اپنے ظاہر و باطن کو یکساں کرنا۔

۷۔ سخت سے سخت کے ساتھ بھی کوئی معاملہ کیا جائے تو حق وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، یعنی اگر کسی سے بدلہ لینا ہے تو حق وانصاف کے ساتھ بدلہ لیں۔ اگر کفار سے مقابلہ ہو تو اس میں بھی تعلیماتِ اسلام کی پوری رعایت کریں۔ اسی طرح اگر بہت زیادہ خطرناک اور غلط شخص ہے جو اُمتِ مسلمہ کے عقائد اور اعمال کو خراب کرتا ہے تو اس کے بھی عقائد، اعمال اور غلطیاں، جو آشکارا ہیں، اُن میں بھی بے انصافی نہ کریں۔ اُس کی بھی صرف اتنی غلطی بیان کریں جو واقعتاً اس میں ہو، اور جو غلطیاں اس میں نہیں اُس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے پرہیز کریں، اور جو غلطیاں اس میں نہیں ہیں وہ غلطیاں اُس پر تھوپنے سے بچیں، ورنہ بے اعتدالی کے اس رویہ سے دینِ اسلام کو فائدہ کے بجائے بالآخر نقصان ہوگا اور غلط نتائج واثرات مرتب ہوں گے۔ نیز یہ شخص خود بھی اس بے اعتدالی کی وجہ سے ظلم اور بہتان میں مبتلا ہوگا جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اور مسلمانوں کو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا، اور اس کے اثرات اور نتائج برے ہوں گے اور یہ بظاہر دین کی خدمت کرنے والے خود بھی ظلم اور بہتان میں مبتلا ہو کر معصیت اور نافرمانی کے مرتکب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لیے راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، اور ہرگز کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر نہ اکسائے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔“ (سورۃ المائدہ: آیت۸)

یہاں چند موٹے اور اہم اجزاء بیان کیے گئے۔ دینِ اسلام میں ان سب کے لیے تفصیلی احکامات موجود ہیں (جن میں سے اہم اہم مسائل ”مسائل اعمال“ میں آچکے ہیں۔) اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ پورے دینِ اسلام پر دل وجان سے پوری طرح عمل کرنا عدل وانصاف کا تقاضا بھی ہے۔ ان اعمال میں جو جس قدر کوئی کوتاہی برتے گا وہ اسی قدر ظلم کا مرتکب ہوگا۔

عدل اور راہِ اعتدال سے ہٹانے والی چیزیں

آخر میں چند ان چیزوں کی نشان دہی بھی خلاصہ کے طور پر کی جاتی ہے جن کا ذکر سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵، سورۂ مائدہ کی آیت ۸ میں کیا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں کو لکھا بھی گیا ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جو عدل اور راہِ اعتدال سے انسان کو ہٹاتے ہیں اس لیے ان چیزوں سے پوری طرح خبر دار ہونا چاہیے۔

۱۔ نفسانی خواہش: یہی چیز انسان کو عموماً راہِ اعتدال اور عدل سے ہٹاتی ہے۔

۲۔ رشتہ داری، کسی کا ہم مسلک یا ہم مذہب ہونا، اسی طرح اپنی ہی جماعت والے کے ساتھ جب کسی غیر شخص، کسی غیر مسلک یا مذہب، یا غیر جماعت والے کا کوئی معاملہ آجاتا ہے تو ایسی حالت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داری، ہم مسلکی اور ہم جماعتی کا لحاظ کیا جاتا ہے اور انسان عدل اور حق سے ہٹ جاتا ہے۔

۳۔ مسئلہ اور معاملہ کے ہر پہلو اور اس کے متعلق تمام دلائل اور پہلوؤں پر نظر و غور نہ کرنے کی وجہ سے انسان عدل اور حق کو قائم کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

۴۔ حکم اور فیصلہ کا مدار: ارتکاب کے اسباب پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے انسان عدل سے ہٹ جاتا ہے۔ مثلاً: کوئی باپ بیٹے کو اس لیے پیٹتا ہے تا کہ وہ غلط کاموں سے باز آجائے، یا اپنے دفاع کی خاطر دوسرے کو مارا جاتا ہے جیسا کہ کوئی ڈاکوؤں سے اپنی جان و مال کو بچانے اور ان کے ساتھ لڑنے کی خاطر ڈاکوؤں کو مار ڈالے وغیرہ؛ تو ایسی صورتوں میں اگر ان اسباب پر پوری طرح نظر نہ کی جائے تو بلا وجہ باپ کو اور ڈاکوؤں کے قتل کرنے والے کو سزا دی جائے گی البتہ جس قدر زیادتی ہو چکی ہے اس کی سزا دے دینی چاہیے۔

عدل وانصاف کے واقعات

حضور ﷺ اور آپ ﷺ کا عدل وانصاف

۱۔ حضرت عروہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں حضور ﷺ کے زمانہ میں فتح مکہ کے موقع پر ایک عورت نے چوری کی۔ اس عورت کی قوم والے گھبرا کر حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس گئے تاکہ وہ حضور ﷺ سے اس عورت کی سفارش کر دیں (اور یوں ان کی عورت چوری کی سزا سے بچ جائے)۔ جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں حضور ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک (غصہ کی وجہ سے) بدل گیا اور فرمایا: (اے اُسامہ!) تم مجھ سے اللہ کی حدود کے بارے میں (سفارش کی) بات کر رہے ہو۔ (حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ سفارش کر کے انہوں نے غلطی کی ہے، اس لیے فوراً) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! آپ میرے لیے استغفار فرمائیں۔

شام کو حضور ﷺ بیان فرمانے کھڑے ہوئے۔ پہلے اللہ کی شان کے مناسب ثنا بیان کی، پھر فرمایا:

اما بعد! تم سے پہلے لوگ صرف اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا طاقتور اور معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد شرعی قائم کرتے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ ضرور کاٹوں گا۔ (اعاذ ھا اللہ منھا)

پھر حضور ﷺ نے حکم دیا جس پر اس عورت کا ہاتھ کاٹا گیا، اور اس نے بہت اچھی توبہ کی، اور اس نے شادی بھی کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس کے بعد وہ عورت (میرے پاس) آیا کرتی تھی اور میں اس کی ضرورت کی بات حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا کرتی۔

(حیاۃ الصحابہ، حصہ دوم: ۱۲۴)

۲۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی کا حضور ﷺ پر قرض تھا، وہ آکر حضور ﷺ سے اپنے قرض کا تقاضا کرنے لگا اور اس نے حضور ﷺ پر بڑی سختی کی یہاں تک کہ یہ کہہ دیا کہ جب

تک آپ میرا قرضہ ادا نہیں کریں گے میں آپ کو تنگ کرتا رہوں گا۔ حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے جھڑکا اور کہا: تیرا ناس ہو، تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟ اس نے کہا: ”میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں“۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”تم نے حق والے کا ساتھ کیوں نہ دیا؟“ اور پھر آپ نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تمہارے پاس کھجوریں ہوں تو ہمیں اُدھار دے دو۔ جب ہمارے پاس آئیں گی تو ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ انہوں نے کہا: ”ضرور یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں“۔

حضور ﷺ نے ان سے قرض لے کر اس اعرابی کا قرض ادا کر دیا، اور جتنا اس کا قرضہ تھا اس سے زیادہ اسے دیا۔ اس اعرابی نے کہا: آپ نے قرضہ پورا ادا کر دیا، اللہ آپ کو پورا بدلہ دے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ”حق کا ساتھ دینے والے لوگوں میں سب سے بہترین لوگ ہیں، اور وہ اُمت پاکیزہ نہیں ہو سکتی جس میں کمزور آدمی بغیر کسی تکلیف اور پریشانی کے اپنا حق وصول نہ کر سکے۔“

۳۔ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بنو ساعدہ کے ایک آدمی کی ایک وسق کھجوریں حضور ﷺ کے ذمہ قرض تھیں (ایک وسق تقریباً سوا پانچ من کا ہوتا ہے)۔ اس آدمی نے آکر حضور ﷺ سے اپنی کھجوروں کا تقاضا کیا۔ حضور ﷺ نے ایک انصاری صحابی سے فرمایا کہ اس کا قرض ادا کر دو۔ انہوں نے گھٹیا قسم کی کھجوریں دینی چاہیں، اس آدمی نے لینے سے انکار کر دیا۔ ان انصاری نے کہا: کیا تم رسول اللہ ﷺ کو ان کی کھجوریں واپس کرتے ہو؟ اس آدمی نے کہا: ہاں! اور حضور ﷺ سے زیادہ عدل کرنے کا کون حق دار ہے؟ یہ سن کر حضور ﷺ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آپ نے فرمایا: یہ ٹھیک کہتا ہے، مجھ سے زیادہ عدل کرنے کا حق دار کون ہو سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس اُمت کو پاک نہیں فرماتے جس کا کمزور آدمی طاقتور سے اپنا حق نہ لے سکے اور نہ اس پر زور دے سکے۔ پھر فرمایا: اے خولہ! اسے گن کر ادا کر دو، کیونکہ جس مقروض کے پاس سے قرض خواہ خوش ہو کر جائے گا اس کے لیے زمین کے جانور اور سمندر کی مچھلیاں دعا کریں گی، اور جس مقروض کے پاس قرضہ کی ادائیگی کے لیے مال ہے اور وہ ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر دن اور ہر رات کے بدلہ میں اس کے لیے ایک گناہ لکھتے ہیں۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۲۷/۲ تا ۱۲۸)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عدل وانصاف

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن کھڑے ہو کر فرمایا کہ جب صبح ہو تو تم صدقہ کے اونٹ ہمارے پاس لے آؤ، ہم انہیں تقسیم کریں گے، اور ہمارے پاس اجازت کے بغیر کوئی نہ آئے۔ ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا: یہ نکیل لے جاؤ، شاید اللہ تعالیٰ ہمیں بھی کوئی اونٹ دے دے۔ چنانچہ وہ آدمی گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اونٹوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ داخل ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ کر فرمایا: تم ہمارے پاس کیوں آگئے؟ پھر اس کے ہاتھ سے نکیل لے کر اسے ماری۔

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اونٹوں کی تقسیم سے فارغ ہو گئے تو اس آدمی کو بلایا اور اسے نکیل دے دی اور فرمایا: تم اپنا بدلہ لے لو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! یہ آپ سے بدلہ بالکل نہیں لے گا۔ آپ اسے مستقل عادت نہ بنائیں (کہ امیر تنبیہ کرنے کے لیے کسی کو سزا دے تو اس سے بدلہ لیا جائے)۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے قیامت کے دن اللہ سے کون بچائے گا؟ (ان حضرات میں اللہ کا خوف بہت زیادہ تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ (اسے کچھ دے کر) راضی کر لیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام سے کہا: تم میرے پاس ایک اونٹ، اس کا کجاوا اور ایک کمبل اور پانچ دینار لاؤ، چنانچہ یہ سب کچھ اس آدمی کو دے کر راضی کیا۔

یہ واقعہ ایک طرف عدلِ صدیقی کی دلیل ہے اور دوسری طرف خوفِ الٰہی اور خوفِ آخرت کے سخت احساس کی نشاندہی کرتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عدل وانصاف

۱۔ حضرت شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت عمر اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے درمیان (کھجور کے ایک درخت کے بارے میں) جھگڑا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آؤ ہم آپس کے فیصلے کے لیے کسی کو ثالث مقرر کر لیتے ہیں، چنانچہ ان دونوں حضرات نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اپنا ثالث بنا لیا۔ یہ دونوں حضرات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم آپ کے پاس اس لیے

آئے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کر دیں (اور امیر المؤمنین ہو کر میں خود آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ) فیصلہ کروانے والے خود ثالث کے گھر آیا کرتے ہیں۔

جب دونوں حضرات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس اندر داخل ہوئے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر کے سرہانے بٹھانا چاہا اور یوں کہا: اے امیر المؤمنین! یہاں تشریف رکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یہ پہلا ظلم ہے جو آپ نے اپنے فیصلے میں کیا ہے، میں تو اپنے فریقِ مخالف کے ساتھ بیٹھوں گا۔ حضرت ابی نے اپنا دعویٰ پیش کیا جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی سے کہا: (قاعدہ کے مطابق انکار کرنے پر مدعیٰ علیہ کو قسم کھانی پڑتی ہے لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ) آپ امیر المؤمنین کو قسم کھانے کی زحمت نہ دیں اور میں امیر المؤمنین کے علاوہ کسی اور کے لیے یہ درخواست نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اس رعایت کو قبول نہ کیا بلکہ) قسم کھائی اور قسم کھا کر کہا: حضرت زید رضی اللہ عنہ صحیح قاضی تب بن سکتے ہیں جب کہ ان کے نزدیک عمر رضی اللہ عنہ اور ایک عام مسلمان برابر ہو۔

ابن عساکر نے اسی قصے کو شعبی سے نقل کیا اور اس میں یہ ہے کہ کھجور کے ایک درخت کے کاٹنے میں حضرت ابی بن کعب اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما میں جھگڑا ہو گیا۔ اس پر حضرت ابی رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا: اے عمر رضی اللہ عنہ! کیا تمہاری خلافت میں ایسا ہو رہا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آؤ آپس کے فیصلے کے لیے کسی کو ثالث مقرر کر لیتے ہیں۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت زید رضی اللہ عنہ کو ثالث بنا لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ مجھے بھی پسند ہیں۔ چنانچہ دونوں حضرات گئے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس اندر داخل ہوئے۔ آگے پیچھے جیسی حدیث ذکر کی۔

۲۔ حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا ایک گھر مدینہ منورہ کی مسجد (نبوی) کے بالکل ساتھ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مسجد میں شامل کرنا چاہا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ یہ گھر میرے ہاتھ بیچ دیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ یہ گھر مجھے ہدیہ ہی کر دیں۔ وہ یہ بھی نہ مانے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ خود ہی یہ گھر مسجد میں شامل کر دیں۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو ان تین

کاموں میں سے کوئی ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر بھی تیار نہ ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اچھا پھر کسی کو آپ ثالث مقرر کرلیں جو ہمارا فیصلہ کردے۔ انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔

یہ دونوں حضرات اپنا مقدمہ ان کے پاس لے گئے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرا فیصلہ یہ ہے کہ آپ ان کی مرضی کے بغیر ان سے یہ گھر نہیں لے سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: آپ کو یہ فیصلہ اللہ کی کتاب یعنی قرآن میں ملا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں؟ انہوں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ حدیث کیا ہے؟ حضرت ابی نے کہا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر شروع کی تو جب بھی وہ کوئی دیوار بناتے تو صبح کو وہ گری ہوئی ہوتی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی بھیجی کہ اگر آپ کسی کی زمین میں بنانا چاہتے ہیں تو پہلے اسے راضی کرلیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ بعد میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی خوشی سے اس گھر کو مسجد میں شامل کردیا۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب کا گھر لے کر مسجد (نبوی) میں شامل کردیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں گھر دینے سے انکار کردیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا: میں تو یہ گھر ضرور لوں گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کروالو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے۔ چنانچہ دونوں حضرات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے سارا قصہ بیان کیا۔

حضرت ابی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی طرف وحی بھیجی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر کریں۔ وہ زمین ایک آدمی کی تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے وہ زمین خریدی۔ جب اسے قیمت ادا کرنے لگے تو اس آدمی نے کہا: جو قیمت تم مجھے دے رہے ہو وہ زیادہ بہتر ہے یا جو زمین مجھ سے لے رہے ہو وہ زیادہ بہتر ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: جو زمین میں تم سے لے رہا ہوں وہ زیادہ بہتر ہے۔ اس پر اس آدمی نے کہا: تو پھر میں اس قیمت پر راضی نہیں ہوں۔ پھر حضرت

سلیمان علیہ السلام نے پہلے سے زیادہ قیمت دے کر خریدا۔ اس آدمی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ دو تین مرتبہ اسی طرح کیا (ایک قیمت مقرر کر کے پھر اس سے زیادہ کا مطالبہ کر دیتا) آخر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس پر یہ شرط لگائی کہ تم جتنی قیمت کہہ رہے ہو میں اتنے میں خرید تا ہوں، لیکن تم بعد میں یہ نہ پوچھنا کہ زمین اور قیمت میں سے کون سی چیز بہتر ہے۔ چنانچہ اس کی بتائی ہوئی قیمت پر خریدنے لگے تو اس نے بارہ ہزار قنطار سونا قیمت لگائی (ایک قنطار چار ہزار دینار کو کہتے ہیں)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ قیمت بہت زیادہ معلوم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اگر تم اسے یہ قیمت اپنے پاس سے دے رہے ہو تو پھر تو تم جانو، اور اگر تم ہمارے دیے ہوئے مال میں سے دے رہے ہو تو پھر اسے اتنا دو کہ وہ راضی ہو جائے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ پھر حضرت ابی نے فرمایا: میرا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے زیادہ حق دار ہیں، اگر ان کا گھر مسجد میں شامل کرنا ہی ہے تو پھر وہ جس طرح راضی ہوں انہیں راضی کیا جائے۔ اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: جب آپ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا ہے تو میں اب یہ گھر مسلمانوں کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔ (حیاۃ الصحابہ: حصہ دوم، ص:۱۲۸ تا ۱۳۱)

۳۔ حضرت جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ (جہاد میں) ایک آدمی تھا۔ (اس لڑائی میں) مسلمانوں کو بڑا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ حضرت ابو موسیٰ نے اسے مالِ غنیمت میں سے اس کا حصہ تو دیا لیکن پورا نہ دیا۔ اس نے کہا: لوں گا تو پورا لوں گا، نہیں تو نہیں لوں گا۔ حضرت ابو موسیٰ نے اسے بیس کوڑے مارے اور اس کا سر مونڈ دیا۔ وہ اپنے بال جمع کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا۔ (وہاں جا کر) اس نے اپنی جیب سے بال نکالے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دے مارے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تمہیں کیا ہوا؟۔ اس نے اپنا سارا قصہ سنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ کو یہ خط لکھا:

سلام علیک! اما بعد! فلاں بن فلاں نے مجھے اپنا سارا قصہ اس اس طرح سنایا۔ میں آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ اگر یہ کام (اس کے ساتھ) آپ نے بھرے مجمع میں لوگوں کے سامنے کیا ہے تو آپ اس کے لیے بھرے مجمع میں لوگوں کے سامنے بیٹھ جائیں اور پھر وہ آپ سے اپنا بدلہ لے، اور اگر یہ کام (اس کے ساتھ) آپ نے تنہائی میں کیا ہے تو آپ اس کے لیے تنہائی میں بیٹھ جائیں اور پھر وہ آپ سے اپنا بدلہ لے۔

چنانچہ جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ خط ملا تو وہ بدلہ دینے کے لیے (اس آدمی کے سامنے) بیٹھ گئے۔ اس پر اس آدمی نے کہا: میں نے ان کو اللہ کے لیے معاف کر دیا۔

۴۔ حضرت حرمازی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ کو یہ خط لکھا:

اما بعد! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ میدے کی روٹی شہد کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گئے ہو۔ لہٰذا جب آپ کے پاس میرا یہ خط پہنچے تو آپ اللہ کا نام لے کر میرے پاس آجائیں اور اللہ کے راستہ میں جہاد کریں۔ (حیاۃ الصحابہ:۱۳۶ تا ۱۳۷)

چنانچہ حضرت فیروز رضی اللہ عنہ (خط ملتے ہی مدینہ) آگئے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اندر آنے کی اجازت مانگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دے دی۔ (وہ اندر جانے لگے تو) ایک قریشی نوجوان بھی اندر جانے لگا جس سے ان کا راستہ تنگ ہو گیا۔ انہوں نے اس قریشی کی ناک پر (اس زور سے) تھپڑ مارا (کہ خون نکل آیا)۔ وہ قریشی نوجوان اسی حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اندر چلا گیا کہ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان سے پوچھا: تمہارے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ اس نے کہا: حضرت فیروز نے، اور وہ اس وقت دروازے پر ہی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فیروز کو اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ اندر آگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے فیروز ! یہ کیا ہے؟ حضرت فیروز نے کہا: اے امیر المؤمنین! ہم نے کچھ عرصہ قبل ہی بادشاہت چھوڑی ہے (جس کا اثر ابھی بھی ہماری طبیعتوں میں باقی ہے) بات یہ ہوئی۔ آپ نے مجھے خط بھیج کر بلوایا۔ اسے آپ نے کوئی خط نہیں لکھا اور (اجازت مانگنے پر) آپ نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی۔ اس نے نہ اجازت مانگی اور نہ آپ نے اسے اجازت دی۔ اس نے (قاعدہ کے خلاف کرتے ہوئے بلا اجازت) مجھ سے پہلے میری اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہونا چاہا (اس پر مجھے غصہ آگیا) اس لیے مجھ سے وہ حرکت سرزد ہو گئی جو یہ آپ کو بتا رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو بدلہ دینا ہو گا۔ حضرت فیروز نے پوچھا: کیا بدلہ ضرور دینا پڑے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! ضرور دینا پڑے گا۔ حضرت فیروز گھٹنوں کے بل بدلہ دینے کے لیے بیٹھ

گئے اور وہ نوجوان بدلہ لینے کھڑا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: اے نوجوان! ذرا ٹھہرنا، میں تمہیں وہ بات سناتا ہوں جو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

ایک دن صبح کے وقت میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جھوٹے نبی اسود عنسی کو آج رات قتل کر دیا گیا ہے اور اس کو اللہ کے نیک بندے فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ہے۔ جب تم نے ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سن لی ہے تو کیا اس کے بعد بھی تم ان سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟ اس نوجوان نے کہا: جب آپ نے ان کے بارے میں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی ہے تو میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ حضرت فیروز نے کہا: میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اس نے خوشی خوشی مجھے معاف کر دیا تو کیا اس کے بعد میں اپنی غلطی پر (اللہ کی پکڑ سے) بچ جاؤں گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں۔ اس پر حضرت فیروز نے کہا: میں آپ کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میری تلوار، میرا گھوڑا اور میرے مال میں سے تیس ہزار اس نوجوان کو ہدیہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے قریشی! تم نے معاف کر کے ثواب بھی لے لیا اور تم کو اتنا مال بھی مل گیا۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۳۶ تا ۱۳۸)

۵۔ حضرت عبد الرحمن بن کعب بن مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بہت سخی، نوجوان اور بہت خوبصورت تھے اور اپنی قوم کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ فضیلت والے تھے۔ وہ کوئی چیز بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ قرض لیتے رہے (اور دوسروں پر خرچ کرتے رہے) یہاں تک کہ سارا مال قرضہ میں گھر گیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ وہ قرض خواہوں سے کہیں کہ وہ میرا قرض معاف کریں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سفارش فرمائی) لیکن قرض خواہوں نے انکار کر دیا۔ اگر یہ قرض خواہ کسی کے کہنے کی وجہ سے کسی کا قرضہ معاف کرنے والے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ضرور معاف کر دیتے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا قرض ادا کرنے کے لیے ان کا سارا مال بیچ دیا یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ وہاں سے خالی ہاتھ اٹھے، ان کے پاس کوئی چیز نہ بچی۔

جب فتح مکہ کا سال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کے ایک حصہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا تا کہ ان کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن میں گورنر بن کر ٹھہرے رہے اور وہ سب سے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اللہ کے مال سے یعنی زکوٰۃ کے مال سے تجارت کی۔ چنانچہ یہ یمن میں ٹھہر کر

تجارت کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے پاس مال جمع ہو گیا اور اتنے عرصہ میں حضور ﷺ کا بھی انتقال ہو گیا۔ جب یہ (مدینہ) واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: اس آدمی یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس قاصد بھیجیں اور جتنے مال سے ان کا گزر اوقات ہو سکے اتنا مال ان کے پاس رہنے دیں باقی سارا مال ان سے لے لیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور ﷺ نے ان کو (یمن) بھیجا ہی اس لیے تھا کہ ان کے نقصان کی تلافی ہو جائے، لہٰذا میں تو ان سے از خود کچھ نہیں لوں گا، ہاں اگر یہ خود کچھ دیں تو لے لوں گا۔

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات نہ مانی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس خود چلے گئے۔ ان سے اپنی اس بات کا تذکرہ کیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور ﷺ نے مجھے تو اپنے نقصان کی تلافی کے لیے ہی بھیجا تھا، لہٰذا میں تو آپ کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں (زکوٰۃ کا مال لے کر انہوں نے تجارت کی تھی، اس سے جو نفع ہوا وہ انہوں نے رکھ لیا اور اصل زکوٰۃ کا مال واپس کر دیا اس لیے یہ نفع ان کا ہی تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ اجتماعی مال اس نفع کا ذریعہ بنا ہے اس لیے سارا نفع نہ رکھیں، بلکہ بقدرِ ضرورت رکھ کر باقی نفع بیت المال میں جمع کرا دیں، یہ فضیلت کی بات تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو ان سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے آپ کی بات مان لی، جیسے آپ کہہ رہیں میں ویسے کر لیتا ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بہت زیادہ پانی میں ہوں اور ڈوبنے سے ڈر رہا ہوں اور اے عمر! پھر آپ نے مجھے ڈوبنے سے بچایا۔

پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان کو سارا قصہ سنایا (اور اپنا سارا مال لا کر ان کو دے دیا) اور قسم کھا کر ان سے کہا کہ انہوں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا، چنانچہ اپنا کوڑا بھی سامنے لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں تم سے یہ مال نہیں لوں گا، میں نے تم کو یہ ہدیہ کر دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ مال لینا ٹھیک ہے کیونکہ انہوں نے تو یہ سارا مال بیت المال کو دے دیا جس سے یہ مال ان کے لیے حلال اور پاکیزہ ہو گیا، اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو ہدیہ کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ملک شام چلے گئے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲۰۴ تا ۲۰۵)

۶۔ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان اور یہودی اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا کہ یہودی حق پر ہے تو آپ نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس پر اس یہودی نے کہا: اللہ کی قسم! آپ نے حق کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے (خوشی میں ہلکا سا) کوڑا مارا اور فرمایا: تجھے کس طرح پتا چلا (کہ حق کیا ہوتا ہے)؟ اس یہودی نے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں تورات میں یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ جو قاضی حق کا فیصلہ کرتا ہے اس کے دائیں جانب ایک فرشتہ اور بائیں جانب ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے صحیح راستے پر چلاتے ہیں اور اسے حق بات کا الہام کرتے ہیں جب تک وہ قاضی حق کا فیصلہ کرنے کا عزم کرتا ہے، جب وہ یہ عزم چھوڑ دیتا ہے تو دونوں فرشتے اسے چھوڑ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔

۷۔ حضرت ایاس بن سلمہ اپنے والد (حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بازار سے گزرے، ان کے ہاتھ میں کوڑا بھی تھا۔ انہوں نے آہستہ سے وہ کوڑا مجھے مارا جو میرے کپڑے کے کنارے کو لگ گیا اور فرمایا: راستہ سے ہٹ جاؤ۔ جب اگلا سال آیا تو آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی۔ مجھ سے کہا: اے سلمہ! کیا تمہارا حج کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے چھ سو درہم دیے اور کہا: انہیں اپنے سفر حج میں کام میں لے آنا، اور یہ اس ہلکے سے کوڑے کے بدلے میں ہیں جو میں نے تم کو مارا تھا۔ میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! مجھے تو وہ کوڑا یاد بھی نہیں رہا۔ فرمایا: لیکن میں تو اسے نہیں بھولا (یعنی میں نے مار تو دیا لیکن سارا سال کھٹکتا رہا)۔

(حیاۃ الصحابہ، حصہ دوم: ۱۴۴ تا ۱۴۵)

حضرت علی بن ربیعہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں حضرت جعدہ بن ہبیرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر کہا اے امیر المؤمنین! آپ کے پاس دو آدمی آئیں گے ان میں سے ایک کو تو اپنے جان سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے یا یوں کہا اپنے اہل و عیال اور مال و دولت سے بھی زیادہ محبت ہے اور دوسرے کا بس چلے تو آپ کو ذبح کر دے اس لیے آپ دوسرے کے خلاف پہلے کے حق میں فیصلہ کریں اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت جعدہ کے سینہ پر مکہ مارا اور فرمایا اگر یہ فیصلے اپنے آپ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے تو میں ضرور ایسا کرتا لیکن یہ فیصلے تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے ہیں (اس لیے میں تو حق کے

مطابق فیصلہ کروں گا۔ اب وہ فیصلہ جس کے حق میں چاہے ہو جائے)۔ (حیاۃ الصحابہ ۲/ ۱۴۷)

حضرت اصبغ بن نباتہ رحمۃ اللہ کہتے ہیں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے ساتھ بازار گیا آپ نے دیکھا کہ بازار والے اپنے جگہ سے آگے بڑھ گئے ہیں آپ نے پوچھا یہ کیا ہے ؟ لوگوں نے بتایا کہ بازار والے اپنے جگہ سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اپنی جگہ بڑھا لینے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے مسلمانوں کا بازار نمازیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ یعنی مسجد کی طرح ہوتا ہے لہٰذا جس جگہ کا کوئی مالک نہیں وہاں پہلے آکر جو قبضہ کرلے گا وہ جگہ اس دن اسی کی ہوگی ہاں وہ خود اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو اس کی مرضی۔ ایک یہودی کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قصہ جلد اول ص ۳۰۷ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے ان اخلاق واعمال کے قصوں میں گذر چکا ہے جن کی وجہ سے لوگوں کو ہدایت ملتی تھی۔

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان اور یہودی اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے آپ نے دیکھا کہ یہودی حق پر ہے تو آپ نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا اس پر یہودی نے کہا اللہ کی قسم آپ نے حق کا فیصلہ کیا ہے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس (خوشی میں ہلکا سا) کوڑا مارا اور فرمایا تجھے کس طرح پتہ چلا (کہ حق کیا ہوتا ہے ؟) اس یہودی نے کہا اللہ کی قسم ہمیں تورات میں یہ لکھا ملتا ہے کہ جو قاضی حق کا فیصلہ کرتا ہے اس کے دائیں جانب ایک فرشتہ اور بائیں جانب ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے صحیح راستہ پر چلاتے ہیں اور اس حق بات کا الہام کرتے ہیں جب تک وہ قاضی حق کا فیصلہ کرنے کا عزم رکھتا ہے جب وہ یہ عزم چھوڑ دیتا ہے تو دونوں فرشتے اسے چھوڑ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔

حضرت ایاس بن سلمہ اپنے والد (حضرت سلمہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں ے کہا ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بازار سے گذرے ان کے ہاتھ میں کوڑا بھی تھا انہوں نے آہستہ سے وہ کوڑا مجھے مارا جو میرے کپڑے کے کنارے کو لگ گیا اور فرمایا راستہ سے ہٹ جاؤ جب اگلا سال آیا تو آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی مجھ سے کہا اے سلمہ کیا تمہارا حج کا ارادہ ہے ؟ میں نے کہا جی ہاں پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے چھ سو درہم دیئے اور کہا انہیں اپنے سفر حج میں کام لے آنا اور یہ اس ہلکے سے کوڑے کے بدلہ ہیں جو میں نے تم کو مارا تھا۔ میں نے کہا اے امیر المؤمنین مجھے تو وہ کوڑا یاد بھی نہیں رہا،

فرمایا لیکن میں تو اسے نہیں بھولا۔ (یعنی میں نے مار تو دیا لیکن سارا سال کھٹکتا رہا)۔

خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ

بارہ اکبر پور ایک مقام ہے اس کے قریب ایک چھوٹا سا اسٹیشن لال پور ہے ایک دفعہ بارہ سے وہاں پہنچا اور بارش کے سبب وقت سے بہت پہلے پہونچا اتفاق سے جس وقت میں پہنچا بارش ہونے لگی اور اسٹیشن کا سائبان بوچھار سے نہ بچا سکتا تھا اکبر پور میں ایک منصف صاحب میرے جاننے والے تھے ان کو اطلاع ہو گئی انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو لکھ دیا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ان کے راحت کا کافی انتظام کیا جائے اس غریب نے ہمارے واسطے ایک بڑا کمرہ کھلوا دیا شام ہوئی تو چوکیدار سے کہا کہ کمرہ میں روشنی کر دو۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ غالباً اس وقت ہمارے واسطے سرکاری تیل جلا کر روشنی کی جائے گی جو شرعاً جائز نہیں کیوں کہ سرکاری تیل سرکاری کاموں کے واسطے دیا جاتا ہے نہ کہ نجی طور پر مسافروں کی خاطر، رات بھر جلانے کے واسطے اب اگر اسٹیشن ماسٹر مسلمان ہوتا تو میں بے تکلف اس سے کہہ دیتا کہ ہمارے واسطے سرکاری تیل کا جلانا جائز نہیں مگر وہ ہندو تھا میں نے سوچا کہ اس کے سامنے شرعی مسئلہ بیان کروں تو یہ کیا سمجھے گا بلکہ عجب نہیں کہ تمسخر (مذاق) کرنے لگے۔ غرض جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اس وقت آپ ہی مجھ کو گناہ سے بچایئے۔ میری کوشش تو بیکار ہے میں دل ہی دل میں دعا ہی کر رہا تھا کہ دفعتاً اسٹیشن ماسٹر نے ملازم سے کہا کہ سرکاری تیل مت جلانا ہماری ذاتی لالٹین رکھ دینا۔

فائدہ: اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان ہمت وارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ مدد کرتے ہیں اس لیے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ ہمت سے کام لینا چاہیے۔ **(پسندیدہ واقعات ۱۲۳، ۱۲۴)**

بیت المال کی طرف سے جب سفراء وزراء یا بیرونی وفود کے لیے شاہی مہمانی کا کچھ نظم ہوتا تو آپ ایسے کھانوں میں شریک نہ ہوتے لوگوں نے جب بہت اصرار کیا تو آپ نے اپنے کھانے کا خرچ بیت المال میں داخل کرنے کے بعد ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ **(طبقات ابن سعد ۵ / ۲۷۲)**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے ملنے کو آئے حضرت نے ان کو اندر بلا لیا اور ان کے آتے ہی چراغ گل کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ گل کیوں کر دیا، فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اور میں اس وقت بیت المال ہی کا کام کر رہا تھا، اب چونکہ ہم اور آپ باتیں کریں گے اور یہ کام بیت المال کا نہیں ہے، اس لیے تیل سے بات چیت میں انتفاع نہیں کر سکتے حضرات آپ کو اس پر بھی تعجب ہو گا مگر اس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کو شریعت کے اصول و قواعد معلوم نہیں اور جو معلوم بھی ہیں تو ان پر عمل کا اہتمام نہیں ہے۔

فائدہ: شاید یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ اتنی احتیاط کس سے ہو سکتی ہے یہ تو قدرت سے باہر ہے، تو سن لیجیے کہ قدرت سے باہر تو نہیں ہاں دشوار ضرور ہے۔ (پسندیدہ واقعات ۱۲۳)

......☆......☆......☆......